جناب منظور دانیک
کی خدمت میں

عبدالغنی شیخ
سرینگر
13/6/2008

لداخ: تہذیب و ثقافت

عبدالغنی شیخ

☆ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

لداخ: تہذیب و ثقافت

عبدالغنی شیخ

کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز جموں (جے اینڈ کے) اِنڈیا

کتاب کا نام	:	لداخ: تہذیب وثقافت
مُصنّف	:	عبدالغنی شیخ
سنہ اشاعت	:	۲۰۰۵ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۱۰۰/روپے
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، جموں
ڈی ٹی پی انچارج	:	جے. آر. بھارتی، جے. کے. بھارتی
سرورق	:	مختار گرافکس
طباعت	:	انیس آفسیٹ پرنٹرس، دہلی
پبلشر	:	عبدالغنی شیخ

" LADAKH: TEHZEEB-O-SAQAFAT "
WRITER: ABDUL GHANI SHIEKH
2005
PRICE: Rs.100/-

Composing & Layout
CRESCENT HOUSE PUBLICATIONS
267-JOGI GATE, JAMMU-180001. J&K (INDIA)
MOBILE:9419134617.

ملنے کے پتے

عبدالغنی شیخ، ''یاسمین''، فورٹ روڈ، لیہہ، لداخ-۱۹۴۱۰۱

کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، ۲۶۷-جوگی گیٹ، جموں-۱۸۰۰۰۱

ڈائمنڈ بک ہاؤس، پریم نگر سرکولر روڈ، جوگی گیٹ، جموں-۱۸۰۰۰۱

اِنتساب

اپنی والدہ مرحومہ

اور

والد مرحوم

کے نام

عبدالغنی شیخ

فہرستِ مضامین

عنوان — صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

لداخ جغرافیائی لحاظ سے ہمارے مُلک کا ایک اہم خطِہ ہے۔ یہاں کی تہذیب اور ثقافت بہت قدیم ہے۔ لیہہ صدیوں تک وسطِ ایشیا کا اہم تجارتی مرکز تھا۔

اپنے آثارِ قدیمہ اور تاریخی اہمیت کے مذہبی مقامات اور یادگاروں کے لئے لداخ مشہور ہے۔ اِن میں گنپے، مساجد، امام باڑے، محلات، قلعے، سنگ تراشی کے نمونے اور ستوپا شامل ہیں۔ اِن میں تیرہ اہم تاریخی مقامات اور گنپوں کو محکمہ آثارِ قدیمہ نے قومی یادگاروں کے طور پر اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔

۱۹۷۴ء میں لداخ کو مُلک کے سیاحتی نقشے پر لایا گیا۔ تب سے بتدریج ہر سال ہزاروں مُلکی سیلانیوں سمیت سالانہ ہزاروں غیر مُلکی سیاح سیاحت کے لئے لداخ آرہے ہیں۔

اسٹریا کے ہرّ رہنرچ نے لداخ کو دُنیا کے دس بہترین سیاحت کے مقامات میں شامل کیا ہے۔ ہرّ رکو ایک سیاحتی ادارے نے دُنیا کے دس بہترین سیاحتی مقامات کا اِنتخاب کرنے کے لئے کہا تھا۔ ہرّ ر نے تقریباً ساری دُنیا کی سیاحت کی ہے اور سیاحت کے موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔

لداخ کے خوبصورت Landscape، ارضیاتی خدوخال، رنگ برنگے اُونچے پہاڑ، تاروں بھری گھنیری رات، مٹی اور غبار سے پاک دُھلی دُھلی فضا، نیلا آسمان، اور لداخی تمدّن کے انوکھے اور دِلچسپ پہلوؤں میں سیاحوں کے لئے بڑی دِلکشی اور کشش موجود ہے۔ اِس لئے لداخ کو جادوئی دیش، نیا شنگر یلا اور پُر اَسرار سرزمین

بھی کہا گیا ہے۔

''لداخ: تہذیب وثقافت'' اُردو میں لداخ پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے' جو میرے پینتالیس سال کی تحقیق اور ریاضت کا ثمرہ ہے۔ اِس میں لداخ کی تاریخ، ثقافت، تمدّن، یادگاروں، اہم مقامات، مذاہب، شخصیات، لوک ادب، زبان، جنگلی جانوروں وغیرہ پر مختلف مضامین میں بصیرت افروز روشنی ڈالی گئی ہے۔ اِن میں انگریزی اور اُردو کے مختلف رسائل وغیرہ میں میرے مطبوعہ مضامین بھی شامل ہیں جن میں نئی تحقیق اور ریسرچ کی روشنی میں ترمیم و تنسیخ اور ردّ و بدل کے ساتھ نئے مواد کا اِضافہ کیا گیا ہے۔ اِنہیں لکھنے میں ذاتی مشاہدات، تجربات، مختلف جانکار افراد سے اِنٹرویو لینے کے علاوہ متعدد کتابوں، مضامین، نیشنل آرکائیوز اور جموں و کشمیر کے آرکائیوز (محافظ خانوں) کے ریکارڈ سے اِستفادہ کیا گیا ہے۔

آج لداخ ایک اہم دوراہے پر کھڑا ہے۔ خِطّے میں بڑے پیمانے پر ترقیاتی اور نجی طور تعمیری کام ہو رہا ہے۔ بیرونِ لداخ کے ہزاروں انجینئر، کلاکار، کاریگر، معمار اور مزدور لداخ میں کام کرتے ہیں۔ لداخ کا حال اور مستقبل دونوں تابناک ہیں۔

مَیں غلام جیلانی (خلفُ الرشید جناب منشی غلام محی الدّین مرحوم)' نثار راہی' لیلیٰ بانو' منشی حسین (محکمہ سیاحت) اور بابو عبدالقیوم کا شکرگزار ہوں جنہوں نے اِس کتاب کے لئے نادر فوٹو مرحمت کئے۔

عبدالغنی شیخ

جغرافیہ

جغرافیائی لحاظ سے لداخ ہمارے مُلک کے نقشے پر ایک اہم خِطّہ ہے۔ یہاں فطرت اصلی رنگ اور رُوپ میں نظر آتی ہے۔ ننگے پہاڑوں اور بنجر میدانوں میں اپنی دِلکشی اور جاذبیت ہے۔ یہاں ایک مسافر کو ہر طرف اُونچے ویران پہاڑ اور لمبے چوڑے میدان نظر آتے ہیں۔ میلوں تک گھاس کا ایک تنکا اُگا نہیں ہے اور جب ایک سرسبز وادی آتی ہے تو آنکھوں کو طراوت ملتی ہے۔ کہیں کہیں مسافر کے ساتھ ایک دریا چلتا ہے یا دُور ایک برفانی چوٹی آسمان کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ دو پہاڑوں کے تنگنائے میں سے پیچ و بل کھاتا ہوا صاف و شفاف نالہ چٹانوں سے ٹکراتا اور شور مچاتا ہوا مسافر کے قدموں کے سامنے سے گزرتا ہے۔ اِسی نالے سے ایک یا ایک سے زیادہ بستیاں سیراب ہوتی ہیں۔

"MAGIC LADAKH" کے مصنّف میجر GOMPARTZ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

''لداخ بلوچستان سے ملتا جلتا ہے۔ بلوچی کہتے ہیں' جب خدا نے دُنیا بنائی تو بچے کھچے پتھر، مٹی گارا وغیرہ ایک ڈھیر کی صورت میں نیچے پھینک دیا۔ یہ ڈھیر بلوچستان ہے۔ لیکن خدا نے لداخ کے معاملے میں روزانہ اپنے برش اور رنگوں کی گونا گونی سے اِس میں تبدیلیاں لائی ہیں تاکہ صبح شام پہاڑوں کے بدلتے رنگ دیکھ کر لوگ خدا کو یاد کریں۔ ان پہاڑوں میں تتلی کے پر، جنگلی پھولوں، سمندر کے کہرے اور قوس قزح کی رنگت ہے۔''

لداخ میں مختلف شکلوں اور رنگوں کی چٹانیں اور پہاڑ ہیں۔ کئی مقامات پر چٹانوں میں بڑے بڑے سوراخ ہیں۔ تُرکی تاجروں نے اِن کو کبوتر خانہ کہا ہے۔

لیہہ ضلع ۳۲ سے ۳۶ ڈگری عرض بلد اور ۷۶ سے ۷۹ ڈگری طول بلد پر واقع ہے جبکہ کرگل ضلع ۳۲ اعشاریہ ۴۵ سے ۴۵ اعشاریہ ۳۰ ڈگری عرض بلد اور ۲۰ اعشاریہ ۷۵ ڈگری اور ۳۶ اعشاریہ ۷۵ ڈگری طول بلد پر واقع ہے۔

لداخ کے شمال اور مشرق میں چین، شمال مغرب میں گلگت اور اسکردو، مغرب میں وادی کشمیر اور جنوب میں پنجاب اور ہماچل پردیش ہیں۔

لداخ کا اصلی رقبہ ۹۷۸۷۲ مربع کلو میٹر ہے جو ریاست جموں و کشمیر کے مجموعی رقبے کا ستر فیصد ہے۔ اِس میں چین کا مقبوضہ علاقہ اکسائی چین شامل ہے۔ موجودہ لداخ کا کُل رقبہ ۵۸۳۲۱ مربع کلو میٹر ہے۔ اِس میں ضلع کرگل کا رقبہ ۱۴۰۳۶ مربع کلو میٹر ہے۔ ۱۹۸۱ء کے بعد مردم شماری نہیں ہوئی ہے تاہم خطّے کی آبادی مختلف اندازوں کے مطابق ڈھائی لاکھ کے آس پاس ہے۔ اِس تناسب سے ایک مربع کلو میٹر میں ۳ سے ۴ کے درمیان لوگ رہتے ہیں جبکہ ضلع سرینگر میں ایک مربع کلو میٹر کے رقبے میں ۳۱۸ اور جموں صوبہ میں ۳۰۵ لوگ بستے ہیں۔ ساری ریاست میں اوسط آبادی فی کلو میٹر اُنسٹھ ہے۔

لداخ کا بہت بڑا علاقہ بلندی، پیروں یا درّوں اور کڑاکے کی سردی کی وجہ سے کھیتی باڑی اور اِنسانی رہائش کے قابل نہیں ہے۔ ۵۸۳۲۱ مربع کلو میٹر رقبے میں صرف ۶۲۰ کلو میٹر مربع رقبے میں کھیتی باڑی، پھل پھول اور سبزیوں کی کاشت ہوتی ہے۔ جینت رضوی کے مطابق حالیہ سالوں میں آبادی میں اضافہ، مکانات وغیرہ کی تعمیر کی وجہ سے یہ رقبہ گھٹ کر ۲۱۰ مربع کلو میٹر رقبہ رہ گیا ہے۔ حال میں کچھ نئ جگہیں آبپاشی کے تحت لائی جارہی ہیں۔ اِس لئے اِس رقبہ میں اضافہ ہوگا۔

۱۹۸۳-۸۴ء کے سروے کے مطابق لیہہ اور کرگل ضلعوں میں ۲۲۲۲۰ ہیکٹر

رقبہ زیرِ کاشت تھا اور ۲۸۰ ہیکٹر رقبے سے سالانہ دو فصلیں ملتی تھیں۔ تب سے زیرِ کاشت اراضی میں معمولی اضافہ ہوا ہے۔ ڈوگرہ دورِ حکومت میں تخمیناً ۱۸ سے ۱۹ ہزار ہیکٹر رقبے میں کھیتی باڑی ہوتی تھی۔

جغرافیائی لحاظ سے لداخ خطّہ پانچ حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مرکزی لداخ، نوبراہ وادی، چنگ تھنگ، کرگل اور زنسکار۔

ضلع لیہہ میں چنگ چھنمو اور اکسائی چین کا لینگزی تھنگ علاقہ آج بھی شامل ہے۔ چنگ چھنمو ایک لمبی وادی ہے۔ اس کا لفظی مفہوم شمالی بڑا علاقہ ہے۔ اُنیسویں صدی اور بیسویں صدی کے نصف کے دوران یہ علاقہ یورپی شکاریوں کے لئے جنگلی یاک کی مشہور شکارگاہ تھا۔ لینگزی تھنگ سو کلومیٹر لمبا میدان ہے۔

لداخ کی سردی تو سبھوں پر عیاں ہے۔ کبھی کبھی سخت سردی کی وجہ سے ڈربے میں مرغ مرغیاں اور گاؤ خانے میں گائیں مری ہیں۔ گرمیوں میں خاصی گرمی ہوتی ہے اور درجہ حرارت ۳۰ ڈگری سینٹی گریڈ کو چھوتا ہے، تاہم رات ٹھنڈی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ لداخ کی ریتلی زمین ہے۔ ریت جلدی گرم اور جلدی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ عالمی سطح پر موسم کی تبدیلی کا اثر لداخ پر بھی پڑ رہا ہے۔

لداخ میں دُھوپ کی بڑی اہمیت ہے۔ سورج چند لمحوں کے لئے بادلوں کی اوٹ میں چلا جائے تو گرمیوں میں بھی سردی کی ایک ہلکی سی لہر اُٹھتی ہے اور اوٹ سے نکلے تو گرمی محسوس ہوتی ہے۔ سورج کی تعریف میں گیت لکھے گئے ہیں۔ دُھوپ چھاؤں کی اِس کیفیت کو ایک یورپی نے یوں پیش کیا ہے:

"Heat there is but it is not hot, and cold there is but it is not cold. One perspires and shivers at the same time."

(ترجمہ: یہاں گرمی ہے لیکن گرم موسم نہیں۔ یہاں سردی ہے بھی اور نہیں بھی۔ ایک آدمی یہاں بیک وقت پسینے سے شرابور ہوتا ہے اور سردی سے ٹھٹھرتا بھی ہے۔)

آ گے وہ لکھتا ہے: ''موسم سخت اور ناساز گار ہو بھی، لیکن لوگ اچھے ہیں۔ سفر کٹھن ہو لیکن زمین مہمان نواز ہے۔''

مُلک کے دُوسرے حصّوں میں جہاں مئی جون میں سخت گرمی پڑتی ہے، وہاں جولائی اور اگست لداخ کے گرم ترین مہینے ہیں۔

سردی کی وجہ سے یہاں لوہا سکڑتا ہے۔ پانی بھاری ہے۔ اِس لئے پانی میں صابن کا کم جھاگ پیدا ہوتا ہے اور کپڑے دیر سے صاف ہوتے ہیں۔ اُونچائی کی وجہ سے اسٹوو پر کھانا دیر سے پکتا ہے۔

لداخ میں بارش کم پڑتی ہے۔ سالانہ اوسطاً ۲۶ اعشاریہ ۹ سینٹی میٹر بارش کی پیمائش کی گئی ہے۔ یہ سمجھ لیجئے سال میں صرف تین چار روز بارش برستی ہے۔ وہ بھی سارا دن نہیں۔ کرگل میں ۲۵ سینٹی میٹر تک بارش ریکارڈ کی گئی ہے لیکن کبھی کبھی موسم کا تیور بدل جاتا ہے اور زیادہ بارش برستی ہے۔ اور لوگ باگ آج کل چھتوں پر ٹین لگا رہے ہیں۔ برف زیادہ پہاڑوں اور اُونچائی پر واقع بستیوں میں زیادہ گرتی ہے۔ موسم میں تبدیلی کے باوجود کبھی کبھی سردیوں میں کڑاکے کی سردی پڑتی ہے۔ لداخ کا علاقہ دراس، رُوس کے سائبیریا کے بعد دُنیا کا دُوسرا سرد ترین علاقہ سمجھا جاتا ہے۔

لداخ میں سطح سمندر کی بلندی ۸۰۰۰ ہزار فٹ سے ۲۵۱۸۰ فٹ کے درمیان ہے۔ ۱۵۰۰۰ فٹ کی بلندی تک لوگ رہائش کرتے ہیں۔

لداخ اور اِس کے پڑوس میں دُنیا کے کئی مشہور پہاڑوں کے سلسلے ہیں۔ ان میں ایک لداخ کا اپنا پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ اس میں خردونگ سمیت نوبراہ وادی کے پہاڑ آتے ہیں جو جنوب کی طرف چنگلا تک چلے گئے ہیں اور کیلاش سلسلہ ہائے کوہ سے جا ملتے ہیں۔ ترو، شام اور پھیانگ کے پہاڑ بھی لداخ پہاڑی سلسلے میں آتے ہیں۔ لداخ سلسلہ ہائے کوہ کی بلند ترین چوٹی ۲۰۷۰۰ فُٹ ہے۔ کئی بُلند درّے اس سلسلہ ہائے کوہ میں آتے ہیں جن میں ۱۸۱۰۵ فٹ بلند چنگلا، ۱۵۰۰۰ فٹ بلند چھاغالا اور

۵۴۹۵ افٹ اُونچا کونکالا شامل ہیں۔

لداخ کے پہاڑوں کا دُوسرا سلسلہ زنسکار سلسلہ ہائے کوہ ہے۔ ستوق کا بلند و بالا پہاڑ اسی سلسلہ ہائے کوہ میں آتا ہے۔ لیہہ قصبہ سے ستوق کی تین چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ جو ستوق کنگری، گولیب اور پارچا کہلاتے ہیں۔ ان کی بلندیاں ۱۹ ہزار اور ۲۱ ہزار فٹ کے درمیان ہیں۔ بلند ترین ستوق کنگری اِکیس ہزار فٹ یا ۶۱۵۳ میٹر اُونچی ہے۔

دُنیا کا سب سے اُونچا اور بلند سلسلہ ہائے کوہ ہمالیہ زوجیلا سے سورو ہوتا ہوا زنسکار کے جنوب مغرب میں چلا گیا ہے۔ لداخ کی دو مشہور چوٹیاں نُن ۲۳۲۱۹ فٹ اور کُن ۲۳۴۱۰ فٹ بلند، اِسی سلسلے میں آتی ہیں۔ وائٹ نیڈل یا سفید سوئی نام کی ۶۹۵۰ میٹر چوٹی بھی اِسی سلسلہ ہائے کوہ میں ہے۔

نوبراہ وادی کے شمال مشرق میں قراقرم کا پہاڑی سلسلہ ہے۔ یہ لداخ سے بلوچستان کے علاقے تک ۴۵۰ میل میں پھیلا ہوا ہے۔ اِس سلسلہ ہائے کوہ میں گا شیر بُوم کنگری، چوگو لُونگما کنگری، بیافو گینگ کنگری، ریمو اور سیاچن کنگری یا گلیشیر ہیں۔ سیاچن ۷۶ کلومیٹر لمبا اور ۲ سے ۸ کلومیٹر چوڑا ہے۔ یہاں دُنیا کی دُوسری بلند ترین چوٹی کے ٹُو (K-2) سمیت گا شیر بُورُوم، گولڈن تھورون اور ساسیر کی چوٹیاں ہیں۔ جن کی بلندی ۲۵ ہزار سے ۲۷ ہزار فٹ کے درمیان ہے۔ ساسیر چوٹی لداخ میں پڑتی ہے۔ اِس کی بلندی ۲۵۱۸۰ فٹ یا ۷۶۷۲ میٹر ہے اور لداخ خطّے کی سب سے اُونچی چوٹی ہے۔

لداخ میں چھوموری ری پہاڑوں کا سلسلہ بھی ہے۔ اس سلسلہ ہائے کوہ میں کئی بلند چوٹیاں ہیں۔ الیگزنڈر کنینگھم نے پہلے پہل اِن چوٹیوں کی پیمائش کی تھی۔ ان میں چھوموری ری اور گیا چوٹیاں ۲۱ ہزار فٹ، آنلے چوٹی ۲۰۱۴۱ فٹ، رونگو چوٹی ۲۰۷۸۶، چنگ لُونگ ۲۰۳۵۷ اور لانق ۲۰۰۰۰ فٹ بلند ہیں۔

لداخ کے گرد و نواح میں کئی سلسلہ ہائے پہاڑ ہیں۔ اکسائی چین کی جانب کیون لین سلسلہ ہائے کوہ ہے۔ ہماچل پردیش میں لاہول، کشمیر کی طرف پیر پنچال اور خطّے کے نواح میں ٹرانس ہمالین رینج ہیں۔

لداخ چاروں طرف سے درّوں سے گھرا ہوا ہے۔ جس طرف جانا ہو درّوں کو ٹاپنا پڑتا ہے۔ لیہہ اور شین جیانگ کے درمیان چھ مشہور درّے ہیں۔ اِن میں لیہہ کے پاس خردونگ، سابو کی طرف سے دِگر اور نوبراہ سے آگے ۱۷۵۰۰ فٹ بلند ساسیر اور ۱۸۶۸۰ فٹ اُونچا قراقرم درّے ہیں۔ قراقرم درّہ لداخ کا بلند ترین درّہ ہے۔ ڈاکٹر تھامس تھامسن نے اُنیسویں صدی کے وسط میں اِن دونوں درّوں کو ناپا تھا۔ وہ ۱۸۴۶ء میں الیگزنڈر کننگھم کے ہمراہ لداخ آیا تھا۔

لیہہ اور بلتستان کے درمیان کئی اور درّے ہیں۔ جن میں ۱۵۷۰۰ فٹ بلند چھوربت لا اور ۱۶۸۹۰ فٹ بلند ہنُو لا قابلِ ذکر ہیں۔

ہماچل پردیش اور لیہہ کے درمیان پانچ درّے ہیں جن میں ۱۸۵۰۰ فٹ بلند راٹنگ لا سب سے اُونچا ہے۔ لیہہ اور سرینگر کے درمیان کئی درّے ہیں۔ اِن میں زوجی لا، فوتو لا اور نامی کا' آتے ہیں۔ ۱۳۴۷۹ فٹ بلند فوتو لا سب سے اُونچا ہے۔ لیہہ سرینگر سڑک جب نہیں بنی تھی تو سفر کرنے والوں کو پشکیوم کے پاس درکیت لا سے گزرنا پڑتا تھا۔ آج کل سڑک اس پیر کے دامن سے گزرتی ہے۔ پہلے پہل لیہہ سرینگر کے درمیان ان درّوں کی بلندیاں الیگزنڈر کننگھم نے معلوم کی تھیں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ آزادی کے بعد لداخ میں ماہرین نے بہتر آلات سے مختلف مقامات اور درّوں کی بلندیوں کی پیمائش کی۔ ان میں اور ماضی کے یورپین محققوں کے نتائج میں کچھ فرق ہے۔ اِسی طرح مصنوعی سیارے کی بدولت آج کل لداخ اور ہمسایہ علاقوں کے بہتر اور صحیح نقشے دستیاب ہیں۔

زنسکار اور کشتواڑ کے درمیان ۱۷۳۷۰ فٹ بُلند اُماسی لا ہے۔ اِسی پیر سے وزیر

زور آور سنگھ لداخ پر حملہ آور ہوا تھا۔ اِس کی پیائش بھی ڈاکٹر تھامسن نے کی تھی۔ اسی طرح لیہہ اور تبت کے درمیان کئی درّے ہیں۔

لداخ کے پرانے علاقے لاہول اور سپیتی کے درمیان ۱۴۸۵۱ فٹ اُونچا گوت زوم لا ہے۔ کینور اور سپیتی کے درمیان مانے زنگ لا اور تاری لا ہیں۔ اوّل الذکر کو A.Gerard نے ناپا تھا اور اس کی بلندی ۱۸۶۱۲ فٹ بتائی ہے۔ تاری لا ۱۵۲۸۲ فٹ اُونچا ہے۔ اس کی پیائش لیفٹیننٹ ماچے گن نے کی تھی۔

لاہور اور زنسکار کے درمیان ۱۶۵۰۰ فٹ اونچا پارالا چا ہے۔

اندرونِ لداخ میں متعدد درّے ہیں۔ اِن میں ساکٹی اور ٹانکچے کے درمیان ۱۸۱۰۵ فٹ بلند چنگلا، زنسکار اور لامایورو کے درمیان ۱۶۹۵۲ فٹ سینگے لا، ژھوکر کے پاس ۱۶۵۰۰ فٹ پھولونگ کونکا اور ژھوموری ری کے پاس ۱۸۰۰۰ فٹ بلند نقپو گونڈ ینگ قابلِ ذکر ہیں۔

کونکالا اور چنگلا کی بلندیاں پہلے پہل مور کرافٹ نے معلوم کی تھیں اور اس کے ساتھی ٹربیک نے چھاغالا کے سروے کیا۔ وہ ۱۸۲۰ء میں لداخ آئے تھے۔

لداخ میں ایسے کئی درّے اور چوٹیاں ہیں جن کے نام نہیں ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں لارڈ ڈینمور لداخ کے سروے پر آیا تھا۔ اکسائی چین کے پاس ڈینمور نے ایک پیر دیکھا۔ اس کی بلندی ۱۸۲۵۰ فٹ تھی۔ اُنہوں نے درّے پر ایک تتلی دیکھی اور اس کا نام اِسی نسبت سے لداخی میں ''پیماپلرٹ ے'' رکھا۔ اس سفر میں ڈینمور نے ایک وادی میں بہت ہڈیاں دیکھیں۔ اِس کا نام اُنہوں نے ''رُوسپا لُونکپا'' رکھا، جس کا مطلب لداخی میں ہڈیوں والی وادی ہے۔

قراقرم کے سوا تمام درّوں کے نام لداخی لگتے ہیں۔

اگرچہ قدرت نے لداخ کو ہرا بھرا اور شاداب نہیں بنایا ہے، تاہم اس کو دریاؤں، جھیلوں اور گرم پانی کے چشموں سے نوازا ہے۔ لداخ کے دریاؤں میں

سندھ، شایوک، نوبراہ، سُورُو، زنسکار اور دراس کے نام آتے ہیں۔ دریائے سندھ سب سے بڑا دریا ہے اور باقی دریا اُس کے معاون ہیں۔ ۳۰۸۰ کلومیٹر لمبا سندھ لداخ میں ۵۰۰ کلومیٹر بہتا ہے۔ دریائے شایوک، جو قراقرم سے نکلتا ہے، ۶۴۰ کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے اسکردو سے ۴۸ کلومیٹر نیچے کریس کے مقام پر دریائے سندھ میں جا ملتا ہے۔ اسے پہلے دریائے نوبراہ دِیسکیت کے پاس شایوک سے گلے لگاتا ہے۔ دریائے نوبراہ کا منبع سیاچن ہے۔ دریائے شایوک میں چِپ چاپ، گلوان اور چنگ چھنمو نالے بھی ضم ہوتے ہیں۔

دریائے سُورُو نُن کُن گلیشیر سے نکلتا ہے اور ۸۰ کلومیٹر بہنے کے بعد کرگل سے آگے مورول کے مقام پر دریائے دراس سے مل کر سندھ میں گرتا ہے۔

دریائے زنسکار، جسے لداخ میں چیلنگ چُھوبھی کہا جاتا ہے' پارالاچا سے نکلتا ہے اور ۳۲۰ کلومیٹر بہہ کر نیموں گاؤں کے پاس دریائے سندھ کے ساتھ اپنا سنگم بناتا ہے۔

لداخ کی جھیلوں میں پنگونگ سب سے بڑی ہے۔ یہ ۱۴۴ کلومیٹر لمبی اور ساڑھے تین کلومیٹر سے سات کلومیٹر چوڑی ہے اور ۵۲۲ مربع کلومیٹر رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اِس کا ایک بڑا حصّہ تبت کی قلمرو میں چلا گیا ہے۔ بیچ میں یہ ۶۰ فٹ گہری ہے۔

جھیل چھوموری ری ۱۵ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اِس کی لمبائی ۲۴ کلو میٹر اور چوڑائی ۵ سے ۸ کلومیٹر ہے۔ یہ بڑی گہری جھیل ہے۔ ایک جگہ اِس کی گہرائی ۲۴۸ فٹ ہے۔

چھوموری ری کے پاس چھوکر جھیل ہے۔ ۸ کلومیٹر لمبی اور ۴ کلومیٹر چوڑی یہ جھیل پیچ و بل کھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اِس جھیل میں سے ہر سال بڑی مقدار میں نمک نکالا جاتا ہے۔

پنگونگ اور چھوموری ری کی جھیلیں سیاحت کے دِلکش مراکز ہیں۔

چھورول لداخ کی ایک پرانی جھیل ہے۔ اِس کا مطلب گلی سڑی جھیل ہے۔

اِن تمام جھیلوں کا پانی گہرا نیلا اور ذائقہ کھاری ہے۔ اِس خطّے میں صرف انلے جھیل کا پانی تازہ ہے۔

نوبراہ سے آگے جھیلِ خومدن ہے۔ جو ماضی میں وقتاً فوقتاً سیلاب اور تباہیاں لانے کا سبب بن چکی ہے۔

لداخ میں گرم پانی کے کئی چشمے ہیں۔ یہ چشمے نوبراہ میں پنامیک، چنگ تھنگ میں چھوما تھنگ اور پوگا، علاقہ لائن میں سُکیو مرکا اور لیہہ کے پاس آیو گاؤں میں ہیں۔ ان میں کئی چشموں کا پانی اِتنا گرم ہے کہ اِن میں انڈے اُبلتے دیر نہیں لگتی۔ گرم پانی کے چشمے کا پانی ریح، معدے کی تیزابیت اور جلد کی بیماریوں کے لئے مفید ہے۔ اِن چشموں کے پانی میں مختلف قسموں کے معدنیاتی اجزاء پائے جاتے ہیں جن میں مثبت طبّی خصوصیات ہیں۔ مریض رہبری کے لئے عموماً امچی یا مقامی حکیم کو اپنے ساتھ جائے موقع پر لے جاتے ہیں۔

اُنیسویں صدی اور بیسویں صدی کی شروعات میں برطانوی ہند حکومت نے لداخ سے ہمسایہ خطّوں میں جانے والے پیدل گھوڑے کے راستوں کا نہ صرف سروے کیا تھا بلکہ اُن کی مرمت اور توسیع بھی کرائی تھی۔ ان رپورٹوں کے مطابق لیہہ سے چینی ترکستان کے شہر یارقند براستہ شایوق ۶۲۵ میل اور براستہ چنگ چھنمو ۵۴۸ میل دُور تھا۔ لیہہ سے لہاسہ ۱۰۰۰ میل، رودوق ۲۱۶ میل، سکردو براستہ کرگل ۲۱۳ میل، براستہ سکپور بُوچن ۲۰۳ میل، لیہہ سے شملہ ۴۰۶ میل اور لیہہ سے سپیتی ۲۲۲ میل کا فاصلہ تھا۔ لیہہ سے یارقند پہنچنے میں تب ایک ماہ لگتا تھا، جب کہ لہاسہ پہنچنے میں تقریباً تین ماہ لگتے تھے۔

تب سے دریائے سندھ میں بہت پانی بہا ہے۔ نئی سڑکیں اور شاہرائیں بنی ہیں۔ مذکورہ تجارتی راستوں کا تذکرہ صرف کتابوں میں ہے، جو ہمیں اُس دَور کی یاد دِلاتا ہے۔

تاریخ

یہ ۱۹۳۴ء کی بات ہے۔ لداخ آنے والے دو یورپین جے ہاکس اور ایچ.ڈی. ٹیرا، کو کرگل میں ایک ڈھلوان جگہ پر پتھر کے زمانے کا ایک اوزار ملا۔ اُنہوں نے یہ سوچا کہ کسی مسافر نے کشمیر سے اپنے ساتھ یہ اوزار لایا ہوگا اور وہاں چھوڑ دیا ہوگا۔ اِس سے پہلے کشمیر میں برزہ ہما کے مقام پر پتھر کے زمانے کے اوزار، آلات، برتن وغیرہ ملے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ لداخ کے ننگے پہاڑ اور چٹیل میدان اِنسانوں کے بسنے کے لئے کشش نہیں رکھتے اور لداخ نے کبھی پتھر کا زمانہ نہیں دیکھا ہوگا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ لداخ کے پیشرو اور حال کے کسی مورخ نے لداخ میں پتھر کے زمانے کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

۱۹۷۹ء میں یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا کہ لداخ نے پتھر کا زمانہ نہیں دیکھا ہے۔ جب محکمہ آثار قدیمہ کے چند ماہرین کو لداخ کے دیہات اِلچی، سسپول، ریزونگ اور لیکیر میں پتھر کے شیشے اور کلہاڑیاں ملیں۔ ان میں ایک ماہر آثار قدیمہ نے اِس خیال کا اِظہار کیا کہ پتھر کی یہ تہذیب زیادہ دیر نہیں رہی ہے کیونکہ پتھر کے زمانے کے بعد اِستعمال کئے جانے والے بہتر اوزار اور آلات دستیاب نہیں ہوئے۔ اِس کا خیال تھا کہ پتھر کے زمانے کے بعد یہ لوگ لداخ کا یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہوں گے۔ لیکن اِس کا یہ نظریہ غلط ثابت ہوا۔ بعد میں آنے والے ماہرین کو نئے اوزار ملے اور اُنہوں نے تصدیق کی کہ اِس خطّے نے پتھر کے پرانے اور نئے دونوں زمانوں کو دیکھا ہے اور یہاں تاریخ سے قبل (Prehistoric) اِنسان بستے تھے۔

۱۹۷۹ء میں ہی واڈیا اِنسٹی ٹیوٹ آف ہمالین جیولوجی ڈیرہ ڈُون کے دو ماہرین نے لیہہ سے سو کلومیٹر دُور دریائے سندھ کے کنارے ایک گاؤں کے پاس جلی ہوئی لکڑی کے پرانے کوئلے دیکھے جو مٹی اور ریت میں پیوست تھے۔ اُنہوں نے ایک چولہے کے پاس موٹی موٹی ہڈیاں دیکھیں جو کسی جنگلی بکرے کی لگتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ قبل از تاریخ کے ایک یا ایک سے زیادہ آدمی نے گوشت بھون کر کھایا تھا اور ہڈیاں وہاں چھوڑ دی تھیں۔

دونوں سائنس دانوں نے چولہے کی راکھ سے نمونے جمع کئے اور اس کی تاریخ تعین کرنے کے لئے اس کا ریڈیو کاربن لیبارٹری میں تجزیہ کیا اور یہ اِنکشاف ہوا کہ یہ چولہا ساڑھے چھ ہزار سال پرانا ہے۔ یعنی وادیءِ سندھ کی تہذیب سے بھی دو ہزار سال پرانا ہے۔

چولہے کے پاس دریائی ڈھلوان دیوار پر رہائش کے لئے غار بنے تھے۔ ایسے غار دریائے سندھ اور دریائے شایوک کے معاونوں کے کنارے بھی پائے گئے۔ ایسے ہی کئی قدیم غار نوبراہ وادی میں بھی ہیں جو تین چار ہزار سال پرانے بتائے جاتے ہیں۔ ان میں اکثر غار قبل از تاریخ کے انسانوں کے مسکن تھے۔

اِس کے چھ سال بعد ۱۹۸۵ء میں جیولوجیکل سروے آف انڈیا کی ایک ٹیم کو لداخ کے دیہات نُورلا، خلسے، پسکیوم اور کرگل کے گردونواح میں پتھر کے مزید اوزار اور آلات ملے۔ ان کے مطابق یہ اوزار پرانے پتھر کے زمانے کے تین مرحلہ وار دَور سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں کلہاڑی اور کدال سمیت کھرچنے اور چھیلنے کے آلات تھے، جو کئی اقسام کے پتھروں سے بنائے گئے تھے۔

سائنس دانوں کو ان دریافتوں سے مزید تحقیق کی تحریک ملی۔ ۸۹-۱۹۸۸ء میں آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا کے چند ماہرین کو سروے کے دوران اپچی گاؤں کے پاس دریائے سندھ کے کنارے پتھر کے اوزار ملے اور کیرے گاؤں میں کھدائی کے

دوران قدیم چولہے، جانوروں کی باقیات، ٹوٹے پھوٹے برتن کے ٹکڑے اور پتھر کے سامان ملے۔ تجزیئے سے معلوم ہوا کہ یہ چیزیں ۴۷۰۰ سال قبل مسیح سے ۹۰۰ سال قبل مسیح کے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔

لداخ کے جغرافیائی خدوخال اور طبعی خصوصیات بتاتی ہیں کہ لداخ پہلے ایک سمندر تھا۔ مچھلیوں سمیت خطّے میں مختلف جانوروں کے فوسلز اور سنکھ ملے ہیں۔

بقولِ ایک ماہرِ ارضیات ٗلداخ میں ہاتھی کا ایک ڈھانچا ملا۔ ہاتھی کا ایک ڈھانچا حال میں وادیٔ کشمیر میں پانپور کے مقام پر ملا ہے جو اِس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ قدیم زمانے میں لداخ اور وادی کشمیر کے جنگلات میں ہاتھی پائے جاتے تھے۔ لداخ میں کئی مقامات پر پتھر کے کوئلے ملے ہیں جہاں کبھی جنگلات ہونے چاہئیں۔ اُن دِنوں لداخ کی آب وہوا آج کل کی طرح سرد اور خشک نہیں تھی۔

لاکھوں سالوں کے دوران آہستہ آہستہ جب سمندر کا پانی خارج ہونے لگا تو خشکی نمودار ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ان گنت جھیلیں معرضِ وجود میں آئیں۔ ایک جغرافیہ دان نے لکھا ہے تب متعدد جھیلوں والا لداخ بڑا خوبصورت ہوگا۔ آج بھی ان جھیلوں کے آثار نظر آتے ہیں۔ لیہہ کے پاس جہاں کھریا مٹی کا ٹیلہ ہے، ایک جھیل تھی۔ شے محل کے پہاڑی دامن میں جھیل تھی۔ لامایورو میں ایک بڑی جھیل تھی جہاں مچھلیوں کے پنجر اور سنکھ ملتے ہیں۔ ان جھیلوں کو خشک ہوئے بہت زیادہ مدّت نہیں ہوئی ہے۔

تبت اور لداخ کے قدیم باشندوں سے متعلق یہ لکھا گیا ہے کہ یہاں آدم خور قسم کے وحشی لوگ رہتے تھے۔ بعد میں مذاہب اور مختلف عقائد کے پرچار سے لوگوں نے یہ قبیح حرکت چھوڑ دی۔

اِبتداء میں نقل مکانی کر کے لداخ آنے والے مون بتائے جاتے ہیں۔ مون ہندوستانی کی قدیم نسل ہے۔ لداخ کی اپنی روایت کے مطابق مون ہماچل پردیش

سے آئے تھے۔ اُنہوں نے لداخ میں بستیاں بسائیں۔ مون قوم کے قدیم آثار مون کھر (مون قلعہ) مون گی چھورتن (مون ستوپا) اور مون جینگ (مون کھیت) کی صورت میں کچھ کچھ موجود ہیں، یا روایات قائم ہیں۔

اِس کے بعد گلگت اور اس کے اطراف سے درد آئے اور خطّے کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ بہت سارے پرانے قلعوں کے کھنڈرات دِردوں کے بتائے جاتے ہیں۔ رونگ میں قبریں ملیں اور ہر قبر سے تین سے بیس تک کھوپڑیاں برآمد ہوئیں۔ فرانکی کے مطابق یہ درد قبریں ہیں اور کھوپڑیاں ڈھائی ہزار سال پرانی ہیں۔

دردوں نے لداخ پر اپنا تسلّط جمانے کے بعد مون نسل کے لوگوں کو یا تو بھگا دیا یا غلام بنایا اور جس کام کو وہ خود کرنا نہیں چاہتے تھے یا نیچ سمجھتے تھے، وہ کام مون سے لیا۔ اپنے ساتھ ہر بستی میں مون غلام رکھے۔ مون کے ساتھ غیر انسانی برتاؤ زمانہ حال تک جاری رکھا گیا اور اُن کو آج بھی ''نیچ ذات'' کہا جاتا ہے۔

درد اور مون دونوں آریائی نسل کے ہیں۔ آریائی قوم حملہ آور اور شرنارتھی کی حیثیت سے ہزاروں سال پہلے ہندوستان آئی تھی۔ لداخ میں دردوں کی آمد کا سلسلہ نمکیل خاندان کے دورِ حکومت تک جاری رہا۔

لداخ اور مغربی تبت کی مشترکہ سرحدیں ہیں۔ اِس لئے زمانہ قدیم سے ہی منگول نسل کے تبّتی لداخ آتے جاتے تھے۔ فرانکی کے مطابق خانہ بدوش تبّتی لیہہ اور اس کے آس پاس کے علاقے میں اپنی بھیڑ بکریاں چرانے کے لئے لاتے تھے۔

لداخ کی موجودہ نسل مون، درد اور منگول نسلوں کی اولاد ہے۔

عام نظریہ یہ ہے کہ لداخ کا قدیم ترین مذہب بون تھا۔ تبت اور بلتستان میں بھی بون مذہب مروّج تھا۔ بون مذہب کا جنم پہلے پہل ایران میں ہوا۔ ابتداء میں یہ پارسی مذہب کا ایک ذیلی فرقہ تھا۔ سومالیگ اور ڈنپا نمکھا' بون کے عالم ہو گزرے ہیں۔ اُن کی کتابیں آج بھی دستیاب ہیں۔ ایک اور روایت کے مطابق بون مت کا

بانی شینرپ مغربی تبت کے صوبہ کوگے کا رہنے والا تھا۔ تبت میں بون مذہب اُن ایرانیوں نے لایا جو پانچویں صدی قبل مسیح نقل مکانی کر کے تبت منتقل ہوئے تھے۔ جغرافیائی طور لداخ تبت اور بلتستان کے درمیان واقع ہے، اس لئے بون کا اثر ناگزیر تھا۔ بون مت میں بہت سارے دیوی دیوتا ہیں۔ تاہم وہ ایک خدا کو بھی مانتے ہیں۔

عظیم لداخ جنگ جوُ نگ' کا مذہب بون تھا۔ جنگ جونگ خطّے کی زبان کو بھی کہا جاتا ہے۔ لداخ کے ایک گاؤں گیا میں ایک ستوپا پر لداخ کو جنگ جونگ لکھا گیا ہے۔ بون مت کے پیرو کار تبت میں آج بھی موجود ہیں۔ بونی زبان جنگ جونگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔

بلتستان میں بون مت کی اشاعت سے متعلق موجودہ بلتی مورخین نے شواہد پیش کئے ہیں۔ کرگل میں شکر گاؤں کا ایک محلّہ آج بھی بونپویُول کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سواستکا بون مت کا متبرک نشان ہے۔ ''لُو'' کا نظریہ بھی بون کا دین ہے۔ اِس کے مطابق چھپکلی کی ایک قسم کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔ Ibex یا کیل بون مت کا مقدس جانور رہا ہے۔ ان عقائد کا اثر لداخ پر بھی پڑا۔

بون مت کے بعد ہندو دھرم نے کچھ عرصے کے لئے اپنا قدم جمایا۔ لداخ کے کئی علاقوں میں ہندو دیوی دیوتاؤں کے نام روایتی طور ورثہ میں ملے ہیں۔ ہنُو پا میں پاربتی، نیموں میں مہادیو، سورو، بارو، چولی چن اور لونگ سلموں اور داھ گرکون میں لوگ نرائن یا ویشنو دیوی کو مانتے تھے۔

ستقنا کے پاس واقع قدیم قلعے کا نام سر گیا موتِک کھر ہے جو سنسکرت کے سورتی اماتی کا بگڑا ہوا ہے۔ دراس کا قدیم نام ہیم بَس ہے۔ ہیم سنسکرت میں برف کو کہتے ہیں۔ ہرژے چوٹی ہری ژے سے نکلا ہے۔ ایسے اور کئی نام ہیں جن سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں لداخ میں ہندوستانی آبادی تھی اور ہندو دھرم کا اثر تھا۔

خلسے کے حکمران اپنے نام کے ساتھ شریما لکھتے تھے۔ جو شریمان کا مخفف ہے۔

۲۴۴ قبل مسیح میں مہاراجہ اشوک کی ایک مشنری نے لداخ کو بدھ مت سے روشناس کیا۔ یہ مشنری بدھ مت کے پرچار کے لئے لداخ کے راستے وسطِ ایشیا بھیجی گئی تھی۔

۱۹۱۵ء کے آس پاس جب ڈاکٹر فرانکی سری نگر سے خلسے آرہا تھا تو اُنھوں نے دیکھا کہ خلسے پُل کے پاس پیدل اور گھوڑے والوں کی آمدورفت کے لئے راستہ بنایا جارہا تھا۔ انگریز جوائنٹ کمشنر لیہہ - سرینگر تجارتی راستے کو کارواں کے آنے جانے کے لئے بہتر حالات میں رکھنے کے لئے کوشاں تھا۔ اِس سلسلے میں آتش گیر مادے سے چٹانوں کو توڑا جارہا تھا۔ فرانکی نے ایک بڑے پتھر پر برہمی تحریر دیکھی۔ مہاراجہ اشوک کے دورِ حکومت میں برہمی تحریر مروّج تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ خلسے کی چٹان کی برہمی تحریر بھی اُسی دور کی ہوسکتی ہے۔

فرانکی نے سڑک بنانے والے اوورسیر کو تاکید کی کہ اس تاریخی چٹان کو نہ توڑا جائے جس پر برہمی تحریر تھی۔ تب تو وہ چٹان بچ گئی لیکن آزادی کے بعد جب گاڑیوں کے لئے کشادہ سڑک بنائی جارہی تھی، تو یہ تاریخی boulder توڑ دی گئی۔

خلسے پُل کے پاس کھروشتی میں کُشن حکمران یونیما کاوی تھیسا کا ایک کتبہ ملا ہے جو ۱۸۲ یا ۱۸۷ عیسوی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کتبہ سے یہ عیاں ہے کہ پہلی یا دُوسری صدی میں پائین لداخ میں کُشن خاندان کی حکومت ہوسکتی ہے۔ زنسکار کے سانی گنپا کے پاس کانیکا ستوپا بھی کشن دور کی یادگار ہے۔ کانیکا کشن سے بگڑا ہوا ہے۔

پہلی صدی سے پانچویں صدی تک شمالی ہندوستان میں کشن خاندان کی حکومت تھی۔ کشمیر بدھ مت کا اہم مرکز تھا۔ کشن خاندان بدھ مت کا مربّی اور سرپرست تھا۔ چوتھی بودھ کانفرنس سرینگر میں منعقد ہوئی تھی۔ کشن خاندان کے پرچار سے لداخ میں بدھ دھرم کی اشاعت ہوئی لگتی ہے۔

۷۲۷ء میں ایک چینی یاتری ہوئی چاؤ (کسی نے کوریائی بتایا ہے) لداخ کے

راستے سنٹرل ایشیا روانہ ہوا تھا لتستان اور لداخ میں بدھ مت عروج پر لگتا ہے۔ وہ اپنے سفر نامہ میں رقم طراز ہے:

''یہ علاقے تنگ ہیں۔ پہاڑ اور وادیاں دُشوار گزار ہیں۔ یہاں گنپے اور بھکشو ہیں اور لوگ بدھ مت کے پیرو کار ہیں جبکہ تبت بدھ مت سے انجان ہے اور کوئی گنپہ نہیں ہے۔''

تب تبت میں پدما سمبھوا نہیں پہنچے تھے۔ جنہوں نے پہلے پہل تبت میں بدھ مت کا پیغام لایا تھا۔

ساتویں صدی میں ہیون سنگ نے لداخ کی سرحد کے پاس گلّو سے لاہول کا سفر کیا تھا۔ اُنہوں نے لکھا ہے: ''یہاں سے شمال کی طرف راستہ بڑا کٹھن ہے۔ ٹھنڈی اور برفیلی ہوائیں چلتی ہیں۔ تب مولوسو کی قلمرو پہنچتا ہے۔'' ہیون سنگ نے مولوسو کو سمپوہو بھی کہا ہے۔

مولوسو اور سمپو لداخ کے دو قدیم نام ہیں۔

چھٹی صدی تک لداخ اور تبت کا رابطہ دکھائی نہیں دیتا۔ مذہبی اور ثقافتی اثر تو دسویں صدی کے بعد ہوا۔ تب تک لداخ پر شمالی ہند خاص کر کشمیر کا تہذیبی اور مذہبی اثر تھا۔

ساتویں صدی میں لداخ کے سیاسی اور تاریخی اُفق پر تبت نمودار ہوا جو اُس زمانے میں ایک بڑی طاقت بن کر اُبھرا تھا۔ اِس کا سہرا رونگ ژن گیالپو کے سر ہے۔ رونگ ژن گیالپو نے تبت کو متحد کیا۔ اس سے پہلے تبت آٹھ قبیلوں اور ذیلی قبیلوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر قبیلہ الگ الگ حکومت کر رہا تھا۔ گیالپو نے ان کو ایک لڑی میں پرو دیا اور لہاسہ کو اپنی راج دھانی بنایا۔

دیو مالائی شخصیت لونپو ریکپا چن رونگ ژن گیالپو کا وزیر تھا۔ گیالپو نے اُس کی غیر معمولی ذہانت کا شہرہ سُن کر اُسے لداخ سے تبت مدعو کیا تھا۔

رونگ ژن گیاپو نے جنگ جونگ پر حملہ کیا اور ان کے جانشین گیاپوٹھی رونگ دیستن نے یکّے بعد دیگرے پورے خطّے کو اپنے قبضے میں لایا۔ جنگ جونگ میں گوگے، رودوق، سپیتی، کرجا، لاہول، موجودہ لداخ، بلتستان اور گلگت شامل تھے۔ ایک اور ماخذ کے مطابق ترکستان کا ختن تک کا علاقہ اس میں شامل تھا۔ گلگت کے بغیر تمام علاقوں میں تبت کے تمدن اور زبان کا گہرا اثر پڑا۔ تب تک مغربی تبت، جس میں گوگے، ژھپرانگ، پورانگ وغیرہ شامل ہیں، تبت کا علاقہ نہیں تھا۔

جنگ جونگ کے لوگوں نے تبت کے خلاف بغاوتیں کیں لیکن تبت نے اُنہیں بڑی سختی کے ساتھ دبادیا۔

۶۶۰ء میں تبت اور چین کے درمیان لڑائیں ہوئیں جو تقریباً تین صدیوں تک جاری رہیں۔ اس جنگ میں کبھی چین اور کبھی تبت کا پلّہ بھاری رہتا تھا۔ شروع میں یہ لڑائیاں چین کے شے ہان، کوکونور، کانسو اور ترکستان کے علاقوں میں ہوئیں۔ دس سال بعد ترکستان کے چار بڑے شہر ختن، کاشغر، کوچا اور قارا' تبت کے قبضے میں آئے لیکن دو دہائیوں بعد یہ تبت کے ہاتھ سے نکل گئے۔ گلگت اور بلتستان بھی لڑائیوں کا اکھاڑا بنے۔ لداخ سے تبت کی فوجوں کی نقل و حرکت رہتی تھی۔ یہ فوج عام طور پر کرجا، زنسکار اور کرگل سے ہوتے ہوئے بلتستان اور گلگت کی سرحدوں تک جاتی تھی۔ دُوسری طرف سے شایوک چنگ چھنمو کے راستے ترکستان نکلتی تھی۔

اُس زمانے میں بلتستان کو بڑا پُولُو اور گلگت کو چھوٹا پُولُو کہا جاتا تھا۔ چین نے گلگت اور تبت نے بلتستان کے حکمرانوں سے اپنی فوجوں کی نقل و حرکت کے سلسلے میں معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اُن کا مقصد اِن خطّوں پر قابض ہونا نہیں ہے بلکہ فوجوں کی آمدورفت کے لئے اُنہیں محض راستے درکار ہیں تا کہ فریقین اپنے دشمن سے متصادم ہوں۔

پھر عرب عباسی خلیفہ اور کشمیر کے حکمران للتا دیتیہ مُکتا پیڈ اس جنگ میں کود

پڑے۔ فریقین اہم درّوں پر قبضہ جمانے کے لئے سرگرم تھے۔ ساتویں صدی کے اِختتام پر عربوں اور تبت کے درمیان معاہدہ ہوا اور دونوں چین کے خلاف صف آراء ہوئے۔ اُدھر چین اور للتا دیتیہ متحد ہوئے اور تبت اور عربوں سے ٹکرا پڑے۔

۷۲۱ء میں بڑا پُولُو یا بلتستان پر تبت قابض ہوا۔ اِس سے پہلے لداخ تبت کے زیرِ نگیں آیا تھا۔ ۷۲۲ء میں چھوٹا پُولُو یا گلگت کو تبت سے خطرہ لاحق ہوا اور چین نے اس کی حفاظت کے لئے کمک بھیجی۔ ایک مرحلے پر عرب جرنیل قتیبہ بن مُسلم نے چینی ترکستان کے شہر کاشغر کو فتح کر لیا۔

رونگ ژن گیا لپو کا جانشین گیا لپوتھی رونگ دیستن بھی اپنے پیشرو کی طرح بڑا بہادر اور جنگجو تھا۔

۷۳۲ء میں للتا دیتیہ مُکتا پیڈ نے نہ صرف بلتستان میں تبّتی فوجوں کی پیش قدمی کو روکا بلکہ لداخ پر حملہ کر کے جھیل مانسرور اور گُوگے کے علاقوں تک پیش قدمی کی۔ ایک مرحلے پر للتا دیتیہ کی سلطنت میں چینی ترکستان کا بڑا علاقہ شامل تھا۔

پانچ سال بعد تبت نے کشمیری فوجوں کو شکست دی اور پورا خطّہ اس کے قبضے میں آیا۔ تبت کی فوجوں نے پھر گلگت پر ہلّہ بول دیا۔ چین نے مداخلت کی لیکن تبت کا پلّہ بھاری رہا۔

اُن دِنوں لداخ کے الچی گاؤں کے پاس دریائے سندھ کے کنارے تبّتی فوجوں کی ایک بڑی چھاؤنی تھی۔ آج بھی اُس جگہ پتھروں پر تبّتی فوج کے کمانڈروں کے نام، ستوپا اور تیر کمان کے خاکے تراشے نظر آتے ہیں۔ اُن میں کم سے کم ایک ایسا نام بھی نظر آتا ہے جو ایک ہزاری یا بٹالین کمانڈر تھا۔ ORTHOGRAPHY سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ سنگ تراشی ۷۴۰ء سے ۸۴۰ء کے درمیان کی گئی تھی۔ جب پورا خِطّہ گھمسان کی جنگ کی لپیٹ میں تھا۔ سسپول اور الچی پُل کے پاس ان فوجوں کے قلعے بنے تھے اور یہاں سے غالباً فوجی کمک بھیجی جاتی تھی۔

لداخ میں ٹانکچے گاؤں کے آس پاس بڑے بڑے پتھروں پر عربوں کے نام اور کم سے کم ایک قرآنی آیت تراشی پائی گئی ہے۔ یہ بھی اُسی زمانے کا کام بتایا گیا ہے۔

یہ عرب سِلک رُوٹ سے لداخ آنے والی قدیم شاہراہ یا شایوک کے راستے آکر یہاں سے غالباً تبت چلے گئے ہوں گے۔

ٹانکچے میں ایک بڑی چٹان پر سریانی زبان میں چند نسطوری عیسائی تاجروں کے سمرقند سے لمبے سفر کے بعد ٹانکچے پہنچنے کا ذِکر ہے۔ تحریر کے اُوپر ایک بڑی صلیب تراشی گئی ہے۔

۷۵۱ء میں دریائے طلاس کے کنارے عربوں نے چین کو ایک فیصلہ کن شکست دی اور اگلے چالیس سال میں سارا سنٹرل ایشیا اُن کے ہاتھ سے نکل گیا اور چین اور تبت کے درمیان ایک بفرسٹیٹ قائم ہوئی۔ نویں صدی میں سارے سنٹرل ایشیا میں لوگوں نے اِسلام قبول کیا تھا اور عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے چین سے دوستی قائم کی تھی۔

تبت سے عربوں کا معاہدہ ختم ہوا تھا اور دُوسری طرف اونان کے شان حکمران سے اختلاف ہونے پر تبت کمزور ہوا۔ نویں صدی کے وسط میں تبت خانہ جنگی کا شکار ہوا۔ لنگ ترما نے بون مت کو دوبارہ زندہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ بادشاہت ختم ہوئی اور تبت مزید کمزور ہوا۔ لداخ سمیت مغربی تبت، لداخ اور بلتستان اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اُن دنوں ستوت مریُول یا بالائی لداخ میں گیا پاچو کی حکومت تھی۔ اُس کی سرحد لیہہ کے پاس لداخ کونکا تک تھی۔ گیا گیا پاچو کا صدر مقام تھا۔ لیہہ اور اُس کے گردونواح میں ابھی آبادی شروع نہیں ہوئی تھی۔ یوق مریُول یا پائین لداخ میں دردوں کی حکومت تھی۔ سب سے مضبوط درد حکمران چو بروقد رسکیا پس تھا۔ لیکن اکثر درد چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے اور آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ خلسے اور کئی دیہات میں نسل درنسل چلتی آئی روایات کے مطابق اُس زمانے میں

جب فصل کٹائی ہوتی تو آدھی آبادی تیر کمان سے لیس پہرہ دیتی اور باقی لوگ فصل کاٹتے تھے۔

گیاپاچو نے سنٹرل ایشیا سے بار بار ترکوں کے حملوں کے پیش نظر شایوق میں ایک قلعہ تعمیر کیا تھا۔ جہاں لڑائیاں اور جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ ترکوں کی بار بار یلغار کی وجہ سے گیاپاچو نے بے بسی محسوس کی اور مغربی تبت کے نوجوان راجا اور اوت سنگ کے پوتے نیما گون کو دعوت دی کہ لداخ کی حکومت سنبھالنے میں اس کا شریکِ کار بنے۔

راجکمار سیکت دے نیما گون تین سو گھوڑ سواروں کے ہمراہ قسمت آزمائی کے لئے لداخ پہنچا۔ گیاپاچو نے نیما گون کو شے اور ٹھکسے کا علاقہ پیش کیا۔ اس کے ساتھ لاماژو گستن اور کھونگ مُو نیا قپا نام کے سردار تھے۔ نیما گون نے شے سمنلہ پر ایک چٹان پر یہ اہم جملہ لکھا:

''نیاٹھی چن کی اولاد سکیت دے نیما گون نارس کو رسُوم کے لوگوں کے مفاد اور بھلائی کے لئے یہاں ہے۔''

سیکت دے نیما گون کے والد چھیپل کھورستن نے لداخ روانگی کے وقت اپنے بیٹے سے کہا تھا۔

''لداخ کے خطرناک قبائیل سے خبردار رہیں۔ ان میں بروشا کا ڈوقی، سبلتی، مون اور ساسکنگ ہیں۔'' موخرالذکر سے مراد غالباً درد قبیلہ ہے۔

سیکت نیما گون نے یکے بعد دیگرے سارا لداخ فتح کیا اور مغربی تبت سمیت وہ ایک بڑی قلمرو کا حکمران بنا۔ اس نے اپنے تین بیٹوں میں اپنی سلطنت تقسیم کی۔ سپلگی گون کو رُودوق سے کشمیر کی سرحد کا علاقہ دیا جس میں زنسکار اور سپیتی شامل تھے۔ ٹشی گون کو پورانگ اور الدے سوگ گون کو گُوگے دیا۔

اُس کی اولاد اور لواحقین میں لائق اور نالائق دونوں قبیل کے حکمران

ہو گزرے ہیں۔ جنہوں نے وزیر زور آور سنگھ کے حملے تک لداخ پر حکومت کی۔ البتہ حال میں دستیاب ماخذوں کے مطابق درمیان میں گاہے گاہے اُن سے حکومت چھین لی گئی اور پھر دوبارہ حاصل کی۔

سکیت دے نیما گون کی اولاد میں ایک حکمران لہا چھن اوت پالا (۱۱۱۰-۱۰۸۰ء) بڑا جنگجو تھا۔ ایک طرف اُس نے کلو، پورانگ اور نیپال کا ماستنگ علاقہ فتح کیا اور دُوسری طرف تقریباً سارا بلتستان اپنے قبضے میں لایا۔ ماستنگ میں آج بھی لوگ لداخی زبان بولتے ہیں۔ لوسینو پیٹک کے مطابق تب لداخ کچھ مدّت کے لئے مغربی ہمالیہ میں سب سے طاقت ور ملک تھا۔ اوت پالا نے ہندی نام بعد میں رکھا ہوگا۔

نغلوک اُس کا بیٹا اور جانشین تھا جس نے خلسے کے پُل پر یہ حکم تراشا تھا۔ ''جو ہاتھ اِس پُل کو نقصان پہنچانے کے لئے اُٹھیں، وہ ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ جو آنکھیں اِسے بری نظر سے دیکھیں وہ آدمی اندھا ہو جائے۔ جو کوئی اِس پُل کو نقصان پہنچائے، مرنے کے بعد نرک میں پیدا ہو۔''

ٹشی گون کا بیٹا ایشے اود (۹۴۷ء- ۱۰۲۴ء) نیک اور مذہبی آدمی تھا۔ اُس نے مذہبی ضابطے اور ملکی قوانین بنائے۔ بدھ مت کے پرچار کے لئے گُوگے سے ۱۰۰، پورانگ سے ۴۰، مریول (لداخ) سے ۳۰، اور سپیتی سے ۱۳۰ افراد منتخب کئے۔ رینچن زنگپو سمیت ۲۱ طلباء کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہندوستان بھیجا۔ ایشے اود نے ٹھکسے کے پاس نیرما میں ایک مذہبی یونیورسٹی قائم کی۔ اُس نے اپنی رعایا کو تیرا کی، تیر اندازی، دوڑ، کود پھاند، کشتی، گھوڑ سواری، لکھائی پڑھائی اور ریاضی کی تربیت دی۔ ایشے اود کے زمانے میں گُوگے بڑا خوشحال اور آباد تھا۔

ایشے اود کا بیٹا چنگ چوب اود (۹۸۴ء-۱۰۷۸ء) نیک حکمران تھا۔ تب تک تینوں حکمران بھائیوں میں تعلقات اچھے رہے لیکن ۱۰۸۳ء میں گُوگے کے

حکمران ژھیلدے نے لداخ کے گیا علاقے پر حملہ کر کے تاوان حاصل کیا جہاں ایک شخص کیسر کا لقب اختیار کر کے حکومت کر رہا تھا۔

۱۲۱۵ء میں موروپ گون، لداخ اور پورانگ دونوں کا حکمران تھا۔ اُنہوں نے ڈیگُو نکپا فرقہ کو فروغ دیا۔ موروپ گون کے بعد لداخ کی تاریخ میں ایک صدی کے لئے خلا سا رہتا ہے۔ دراصل ایک درد سردار بغدورسکیاپس نے سکیت دے نیما گون کے خاندان کی حکومت عارضی طور چھین لی اور کُوگے تک اس کی عمل داری قائم ہوئی۔ اور ٹھیس پون کا خطاب ملا۔ ۱۲۴۰ء کے آس پاس وہ لداخ کا حکمران تھا۔ ۱۲۵۰ء میں ایک اور درد حکمران لھاچھن ویکھیم نے لداخ میں حکومت کی۔ خسروپ اُرگیان پا اُس کے گورو تھے۔ اِسی صدی کے دوران کئی اور غیر تبّتی لداخ کے حکمران رہے۔

اِسی طرح گُوگے پر بھی غیر تبتیوں کی حکومت رہی جو تیرھویں صدی تک جاری رہی۔ ایک حکمران کا نام لاگا تھا۔ اُس کا مذہبی میلان سسکیا پا سکول سے تھا۔

تین ماخذ کے مطابق سپلگی گون کے بعد ۲۷ حکمرانوں میں ڈی وین، ڈیموُ را اور موگول نام کے تین حکمرانوں کے نام بھی ملتے ہیں جو تبّتی کے علاوہ درد نام بھی نہیں لگتے۔

نمگیل دے (۱۳۷۲ء۔ ۱۴۲۴ء) گُوگے کا ایک طاقت ور حکمران ثابت ہوا جس نے گُوگے کو ایک مضبوط ملک بنایا۔ ۱۳۹۹ء میں اُس نے لداخ میں ایک بغاوت دبائی اور راجہ چھیتن دے کی حکومت بحال کی۔ چھیتن دے ایک مطلق العنان حکمران تھا۔ اُس نے لوگوں پر بھاری ٹیکس ڈالا تھا اور خطّے میں قحط کا سا سماں پیدا ہوا تھا۔

پندرھویں اور سولہویں صدیوں میں کشمیر کی طرف سے سلطان زین العابدین، آدم خان، سلطان سکندر، غازی شاہ احسن خان، چک حکمران دولت چک اور ابراہیم چک اور ترکستان سے سلطان سعید، مرزا حیدر گورکان اور مایزید وغیرہ نے لداخ پر حملے کیئے۔ حملہ آور آندھی کی طرح آتے تھے اور بگولے کی طرح جاتے تھے اور

جو کچھ ملے، لوٹ کر لے جاتے تھے۔ اُن حملوں میں ہمیشہ حملہ آور کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ کئی دفعہ میدانِ جنگ میں لداخیوں کے ہاتھوں اُنہیں شکست سے دوچار بھی ہونا پڑا ہے۔

لداخ کے سرحدی علاقے زنسکار، گیا، دراس، سپیتی وغیرہ عموماً محفوظ نہیں تھے۔ ہمسایہ علاقوں کے ڈکیتی مار مال مویشی، اناج، اور دولت لوٹ لیتے تھے۔ ایک طاقت ور راجہ اُن کی سرکوبی کرتے تھے۔ ورنہ عام لوگ ڈکیتی ماروں کے رحم و کرم پر تھے۔

مرزا حیدر کے حملے کے بعد لداخ کو ایک تجربہ کار اور بہادر حکمران ملا۔ اُس کا نام چھوانگ نمگیل (۱۵۷۵ء-۱۵۹۵ء) تھا۔ اُس نے بلتستان فتح کیا اور ترکستان پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ مرزا حیدر کے حملے کا اِنتقام لینا چاہتا تھا لیکن نوبراہ کے لوگوں کی درخواست پر اپنا ارادہ چھوڑ دیا۔ وادی نوبراہ ترکستان کی طرف سے لداخ کا پہلا علاقہ پڑتا ہے۔ چھوانگ نمگیل کے بعد اس کا بھائی جمیانگ نمگیل (۱۵۹۵-۱۶۱۶ء) تخت نشین ہوا۔ اُن کے عہدِ حکومت میں ایک پادری فادر اندرادے لداخ آئے۔ فادر اندرادے کے مطابق لداخ کے لوگ مادّی لحاظ سے خوشحال تھے۔

جمیانگ نمگیل کا بیٹا اور جانشین سینگے نمگیل (۱۶۱۶ء-۱۶۴۲ء) فنِ سپاہ گری میں ماہر تھا۔ اُس نے چھوٹی عمر میں لڑائیاں دیکھی تھیں۔ گیالپو نے تبت کا وسیع علاقہ فتح کیا اور ژھنگ کی سرحد تک اس کی فوج نے پیش قدمی کی جہاں دیپا پنچگ نمگیل کی حکومت تھی۔ شگاژے اُس کی راج دھانی تھا۔ لداخی فوج نے مایُوم درّہ پار کیا جو لیہہ سے دو ماہ کا پیدل یا گھوڑے کا سفر ہے۔ لداخی سپاہی بڑے تھکے ہوئے تھے اور وہ گھر سے بہت دُور آئے تھے۔ یہاں ایک مختصر سی لڑائی میں لداخی ہار گئے۔ چنانچہ ایک معاہدہ عمل میں آیا جس کے تحت مایُوم لا لداخ کی سرحد قرار دی گئی۔ یہ جھیل مانسرور کے مشرق میں نیپال کی سرحد کے قریب ہے۔ نیپال کے کچھ علاقے پر بھی لداخیوں

نے قبضہ کیا۔ اس علاقے کو مون یُول کہا جاتا ہے اور یہاں لداخی زبان مروّج ہے۔
۱۸۰۱ء میں لداخ کی حکومت نے یہ علاقہ نیپال کو واپس کیا۔
اس مہم سے واپسی پر سینگے نمگیل لداخ کے انلے دیہات میں ۵۰ سال سے کم عمر میں فوت ہوا۔ مغل ذرائع کے مطابق اُن دنوں لداخ لمبائی میں چھ ماہ اور چوڑائی میں دو ماہ کا سفر تھا۔ گیالپو کی فوج میں ۱۲ ہزار پیدل اور گھوڑ سوار نفری تھے، جو خطّے میں لڑنے کے لئے اچھے تھے۔

سینگے نمگیل کا بیٹا دیلدن نمگیل (۱۶۴۲ء۔ ۱۶۹۴ء) تھا۔ اُن کے زمانے میں لداخ کی سلطنت کو مزید وُسعت ملی۔ اُس کے جانشین دے لیکس نمگیل (۱۶۸۰ء۔ ۱۶۹۱ء) نے تبت اور بھوٹان کے مذہبی جھگڑوں میں مداخلت کی اور بھوٹان کی حمایت کی۔ اِس پر منگول اور تبّتی فوجوں نے لداخ پر حملہ کیا۔ گُوگے کے مقام پر لداخیوں کو پہلی شکست ہوئی۔ یہاں سے لداخی بزگو تک پسپا ہوئے جہاں تین سال تک فریقین میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخر کار لداخی راجہ نے کشمیر کے مغل گورنر سے مدد کی اپیل کی اور منگول اور تبّتی مشترکہ فوج کو پسپا کیا لیکن اِس لڑائی میں لداخیوں کے ہاتھ سے بڑا علاقہ جاتا رہا۔ اور ایک معاہدہ کے تحت لداخ کی سرحد دیم جوک قرار پائی جو لداخ اور تبت کی موجودہ سرحد ہے۔ تب ہماچل پردیش کے علاقے بشاہیر، کنور اور بالائی لاہول بھی لداخ نے کھوئے۔

۱۸۴۶ء میں سپیتی کو انگریزوں نے لے لیا۔
دے لیکس نمگیل کا بیٹا نیما نمگیل (۱۶۹۴ء۔ ۱۷۲۹ء) بڑا ذہین اور سمجھ دار تھا۔ اُنہوں نے لوگوں کو اِنصاف دینے کے لئے نیا نظام قائم کیا۔

اِس خاندان کا راجہ چھیتن نمگیل (۱۸۰۸ء سالِ انتقال) عالم اور عقل مند تھا۔ وہ فارسی اور کشمیری زبانیں جانتا تھا۔ یہ لائق راجہ لیہہ کے کرزو باغ میں چیچک سے عین جوانی میں چل بسا۔

خود مختار لداخ کا آخری راجہ چھیپل تنڈوپ نمگیل لائق حکمران نہیں تھا اور بڑی رانی کا اُن پر بڑا اثر تھا۔ اُس کے زمانے میں ۱۸۳۴ء میں ڈوگرہ جرنیل زورآور سنگھ نے لداخ پر حملہ کیا، جس کا انجام لداخ پر ڈوگرہ حکومت کے قیام پر مُنتج ہوا۔ ڈوگرہ حملے اور لداخیوں کی بغاوتوں اور ڈوگروں کی جوابی کاروائی کا تذکرہ کرنے کے لئے ایک اور کتاب کی ضرورت ہوگی۔ ۱۸۳۴ء سے ۱۹۴۸ء تک لداخ پر ڈوگروں کی حکومت رہی۔ اِس کے بعد لداخ جمہوریہ ہند میں شامل ہوا۔

سکیت دے نیماں گون کے خاندان کی ایک ہزار سالہ حکومت میں لداخ میں بدھ مت کو فروغ ملا اور متعدد گنپے تعمیر ہوئے۔ اُسی دَور میں خطّے میں اِسلام بھی پروان چڑھا۔ اُس دوران متعدد مذہبی رہنما اور خدارسیدہ بزرگ تبت اور کشمیر سے لداخ آئے۔

۱۹۴۸ء میں لیہہ میں لی گئی ایک نادر تصویر میں کُرسی پر: خواجہ عبداللہ شاہ (اقسقال)، کرنل پرتھوی چند، پادری نارمن ڈرائیو وغیرہ۔ صنم زبؤ، ایلی ایز ر جولدن اور کاچو محمد علی کھڑے نظر آرہے ہیں اور کلون چھوانگ (گزین)، خواجہ عبدالحق، بابو دورجے، تنیت شاہ وغیرہ بیٹھے ہوئے۔

نام، ثقافت اور بیرونی اثرات

تاریخ کے مختلف ادوار میں لداخ کو مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے۔ یہ نام لداخ کے منفرد جغرافیائی خدوخال، طبعی خصوصیات، محل وقوع، آب و ہوا اور تمدنی عوامل کی دین ہیں لیکن جس نام کو دائمی حیثیت حاصل ہوئی، وہ لداخ ہے۔

لداخ کا سب سے قدیم نام جو ہم تک آیا ہے، وہ جنگ جُونگ ہے۔ جنگ جُونگ کا مطلب OVIS AMMON کا دیش ہے۔ Ovis Ammon ایک نادر جنگلی بکرا ہے، جو اِس خطّے میں پایا جاتا ہے۔ لداخی اسے نیان کہتے ہیں۔ جنگ جُونگ عظیم لداخ (GREATER LADAKH) کا نام تھا جو کیلاش مانسرور سے سوات (دردستان) تک پھیلا ہوا تھا۔

جنگ جُونگ بون مذہب کے پیروکاروں کی زبان کو بھی کہا جاتا ہے۔ تب لداخ خطّے کے لوگ غالباً بون مت کے پیروکار تھے۔ بون مذہب کا بانی DMURA تھا، جو ایران کا رہنے والا تھا۔ تبت میں وہ دونپا شینرپ کے نام سے مشہور ہوا۔

جنگ جُونگ آج کل کھُونُو، کینور اور نیپال میں تامنگ کے تھکالی قبیلہ کے لوگوں کی زبان ہے۔ سپیتی میں جنگ جُونگ زبان میں ایک منتر جاپا جاتا ہے، جو بون مت کی دین ہے۔

لداخ، تبت اور بلتستان کی سماجی زندگی پر آج بھی بون کا کچھ اثر پایا جاتا ہے۔

لداخ پر تبت کے شاہزادہ سکیت دے نیماگون کے تسلّط سے پہلے لداخ مریُول کے نام سے مشہور تھا۔ یہ آج سے ایک ہزار سال سے زیادہ پہلے کی بات ہے۔ لداخی میں مریُول کا مطلب سرخ دیش ہے۔ لداخ میں اکثر مقامات پر پہاڑ اور مٹی کا

رنگ سرخ مائل ہے۔ غالباً اِسی بنا پر اس کا نام مریُول پڑا تھا۔ بعض مورخین نے مریُول سے مراد ''نشیبی مُلک'' قرار دیا ہے کیونکہ لداخ کا مرکزی علاقہ گردونواح کے بالائی علاقوں کے مقابلے میں نشیب میں واقع ہے۔

سکیت دے نیما گون لداخ کے ایک راجہ گیا پا چو کی دعوت پر تین سو سواروں کے ہمراہ اپنی قسمت آزمائی کے لئے لداخ آیا۔ اُن دنوں لداخ میں کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی اور سارا علاقہ چھوٹی چھوٹی جمہوریتوں میں بٹا ہوا تھا' جو آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ نیما گون نے یکے بعد دیگرے انہیں شکست دی اور سارا لداخ اپنے قبضے میں لا کر ایک مضبوط مرکزی حکومت کا قیام عمل میں لایا۔ شے کو اپنا پایہ تخت بنایا، جو لیہہ سے ۸ کلومیٹر دُور ہے۔ اُس زمانے میں لداخ نارِس کورسُوم کہلاتا تھا۔

نارِس کورسُوم کا مطلب تین صوبوں والا ملک ہے۔ اُن دنوں لداخ کے تین صوبے تھے۔ موجودہ لداخ کا علاقہ دو صوبوں میں بٹا تھا۔ تیسرے صوبے میں مغربی تبت کا علاقہ تھا جس میں پورانگ اور گُوگے کے تہذیبی اور تاریخی مقامات شامل ہیں۔

آخری عمر میں راجہ نے اپنی سلطنت تین بیٹوں میں تقسیم کی اور ہر بیٹے کو ایک صوبہ ملا۔ بعد میں مغربی تبت 'لداخ کے ہاتھ سے نکل گیا۔

چینی سیاح فاہیان نے لداخ کو ''خاچن پا'' یا ''کھچا'' کہا ہے۔ جس سے مراد برفانی ملک ہے۔ اُن دنوں لداخ میں آج کے مقابلے میں زیادہ برف باری ہوتی تھی۔ آج بھی لداخ کے علاقہ دراس میں سردیوں میں بیس تیس فٹ برف پڑتی ہے۔

ہیون سنگ نے لداخ کو مولوسو اور سانپو کہا ہے۔

قدیم روم کے مورخ PTOMLY ٹوملی نے لداخ کو 'اخاسا' اور بلتستان کو 'بالور' کہا ہے۔ اخاسا' خاچن پا کا بگڑا ہوا نام بتایا جاتا ہے۔ لداخ کو منگیول یا عوامی دیش بھی کہا گیا ہے۔

کشمیر کی تاریخی کتاب ''سری ورا'' میں لداخ کو بڑا اور چھوٹا ''بھوٹا'' کہا

ہے۔ مغلیہ حکومت کے زمانے میں لداخی سکّہ پر اُردو خط میں بھوٹان لکھا جاتا تھا۔ بھوٹان سے مراد بودھوں کا ملک ہے۔ کشمیر میں لداخیوں کو ''بوہ ٹہ'' یا ''بوٹو'' کہا جاتا ہے۔

فارسی تاریخ نویسوں نے لداخ کو تبت خورد اور تبت کلاں یا بڑا تبت کہا ہے۔ کئیوں نے بلتستان کو تبت خورد کہا ہے۔ اصل تبت کو تبت بزرگ کے نام سے یاد کیا ہے۔ چند تذکرہ نویسوں نے لداخ کو تبت بھی کہا ہے۔ بعض مغربی مورخین اور سیاحوں نے لداخ کو مغربی تبت کہا ہے۔ لداخی تاریخ اور کلچر کے محقق ڈاکٹر فرانکی نے لداخ پر اپنی تاریخ کی کتاب کا نام ''تاریخِ مغربی تبت'' رکھا ہے اور دُوسری کتاب میں لداخ کو انڈین تبت سے موسوم کیا ہے۔

ایک اور نام بھی لداخ سے منسوب ہے۔ یہ ہے سانپو۔ سانپو (ژانکسپو) لداخی میں دریا کو کہتے ہیں۔ لداخ کے علاقے میں دریائے سندھ پانچ سو میٹر کی لمبائی میں بہتا ہے۔ کئی جغرافیہ دانوں نے دریائے برہم پتر کی طرح دریائے سندھ کو بھی سانپو کہا ہے۔

لیکن جس نام سے لداخ مدتّوں سے مشہور ہے اور جسے دائمی حیثیت ملی ہے، وہ نام لداخ ہے۔ لداخ تبّتی اور لداخی زبان کا لفظ ہے۔ جس سے مراد ''درّے پر بُو دو باش کرنے والے'' ہے۔ ''لا'' لداخی میں درّے کو کہتے ہیں اور ''داقس'' سے مراد ''ساکنان یا رہنے والے'' ہے۔ اِس طرح لداخی میں پہاڑی بکری یا ہرن کو ری داقس کہتے ہیں۔ ری کا مفہوم پہاڑ اور داقس کا مطلب رہنے والا ہے۔ کثرتِ استعمال سے لداقس بعد میں لداخ بن گیا۔ کئی مورخوں نے لداخ کا مطلب ''درّوں کے پار'' بتایا ہے۔ بہر حال لداخ چاروں طرف اُونچے اُونچے درّوں سے گھرا ہوا ہے۔ جن میں چند درّے دُنیا کے بلند ترین درّے ہیں۔

اپنی طبعی خصوصیات اور تمدّنی عوامل کی وجہ سے بھی لداخ کے کئی نام پڑے ہیں جنہیں ہم اِصطلاحی، تشبیہی اور اِستعاراتی نام کہہ سکتے ہیں۔

جس طرح اپنے دِلکش فطری مناظر کے لئے وادیٔ کشمیر کو ''کشمیر جنت نظیر'' یا

''ایشیا کا سوئزر لینڈ'' کہا جاتا ہے اُسی طرح اپنے طبعی خدوخال کی وجہ سے لداخ کو MOON LAND ''چاند جیسی سرزمین'' یا MAGIC LAND ''جادوئی دیش'' کہا جاتا ہے۔ اِن ناموں پر لداخ سے متعلق کتابیں چھپی ہیں۔ ہوٹلوں وغیرہ کے نام رکھے گئے ہیں۔ ۱۹۳۰ء کے دہے میں جب ایک غیر ملکی سیلانی ایوا اورمے لداخ آیا تو وہ بے ساختہ کہہ اُٹھا۔ ''ہم ایک ایسے دیش میں آئے ہیں جو کسی اور سیارے کا لگتا ہے۔''

دُوسرے غیرملکی رابرٹ شا نے لکھا ہے:

''لداخ کی بستیاں کسی اور ملک کی لگتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قینچی سے تراش کر ایک ریگستان میں چپکا دی گئی ہیں۔''

چند یورپیوں نے لداخ کو لاموں کا دیش (LAND OF LAMAS) کہا ہے۔ یہاں بیسیوں گنپے اور ہزاروں لاما ہیں۔

ماضی میں لداخیوں کے طور طریقوں اور رسم و رواج دیکھ کر غیر ملکی سیاح حیران ہوتے تھے چنانچہ لداخ کو MYSTERIOUS LAND ''پُراسرار دیش'' بھی کہا گیا ہے۔

لداخ میں ماضی قریب میں ایک عورت کے ایک سے زیادہ شوہر رکھنے کی رسم POLYANDRY تھی چنانچہ کئی سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں لداخ کو LAND OF POLYANDRY کہا ہے۔

لداخ کے ننگے پہاڑوں میں دُنیا کے چند مشہور جنگلی جانور پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ماضی میں ہر سال بہت سارے سیاح شکار کھیلنے کے لئے لداخ آتے تھے۔ لداخ میں شکاریات پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں اور لداخ کو SPORTSMAN'S PARADISE یا ''شکاریوں کی جنت'' کہا گیا ہے۔ شکاریوں نے لداخ کو LAND OF OVISAMMON بھی کہا ہے۔ ''اوویس آمون'' کے سینگ بڑے قیمتی اور نادر مانے جاتے ہیں اور یورپی شکاری اپنے گھروں کی زینت

کے لئے اِنہیں دیوار پر آویزاں رکھتے تھے۔

لداخ کے ہر گاؤں میں ستوپا نظر آتے ہیں۔ اِس مناسبت سے اِسے ''ستوپاؤں کی سرزمین'' بھی کہا گیا ہے۔

اپنی بلندی کی وجہ سے لداخ کو ''بامِ عالم'' یا ''دُنیا کی چھت'' بھی کہا جاتا ہے۔

آزادی کے بعد لداخ کے لئے ''بڈھسٹ لداخ'' اور ''مسلم لداخ'' جیسی سیاسی اِصطلاحیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ اِس طرح کئی صحافیوں اور سیاست دانوں نے لداخ کے بودھوں اور مسلمانوں میں حدِ فاصل قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ الغرض لداخ کو عجب عجب ناموں سے پکارا گیا ہے۔ لیکن لداخیوں کا لداخ سے متعلق اپنا نظریہ ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ لداخی لداخ کو کیا سمجھتے ہیں؟

''دُنیا کی ناف!'' —— جی ہاں —— دُنیا کی ناف! صدیوں تک لداخیوں نے لداخ کو ''دُنیا کی ناف'' سے تعبیر کیا ہے۔ جس طرح ناف اِنسان کے پیٹ کے بیچ میں ہے۔ اِسی طرح لداخیوں کا یہ تصوّر تھا کہ لداخ دُنیا کے عین مرکز میں واقع ہے۔

لداخ کو ''شنگری لا'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک بہشت نما دیومالائی دیش ہے جو بودھ عقائد کے مطابق ہماری اِس دُنیا میں موجود ہے۔

لداخ کی ثقافت پر تبت، کشمیر، چینی ترکستان اور بلتستان کے اثرات ہیں۔ تاہم تبت کے اثرات گہرے اور دُور رس ہیں۔ چاہے یہ فنونِ لطیفہ ہو یا رقص و سرود، ادب ہو یا زبان، طب ہو یا دست کاری، پوشاک ہو یا خوراک، زِندگی کے ہر پہلو پر تبت کا اثر ہے۔

لداخی بودھوں اور تبتیوں کا آپس میں مذہبی رشتہ ہے۔ لداخ سے متعدد بودھ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے تبت جاتے تھے اور وہاں سے لاما کا درجہ پا کر لداخ آتے تھے۔ اس کا آغاز بارھویں صدی میں لداخی راجہ لھاچھن موروپ گون کے زمانے میں ہوا اور دلائی لاما کے ہندوستان میں پناہ لینے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ عام

لداخی بودھوں کے لئے تبت ایک مقدس تیرتھ ہے۔ ماضی میں متعدد لداخی لہاسہ اور تبت کے دُوسرے اہم مقامات اور گنپوں کی تیرتھ یاترا کے لئے جاتے تھے۔

کئی لداخی شاہزادے مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے تبت گئے تھے۔ یہ وہاں سے راہب بن کر آئے اور گنپوں کے بڑے لاما بنے۔

تبت کے ساتھ صدیوں سے لداخ کے تجارتی تعلقات رہے ہیں۔ تبت لداخ کو اُون، پشمینہ اور نمک برآمد کرتا تھا۔ لداخ اور تبت کے مابین سفارتی اور مذہبی مشن کے تبادلے ہوتے تھے۔

لداخ، تبت اور بھوٹان کی بنائی ہوئی چیزوں میں حیرت انگیز یکسانیت ہے۔ ایک تجربہ کار اور جانکار آدمی ہی ان کے ہلکے فرق کو پہچان سکتا ہے۔ لداخ میں تبّتی طرز کی چائے دانی، جام، صراحی، پیالی اور چائے گرم رکھنے کی منقش انگیٹھی (BRAIZER) بنائی جاتی ہے۔ اِسی طرح میزوں، محرابوں، ستونوں وغیرہ پر مصوّری کا کام تبت کی دین ہے۔ ایک تجربہ کار آنکھ ہی تبّتی اور لداخی مذکورہ چیزوں کے تفاوت کو دیکھ سکتی ہے۔

تبت اور چین کا پکوان NOODLE لداخیوں کا بھی من بھاتا کھاجا ہے اور تبّتی عورتوں کا لباس ''پھومیت'' لداخی فیشن زدہ عورتوں میں مقبول ہے۔

تبت کی طرح ہر زمانے میں لداخ میں مشہور مصوّر، بت ساز اور کلاکار ہو گزرے ہیں جن کی سماج میں خوب قدر و منزلت ہے۔

لداخ کے تین یا چار نسلی گروہوں میں سب سے پہلے یہاں مون آئے۔ مقامی روایت کے مطابق یہ ہماچل پردیش سے آئے۔ اُنہوں نے یہاں دیہات بسائے۔ مون اپنے ساتھ موسیقی کے آلات لائے۔ آج بھی لداخ کے اکثر گاؤں میں ایک یا ایک سے زیادہ مون خاندان پائے جاتے ہیں۔ سماجی تقریبات میں یہ لازمی طور موسیقی کے آلات بجانے کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ ان کے اور دُوسرے

پیشہ ور موسیقار کے بغیر لداخ کی سماجی اور ثقافتی زندگی بالکل بے کیف اور پھیکی ہے۔ ان کی اولاد ساز سنگیت سے کنارہ کش ہو رہی ہے۔ لداخی سماج مون اور دُوسرے پیشہ ور موسیقاروں کے ساتھ چُھوت چھات برتتا آیا ہے۔ اِس لئے یہ سماج سے نالاں ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات میں اِن کی معاشرتی زندگی میں بہتری آئی ہے لیکن ذات پات پوری طرح ختم نہیں ہوئی ہے۔

مون کے بعد پچھّم سے درد آئے۔ اُنہوں نے دریائے سندھ کے کنارے بستیاں بسائیں۔ روایت کے مطابق اُنہوں نے لداخ کو پولو سے روشناس کیا جو اب بھی یہاں کا مقبول کھیل ہے۔

کشمیر نے لداخ کو بہت کچھ دیا ہے۔ اکثر مورخین نے لکھا ہے کہ لداخ میں بدھ مت لگ بھگ ڈھائی سو سال قبل مسیح مہاراجہ اشوک کے زمانے میں پہنچا اور دسویں صدی تک مذہبی اور ثقافتی طور کشمیر کے زیرِ اثر رہا۔

کشن خاندان کے عہد میں کشمیر میں بدھ مت عروج پر تھا اور پہلی صدی میں یہاں بدھ مت کی چوتھی کونسل منعقد ہوئی۔ لداخ کے گاؤں خلسے میں کشن دورِ حکومت سے وابستہ کھروشتی کی ایک تحریر ملی ہے۔ Sten Konow نے اِسے یونیما کائے تھیسو پڑھا ہے جو کشن راجہ دویم وینا کائل پھیسیس تھا اور یہ تحریر پہلی صدی کی ہے۔ خلسے میں گپتا دورِ حکومت کی کھروشتی تحریریں بھی ملی ہیں۔ ڈاکٹر ووگل نے ان کا زمانہ چھٹی سے آٹھویں صدی قرار دیا ہے۔ چیکتن، دراس، مُولبیک اور خلسے میں شاردا تحریریں پائی گئی ہیں۔ یہ تحریریں کشمیر اور لداخ کے پرانے تعلقات کو اُجاگر کرتی ہیں۔ زنسکار کا کانیکا ستوپا بھی کنشک سے منسوب ہے۔

جے این گنہار نے اپنی کتاب Buddhism in Kashmir and Ladakh میں لکھا ہے کہ کشن حکمرانوں کے سکّوں پر پریویل اور ستوپا کی تصویریں بنی ہیں اور لداخ کو یہ کشمیر کے راستے کشن خاندان سے ملے ہیں۔

سرلا کھوسلہ نے پق سوم جون سونگ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بہت سارے کشمیری پنڈت لداخ آئے اور سنسکرت کتابوں کا کلاسیکل لداخی میں ترجمہ کیا۔

دسویں صدی میں رینچن زنگپو نے کشمیر سے معمار، مصوّر اور کاریگر لداخ لائے جنہوں نے متعدد وہار کی تعمیر و تزئین کے لئے کام کیا۔ بودھ کشمیر کی مصوّری، بت سازی اور چوب تراشی کا بہترین نمونہ الچی وہار میں ملتا ہے۔ یہ مشہور وہار لیہہ سے ۶۲ کلومیٹر دُور لیہہ - سرینگر شاہراہ پر دریائے سندھ کے کنارے الچی گاؤں میں واقع ہے۔ اِس کی دیوار پر بنی ہوئی اِنسانی تصویروں اور مورتیوں کے خدوخال اور ناک نقشے آریائی ہیں جبکہ دُوسرے گنپوں کی مصوّری پر تبت کی گہری چھاپ ہے۔

اِسلام کشمیر سے لداخ آیا۔ میر سیّد علی ہمدانیؒ، زین شاہ ولیؒ اور دُوسرے برگزیدہ اور خدا کے نیک بندوں نے لداخ میں دینِ اسلام کی تبلیغ کی۔ کشمیر اور لداخ کو ایک دُوسرے کے قریب لانے اور لداخ کی ثقافت پر کشمیری اثرات ڈالنے میں حکمرانوں اور فوجوں کا ہاتھ نہیں، بلکہ یہ کارنامہ مذہبی عالموں، مبلّغوں اور تاجروں کا رہینِ منت ہے۔

کشمیر سے لداخ کو اُردو اور فارسی وِرثے میں مِلیں۔ مورکرافٹ نے ضلع کرگل کے ہر گاؤں میں کم سے کم ایک یا ایک سے زیادہ فارسی جاننے والے افراد دیکھے۔ لیہہ میں بھی فارسی دان تھے۔ سون ہیڈین نے خواجہ غلام رسول سے فارسی میں بات چیت کی۔ موخر الذکر لیہہ کا ایک متموّل تاجر تھا۔ لداخ کا راجہ چھیتن نمگیل فارسی اور تبّتی کا عالم تھا۔ وہ ترکی اور کشمیری زبانیں بھی جانتا تھا۔

کشمیری زبان کے متعدد الفاظ اصل روپ میں اور کئی خفیف تغیّر و تبدّل کے ساتھ لداخی زبان میں عام اِستعمال ہوتے ہیں۔ اِن میں ٹھول (انڈا)، گام (گاؤں) اور چنڈا (جیب) جیسے روزمرّہ استعمال کے الفاظ شامل ہیں۔

سنٹرل ایشیا کے پکوان جیسے گوشتابہ، روغن جوش، یخنی، کباب وغیرہ کشمیر ہی

سے لداخ آئے۔

کشمیر میں بنائے گئے برتن جیسے طبق، کٹورے اور دیگچیاں ایک لداخی کچن میں عام اِستعمال ہوتے ہیں۔ کشمیر نے لداخ کو زرگر کے کام سے روشناس کیا۔ پہلے پہل لداخ کے ایک راجہ نے سترھویں صدی میں اسماعیل نامی زرگر کو لداخ میں سکّہ ڈھانے کے لئے بلایا اور لیہہ میں بسایا۔

چینی ترکستان اور لداخ کے مابین قدیم زمانے سے تجارتی تعلقات تھے۔ دونوں ملکوں کے درمیان ماضی میں لڑائیاں بھی ہوئی ہیں، جن میں کبھی لداخیوں کا پلّہ بھاری رہا اور کبھی ترکوں کا۔ تاہم تجارتی تعلقات کی وجہ سے عام ترکوں سے لداخیوں کے تعلقات خوشگوار تھے۔ لداخیوں کی بہت سی ضروریات چینی ترکستان کی مصنوعات سے پوری ہوتی تھیں۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب لداخ کی ایک بڑی آبادی ترکی زبان بولتی تھی۔ آج لداخ میں ترکی دان خال خال نظر آتے ہیں۔ بہت سارے لوگ ترکوں کے زیرِ اثر نسوار کا نشہ کرتے تھے۔ نسوار اِستعمال کرنے والا اب شاید ہی کوئی ہو۔ البتہ چینی ترکستان کا کھانا ''موموٗ'' لداخیوں کی پسندیدہ اور مرغوب خوراک ہے۔ لداخ میں مومو کو موق موق کہا جاتا ہے۔ لداخ کے اکثر گھروں میں موق موق پکایا جاتا ہے۔ لیہہ کے ریستورانوں میں یہ مینو کا ایک اہم جز ہے۔ بہت سارے غیر لداخی اور غیر ملکی بڑے شوق سے موق موق کھاتے ہیں۔ موق موق آٹے کے پیڑے میں کُوٹا ہوا گوشت ڈالا ہوا ایک مقوی غذا ہے جو ایک مخصوص برتن میں بھاپ سے تیار کی جاتی ہے۔

اِس کے علاوہ چینی ترکستان کا سموسہ بھی لیہہ میں بنتا ہے۔ ترکی پلاؤ بھی لداخ میں بہتوں کا من بھاتا کھاجا تھا۔ کھانے کی یہ قسمیں لداخ کی نئی اور آنے والی نسلوں کو ماضی میں چینی ترکستان کے ساتھ لداخ کے تعلقات کی یاد دِلاتی رہیں گی۔

کسی زمانے میں لداخیوں کا لباس، وضع قطع اور انداز چینی ترکستانی تھا۔ اِس کی تصدیق لیہہ کے ژیمو کے دوگنپون کی دیواری رنگین تصاویر سے ہوتی ہے۔ ان

ایک جیسی دو دیواری تصاویر میں ایک محفل نشاطِ دِکھائی گئی ہے جس میں راجہ، اُس کے اہلِ خاندان، درباری اور پرجا کی ایک چھوٹی سی بھیڑ نظر آتی ہے۔ اس تصویر میں چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ مجلس کے تمام مردوں نے جُبّہ و دستار پہنے ہیں اور ہر ایک نے داڑھی رکھی ہے۔ ان کی پوشاک اور وضع قطع چینی ترکستان کی اِسلامی معاشرت کا ہو بہو آئینہ ہے۔ یہ تصویر لداخ کے راجہ ٹشی نمگیل کے دورِ حکومت سے متعلق بتائی جاتی ہے۔ یہ راجہ سولھویں صدی میں لداخ کا حکمران رہا۔

ترکوں نے لداخی زبان کو کئی الفاظ دیئے جن میں دو الفاظ ''سرق تُورمن'' اور ''شاپوس'' عام استعمال ہوتے ہیں۔ سرق تُورمن گاجر کو کہا جاتا ہے۔ غالباً ترکوں نے پہلے پہلے لداخ کو گاجر کے بیج سے متعارف کیا تھا۔ 'شاپوس' شاہ پوش کا بگڑا ہوا لفظ ہے اور رضائی کا متبادل لفظ ہے۔

لداخی لوک گیتوں میں ترکی ''پیچق ٹونگ یُو'' اور ''کوسا ماسی'' کا تذکرہ ہے۔ پیچق ٹُونگ یُو کا مطلب فیروزہ کا دستہ والا چاقو اور کوسا ماسی سے مراد سنکھ کا دستہ والا چاقو ہے۔ یہ دونوں چیزیں لداخ میں مقبول تھیں۔

جس طرح تبت کے ساتھ لداخ کے بودھوں کا مذہبی رشتہ ہے۔ اُسی طرح خاص کر لداخ کے شیعہ مسلمانوں کے ایران اور عراق کے ساتھ مذہبی تعلقات ہیں۔ ہر سال لداخ سے بہت سارے مسلمان کربلائے مُعلّیٰ اور دُوسرے مذہبی مقامات کی زیارت کے لئے جاتے ہیں اور بیسیوں طلباء عراق اور ایران کے اہم دینی اداروں میں مذہبی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہ طلباء حصولِ تعلیم کے بعد اپنے علاقوں میں ائمہ، شیوخ اور شرعی طور علماء کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ کرگل کی تہذیبی اور مجلس زندگی میں ان کا گہرا اثر و رُسوخ ہے اور مذہبی مسائل میں ایران کے مجتہدوں کی رہبری حاصل کرتے ہیں۔ ان دو اجنبی ثقافتوں کے اِتصال سے لداخ کے اِس خطے میں ایک نئی ثقافت نے جنم لیا ہے۔

لداخ کی ثقافت کا ایک دِلچسپ پہلو یہ ہے کہ بہت سارے یورپیوں نے یہاں کے بدھ مت کی شوکت اور رومی کلیسا کی حشمت میں حیرت انگیز یکسانیت اور مماثلت کا مشاہدہ کیا ہے اور بقولِ ایک انگریز مشاہد' لداخ سے متعلق انگریزی میں شاذ ہی کوئی کتاب ہوگی جس میں اِس کا ذکر نہ ہو۔

ایک انگریز سیاح نے اِس ضمن میں لکھا ہے:

''رِشی منی کا کردار پیش کرتے ہوئے لاما اپنے بہروپیوں میں قدیم عیسائی بشپ جیسے لگتے ہیں۔ وہ پادریوں کی عبا زیب تن کیے، ٹوپیاں پہنے، ہاتھوں میں پادریوں کے سے ترشول تھامے، لوبان اور دُوسری خوشبودار چیزیں ڈالے ہوئے عوددانوں کو جھلائے، دھیمی دھیمی جاپ کرتے ہوئے جلوس کی صورت میں گزرتے ہیں۔ تقریب کے دوران وقفے وقفے کے بعد چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں۔ اُن کے بھجنوں کی جاپ تیرھویں پوپ گریگوری کی جاپ جیسی ہے۔ اسی طرح یورپی طرز کی مذہبی رسوم میں مقدس پانی میں اُنگلیاں ڈبوئی جاتی ہیں۔

سر مونڈے ہوئے لاما اپنے لباس میں اِٹلی کے چند عیسائی درویشوں جیسے نظر آتے ہیں جو رومی کلیسا میں تسبیح پھیرتے، وقتاً فوقتاً اپنے سر جھکائے اور چھاتی پر ہاتھ رکھتے نظر آتے ہیں۔''

لداخ کی مصوّری کے کئی نمونے دورِ وسطیٰ کے یورپ کی یاد دلاتے ہیں۔

مارکو پالیس اپنی کتاب PEAK AND LAMAS میں رقم طراز ہے:

''اگر ایک لداخی مصوّر اطالوی کلیسا میں ORCAGNA اور GIATO کے شاگردوں کی بنائی ہوئی تصویروں کے درمیان اپنے آپ کو پائے تو وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا محسوس کرے گا۔''

اِس یکسانیت کے باوجود لداخ یا تبت اور یورپ کے درمیان کسی مذہبی اور ثقافتی تعلقات کے مستند شواہد نہیں ملتے۔ کچھ یورپیوں کا خیال ہے کہ زمانہ ءِ وسطیٰ میں

لداخ آنے والے نسطوری عیسائیوں سے میل جول سے یہ اثر پڑا ہوگا۔

ان تمام اثرات کے باوجود لداخ کی ثقافت میں اپنی ایک انفرادیت رہی ہے۔ لداخ کے آرٹ پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے مارکو پالیس نے لکھا ہے:

''لداخ کو اگرچہ کلچر کے اہم گہواروں میں شمار نہیں کیا جاتا لیکن یہاں کے دیہات اور لیہہ میں سفر کرتے ہوئے ایک خالص اور کھری تہذیب کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے، جسے ہم یورپ کے ایک بڑے حصے میں نہیں پاتے۔''

تمام غیر ملکی سیاحوں نے لکھا ہے کہ لداخی بڑے دیانت دار، خوش طبع، محنت کے عادی اور امن پسند ہیں۔ اِس کے برعکس لداخ کی ہمسائیگی میں رہنے والوں سے متعلق اُن کے تاثرات مختلف ہیں۔

دو پادری فادر ڈیزی ڈیری اور فادر فیرے رے نے ۱۷۱۵ء میں لداخ کا سفر کیا۔ اُن دِنوں لداخ خود مختار تھا۔ فادر ڈیزی ڈیری نے لداخیوں سے متعلق اپنے تاثرات یوں پیش کئے ہیں۔ ''لوگ چال چلن کے لحاظ سے شریف، معتبر اور بے ضرر ہیں۔ نیز وہ خوش طبع اور بڑے مِلنسار ہیں۔'' لداخ کا راجہ اور وزیر اُن کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آئے تھے۔

ایک لداخی کے لباس میں تبت کی گہری چھاپ ہے لیکن تبّتی لباس کا گریبان چاک ہوتا ہے اور لداخی کا گلا بند اور دیدہ زیب ہوتا ہے۔ لداخیوں کے سرپوش تبّتی یا کشمیری ٹوپیوں سے بالکل جداگانہ ہیں۔ اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ احساس ہوتا ہے کہ لداخیوں نے اپنے اندازِ فکر، وضع قطع اور ثقافت میں اِنفرادیت اور ''لداخیت'' کو قائم رکھا ہے۔ لداخیوں کو اِس کا بخوبی احساس ہے۔

تیر اندازی اور تفریحی تقریبات میں لداخی فن کار تبّتی، انگریزی، کشمیری، گلگتی، چینی، ترکستانی، بلتی اور ہماچلی لباس میں ان علاقوں کے ناچ پیش کرتے ہیں اور مختلف رُوپ دھار کر ان علاقوں کے باشندوں کی سماجی کمزوریوں کے مختلف پہلو

پیش کرتے ہیں۔ وہ خود بھی ہنستے ہیں اور دُوسروں کو بھی ہنساتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ مختلف سوانگ رچا کر اپنی کمزوریوں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ اب تیر اندازی کے ان میلوں میں پہلے کی سی رونق نہیں رہی ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد لداخ ایک نئے مرحلے میں داخل ہوا ہے۔ ۲۴ مئی ۱۹۴۸ء کو ائر کموڈر مہر سنگھ نے لیہہ ہوائی اڈہ پر جہاز اُتارا۔ اس سے پہلے ہوائی جہاز سے متعلق لوگوں میں انوکھا نظریہ تھا۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے کہ ہوائی جہاز میں سفر کرنے سے عمر چھوٹی ہوتی ہے اور آنکھیں نیلی ہو جاتی ہیں۔ اِس ضمن میں ایک نیلی آنکھوں والے شخص کی مثال دی جاتی تھی جس نے ہوائی جہاز میں سفر کیا تھا۔

جہاز آنے کے بعد اوائل میں بہت سے لوگ جہاز کا نام احترام سے لیتے تھے۔ لطیفہ مشہور ہے کہ ایک بُڑھیا ٹوکری میں گھاس لے کر ہوائی جہاز کو کھلانے کے لئے ہوائی اڈہ پر پہنچی۔

ہوائی جہاز کی آمد کے چودہ سال بعد اگست ۱۹۶۲ء کو لیہہ میں گاڑی پہنچی۔ اگرچہ سینکڑوں ہزاروں برس پرانے لیہہ سے تبت، چین، ترکستان اور بلتستان جانے والے تاریخی راستے لداخیوں کے لئے بند ہیں تاہم لیہہ - سرینگر اور لیہہ - منالی کی سڑکوں پر گاڑیوں کی آمد و رفت ہے۔ لداخ کی فضا میں روزانہ ہوائی جہاز سنسناتے رہتے ہیں اور لداخ دُنیا کے دُوسرے ملکوں کے بہت قریب آ گیا ہے۔

سارا لداخ ایک عظیم سماجی اور معاشرتی اِنقلاب کے دوراہے پر ہے۔ نئے تعمیر کئے جا رہے مکانات کی نچلی منزلوں میں اب بھیڑ بکریوں کے لئے باڑا، گائے کے لئے تھان اور گھوڑے کے لئے اصطبل نہیں بنائے جاتے ہیں بلکہ مکینوں کے لئے آرام دہ کمرے بناتے ہیں۔

لیہہ اور اِس کے آس پاس اکثر گھروں میں ٹیلی فون ہیں۔ بہتوں نے سہولت کے لئے کار رکھی ہے۔

درد قبیلہ

لداخ کا درد قبیلہ اپنے منفرد رسم و رِواج، اعتقادات، شکل وصورت، معاشرت اور نسلی اعتبار سے دُوسرے لداخیوں سے جُدا ہے۔ دردوں سے متعلق کہا جاتا ہے کہ پچھلے دوڈھائی ہزار سال کے دوران اُن کے خون میں کسی اور نسل کی آمیزش نہیں ہوئی ہے۔

لداخ میں درد وادئ سندھ میں داہ ہنُو، گرکون، سیلموں، بٹالیک اور درچیکس دیہات میں آباد ہیں جو کرگل، لیہہ اور بلتستان کے سنگم پر واقع ہیں۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق داہ ہنُو، درچیکس اور گرکون کی آبادی ۲۴۶۷ نفوس پر مشتمل تھی۔ خاص کر اِن گاؤں کے دردوں سے متعلق کہا جاتا ہے کہ پچھلے دوڈھائی ہزار سال کے دوران اُن کے خون میں کسی اور نسل کی آمیزش نہیں ہوئی ہے۔

درد دراس اور شغر شنگھو میں بھی بستے ہیں، تاہم اُن کی معاشرت داہ ہنُو کے دردوں سے مختلف ہے۔

درد ایک قدیم قوم ہے۔ مہابھارت، یونان اور ہندوستان کے قدیم سنسکرت ادب میں دردوں کا ذِکر ملتا ہے۔ سکندرِ اعظم کی فوجی مہمات اور قدیم ہندوستان کے قلمکار وراہ مہر کی تصنیفات اور راج ترنگنی میں دردوں کا تذکرہ ہے۔

یونانی مورخ ہیروڈٹس نے، جنہیں دُنیا کا پہلا مورخ کہا جاتا ہے، دردوں کو ہندوستان میں سب سے جنگجو قوم قرار دی ہے۔

دردوں نے اپنی خود مختار حکومتیں قائم کیں اور کئی دفعہ حملہ آور قوموں کے

ہاتھوں شکست اُٹھانی پڑی۔ شمالی ہندوستان میں ستھین نام کے جس قبیلے نے حکومت کی، خیال کیا جاتا ہے وہ ایک درد قبیلہ شین تھا۔

کئی مورخوں نے دردوں کو سکندرِ اعظم کے اُن فوجیوں کی اولاد بتائی ہے جو سکندرِ اعظم کے ہمراہ ہندوستان سے یونان واپس نہیں لوٹے تھے۔

لداخ آنے والے دردوں سے متعلق پیٹیک، فرانکی، سٹین، حشمت اللہ، ٹوچی، میر عزت اللہ، پیٹر، گیرگن، ڈینیلی، خاص کر روہیت وو ہرا اور کاچو سکندر خان نے بہت کچھ لکھا ہے اور ان کے گیتوں کا انگریزی اور اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔

لداخ میں درد گلگت، چیلاس، اسٹور، بونجی، یاسین اور چترال سے آئے تھے۔ ان علاقوں میں دردوں نے خودمختار حکومتیں بھی قائم کیں اور کبھی یہ تبت کے زیرِ نگیں رہے۔ یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے، جب تبت ایک بڑی طاقت بن کر اُبھرا تھا۔

دردوں نے اپنے ساتھ لداخ اپنا مذہب لایا۔ اپنی تہذیب اور ثقافت لائی۔ بعد میں بہت سارے دردوں نے بدھ مت یا اِسلام اختیار کیا۔ تاہم آج بھی داہ ہنو اور گرکون میں دردوں نے اپنی بہت ساری رسومات اور روایات قائم رکھی ہیں۔

درد اچھے سنگ تراش اور نقاش تھے۔ چٹانوں پر اُن کی تحریریں اور تصویریں آج بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ ایسی بہت ساری چٹانیں اور پتھر زمانہ حال میں توڑ دیئے گئے ہیں۔

درد لداخ میں پہلے پہل کب آئے؟ اِس کی صحیح تاریخ نہیں ملتی۔ تاہم یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ گزشتہ دو ڈھائی ہزار سال پہلے لداخ میں دردوں کی آمد شروع ہوئی تھی اور سترھویں صدی تک جاری رہی۔

دسویں صدی میں لداخ کے ایک بڑے حصّے پر درد سردار بروقپا بغدور کی حکومت تھی، جب سکیت نیما گون لداخ وارد ہوا تھا۔ خلسے برسوں تک درد طاقت کا مرکز رہا۔ بلُو کھر دردوں کی یادگار ہے۔ خلسے میں آنے جانے والوں سے درد حکام پُل

کے نا کے پر ٹیکس لیتے تھے۔

لداخ کے دردوں سے متعلق یہ روایت بھی مشہور ہے کہ زمانہ قدیم میں ایران کے ایک بادشاہ نے دردوں کو سونا حاصل کرنے کے لئے لداخ بھیجا تھا۔ آہستہ آہستہ اُنہوں نے اپنے اہل وعیال لائے اور مستقل طور یہیں بس گئے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ گلگت، چیلاس، بونجی وغیرہ میں جب آبادی بڑھی اور کھیتی باڑی اور چرائی کے لئے زمین کم پڑی تو درد نئی زمین اور بستیوں کی تلاش میں اپنے گھروں سے نکلے۔ اُن کے ایک پرانے گیت میں گلگت سے اُن کی آمد کا ذکر موجود ہے۔ آج بھی تیوہاروں پر یہ گیت گایا جاتا ہے۔ گیت ملاحظہ ہو:

"آپ لوگ کہاں سے آئے ہو؟
ہم گلگت سے آئے ہیں
آپ کا مذہب کیا ہے؟
ہم دیوی دیوتاؤں کو پوجتے ہیں
آپ کی نسل کیا ہے؟
ہم گالو، مےلو اور ڈولو کی اولاد ہیں
آپ کا پیشہ کیا ہے؟
ہم سونا جمع کرتے ہیں"

کئی گیت ان کے سفر کے راستوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ایک گیت کہتا ہے:

"ہم گلگت کے بُروکسل نالے سے نکلے
اور پھر گلگت کی رقص گاہ پہنچے
پھر تو رمیک کے سردار کے محل کی کھڑکی کے پاس سے گزرے
پھر بسوبسو پہنچے
شکر کندب پہنچے"

جہاں سے سکر دو اور چلو پہنچنے کا ذکر ہے۔

دُوسرے گیت میں مولبیک، لامایورو، تیاہ تینگ موگنگ ہوتے ہوئے ہمس شُوگپا چن پہنچنے کا ذِکر ہے۔ ہمس شُوگپا چن میں اُنہوں نے چُگلی (جونیپر) کی خودرو خوشبودار جھاڑی دیکھی جو دردوں کے لئے اہم ہے۔ یہاں سے وہ لیہہ اور شے تک گئے لیکن اُنہیں یہ جگہیں پسند نہیں آئیں۔

سات بھائیوں کی ایک جماعت موجودہ داہانُوگرکون پہنچتی ہے۔ اُنہوں نے زمین کھود کر جانچا۔ کیل کے سینگ سے زمین کھود کر بیج بوئے۔ پودے لگائے اور مزید اچھی جگہ کی تلاش میں نوبراہ روانہ ہوئے۔ نوبراہ کی شادابی کی اُنہوں نے تعریف کی ہے لیکن تین سال بعد داہانُوگرکون لوٹے۔ یہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے کہ اُن کے لگائے ہوئے پودے بالشت بھر لمبے ہو گئے تھے۔

ایک سردار، گل سینگے نے داہ میں زمین کے تعیّن کے لئے فال نکالتا ہوا یہ کہہ کر ندی میں ایک تیر بہا دیا کہ جہاں یہ رُکے وہاں سے آبادی شروع کی جائے گی۔ تیر ایک مقام پر ایک چٹان کے شگاف میں رُکا اور اُس مقام کا نام تیر کی نسبت سے ''داہ'' یا تیر پڑا۔ داہ لداخ کے اُن چند گاؤں میں سے ایک ہے جہاں سال میں دو فصلیں ملتی ہیں۔

شروع میں درد پوریگ پہنچے اور بستیاں بسائیں۔ پھر ایسے مرحلے آئے جب ایک طاقت ور قبیلے کے سردار نے دُوسرے قبیلوں کو یکے بعد دیگرے زیر کر کے اپنے زیر نگیں لایا۔ ان سرداروں میں ٹھاٹھا خان کا نام قابلِ ذکر ہے۔

ڈاکٹر فرانکی نے لکھا ہے کہ کبھی سارا لداخ دردوں کے قبضے میں تھا۔ اُنہوں نے لداخ کے علاقہ رونگ میں قبریں دیکھیں جو اُن کے مطابق دردوں کی تھیں۔ تب درد اپنی لاشیں دفناتے تھے۔ میّت کے ساتھ پوشاک، زیورات اور برتن بھی دفن کئے جاتے تھے۔

لیہہ میں پہاڑی پر واقع ایک کھنڈر آج ''ڈوقپا کھر'' یا ''درد محل'' کے نام سے مشہور ہے۔ تاہم لداخی مورخ ایس. ایس. گیر گن لکھتے ہیں کہ درد خلسے سے آگے نہیں گئے تھے۔ لداخ میں بسنے سے پہلے درد مال مویشی کی چرائی اور شکار کے لئے بلتستان اور پوریگ آئے تھے۔

گیالپو جمیانگ نمگیل کے زمانے میں گر گر دو پر بلتی اور لداخی سرحد تھی۔ ''گرگر دو'' درد لفظ GOTH MATCO کا بگڑا ہوا ہے، جس کا مطلب خِطّہء بٹوارہ ہے۔

ماضی قریب تک دردوں کی رسومات بڑی انوکھی تھیں۔ وہ انڈے، مرغی اور مچھلی نہیں کھاتے تھے۔ گائے کا دُودھ اور مکھن کا اِستعمال نہیں کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ گائے پالنے اور اِس کا دُودھ پینے سے وہ مال مویشی اور زمین کی پیداوار سے محروم ہو جائیں گے۔ البتہ یہ بکریاں پالتے تھے اور اُس کا دودھ اِستعمال کرتے تھے۔ آج کل گائیں اور مرغیاں رکھتے ہیں۔ تاہم آج بھی کئی عمر رسیدہ لوگ گائے کا دُودھ اِستعمال نہیں کرتے ہیں۔

درد Principle of pollution آلودگی یا کثافت کے اصول پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے چُگلی کی دھونی سے اپنے جسم کی تطہیر کرتے ہیں۔ ماضی میں ایک اجنبی کو گھر میں داخل ہونے سے پہلے چگلی کی دُھونی سے جسم کو پاک کرنا پڑتا تھا۔ حتیٰ کہ گاؤں میں اجنبیوں کے داخلے پر پابندی تھی۔ اگر کوئی اجنبی یا گاؤں سے باہر کا آدمی کسی سے ملنے آتا تو وہ دُور سے اُس کو پکار کر بلاتا تھا۔

آلودگی کا مسئلہ اُن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہے۔ بچہ پیدا ہونے پر زچہ اور اُس کا شوہر گھر سے باہر نہیں نکل سکتے۔

دردوں سے کثافت کا نظریہ لداخ کے دُوسرے حصّوں میں پہنچا۔

اُن کی روزمرّہ کی زندگی میں چولھے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کسی اجنبی یا

غیر کو کثافت کے ڈر سے اس کے پاس آنے یا چھونے کی اجازت نہیں دیتے۔ چولھے کے پاس ان کے گھر کا دیوتا ''سب دق'' رہتا ہے جس کا بظاہر کوئی وجود نہیں۔ کھانا کھانے سے پہلے وہ کھانے کے ٹکڑے ''سب دق'' کی جگہ کی طرف پھینکتے ہیں۔

درد اروا حِ خبیثہ اور بھوت پریت پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اِن کا اثر زائل کرنے کے لئے ٹونے ٹوٹکے اور تعویذ گنڈے باندھتے ہیں۔

یہ ''لُو'' نام کی ایک غیر مرئی ہستی کو مانتے ہیں۔ جس سے متعلق اُن کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ پانی میں رہتا ہے اور چشمے کے تازہ اور صاف پانی کا محافظ ہے۔ وہ لُو کو اشتعال دینے سے سخت گھبراتے ہیں۔ دردوں سے جزوی طور لُو کا نظریہ لداخ کے دُوسرے حصّوں میں پہنچا۔

ایک زمانہ آئے گا جب دردوں کی ساری رسمیں قصہء پارینہ بن چکی ہوں گی۔ نوجوان نسل پرانی قدروں کو چھوڑ رہی ہے اور نئے دور کی قدروں کو اختیار کر رہی ہے۔

ننھے منھے بچے جب بڑے ہوں گے تو یقیناً مختلف ہوں گے۔ فی زمانہ تعلیم اور مختلف لوگوں سے میل جول تبدیلیوں کے محرک ہیں اور توہم پرستی کے سدباب کے موجب ہیں۔

تا حال عمر رسیدہ درد ماضی کی معاشرت اور تمدّن کا نمونہ ہیں۔ گھنی مونچھیں والے یہ درد پرانی رسومات اور روایات کے پاسدار اور امین ہیں۔ ان کی عورتیں بھی ان کی ہم خیال ہیں۔ ادھیڑ عمر کے درد بزرگوں سے قدرے مختلف ہیں۔

دردوں کے سماج میں تین افراد اہم ہیں۔ ایک پجاری، دُوسرا برونگپا، یا پرانے بھجن گانے والا اور تیسرا کاہن جس کو 'لہا' کہا جاتا ہے۔ 'لہا' جب وجد میں جاتا ہے تو پیشین گوئیاں کرتا ہے۔ دردوں کے عقیدے کے مطابق ایسے میں وہ ایک دیوتا کے زیرِ اثر آتا ہے اور جو کچھ وہ بولتا ہے، حقیقتاً دیوتا کے الفاظ ہوتے ہیں۔

لوگ اپنے مسائل لے کر لہا کے پاس آتے ہیں۔ اور لہا وجد کے عالم میں

اُن کے حل بتا تا ہے۔

کرگل کے سوت کے راجگان کی کوششوں اور مبلغین کی تبلیغ سے سولہویں صدی کے اختتام یا سترھویں صدی میں بہت سارے درد حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ مسلمان درد چولی چن اور سیلموں میں آباد ہیں۔

۱۷۷۹ء میں تین لاموں نے ہنو میں بدھ مت کا پیغام لایا۔ بعد میں سیکور بُوچن کے ایک لامایوگی قونچوگ ونگپو نے بدھ مت کی تعلیم دی اور بہت سارے لوگ بدھ مت کے پیروکار بنے لیکن اُنہوں نے پرانے عقائد کُلّی طور پر نہیں چھوڑے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ان کی تمدنی زندگی اور پیشوں کا آغاز دیوتاؤں کے نزول سے ہوا، جو اِنسان کی پیدائش کا سبب بنا۔ منڈے ڈے منڈے دردوں کا اہم ترین دیوتا ہے۔ وہ اِس کی تعریف میں اکٹھے گاتے ہیں:

''ہم منڈے ڈے منڈے کی حرمت کرتے ہیں
آؤ ہم اِس جگہ ناچیں''

دُنیا کی آفرینش سے متعلق اُن کا نظریہ اِس گیت میں دیا ہے:

''اِنسان کی یہ دُنیا کیسے بنی؟
شروع میں پانی اور منجمد یخ تھا
یخ پر گرد پڑا
اِس پر کچھ گھاس اُگی
تب تین پہاڑ اُبھرے''

درد بڑے خوددار اور غیور تھے۔ ہنو کو اپنے قبضے میں لانے کے بعد سولھویں صدی میں ایک لداخی راجہ نے دردوں سے بیگار پر کام لینا چاہا تو اُنہوں نے اپنے لیڈر رآپو تھوشالی کی سرکردگی میں اِس کی پُرزور مخالفت کی۔ انہوں نے کہا ''بیگار ایک درد کے لئے بڑی ذلّت ہے۔'' راجہ نے آپو تھوشالی کو بیگار کا کام لینے کے لئے بلایا۔

تھوشالی نے مزاحمت کی۔ راجہ نے اُس کو زندہ دیوار میں چن دینے کا حکم دیا۔ جب دیوار چُنتے ہوئے یہ درد رہنما کے گلے تک پہنچی تو سرکاری اہل کار نے پوچھا کہ کیا اب وہ بیگار کے لئے تیار ہے تو تھوشالی نے پھر ایک دفعہ مضبوط قوّتِ ارادی سے اِنکار کیا۔

تھوشالی کو دیوار میں زندہ چن دینے کے بعد ایک چٹان پر لوگوں کی عبرت کے لئے یہ لکھا گیا۔

''حکم عدولی کے لئے تھوشالی کو ہلاک کیا گیا۔''

لیکن تھوشالی کی قربانی بے کار نہیں گئی۔ لوگوں کی مزاحمت جاری رہی اور بیگار معاف ہوا۔ ہنو سے چند میل کے فاصلے پر ایک چٹان پر لداخ کے راجہ کی طرف سے دردوں سے بیگار نہ لینے کا حکم تراشا گیا۔ لداخی میں ایک کہاوت ہے۔ ''کُتّے پر بوجھ لادا نہیں جا سکتا۔ دردوں پر بیگار ٹھونسا نہیں جا سکتا۔'' غالباً یہ کہاوت اِس واقعہ کے بعد بنی ہوگی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ایک دفعہ آزادی پسند دردوں کو لداخ میں ایک قلعے میں قید کر لیا گیا۔ جب اُن کی خوراک اور پانی ختم ہوا تو اُنہوں نے ہتھیار ڈالنے کے بجائے اجتماعی طور خودکشی کرنے کا اِرادہ کیا۔ وہ قلعے کے مرکزی ہال میں جمع ہوئے۔ سب سے عمر رسیدہ آدمی نے اُس پتھر کو ہٹا دیا جس پر مرکزی ستون کھڑا تھا اور سب کے سب دب کر مر گئے۔

درد عورتیں زیورات میں لدی پھندی رہتی ہیں جو عموماً سستے ہوتے ہیں۔ زیورات میں مونگوں کے ہار، سکوں کی جھالریں، پیتل یا چاندی کے منقش بازو بند، سر پر مختلف رنگوں اور اقسام کے نگ، سوئیاں اور سکے، کلائیوں میں کانچ اور سیپی کی چوڑیاں اور کانوں میں چاندی یا کانسے کے آویزے شامل ہیں۔

مرد بھی کانوں میں آویزے اور گلے میں ہلکا سا زیور پہنتے ہیں۔

عورتیں شلوار اور قمیص پر پیرہن پہنتی ہیں۔ پیرہن کے کناروں پر رنگ دار

دھاگوں سے گل بوٹے یا حاشیے بنائے جاتے ہیں۔ پیرہن کے اُوپر بکری کی بالوں والی کھال پہنتی ہیں، جو غالباً ماضی کے لداخ کی دین ہے۔ پٹو کا پاجامہ بھی استعمال ہوتا ہے، جس کے پائینچوں پر رنگین دھاگوں سے سوزن کاری کی جاتی ہے۔

مرد چوغہ پہنتے ہیں۔ کمر بند سے چقمق، چاقو وغیرہ باندھتے ہیں۔ ان کی ٹوپی کا کنارا اُوپر کی طرف مڑا ہوا اور بیچ میں کاٹا ہوا ہوتا ہے۔ کٹے ہوئے گوشے دائیں بائیں لٹک جاتے ہیں۔

کاچو سکندر خان کے الفاظ میں ان کی ٹوپی پھولوں کا چلتا پھرتا ایک ننھا منا باغیچہ ہوتی ہے۔ اس پر گل سبز ریحان کی کلغی ہوتی ہے۔ دردوں کا عقیدہ ہے کہ ٹوپی پر پھول لگانے سے ان کے دیوی دیوتا خوش ہوتے ہیں۔ وہ مہمانوں کی آؤ بھگت پھولوں سے کرتے ہیں۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد اور عورتیں سبھی پھولوں کے شائقین ہیں۔ ایک گیت میں پھولوں کے مصرف کو یوں اُجاگر کیا گیا ہے:

''پہاڑوں کے چرواہا! خوبصورت پہاڑی پھول چن چن کر اپنی محبوباؤں کو بھیجو۔''

اور محبوباؤں سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

''اے حسیناؤں! اپنے گاؤں کے باغیچوں سے گلدستے اپنے محبوب چرواہوں کو بھیجو اور اپنی زندگی کا دامن خوشیوں سے بھر دو۔''

جب خاندان میں کوئی فوت ہو جاتا ہے تو سوگ میں ٹوپیوں کے پھول نوچ پھینکتے ہیں۔

درد گاؤں بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ شاداب اور ہرے بھرے ٹیلوں پر چٹان کے درمیان یا دامن میں اُن کے چھوٹے چھوٹے مکانات ایسے لگتے ہیں گویا دیوار سے تصویریں آویزاں کی گئی ہیں۔ مکان کی چھتوں پر انگور کی بیلیں اور میوہ دار درختوں کی شاخیں سایہ فگن رہتی ہیں۔ وہ گیندا، گل عباسی، گلاب اور عنبریں جیسے پھول اُگاتے ہیں۔

درد ناچ گانوں کے بڑے شوقین ہیں۔ اُن کے متعدد تیوہار ہیں جیسے بونونو، من ٹھانا، نارن، شاہ نصیر، شندوم، موری پی پھن، ممانی، لوستون، رُو پہلا وغیرہ۔

بونونو تیوہار کے دوران آبا و اجداد اور اپنے سرداروں کی یاد میں رزمیہ گیت گائے جاتے ہیں اور سردار گل سینگے کی موت کا سین پیش کیا جاتا ہے۔ جس کو اُس کی بیوی نے زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔ سردار میلو کی یاد میں ہنو، درچیکس، سلموں، گنوخ اور چولی چن میں میلے لگتے ہیں اور اُن کے گُن گائے جاتے ہیں۔

میر عزت اللہ کے مطابق وہ اِس موقعے پر تبتیوں اور ڈوگروں کے ہاتھوں اپنی شکست پر اِظہارِ غم کرتے ہیں۔ میر اُنیسویں صدی کے شروع میں لداخ آیا تھا۔

آپو تھوشالی کے ماتم میں تقریب منائی جاتی ہے۔ تقریب تین گیتوں سے شروع ہوتی ہے، جن میں سات دیوتاؤں اور سات دیویوں کے نام لئے جاتے ہیں اور سات پھول پیش کئے جاتے ہیں۔

مرنے والوں کی یاد میں ممانی تیوہار منایا جاتا ہے۔ یہ عموماً سردیوں میں ۲۱/ جنوری کو منعقد ہوتا ہے۔ اُس روز شمشان پر کھانے لئے جاتے ہیں اور غریبوں کو کھلائے جاتے ہیں۔ جس سے اُن کے عقیدے کے مطابق مرنے والوں کو شانتی ملتی ہے۔

کِسی کی عمر میں بارہ سال پورا ہونے پر ایک اجتماعی تیوہار منایا جاتا ہے۔ جس میں بارہ بارہ سال پورے کرنے والے سارے افراد بطور مہمان شرکت کرتے ہیں اور اُن کی خاطر تواضع اور عزت افزائی ہوتی ہے۔ چنانچہ شرکاء کو زندگی میں عموماً ایسی کئی تقریب میں شرکت کا موقع ملتا ہے۔

درد کئی موسمی تیوہار مناتے ہیں۔ ساکا بیج بوائی کا تیوہار ہے۔ سنولا آغازِ بہار میں منایا جاتا ہے۔ یہ پھولوں کا تیوہار ہے، جب لڑکے لڑکیاں پہاڑوں سے پھول چنتے ہیں۔ اس موقعے پر اچھی فصل کے لئے دُعا مانگی جاتی ہے۔

نئی فصل ملنے پر فصل کٹائی کا تیوہار ''رُو پہلا'' منایا جاتا ہے۔

ناچ گانے تیوہاروں کی خصوصیات ہیں۔ ان کے سازسنگیت کے آلات میں دمامہ اور سرنائی کے علاوہ ڈھول شامل ہیں۔

ماضی میں درد پولو کھیلتے تھے۔ وہ اچھے تیرانداز تھے اور جانوروں کا شکار کھیلتے تھے۔

درد اپنے قبیلے سے باہر شادی نہیں کرتے۔ پیام دینے کا عام طریقہ یہ ہے کہ لڑکے کے گھر ایک آدمی مع برادری کے ایک آدمی سات چپاتیاں، ایک مٹکا شراب اور ایک سوئی لے جاتے ہیں۔ نسبت ٹھہرائی جاتی ہے۔ اور شادی کی تاریخ مقرر ہوتی ہے۔

درد شراب کے رسیا ہیں، جو انگور سے کشید کی جاتی ہے۔

درد مرد اور عورتیں خوبصورت ہوتے ہیں۔ اُن کی ناک لمبی، رنگ سپید و سرخ اور آنکھیں سبز اور نیلی ہوتی ہیں۔ لیکن یہ جسمانی صفائی کی طرف کم توجہ دیتے ہیں۔ ان کو یہ توہم ہے کہ نہانے دھونے سے گھر کی برکت چلی جاتی ہے۔ تاہم تعلیم کی روشنی اور بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے یہ فرسودہ نظریہ ختم ہورہا ہے۔

دردوں کی زبان قدیم شینا ہے جو آج کل گلگت میں مروّج نہیں ہے۔ سبھی قدیم شینا بولنے والے نقل مکانی کر کے لداخ آئے۔ ان کی بولی میں فارسی، سنسکرت، لداخی اور انگریزی کے الفاظ ہیں۔ البتہ دراس میں جو شینا بولی جاتی ہے وہ گلگت میں مروّج ہے۔

پانسہ کھیلنا دردوں کا مرغوب مشغلہ ہے۔ کئی دفعہ کوئی سنجیدہ کام کرنے سے پہلے وہ پانسہ پھینک کر آزماتے ہیں کہ انہیں وہ کام کرنا چاہئے یا نہیں۔

ان کی خوراک سادہ ہے۔ وہ گندم کے آٹے کی روٹی، جَو کے آٹے کے گولے، ساگ سبزی، دہی، مکھن، لسّی، پھل اور بھیڑ بکریوں کا گوشت استعمال کرتے ہیں۔ خوبانی اُن کے لئے اہم ہے۔ اس کی گری سے وہ تیل نکالتے ہیں جو کھانا بنانے

کے علاوہ بالوں کی نشو و نما کے لئے مفید ہے۔ خوبانی کے علاوہ درد بستیوں میں اخروٹ، ناشپاتی، شہتوت، سیب اور انگور پیدا ہوتے ہیں۔

ترقیاتی سکیموں کی وجہ سے دردوں کی زندگی میں خوشگوار تبدیلیاں آ رہی ہیں۔

گرم آب و ہوا کی وجہ سے لداخ میں سب سے پہلے درد بستیوں میں سبزیاں تیار ہوتی ہیں اور فروخت کے لئے لیہہ اور کرگل بھیجی جاتی ہیں۔

درد گاؤں میں لداخ میں پیدا ہونے والی عام سبزیوں کے علاوہ آج کل بینگن، کھیرا، بھنڈی، مرچ، ٹماٹر، آل، کدّو، تربوز وغیرہ اُگائے جاتے ہیں۔

درد عموماً بڑے روادار، نیک اور صاف گو ہوتے ہیں۔

لداخی عورتیں، پیرق اور روائتی لباس میں

(مضمون ''رسم و رواج اور لباس'' ملاحظہ ہو)

سِلک رُوٹ

سلِک رُوٹ یا شاہراہِ ابریشم قدیم دُنیا کی سب سے مشہور لمبی اور پُراسرار شاہراہ ہے جو رُوئے زمین پر اِنتہائی دُشوار گذار خطّوں سے گزرتی تھی۔ یہ چین سے ہوتی ہوئی یورپ میں قدیم سلطنت روما تک جاتی تھی۔ چین کے شہر گوانگ زہو سے بحرِ روم کی بندرگاہ تک اِس کی لمبائی تقریباً پندرہ ہزار کلومیٹر تھی۔ ایک سرے سے دُوسرے سرے تک مال واسباب کی نقل وحمل میں ایک سال کا عرصہ لگتا تھا۔ شاہراہ پر بہت سارے شہر، قصبے اور بستیاں آباد تھیں۔ مسافروں اور تاجروں کی رہائش کے لئے جابجا سرائیں بنی تھیں اور مال کی نمائش اور خرید وفروخت کے لئے ایمپوریم بنے تھے۔ چین ترکستان (موجودہ ژِن جیانگ) کا شہر کاشغر سِلک رُوٹ کے تقریباً مرکز میں تھا۔

تجارت کی وجہ سے اِن شہروں اور قصبوں کو بڑا فائدہ پہنچتا تھا اور لوگ بڑے خوشحال تھے۔

اِس شاہراہ سے صدیوں تک تاجر، مبلغ، یاتری، فوجی اور مسافر ہوگزرے ہیں۔ جہاں جہاں سے لوگ گزرتے تھے وہاں وہ اپنی تہذیب کی چھاپ اور نشان چھوڑتے تھے۔

سلک رُوٹ ریگستانوں سے گزرتی تھی۔ جہاں دریا بہتے تھے اور جابجا چشمے پھوٹتے تھے۔ جہاں جہاِں پانی تھا وہاں نخلستان تھے اور انسانوں کی آبادی تھی۔

اِس شاہراہ اور اس سے منسلک دُوسری شاخوں کی شاہراوں پر مختلف اقسام

کے مال و اسباب سے لدے گلے میں ٹنٹناتی ہوئی گھنٹیاں باندھے اونٹوں، گھوڑوں اور دُوسرے بار بردار جانوروں کی لمبی قطاریں گزرتی تھیں۔ تصوّر کی آنکھوں کے سامنے جب وہ نقشہ آتا ہے تو ذہن پر عجیب سی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

جرمنی کے ایک محقق اور جغرافیہ دان BARON VON RICHTHAFEN نے ریشم کی مناسبت سے اِس شاہراہ کا نام سِلک رُوٹ رکھا۔ ریشم رومن شہریوں میں بڑا مقبول تھا۔ وہ اسے اپنا مخصوص لباس بنا کر پہنتے تھے جو ٹوگاس کہلاتا تھا۔ چوتھی صدی میں سرکاری سطح پر ریشم کی درآمدات میں اِتنا اضافہ ہوا کہ بازنطین حکومت (مشرقی روم کی حکومت) کا خزانہ خالی ہو گیا۔

اس خطے میں ایشیا کی چار اہم تہذیبی اِکائیاں چین، برصغیر ہندوستان، سنٹرل ایشیا اور ایران شامل ہیں، جن کو ایک جغرافیہ دان نے ٹرانس ہمالین کا نام دیا ہے۔ پامیر، گلگت، بلتستان، لداخ، مغربی تبت اور ہماچل پردیش کے متصلہ علاقوں کو مغربی ٹرانس ہمالین کہا جاتا ہے۔ اِن علاقوں سے سِلک رُوٹ کی تین اہم شاخیں گزرتی تھیں۔

یہ خطّہ خاص کر سنٹرل ایشیا، محققوق اور سائنس دانوں کے لئے ہمیشہ سے باعثِ کشش اور پُر اسرار رہا ہے اور دُنیا اِس سے متعلق زیادہ جانکاری حاصل کرنا چاہتی ہے۔ دُنیا کے بہت سارے ملکوں میں سنٹرل ایشیا سے متعلق تعلیمی اور تحقیقی ادارے ہیں۔ ان میں امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، جرمنی، چین، ہندوستان اور جاپان شامل ہیں۔

سلک روٹ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے کم از کم دو سو سال پرانی ہے اور یہ چین اور رومن حکومتوں کے مابین تجارت کے لئے بنائی گئی۔ تجارتی تعلقات قائم کرنے کے لئے چین کے شہنشاہ کے قاصد زہانگ قیان نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ ہمسایہ ملکوں کے ساتھ بھی تجارتی راہیں کھلیں جن میں

ہندوستان بھی شامل ہے۔

چین سے ریشم، کاغذ، چھپائی کا سامان، بلوریں برتن اور بارُود برآمد ہوتے تھے۔ وسط ایشیا سے گھوڑے، عطریات، نیل کے بنے رنگ، ناشپاتی اور اخروٹ وغیرہ برآمد کئے جاتے تھے۔ ہندوستان کی برآمدات میں کپاس، کالی مرچ اور صندل کی معطر لکڑی شامل تھی۔ مغرب سے شیشے اور شیشے کے آرائشی سامان مشرقی ممالک برآمد کئے جاتے تھے۔ مغرب سے انگور کی بیلیں بھی آئیں اور مشرق نے شراب کشید کرنا سیکھی۔

تجارت کے فروغ کے ساتھ اِن خطّوں کی مصنوعات کی درآمدات اور برآمدات میں اضافہ ہوتا گیا اور تجارت کے لئے مال پر محصولات لئے جاتے تھے۔

لیکن سِلک رُوٹ صرف تجارت کا نام نہیں ہے، مادی ترقی کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک تہذیب، تمدن اور ثقافت کا نام ہے۔ سلک رُوٹ اور اس کی شاخوں کے راستوں سے دُنیا کے بڑے مذاہب اِس خطّے میں پہنچے۔ سلک رُوٹ نے ایک دُوسرے کو اپنی تہذیب، کلچر، علم وعرفان اور فنونِ لطیفہ سے روشناس کیا جن کی وجہ سے مشرق اور مغرب پر دُوررس اثرات پڑے۔ یہی خصوصیات سلک رُوٹ کی تاریخی اہمیت کو بڑھاتی ہیں اور عالموں اور محققوں کو دعوتِ فکر دیتی ہیں۔

اِس شاہراہ نے ہندوستان سے بدھ مت، مشرقی روم سے نسطوری عیسایت NESTORIANISM ایران سے مانی کے اِزم MANICHAEISM اور پارسی مذہب اور عرب سے اِسلام لایا۔

سِلک رُوٹ چینی ترکستان کے ریگستان تکلا مکان سے گزرتی تھی۔ تکلا مکان کا مطلب اُویگور ترکوں کی زبان میں ''اندر جاؤ گے تو واپس نہیں آؤ گے'' ہے۔ کیونکہ کئی دفعہ یہاں کارواں راستے سے بھٹک جاتا اور ریت کے ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں غائب ہو جاتا تھا۔ پھر اُن کی صرف ہڈیاں ہی ملتیں۔

تکلا مکان کا رقبہ تین لاکھ پچاس ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ یہاں رنگ برنگے

پتھر پائے جاتے ہیں۔ تیز آندھیاں چلتی ہیں اور ریت کے بگولے اُٹھتے ہیں۔ چین نے تکلا مکان کے لوب نور کے مقام پر اپنے نیوکلائی تجربے کئے ہیں۔

ایک مغربی مشاہد نے لکھا ہے کہ ختن اور شین جیانگ کی راجدھانی اُروچی کے درمیان ہوائی اُڑان کے دوران تکلا مکان کا منظر بڑا خوبصورت اور دلکش لگتا ہے۔

سِلک رُوٹ پر تجارت کے عروج کے دوران ریگستان میں بڑی بڑی بستیاں تھیں۔ ایک محقق نے لکھا ہے کہ ان بستیوں کی تعداد ڈھائی سو سے تین سو کے درمیان تھی۔ سنٹرل ایشیا میں بودھ مذہب کے دَور میں اِن بستیوں سے ناقوس، سنکھ، ڈھول، جھانجھ، اور تُرہی کی آوازیں گونجتی تھیں اور جب اِسلام آیا تو مسجد کے میناروں سے اذان کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

جغرافیائی محرکات اور آب وہوا کے تغیّر وتبدّل کی وجہ سے یہاں بستیاں اور اِنسانوں کی آبادی ختم ہوئی۔ دریاؤں کا رُخ بدل گیا یا اُن میں پانی گھٹ گیا۔ چشمے سوکھ گئے۔ ریت کے بگولے اُٹھنے لگے۔ نخلستان ریگستان میں جذب ہونے لگے اور بستیاں زیرِ زمین دب گئیں۔

مغربی سیاح مارکو پولو نے اپنے سفر نامہ میں ریگستانی حصّے کی سلک رُوٹ پر اپنے مصائب کا ذِکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سفر کے پہلے تیس دِن مشکل ترین تھے۔ اِس دوران ایک دِن اور ایک رات سفر کرنے کے بعد پانی ملتا تھا۔

ریگستان میں عجیب وغریب آوازوں کے آنے کا تذکرہ ہے۔ جیسے موسیقی کے بہت سارے آلات بجائے جارہے ہوں۔ خاص طور پر ڈھولوں، دماموں اور ہتھیاروں کے ٹکراؤ کا گماں ہوتا تھا۔ ہوائیں چلنے سے آوازیں زیادہ آتی تھیں۔ پہلے ان آوازوں کو بھوت پریتوں کا کام سمجھا جاتا تھا یا ان مقامات پر مرنے والے مسافروں کی بدرُوحوں کی کارستانی بتائی جاتی تھیں۔ ایک جگہ سے متعلق یہ روایت ہے کہ وہاں ایک ہزار سال پہلے دو برسر پیکار فوجیں ریگستانی طوفان کے دوران ریت

کے نیچے دب گئی تھیں۔

سلک رُوٹ ایک جگہ منحنی سادائرہ بناتی تھی۔شمال کی جانب یہ ٹرپان قصبے کی طرف جاتی تھی۔ یہ راستہ نخلستانی قصبوں سے گزرتا تھا اور آمد ورفت کے لئے بہتر تھا۔ دوسرا راستہ مغربی لولن کی طرف جاتا تھا جہاں سے جنوب مغرب کی طرف ختن سمیت کئی نخلستانی قصبوں سے ہوتا ہوا کاشغر میں شمالی راستہ سے ملتا تھا۔

سِلک رُوٹ سے کئی شاخیں نکلتی ہیں اور مختلف خطّوں سے اِن کا رابطہ ہوتا ہے۔ایک اہم شاخ کاشغر سے ہوتے ہوئے پاکستان کے زیرِ نگیں شمالی علاقہ میں داخل ہوتی تھی اور شمالی ہندوستان جاتی تھی۔

دُوسری اہم شاخ کاشغر، قراقرم، لیہہ کا تجارتی راستہ تھا جو لیہہ سے سرینگر جاتا ہے۔ اِس راستے کو TREATY ROAD بھی کہا جاتا ہے۔ اس راستے پر چینی ترکستان کا شہر یارقند نہایت ہی اہم تجارتی مرکز تھا۔سلک رُوٹ سے ایک اور راستہ پاکستان کے شمالی علاقہ میں آتا تھا۔ ہُنزہ اس راستے پر پڑتا تھا۔ اس راستے کو جیبن روڈ کا نام دیا گیا۔

سِلک رُوٹ کے عروج کے زمانے میں پامیر کی بڑی اہمیت تھی۔نویں اور دسویں صدیوں میں سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے سلک رُوٹ کی تجارت کو دھکا لگا اور تجارتی قافلوں کی آمدورفت میں بڑی کمی آئی جس کے نتیجے میں سنٹرل ایشیا اور ہندوستان کے درمیان تجارت پامیر سے شمالی قراقرم کے درّوں سے گزرنے والے راستوں پر منتقل ہوئی۔

دسویں صدی کی ایک تاریخی تصنیف ''حدودِ عالم'' میں لکھا ہے کہ کاشغر۔ لیہہ شاہراہ پر اُن دِنوں اچھی تجارت ہوتی تھی۔

کاشغر-لیہہ شاہراہ سے سرینگر کے علاوہ لیہہ سے ہماچل پردیش اور تبت کے لئے تجارتی راستے بنے تھے جن پر تجارتی قافلوں اور مسافروں کی آمدورفت تھی۔

سنٹرل ایشیا میں بدھ مت ایک صدی قبل مسیح پھیلا۔ شمالی ہند سے آئے ہوئے آریائی نسل کے بودھ تاجروں، پروہتوں اور سنتوں نے یہاں ریگستانوں میں ساتھ ساتھ مٹھ، محلات اور رہائشی عمارتیں تعمیر کیں۔ شاہکار تصویریں بنائیں۔ چٹانوں پر تحریریں اور تصویریں تراشیں۔ مدتوں پہلے یہ شہر اور قصبے اگرچہ ریت کے نذر ہوگئے تاہم آثار باقی ہیں۔ اُن کے تخلیق کردہ آرٹ کے خوبصورت نمونے دُنیا کو آج بھی ورطۂ حیرت میں ڈالتے ہیں۔

کنشک کے دورِ حکومت میں سلک رُوٹ کے شمالی علاقے سے گزرنے والے ذیلی راستے سے چین اور ہندوستان کے درمیان براہِ راست آمد و رفت قائم ہوئی اور چین اور کُشن خاندان کے درمیان سفیروں کا تبادلہ ہوا۔

تیسری صدی میں سنٹرل ایشیا میں بودھ مٹھ اور ستوپا تعمیر ہوئے جن کا چٹانوں پر کھدی تحریروں میں ذِکر کیا گیا ہے۔

چوتھی اور ساتویں صدی کے درمیان ہندوستان سے متعدد عالموں کو بودھوں کی کتب کے ترجمے اور توجیہات کے لئے سنٹرل ایشیا اور چین مدعو کیا گیا جن میں کمار جیوا جیسے مشہور عالم شامل تھے۔

ساتویں صدی میں کاشغر میں کئی سو بودھ خانقاہیں تھیں۔ جن میں دس ہزار بھکشو تھے۔ ختن اور کوچا کے شہروں میں تقریباً پانچ ہزار بھکشو تھے۔

گلگت اور بلتستان میں بھی بدھ مت کا غلبہ تھا جس کا ذکر فاہیان اور ہیون سانگ نے بھی کیا ہے۔

سوات نے سنٹرل ایشیا کو وجرایوگنی کا فلسفہ دیا اور ختن سے کالا چکرا آیا۔ آج کل دلائی لاما وقتاً فوقتاً کالا چکرا کے فلسفہ پر اُپدیش دیتے ہیں جنہیں سُننے کے لیے خاص طور پر تبّتی اور لداخی بودھ بڑی تعداد میں حاضری دیتے ہیں۔

سنٹرل ایشیا کا شہر ختن بودھوں کا روایتی مقدس رُوحانی شہر شمبھالا سمجھا جاتا ہے۔

بدھ مت کے بعد مانی کے اِزم MANICHAEISM اور نسطوری عیسائیت سنٹرل ایشیا پہنچی اور بدھ مت کے ساتھ ساتھ ان مذاہب کی اشاعت ہونے لگی۔ ان کے پیروکاروں نے عبادت گاہیں اور رہائشی مراکز تعمیر کیے۔

مانی کے اِزم کا بانی مانی تھا۔ جس نے تیسری صدی میں ایران میں اس فرقے کی بنیاد ڈالی تھی۔ مانی نے پیغمبری کا دعویٰ کیا۔ اس مذہب کے پیروکار مسئلہ تناسخ پر اعتقاد رکھتے تھے۔ گوشت نہیں کھاتے اور دن میں کئی دفعہ عبادت کرتے تھے۔ برت رکھنا اور دان دینا اس کے عقائد میں داخل تھے۔

مانی کے اِزم عیسائی کلیسا کے خلاف ایک حریف کی حیثیت سے اُبھرا۔ موخرالذکر نے اس کی تعلیمات کو الحاد قرار دیا۔ راسخ الاعتقاد زرتشتیوں کی ایما پر اس فرقے کے پجاریوں نے مانی کو ہلاک کیا۔

یہ فرقہ مصر، شمالی افریقہ اور رومی مملکت کے راستے مغرب میں پہنچا۔ چھٹی صدی میں مذہبی تشدد کا شکار ہونے کی وجہ سے یہ فرقہ مٹ گیا۔

مشرق کی جانب یہ چینی ترکستان (موجودہ شن جیانگ) پہنچا جہاں دسویں تک اِس کے ماننے والے موجود تھے۔

NESTORIANISM نسطوری عیسائیت کے بانی قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کے بشپ سٹن ٹینوپال نسطوری تھے۔ اُنہوں نے پانچویں صدی میں ایک نیا مکتبہ خیال پیش کیا جس کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ اقدس انسانی اور روحانی دو ہستیوں کا مجموعہ قرار دی گئی جب کہ عیسائیوں کا عام عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک رُوحانی ہستی تھے جنہوں نے اِنسانی روپ اور فطرت اختیار کی تھی۔ پرانے عقائد کے ماننے والوں نے نسطوری عقیدے کی سخت مذمت اور مخالفت کی۔ نسطوریوں کے مذہبی ادارے کو بند کیا اور جو تھوڑے نسطوری اُن کی دستبُرد سے بچے وہ ایران چلے گئے۔ ساتویں صدی کی پہلی نصف صدی کے دوران ایران پر

عربوں کا تسلّط ہوا اور نسطوری عیسائیت کو ایک مذہبی فرقے کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ آج کل اِس فرقے کے پیروکار ایران کے علاوہ عراق اور شام میں بستے ہیں۔

ساتویں صدی میں تبت ٹرانس ہمالیائی خطے میں ایک اہم سیاسی طاقت کی حیثیت سے اُبھرا اور اسی صدی کے آخری ربع میں تبّتی فوجیں لداخ اور بلتستان کے راستے سنٹرل ایشیا میں داخل ہوئیں۔ سلک رُوٹ پر واقع شہر ختن، کوچا اور دونگ ہانگ فتح کئے۔ ان فتوحات کی وجہ سے تبت کو نہ صرف مادی طور فائدہ ہوا بلکہ یہ ثقافتی لحاظ سے بھی مستفید ہوا۔ سنٹرل ایشیا پر تبت کے بدھ مت کا اثر پڑا۔ بلتستان اور لداخ نے تبّتی زبان اور کلچر اختیار کیا۔

آٹھویں صدی کے دوران یہ خطّہ کئی طاقتوں کی کشمکش کی آماجگاہ بنا۔ کشمیر کے حکمران للتادتیہ نے سنٹرل ایشیا میں اپنا اثر ورسوخ قائم کیا۔ پھر عرب اِس خطّے میں داخل ہوئے۔ چینی حکمران اور للتادتیہ نے تبت کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا اور تبتیوں کو ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ ۷۵۱ء میں عربوں نے وادیٔ تلاس میں چین کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس کشمکش میں عربوں کا پلّہ بھاری رہا اور سنٹرل ایشیا پر عربوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس طرح آٹھویں صدی میں سنٹرل ایشیا میں اسلام نے جڑ پکڑ لی اور اگلی دو یا ڈھائی صدیوں میں سنٹرل ایشیا کے لوگ اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

عربی کے دو کتبوں کے مطابق خلیفہ المامون (۸۳۳ء۔ ۸۱۳ء) کے دورِ حکومت میں بلتستان اور تبت تک اِسلام کی اشاعت ہوئی۔ تاہم تاریخی طور اس کی توثیق نہیں ہوتی ہے۔ بلتستان اور لداخ میں اسلام کا ورود اس کے کئی صدیوں بعد ہوا۔

سنٹرل ایشیا کے انمول ورثہ سے متعلق دُنیا کو جانکاری بیسویں صدی کے آغاز میں آثارِ قدیمہ کی کھدائی اور کھوج کے دوران ہوئی۔ کئی ملکوں کے ماہرین نے اس سلسلے میں کام کیا۔ اِس میں اہم نام جرمن کے سرارل سٹین (SIRARALSTEIN)، البرٹ وون لے کوگ (ALBERT VON LE COG)، فرانس کے رانل پیلیوٹ

(RANAL PELLIOT)، سویڈن کے سون ہیڈین (SVEN HEDIN)، امریکہ کے لنگ ڈون ورنر (LANGDON WARNER)، جاپان کے کاؤنٹ اوٹانی (COUNT OTANI) اور روس کے اولڈن برگ (OLDEN BURG) اور کوزلوف (KOZLOV) شامل ہیں۔

سِلک رُوٹ پر متعدد مقامات پر ایک ہزار غار دریافت ہوئے۔ ان میں چند مقامات مے جی شان، ینگ لینگسی، موگاؤ، بے زیک لیگ اور قیذیل ہیں جن میں بدھ کی خوبصورت تصویریں بنائی گئی ہیں اور جن کے حسن، نفاست اور نزاکت کی بڑی تعریف کی جاتی ہے۔ ان تصویروں کی وجہ سے اِن غاروں کو ریگستان میں "آرٹ کے شاہپاروں کی گیلری" کہا گیا ہے۔ بودھ آرٹ سنٹرل ایشیا میں لگ بھگ دُوسری صدی میں آیا۔

کئی غاروں میں سنسکرت، چینی، برہمی، کھروشتی، شاردا، سریانی اور دُوسری زبانوں کے متعدد مخطوطات ملے۔ ایک خود ساختہ نگران راہب نے بہت سارے مخطوطات غیر ملکی ماہرین کو فروخت کیے۔

ماہرین کے مطابق غاروں کی دیواری تصاویر اور مورتیاں گندھارا آرٹ کے نمونے ہیں جن پر یونانی، ایرانی، چینی اور ہندوستانی آرٹ کے مختلف اسکولوں کے اثرات نظر آتے ہیں۔

دسویں صدی کے لداخ کے الچی وہار اور ہماچل پردیش میں سپیتی کے تابو گنپہ پر بھی اِس مخلوط آرٹ کی نمایاں چھاپ ہے۔

دُون ہانگ کے موگاؤ غاروں کی تصاویر پر گندھارا آرٹ کا نمایاں اثر بتایا گیا ہے۔ ان کی فنی غنائیت اور پختگی کے لئے مطالعاتِ دُون ہانگ DUNHAUNGOLOGY کے شعبے کے قیام کی بین الاقوامی سطح پر تحریک چلی ہے تا کہ اِس کی تصاویر، مخطوطات اور سنگ تراشی کے کام کی تحقیق ہو اور اُنہیں منظرِ عام

پر لایا جائے۔

اِن دیواری تصاویر کی وجہ سے آج دون ہانگ سیاحت کا ایک اہم مرکز بنا ہے۔ چین کی حکومت نے تمام غاروں کو سیاحوں کے لئے نہیں کھولا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق تین سو غار بند رکھے گئے ہیں۔

دُون ہانگ میں ایک خوبصورت جھیل ہے جو ہلالی جھیل کے نام سے مشہور ہے۔ اس سے متعلق ایک مقولہ ہے کہ "اِنسان کی صلاحیت نے ہزار بدھ والا غار بنایا اور قدرت نے ہلالی جھیل بنائی۔"

سفر کے دوران بحفاظت پہنچنے پر شکرانے کے طور پر ان غاروں میں تصویریں بنانے کے لئے مسافر اور تاجر چندہ دیتے تھے اور منتیں مانگتے تھے کہ صحیح وسلامت اپنے گھروں کو پہنچے۔ مقامی رُوساء اور اُمراء ان کا حسن بڑھانے اور ان کے تحفظّ کے لئے مالی امداد فراہم کرتے تھے۔

سِلک رُوٹ پر تجارت کی سرگرمیوں کے زمانے میں دون ہانگ میں تاجر اونٹوں سے گھوڑوں کا تبادلہ کرتے تھے کیونکہ یہاں سے آگے تکلا مکان کا ریگستان آتا تھا۔ ریگستانی سفر میں "ریگستان کا جہاز" اونٹ کار آمد رہتا تھا۔

غیر ملکی ماہرین، جن کا ذِکر اُوپر ہو چکا ہے، بہت سارے مخطوطات اور آرٹ کے نمونے اپنے ممالک لے گئے اور وہاں انہیں عجائب گھروں کی زینت بنایا۔ ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ تکلا مکان سے لائے گئے آرٹ کے نمونے اور نوادرات لیہہ کے راستے برٹش میوزیم لے جائے گئے۔

لندن، پیرس، ماسکو، ٹوکیو، لینن گراڈ، برلن اور دُنیا کے کئی شہروں کے عجائب گھروں میں سنٹرل ایشیا کے نوادرات رکھے گئے ہیں۔ دہلی کے نیشنل میوزیم میں بھی سنٹرل ایشیا کے آرٹ کے چند شاہپارے موجود ہیں۔

دُوسری جنگِ عظیم میں جرمنی کے دارالخلافہ برلن میں اتحادیوں کی بمباری

کی وجہ سے آرٹ کے اِن نمونوں کو جزوی طور نقصان پہنچا۔ یہ برلن میوزیم میں رکھے گئے تھے۔

چین کی کمیونسٹ حکومت نے ان غیر ملکی ماہرین کو ''نوادرات کے لٹیرے'' کہا ہے جنھوں نے اُن کے ملک کے گرانمایہ ثقافتی ورثے کو اپنے ملکوں میں پہنچا دیا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن دنوں اِن آثار قدیمہ کے تحفظ کا کوئی اِنتظام ہی نہیں تھا اور آرٹ کے شاہپارے اور نوادرات غلط ہاتھوں میں پہنچ رہے تھے۔ کئی تصاویر کو سنٹرل ایشیا کے کچھ مسلمانوں نے غیر اسلامی قرار دے کر نقصان پہنچایا۔ ان ماہرین نے ان کو مزید نقصان پہنچنے سے بچایا۔

سِلک رُوٹ اور اِس کی شاخوں کی گزرگاہوں، خاص کر شاہراہِ قراقرم اور لیہہ - سرینگر TREATY ROAD معاہداتی سڑک پر بہت سی چٹانوں پر تصویریں اور تحریریں کندہ کی گئی ہیں۔ یہ تحریریں سنسکرت، عربی، چینی، کھروشتی، برہمی، شاردا، تبّتی، سریانی، سوقدانی' جو سمرقند رسم الخط سے جانا جاتا تھا' وغیرہ میں ہیں۔ اور اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہیں کہ یہ خطّہ مختلف قوموں کا گہوارہ رہا ہے۔ اِن میں سے بہت سی تحریریں ضائع ہو چکی ہیں۔

کاشغر، لیہہ، مغربی تبت کے تجارتی راستے پر ٹانکچے کے مقام پر ایک سریانی تحریر چٹان پر تراشی گئی ہے جو نسطوری عیسائیوں کا کام بتایا جاتا ہے۔

حال میں ٹانکچے اور اس کے آس پاس عربی تحریریں اور نام ملے ہیں۔ ایک محقق روہیت دوہرا نے اِنھیں اُن عرب کمانڈروں سے منسوب کیا ہے جنھوں نے چین کے خلاف ایک جنگ میں حصہ لیا تھا۔ یہ جنگ آٹھویں صدی میں لڑی گئی تھی۔ ایک مرحلے پر عربوں اور تبتیوں میں ایک معاہدہ ہوا تھا، جس کے تحت دونوں چین سے نبرد آزما ہوئے تھے۔

غالباً یہ عرب کمانڈر اِسی راستے سے تبت گئے تھے۔ اُن دِنوں لداخ کے اس

خطّے میں فوجوں کی نقل و حرکت رہتی تھی۔

کئی چینی عالم اور سیاح سِلک رُوٹ سے شمالی علاقے میں گزرنے والے راستے سے ہندوستان آئے۔ ان میں شروع میں آنے والا ایک اہم سیاح فاہیان تھا۔ وہ ۳۹۹ء میں چین سے سفر پر نکلا اور پندرہ سال بعد وطن واپس لوٹا۔ سون یونگ ۵۱۸ء میں چین سے سوات اور گندھار آیا اور ۵۲۲ء میں واپس چین پہنچا۔ ہیون سانگ نے ۶۲۹ء میں اپنا سفر شروع کیا اور ایک لمبی مدّت ہندوستان میں رہنے کے بعد ۶۴۵ء میں واپس چین گیا۔ وہ کشمیر میں بھی رہا۔

ایک کوریائی ہوئی چاؤ ۷۲۳ء میں چین کے راستے سفرِ ہندوستان پر نکلا اور ہندوستان میں تین سال سے زیادہ مدّت گزار کر واپس لوٹا۔ کئیوں نے ہوئی چاؤ کو چینی بتایا ہے۔

ایک اور چینی اوکونگ ۷۵۹ء میں سلک رُوٹ کے اِس ذیلی راستے سے سفر کر کے ہندوستان آیا۔ وہ تقریباً چار سال گزار کر واپس وطن لوٹا۔

ان کے سفرناموں خاص کر فاہیان، ہیون سانگ اور اوکونگ کی تحریروں سے اُس دور کے ہندوستان کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے گمنام مسافر ہوں گے جو ان راستوں سے گزرے ہوں گے۔

لق و دق ریگستان سے گزرنے والے سلک رُوٹ پر رہزنی اور ڈکیتی کی وارداتیں بھی ہوتی تھیں۔ ہیون سانگ نے بھی اِس کا ذِکر کیا ہے۔ تاہم تجارت یہاں بڑا منافع بخش کاروبار تھا۔ اِس لئے تاجر یہ خطرہ مول لیتے تھے۔

مارکوپولو لکھتا ہے کہ کئی دفعہ ریگستان میں سفر کرتے ہوئے قافلے کے افراد مختلف سمت سے آنے والے آدمیوں کے گروہ کو ڈاکو سمجھتے اور فرار ہو جاتے، پھر اصلی راستہ ملنے میں انہیں دِقت پیش آتی تھی۔

اُنیسویں اور بیسویں صدیوں میں ایک دفعہ پھر ٹرانس ہمالیائی خطّہ رُوس، برطانوی ہند، چین اور افغانستان کے درمیان سیاسی کشمکش کی آماجگاہ بنا جسے GREAT GAME کا نام دیا گیا۔ رُوس کی حکومت نے سنٹرل ایشیا کے کئی آزاد ملکوں کو اپنے قبضے میں لے لیا اور ہندوستان کی سرحد تک رُوسی فوج آ پہنچی۔ لداخ، ہُنزہ، گلگت اور چترال کی علاقائی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوا۔ رُوسی پیش قدمی کو روکنے کے لئے برطانوی ہند نے فوجی اور سیاسی سطحوں پر اقدام کیے۔ سلک رُوٹ اور اس کی ذیلی شاہراؤں پر جہاں تجارتی قافلوں اور کاروانوں کی چہل پہل اور ریل پیل رہتی تھی، جاسوسوں اور محققوں کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔

کاشغر، رُوس، برطانوی ہند اور چین کی سیاسی اور سفارتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ جہاں رُوس اور برطانوی ہند نے قونسل خانے کھولے تھے۔ دونوں طاقتوں نے پورے خطّے میں اپنی جاسوسی کا جال بچھا رکھا تھا۔ کمیونسٹ حکومت کے اِقتدار میں آنے کے بعد قونسل خانے بند ہوئے اور قونسل خانوں کی عمارتیں ہوٹلوں میں تبدیل کر دی گئیں۔

سِلک رُوٹ کے زمانے کے بہت سارے تاریخی شہر آج بھی موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شہر اب بہت بدلے ہیں۔ ماضی میں XIAN زِیان سلک رُوٹ پر ایک اہم شہر تھا اور قدیم سلطنت کا دارالخلافہ بھی رہا۔ تب یہ ''چانگن'' کہلاتا تھا۔ آج یہ شانکسی صوبے کی راجدھانی ہے۔

مغرب کے ایک مشاہد نے اِس شہر سے متعلق لکھا ہے:

''آج زیان ایک جدید شہر ہے۔ اِس کی شہرت اس کے ماضی سے ہے جس کے شاندار آثار فصیلوں، مندروں اور پگوڈوں کی صورت میں موجود ہیں۔ تانگ خاندان کے دورِ حکومت (۶۱۸-۹۰۷ء) میں یہ شہر ترقی کی معراج پر تھا۔ اُس دور میں اِس کے محلات سنٹرل ایشیا کے کوچا شہر کی موسیقی اور سمرقند اور تاشقند کے رقاصوں

کے رقص کی تھرک سے گونجتے تھے۔ اِس کے بازار غیر ملکی تاجروں سے بھرے رہتے تھے اور درآمدی تعیش اور آرائشی اشیاء سے اس کی منڈیاں بھری رہتی تھیں۔ اس کی خانقاہوں میں عالم بھکشو سنسکرت میں لکھے بودھوں کے صحیفوں کا ترجمہ کرنے میں منہمک رہتے تھے۔ اس شہر میں تیسری صدی قبل مسیح کے قدیم شہنشاہ قینشی ونگدی کے دور کے زیرِ زمین قبرستان سے نکلے ہوئے ٹیری کوٹا کے بنے جنگجو آج کی مہذب دُنیا کے لئے ایک عجوبہ ہیں۔ شہنشاہ نے چین کو متحد کیا تھا۔"

گانسو صوبے میں لن زہو سے متعلق لکھا گیا ہے کہ یہ سرحدی قصبہ جیسا لگتا ہے۔ اگرچہ چینیوں کی آبادی ۹۷ فیصد ہے تاہم یہاں بہت سے ہوئی نسل کے مسلمان بھی آباد ہیں۔ ان کے ناک نقشے عربی ہیں جو ان کے اصلی وطن اور تاریخ کی نشان دہی کرتے ہیں.......... اِس شہر کی بھیڑ بھاڑ میں ترک، تبّتی اور منگول چہرے پہچانے جاسکتے ہیں..........

..........شہر کے اُوپر تلے پن بجلی کے بندھ دریا میں پانی کے بہاؤ روکتے ہیں.......... یہاں کبھی پانی سے سفر کرنے کے لئے ہوا بھری جانوروں کی کھال کی کشتی استعمال ہوتی تھی۔

لنز وھو کے شمال مغرب میں چھوٹا سا قصبہ آنکسی ہے۔ چند جغرافیہ دانوں کا خیال ہے کہ سلک رُوٹ کی تجارت کے عروج کے دور میں یہ ایشیا کے مرکز میں واقع تھا۔ آج بھی آنکسی وسط ایشیا کی اہم تجارتی شاہراہ کے سنگم پر واقع ہے۔ آج بس میں سفر کرنے والے مسافر یہاں پہنچ کر کھانے کے لئے رُکتے ہیں۔

سِلک رُوٹ کے تجارتی دور میں گانسو کی گزرگاہ Corridor کے کنارے پر واقع قصبے بڑے خوشحال تھے۔ یہاں بہت ساری کارواں سرائیں تھیں۔ جہاں مشرق اور مغرب تجارت پر جانے والے تجار قیام پذیر ہوتے تھے۔ گانسو کی گزرگاہ میں چین کی سرکاری چراگاہیں تھیں جہاں ریشم اور چائے کے عوض گھوڑوں کا تبادلہ کیا جاتا تھا۔

سِلک رُوٹ پر جب کارواں رواں دواں تھے تو شِن جیانگ (چینی ترکستان) کی بڑی اہمیت تھی۔ اِس کے شہر اُرُومچی کی خاص حیثیت نہیں تھی۔ یہاں چینی فوج کی چھاؤنی تھی۔ اُرُومچی آج شِن جیانگ کا دارالخلافہ ہے اور ایک جدید شہر ہے۔

سِلک رُوٹ سے متعلق حال میں چھپی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ اُرُومچی اور کاشغر کے درمیان شاہراہ پر واقع خوابیدہ قصبے آج بھی زمانۂ وسطیٰ کی یاد دِلاتے ہیں۔ ہفتے میں ایک روز یہاں بازار لگتے ہیں۔ اوگیور تر کی گدھے گاڑیوں پر چیزیں بیچنے کے لئے لاتے ہیں۔ ان اشیاء میں خوبانی، انجیر، انگور، ٹوپیاں، جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ دوائیاں، بھیڑ کی کھالیں، جوتے، خورجین، نمدے، اُون، کھیتی باڑی کے سامان، پنگوڑے وغیرہ شامل ہیں۔ یہ گلیوں اور کوچوں میں اپنے سامان لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور پکار پکار کر گاہکوں کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں .... چیزیں بیچنے والوں میں بہت سی عورتیں ہوتی ہیں، جن میں کئی برقعہ پوش ہیں۔

کھانے میں یہاں بھیڑ کی اُبلی ہوئی سری، پلاؤ، دہی اور مختلف قسموں کی روٹیاں اور کئی پکوان ملتے ہیں۔

مشروبات میں چائے، انار اور شہتوت کے رس بکتے ہیں۔

جمعہ کے روز کاشغر میں بازار لگتا ہے۔ شہر کے گرد و نواح سے ہزاروں لوگ یہاں جمعہ کی نماز پڑھنے آتے ہیں۔ اُس روز مال مویشیوں کی منڈی میں اُونٹ، گدھے اور بھیڑ بکریاں فروخت کی جاتی ہیں۔ کرغیز شاہسوار گھوڑوں پر حیرت انگیز کرتب دِکھاتے ہیں۔

شین جیانگ کا رقبہ ساڑھے سولہ لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ اِس خطّے میں تیرہ قومیتوں کے لوگ آباد ہیں جن میں اُوگیور ترکوں کی آبادی سب سے زیادہ ہے۔ تاہم ۱۹۴۹ء کے بعد یہاں لاکھوں چینی آباد کئے گئے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اِس لئے

کئی علاقوں میں اُویگور اقلیت میں بدل گئے ہیں۔ اُویگور رُوس کی جھیل بیکال کے جنوب میں رہنے والے ترکی قبیلوں کی اولاد ہیں اور نویں صدی میں شین جیانگ کے آس پاس آباد ہوئے تھے۔ پہلے پہل اُنہوں نے بدھ مت اور مانی کے اِزم اختیار کیئے۔ سنٹرل ایشیا میں جب عربوں کا پرچم بلند ہوا تو اُنہوں نے عرب مبلغوں کے ہاتھوں اِسلام قبول کیا۔

آج بھی یہ لوگ ریشم سازی اور قالین بافی میں پیش پیش ہیں۔ یہ ریشم کی غیر معمولی مقبولیت کا کرشمہ ہے کہ قدیم دُنیا کی سب سے مشہور اور الف لیلوی داستان جیسی جادوئی اور دلچسپ شاہراہ کا نام ریشم پر رکھا گیا ہے۔
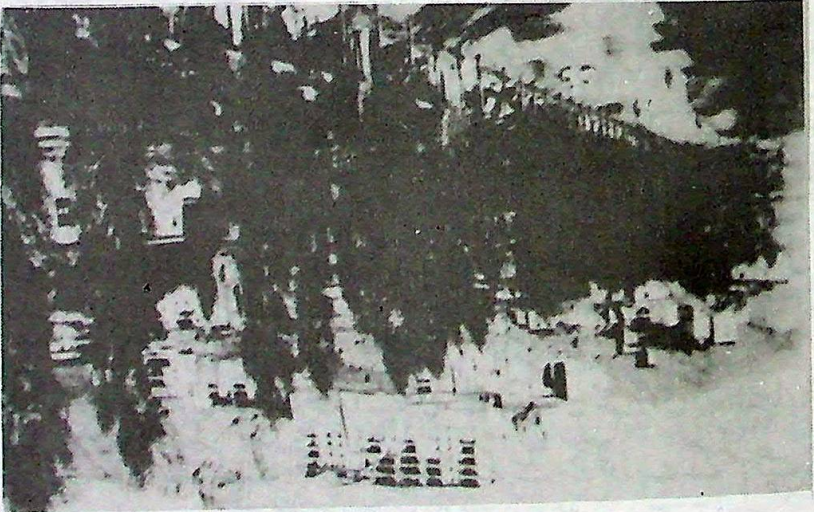
۱۹۱۷ء میں لی گئی لیہہ بازار اور محل کی تصویر

(مضمون ''لیہہ'' دیکھیے)

لداخ کی تجارتی افادیت

(ماضی کے جھروکے سے)

زمانۂ قدیم سے لداخ اور اس کے ہمسایہ مُلکوں میں دُوررس تجارتی تعلقات تھے اور لیہہ وسط ایشیا کا ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ لداخ کے ہمسایہ ملکوں اور خطّوں میں، جن کے ساتھ لداخ کے تجارتی تعلقات تھے، تبت، سنٹرل ایشیا، چین، افغانستان، رُوس، بلتستان، کشمیر، پنجاب، کشتواڑ اور ہماچل پردیش شامل ہیں۔ موسمِ گرما کے آغاز میں جب برگ پگھلتی اور لداخ میں داخل ہونے کے قدرتی دروازے کھل جاتے تو لداخ کے مختلف علاقوں میں، خاص طور پر لیہہ میں خوب چہل پہل اور روپے پیسے کی ریل پیل رہتی تھی۔ ترکی تاجر اگست کے بعد لیہہ پہنچتے تھے۔ لیہہ مختلف قوموں اور نسلوں کے تاجروں کا سنگم تھا۔ یہاں ترک، تبّتی، پنجابی، کشمیری، ہماچلی، بلتی، افغان حتیٰ کہ سائبیریا اور وسط ایشیا کے دُور دراز خطّوں کے لوگ بازار میں نظر آتے اور اشیاء کا تبادلہ کرتے تھے۔ یہاں بھانت بھانت کے لوگوں کے ساتھ ساتھ ہمسایہ ملکوں اور خطّوں کے سکّے اور روپے بھی ملتے تھے۔ ان میں رُوسی وسط ایشیا، بخارا اور کوکنڈ کے سونے کے سکّے، چین کے چاندی کے سکّے، جو گھوڑے کے سُم جیسے لگتے تھے، نیپال کے چاندی کے سکّے، رام پور کے تانبے کے سکّے، مغلیہ حکومت کے روپے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نانک شاہی اور گووند شاہی روپے شامل تھے۔ لداخ کا اپنا سکّہ تھا جو جئو کہلاتا تھا۔ اور جس کی قیمت ۴/ ا روپیہ تھی۔ جئو پر ایک طرف محمود شاہ اور دُوسری طرف بھوٹان لکھا ہوتا تھا۔ محمود شاہ لداخی راجہ دے لیکس نمگیل کا مغلوں کا رکھا

ہوا نام تھا اور بھوٹان سے مراد لداخ تھا۔

چین کا اینٹ نما ڈلا عام مستعمل تھا۔ لداخی اِسے دوژت کہتے تھے۔ بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا روپیہ بھی لداخ پہنچا۔ مغلیہ حکومت کے زوال کی وجہ سے اس کے روپیہ کی قیمت ختم ہوگئی تھی۔ چینی یاتر کی چاندی کا سکّہ آخ تنگا لداخ میں مقبول تھا۔

لداخ میں سکّے کو ڈونگ کہا جاتا تھا۔ اور سیر کارڈ ونگ (سونے کا سکّہ)، مُلکی ڈونگ (چاندی کا سکّہ) اور زنکسی ڈونگ (تانبے کا سکّہ) جیسی اِصطلاحات عام مستعمل تھیں۔

دُنیا کی قدیم ترین تجارتی شاہراہ سلک رُوٹ SILK ROUTE کی ایک شاخ قراقرم کے راستے لداخ تک آتی ہے، جس پر صدیوں سے تجارتی قافلے گزرے ہیں۔ اِس شاہراہ پر سے ہو کے کئی مرتبہ سنٹرل ایشیا سے حملہ آور لداخ پہنچے۔ ۱۹۴۹ء میں یہ شاہراہ تجارتی کاروانوں کے لئے بند ہوگئی۔ اِس کے تیرہ سال بعد لیہہ اور تبت کا تجارتی راستہ بھی بند ہوگیا۔ صدیوں تک ان راستوں پر قافلے گزرے تھے۔ گھوڑوں، اونٹوں اور دُوسرے باربردار جانوروں کے گلے میں بندھی ہوئیں گھنٹیاں صدیوں تک ٹنٹنائی تھیں۔ ۱۹۶۲ء کے ہند۔ چین تصادم کے بعد اِس خطّے میں تناؤ سا بنا رہا اور یہ شاہرائیں تب سے سُونی پڑی ہیں۔

شروع میں وسطِ ایشیا اور ہندوستان کے درمیان تجارت عموماً پامیر کے راستے ہوتی تھی۔ بقولِ یِی لیانگ Ye Liang آٹھویں یا نویں صدی میں سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے قراقرم کے درّے تجارتی شہہ رگ بن گئے۔

نویں صدی کی ایک تاریخی دستاویز ''حدودِ عالم'' میں لکھا ہے کہ تجارت نے لداخ کی مالیات میں اچھا کردار ادا کیا ہے۔

تمام اطراف سے تجارتی مال لیہہ پہنچتا تھا اور یہاں مختلف قومیتوں کے تاجر اِس کا تبادلہ اور خرید و فروخت کرتے تھے اور لداخیوں کی ضروریات گھر بیٹھے پوری ہو

جاتی تھیں۔ لداخیوں کا اِس تجارت میں بہت کم دخل تھا۔

چین اور چینی ترکستان سے ریشم، قالین، کپڑے، چاندی، کھانڈ، سونا، چائے، فیروزے، مونگا، مشک، تمباکو، کشمش، صابن، بادیان، بھیڑیں، کھالیں، میوے، دوائیاں، کمخواب، مخمل، چرس اور گھوڑے آتے تھے۔ جو زیادہ تر پنجاب برآمد کیے جاتے تھے۔ کچھ چائے اور اُون بھی درآمد ہوتی تھی۔

کشمیر، پنجاب اور میدانی علاقوں سے برتن، گھی، مکھن، شہد، اناج، رنگ، روئی، جوتے، موتی، مصالحے، شال، پگڑی، گُڑ، شربت، کھجور، چاول، زعفران، شکر، افیون، کلچہ، تمباکو، بادام، تیل، جڑی بوٹیاں، سوتی کپڑا، لنگی، گبّا، پٹو، موٹی چھینٹ، صابون، کاغذ، قلم، قلمدان، نعل، سوئیاں، انگوٹھی، کنگھا وغیرہ آتے تھے' جو زیادہ تر چینی ترکستان اور تبت برآمد ہوتے تھے۔ چینی ترکستان میں ہندوستانی گھڑیوں اور دِینی کتابوں کی بھی مانگ تھی۔

لداخ کے راستے کشمیر سب سے زیادہ پشمینہ برآمد ہوتا تھا۔ اِس کے بعد چینی چائے جاتی تھی۔ اِن کے علاوہ سونا، چاندی، ریشم، چین میں بنا شال، ترکی ٹوپی، نوبرا کا سوڈا اور سہاگہ برآمد کیے جاتے تھے۔

تبت سے پشمینہ، اُون، سونا، گندھک، بھیڑیں، نمک وغیرہ درآمد ہوتے تھے۔ چینی ترکستان سے درآمد شدہ چینی پیالیاں اور ترکی ٹوپیاں بھی تبت جاتی تھیں۔

چنگپا تاجر گروپوں میں لداخ کے دیہات چیمرے اور ساکٹی آتے تھے۔ ہر گروپ میں نمک لدی ۷۰۰ سے ۱۰۰۰ بھیڑیں ہوتی۔ ایک بھیڑ ۱۴ کلو وزن کا نمک یا اناج اُٹھاتی تھی۔ نمک کا تبادلہ اناج سے ہوتا تھا۔ اناج کی چار تھیلیوں کے عوض نمک کی پانچ تھیلیاں دی جاتی تھیں۔ اناج میں زیادہ تر گرم ہوتا تھا۔

تبت کے ساتھ لداخ کی تجارت تبت کے ایک مقام غارتک ہوتی تھی جو لیہہ سے تقریباً ایک ماہ کا راستہ ہے۔

چنگپاؤں کے ساتھ تجارت کو فروغ دینے کے لئے میلہ لگتا تھا۔ یہ میلہ چنگ دُوس کے نام سے مشہور تھا۔ جس کا مطلب چنگپاؤں کا اجتماع ہے۔ چنگپا تبت کے علاوہ لداخ کے علاقہ چنگ تھنگ میں بھی بستے ہیں۔ یہ میلہ لداخ کے علاوہ مغربی تبت میں رُودوق اور گرتوق میں بھی منایا جاتا تھا۔ اس موقعے پر خرید وفروخت ہوتی تھی۔

کشتواڑ اور جموں سے افیون، کھانڈ، مصالحے، نیل، گھی، شہد، کھال، جوتے، چھینٹ، ململ، لُنگی، پگڑی اور سوتی کپڑے درآمد کئے جاتے تھے۔

لداخ سے کشتواڑ اور جموں چاندی، ترکی ادویات، سونا، چائے، پشمینہ، ریشم، شال اور ترکی ٹوپیاں برآمد کی جاتی تھیں۔

لاہول اور زنسکار کے درمیان تجارتی تعلقات تھے۔ لاہول سے تانبے کے برتن اور لوہے کے سامان آتے تھے۔ جن کا تبادلہ زنسکاری گھوڑوں، گدھوں اور بھیڑ بکریوں سے ہوتا تھا۔

ایک ریکارڈ کے مطابق بیسویں صدی کے شروع میں چند لداخی تاجر بڑھیا (elite) چیزیں منگاتے تھے، جن میں آلو کچلنے کی مشین (Potato Masher) گلٹ برانڈ ریزر، کیوی برانڈ بوٹ پالش، اتجکس ہاٹ واٹر بوتل، یورپی سیفٹی جڑاؤ پن اور لندن میں بنائے برٹش امریکن ٹوبیکو سگریٹ شامل تھے۔

لداخ میں سامانِ تجارت پر محصولات نقد اور جنس دونوں صورتوں میں لئے جاتے تھے۔ ترکستان اور تبت سے آئے مال پر گھوڑے کے اُٹھائے سامان کے وزن کے حساب سے محصول لیا جاتا تھا۔ ایک گھوڑا ساٹھ سے ستر سیر کا وزن اُٹھاتا تھا۔ البتہ مختلف اشیاء کے محصولات کی شرح الگ الگ تھی۔ پشمینہ اور اُون پر شرح ٹیکس فی من آٹھ آنے، چائے پر دو آنے اور چرس پر سوا دو روپے تھے۔ محصولات سے متعلق یہ اعداد وشمار اُنیسویں صدی کے دُوسرے نصف میں مرتب ہوئے۔

ہندوستان سے درآمد ہونے والی فی من افیون پر ڈھائی روپے، مصالحوں پر

پندرہ آنے اور زعفران پر تین روپے محصول تھا۔

بیرونِ لداخ سے کشمیر فی من پشمینہ اور اُون کی برآمدات پر آٹھ آنے اور دُوسرے مقامات کے لئے بارہ آنے تھے۔ جبکہ چائے پر چار آنے، چرس پر دس آنے، سہاگہ پر چار آنے اور گندھک پر چار آنے تھے۔

کشمیر سے درآمد گھوڑے پر لدے ۱۲۰ سیر چاول پر ۴ سیر چاول بطورِ ٹیکس لئے جاتے تھے جبکہ ایک بار بردار قلی سے ۶۰ سیر چاول پر ایک سیر چاول لیا جاتا تھا۔ ۴ سیر چاول کا دام تین آنے تھے۔ قرائن سے لگتا ہے کہ گیالپو کے دورِ حکومت میں لداخ میں ٹیکس کی یہی شرح مقرر تھی۔ مختلف مقامات پر ٹیکس کی شرح جداگانہ تھی۔ گیالپو کو لداخ میں محصولات سے اٹھارہ ہزار روپے کی آمدن تھی۔

کشمیر اور کلو سے آنے والے تجارتی مال پر نانک شاہی روپیہ بطور محصول لیا جاتا تھا جبکہ لداخ۔ کشتواڑ تجارت پر جنؤ مروّج تھا۔

۱۸۶۸ء میں تجارتی محصولات سے ڈوگرہ سرکار کو ۱۶۰۰۰ روپے کی آمدن رہی۔

بلتستان سے لیہہ سوکھی خوبانیاں، مٹی کے برتن اور مکھن درآمد کئے جاتے تھے۔ جو لگ بھگ لداخیوں کے استعمال میں آتے تھے۔ لداخ کے آخری خودمختار راجہ تنڈوپ نمگیل کے زمانے میں تین سو من خوبانیاں آتی تھیں جن میں سے نصف لداخ میں استعمال ہوتی تھیں۔ بلتی عموماً اُون اور نمک سے خوبانیوں اور برتنوں کا تبادلہ کرتے تھے۔

الیگزنڈر کننگھم کی "لداخ" میں ۱۸۴۶ - ۱۸۴۷ء کی تحقیق کے دوران تبت اور چین سے ایک ہزار من چائے لداخ درآمد کی جاتی تھی۔ اِس میں سے آٹھ سو من چائے مقامی طور خطّے میں اِستعمال ہوتی تھی اور باقی باہر جاتی تھی۔ اُن دنوں ایک سیر چائے کی قیمت تین روپے تھی۔

راجہ سینگے نمگیل کے زمانے میں جب مغربی تبت کا بڑا علاقہ لداخ کا حصہ تھا، گُوگے سے سالانہ اوسطاً تین سو بیس کلو سونا لداخ درآمد کیا جاتا تھا۔

لداخ کی اپنی پیداوار میں سہاگہ، گندھک، پشمینہ اور اُون بڑی مقدار میں ہر سال برآمد ہوتی تھی۔

سابق راجوں کے زمانے کی برآمدات کے اعداد و شمار تو دستیاب نہیں ہیں تاہم مشہور ہے کہ آخری راجہ کے عہد میں سالانہ پانچ سو من تک گندھک نکالا جاتا تھا۔ جو برآمد ہوتا تھا۔ ڈھائی ہزار من سہاگہ برآمد کیا جاتا تھا۔ خطّے میں اُون کی پیداوار سالانہ چار لاکھ سیر تھی۔ اس مقدار میں سے صرف پانچ ہزار من اُون برآمد ہوتی تھی۔ من کے دو اقسام تھے۔ ایک من میں ۱۶ سیر ہوتا جو ''لُوک خل'' کہلاتا تھا جبکہ ۶۴ سیر کے من کو ''ستا خل'' یا ''یاک خل'' کہا جاتا تھا۔

لداخ کی تجارت میں پشمینہ کو بڑا دخل رہا ہے۔ مغربی تبت کا پشمینہ بھی یہاں سے کشمیر جاتا تھا۔ صوفی غلام محی الدّین نے اپنی کتاب ''کشمیر'' میں لکھا ہے کہ کشمیر میں پشمینہ شال کی صنعت نے کوروں اور پانڈوؤں کے زمانے میں اچھی خاصی ترقی کی تھی۔ تاریخ ابھی تک اس دور کا تعین نہیں کر سکی ہے۔ مہاراجہ اشوک کے زمانے میں بھی لداخ اور تبت سے کشمیر پشمینہ برآمد ہوتا تھا جہاں اس سے شال بُنے جاتے تھے جو یورپ تک جاتے تھے۔ یہ شال ساری دُنیا میں مشہور تھے۔ رومن دورِ حکومت میں قیصر کے دربار کی مقتدر حسین خواتین یہ شال زیب تن کرتی تھیں۔ مغل حکومتوں کی نظر بھی پشمینہ پر رہی ہے۔

پُرتگال کے دو پادری فادر ڈیزی ڈیری اور فادر فریرے ۱۷۱۵ء میں جب لداخ آئے تو اُنہوں نے لداخ میں بہت سارے کشمیری تاجروں کو دیکھا۔ ڈیزی ڈیری اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے: ''بہت سارے کشمیری سوداگر لداخ میں ہیں اور یہ پشمینہ کی تجارت کرتے ہیں۔ اِن سوداگروں نے بہت سارے ایجنٹ بھی اُون جمع کرنے کے لئے رکھے ہیں۔ گرمیوں میں ہزاروں لوگ لیہہ آتے اور اُون (پشمینہ) لے جاتے۔''

پشمینہ اور اُون کی تجارت کو خاص طور پر فروغ دینے کے لئے لداخی راجا جمیانگ نمگیل نے سولھویں صدی میں کشمیر سے چھ مسلمان تاجروں کو لیہہ میں مستقل طور پر آباد ہونے کے لئے دعوت دی۔ اُنہیں لیہہ میں مکانات بنانے کے لئے زمین دی اور دُوسری مراعات اور سہولیات فراہم کیں۔ ان مسلمانوں نے تبت میں تجارتی قصبہ رُودوق میں بھی مکانات بنائے۔ یہ خاندان شنکو، ریلی، بنارس، سوتے، ہنگول اور خل سوار کہلاتے ہیں۔ اُن کی اولاد اب متعدد خاندان میں بٹی ہوئی ہے۔ راجا نے اس تجارتی برادری میں ایک بودھ خاندان کو بھی شامل کیا۔ ڈوگرہ حکمران مہاراجہ گلاب سنگھ نے بھی کشتواڑ کے راستے لداخ سے جموں پشمینہ درآمد کرنے کی کوشش کی۔

۱۶۸۳ء کے تنگ موگنگ معاہدہ کے تحت یہ طے پایا کہ تبت کی اُون اور پشمینہ صرف لداخ کو فروخت کیا جائے۔ اور ایک تجارتی اور سیاسی مشن ''لوپچق'' کا قیام عمل میں آیا جو ہر تیسرے سال لیہہ سے تبت کی راجدھانی لہاسہ جاتا اور دلائی لامہ کو نذرانے پیش کرتا تھا۔ جس میں سوا تین تولہ سونا، ۳۵ تولہ کشمیری زعفران، ۴ تھان یارقندی کپڑے اور ایک تھان سوتی کپڑا ہوتا تھا۔ اِسی طرح تبت سے بھی ہر سال ایک خیر سگالی مشن آتا تھا اور چائے لاتا تھا۔ چائے کی نسبت سے یہ مشن، چابا، یا چائے والی مشن، کے نام سے مشہور تھا۔ اِس کا سربراہ دلائی لاما کا نمائندہ ہوتا تھا۔ یہ وفد جون کے مہینے میں لہاسہ سے نکلتا تھا اور دسمبر میں لیہہ پہنچتا اور اپریل تک لیہہ میں رہتا تھا۔

ستوق اور ماٹھو کے راجے بھی گرتوق، تبت میں ہر سال اپنے تجارتی مشن بھیجتے تھے۔ لداخ کے کئی بڑے گنپے بھی ہر سال مذہبی اور تجارتی مشن لہاسہ بھیجتے تھے۔ ہر دس سال بعد تبت کے ٹشی لُومبو گنپہ سے ایسا ہی ایک مشن لداخ آتا تھا۔

۱۸۴۲ء میں تبّتی سرکار اور ڈوگرہ حکومت نے دیجوق میں معاہدہ تنگ موگنگ اور لوپچق مشن کی تجدید کی۔ اِس پر ۱۹۶۲ء تک عمل ہوتا رہا۔

کننگھم نے تجارتی مالیت سے متعلق جو اعداد و شمار جمع کئے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ ہمسایہ ملکوں سے بڑے پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ الگزنڈر کننگھم نے یہ اعداد و شمار ۱۸۴۵-۱۸۴۶ء کے دوران جمع کئے اور یہ لداخ کے آخری راجہ سے متعلق ہیں۔ اس سے پہلے کا ریکارڈ نہیں ملتا۔ اُن دنوں چین ۲۶۷۶۵۰ روپے کی مالیت کا مال درآمد کرتا تھا۔ جبکہ ۲۱۶۰۰۰ روپے کی اشیاء برآمد کرتا تھا۔ ہند ۲۲۰۲۰۰ روپے کی چیزیں درآمد کرتا تھا اور ۲۳۸۰۰۰ روپے کا مال برآمد کرتا تھا۔ ان کی مجموعی مالیت ۹۴۱۸۵۰ روپے بنتی ہے۔ ان پر ۱۶۴۴۱ روپے کے محصولات لگتے تھے۔ چین ترکستان سے سالانہ ایک لاکھ اسی ہزار روپے کی مالیت کا مال درآمد ہوتا تھا جبکہ وہاں دو لاکھ سولہ ہزار روپے کا مال برآمد کیا جاتا تھا۔

اُن دنوں روپے کی بڑی قیمت تھی۔ پشمینہ ایک سیر دو روپے میں ملتا تھا۔ حالیہ سالوں میں ایک کلو گرام پشمینے کا دام ڈیڑھ ہزار روپے تک بڑھا ہے۔ اس حساب سے اُس زمانے کا روپیہ آج سے سات سو سے زیادہ گنا زیادہ قیمت Value رکھتا تھا۔ اس تناسب سے آج کے روپے کی قیمت میں لگ بھگ چھ کروڑ روپے کا صرف پشمینہ برآمد ہوتا تھا اور ایک ارب روپے سے زیادہ مالیت کی تجارت ہوتی تھی۔ اُن دنوں ایک بھیڑ دو ڈھائی روپے میں ملتی تھی اور ایک یاک کی قیمت سولہ روپے تھی۔ آج ان مویشیوں کی قیمتوں میں سینکڑوں گنا اضافہ ہوا ہے۔

کشمیر سے لائی گئی زعفران فی سیر چالیس روپے اور ترکستان سے درآمد کی گئی چرس فی سیر تین روپے بکتی تھی۔ یہ چیزیں آج تولہ ماشہ کے حساب سے بکتی ہیں۔ بعد میں تجارت کی مالیت کی رقم میں اضافہ ہوتا گیا تاہم روپیہ کی قیمت گھٹتی گئی۔

۱۸۴۸ء میں لداخ میں ۱۵۰ تاجر تھے۔ اُن میں ۳۰ مقامی پرچون فروش تھے۔ ۲۵ لداخیوں کو تجارتی لائسنس تھے۔ ۶ تبتی اور باقی کشمیری یا آرغون تھے۔ نور پور کے ۲۰ سوداگر اور کلو کے ۱۳ تھے۔ کلو کے زیادہ تر سوداگر کرجا سے تعلق رکھتے تھے۔

کشتواڑ کے ۱۶ اور بشاہیر کینور کے ۱۰ سوداگر تھے۔

جولائی ۱۸۴۸ء میں لیہہ میں ۳۷ کشمیری تاجر تھے۔ بعد میں کشمیر سے مزید تاجروں کی آمد سے اُن کی تعداد ۶۰ تک پہنچی۔ نیز بساطیوں اور پھیری والوں کی تعداد ۳۰۰ تک پہنچی۔ یہ لوگ اپنا محدود تجارتی مال خود اُٹھا کر لاتے تھے۔ ان میں کچھ لوگ سال میں دو مرتبہ لداخ کا سفر کرتے تھے۔

۱۸۴۸ء میں لداخ آنے والے ۲۵ ترکی تاجروں میں کئی تاجیک تھے۔ ان میں ۸ یا ۱۰ بڑے تاجر تھے۔

۱۸۴۹ء میں لداخ میں ۱۴۹ تاجر تھے۔ ان میں ۶۳ درمیانہ درجے کے تھے۔ ۳۶ چھوٹے اور ۲ بڑے تھے۔

کئی لداخی تاجر سنٹرل ایشیا اور ہمسایہ ملکوں میں تجارت کرتے تھے۔ میں نے ایک لداخی آرغون تاجر محمد اسمیعل بٹ مرحوم کا پاسپورٹ دیکھا۔ جو انہیں کاشغر میں تعینات برٹش کونسل جنزل نے ۴ ستمبر ۱۹۳۵ء کو اجراء کیا تھا۔ پاسپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے تجارت کے سلسلے میں افغانستان، ایران، بدخشان اور چین کا سفر کیا تھا۔

اُن دنوں لیہہ سے چینی ترکستان تک کرایہ کش گرمیوں میں ایک گھوڑے کا ۴۵ سے ۶۰ روپے کرایہ لیتے تھے جبکہ آغازِ بہار میں ۶۰ سے ۷۰ روپے اور سردیوں میں ۷۰ سے ۸۳ روپے کرایہ لیتے تھے۔

راجوں کے دورِ حکومت میں کشمیری، بلتی اور دردی تاجروں کو لیہہ سے ۵ کلو میٹر دور سپتک میں رہنا پڑتا تھا۔ لیہہ آنے کے لئے انہیں اجازت لینی پڑتی تھی۔ اپنے تجارتی مال پر ۱۰ فیصد ٹیکس ادا کرنے کے بعد وہ اسے فروخت کرنے کے لئے لیہہ لاتے تھے۔

ڈوگرہ دورِ حکومت میں انتظامیہ کے ملازمین لیہہ میں تاجروں کو لوٹتے تھے

اور نت نئے ٹیکس لگا کر بڑے چٹور پن سے پیسہ بٹورتے تھے۔ کانگڑہ کے انگریز ڈپٹی کمشنر نے لداخ میں اپنے دورے کے دوران لکھا:

''سفر کے دوران میں نے لداخ میں مہاراجہ کی سرکار کے ظلم کی ایک کہانی سنی۔ خود حکمران کے لالچ اور لوٹ کھسوٹ اور اِس کے سارے اربابِ اختیار کی بدعنوانیاں!''

مہاراجہ نے تجارت پر اجارہ داری حاصل کی تھی اور ہر سال ہزاروں روپے کمانے لگا تھا۔ لیہہ کا ناظم بستی رام بھی تجارت سے سالانہ دس سے بارہ ہزار روپے کماتا تھا۔

۱۸۶۷ء میں برطانوی ہند سرکار نے سنٹرل ایشیا کے ساتھ تجارت کو فروغ دینے اور لداخ کی جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر سرحدوں پر نظر رکھنے کے لئے مہاراجہ کی مرضی کے بغیر لیہہ میں ایک انگریز افسر مقرر کیا، جو گرمیوں میں چند مہینوں کے لئے لیہہ آتا تھا۔ یہ جوائنٹ کمشنر یا اسسٹنٹ ریذیڈنٹ کہلاتا تھا۔ پہلا جوائنٹ کمشنر ڈاکٹر ہنری کیلے تھا۔ جنوری ۱۸۶۸ء میں ڈاکٹر کیلے نے پنجاب کی حکومت کو لیہہ میں تجارت کی صورت حال اور بدعنوانیوں پر ایک رپورٹ میں لکھا:

''تاجروں کو لیہہ میں تعینات سرکاری ملازمین بہت ہراساں کرتے ہیں۔ نذر، چونگی، زکواۃ وغیرہ کے نام سے محصولات لئے جاتے ہیں جو عام ٹیکس سے دس گنا تک زیادہ ہیں۔ تھانیدار کو الگ سے خوش رکھنا پڑتا ہے۔ تاجران لداخی ملازموں کے رحم و کرم پر ہیں۔ تھانیدار اور دُوسرے ملازمین اُن کے بل بوتے پر جلد سے جلد امیر بننے میں لگے ہیں۔''

۱۷۱۵ء میں فادر ڈیزی ڈیری نے بھی کسٹم افسروں کے لالچ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُنہیں خوش کرنے کے لئے ہمیشہ تمباکو دینا پڑتا تھا۔ کیلے نے تاجروں کی سہولت کے لئے چند اقدام بھی اُٹھائے۔ چنگ چھنمو اور ٹانگچے میں تاجروں اور ان

کے جانوروں کے لئے آٹا، جو اور دُوسری اشیاء رکھیں۔

۱۸۷۰ء میں برطانوی ہند حکومت اور مہاراجہ کے مابین ایک تجارتی معاہدہ ہوا۔ اِس کے تحت اوّل الذکر کو چینی ترکستان کے تجارتی امور اور معیشت پر پورے اختیارات حاصل ہوئے۔ اور ۱۸۷۱ء میں مہاراجہ نے لیہہ میں عائد کئے جانے والے تمام محصولات ختم کئے۔ ان میں لداخ میں زیرِ استعمال آنے والے چاول اور لوہا شامل تھے۔

اِن اقدام سے تجارت پر خوشگوار اثر پڑا۔ اور سال بہ سال ترکستان کے ساتھ ہونے والی تجارت کی مالیت بڑھی۔ ۱۸۶۷ء میں جہاں ۵۵۴۹۴۵ روپے کی تجارت ہوئی۔ ایک سال بعد ۱۸۶۸ء میں ۱۰۳۸۴۰۱ روپے تک بڑھی۔ ۱۸۶۹ء میں یہ رقم بارہ لاکھ روپے سے زیادہ بڑھی۔ چوتھے سال ۱۵۴۸۰۰۰ روپے کی تجارت ہوئی۔

۱۸۶۸ء میں چند پنجابی تاجروں نے اپنا کاروبار براہِ راست ترکستان تک بڑھایا۔ پہلے کشمیری اور لداخی تاجر ترکستان جاتے تھے۔ لیکن ترکستان میں ہندو تاجروں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں سے ۴ فیصد اور مسلمانوں سے ڈھائی فیصد تجارتی محصول لیا جاتا تھا۔ اُنہیں پگڑی پہننے اور شہر کے اندر گھوڑ سواری کی اجازت نہیں تھی۔

۱۸۷۱ء میں پٹھان تاجروں کا ایک قافلہ لیہہ پہنچا۔ اُن میں زیادہ تر پہلی دفعہ لیہہ آئے تھے۔

۱۸۶۹ء میں لداخ سے کشمیر اور سکرود برآمدات ۱۹۱۹۷ روپے اور ۱۸۷۰ء میں ۱۸۳۹۳ روپے تھے اور درآمدات بالترتیب ۴۰۰۰۲ اور ۱۱۸۱۹۵ روپے کی مالیت کی تھی۔

عمومی طور ترکستان اور تبت سے درآمد ہونے والے مال کو درآمدات اور پنجاب سے آنے والے مال کو برآمدات کہا گیا ہے۔

۱۸۷۱ء میں مختلف خطّوں سے لیہہ آنے والے تاجروں، بار بردار جانوروں اور عازمینِ حج کی تفصیلات کا ایک نقشہ ملاحظہ ہو:

	کلو	رام پور	کشمیر	چنگ تھنگ	ترکستان	کل میزان
بار بردار خچریں اور گھوڑے	۳۸۸	۱۵	۲۶۴	۴۶۰	۹۵۶	۲۲۸۳
گدھے	۳۵	۳۵	-	۴۵	۱۳	۱۲۸
بھیڑیں	۵۱۰	-	-	-	-	۵۱۰
فروخت کے لئے						
فالتو گھوڑے	۱۰	۲	۷۵	۵	۱۲۹	۲۲۱
اونٹ	-	-	-	-	۱۸	۱۸
افراد	۸۶	۱۵	۳۱۰	۷۵	۱۴۶	۶۳۲
عورتیں	۴	-	۸	-	-	۱۲
عازمین حج (سمندری جہاز سے سفر کرتے تھے)	-	-	-	-	۱۰	۱۰

اُونٹ ۱۸۷۰ء میں پہلی دفعہ ترکستانی تاجروں نے چنگ چھنمو کے راستے لیہہ لائے۔ تب کارواں کے ساتھ ۱۵ اُونٹ تھے اور ایک اُونٹ نے ۳۰۰ سیر کا وزن اُٹھایا تھا۔ کیلے اور اُس کے جانشین برٹش جوائنٹ کمشنر نے تجارت کو فروغ دینے کے لئے کئی اقدام کیے۔ تجارتی راستوں کی مرمت کی اور اُنہیں وُسعت دی۔ اس دوران قرضے اور محصول ادا نہ کرنے والے تاجروں کو جیل بھیجا اور جرمانہ کیا۔ گیارہ مقروض تاجروں کے خلاف لیہہ قصبہ میں تشہیر کی کہ اِنہیں پیشگی رقم نہ دی جائے۔ سرینگر میں صفا کدل کے پاس ترکی تاجروں کے لئے سرائے تعمیر کی۔

۱۸۷۳ء میں درآمدات اور برآمدات کی مالیت ۱۷۷۶۲۹ روپے تھی۔ ۱۸۷۴ء میں یہ رقم بڑھ کر ۲۶۳۰۹۳۲ روپے تک پہنچی۔ لیکن ایک سال بعد ۱۸۷۵ء

میں گھٹ کر ۲۱۶۰۲۸۹ روپے ہوئے۔ تجارت میں گراوٹ کی کئی وجوہات ہوتی تھیں۔ ترکستان میں بدامنی، چرس کی مانگ میں کمی، درآمدات میں کمی اور رُوس اور ہندوستانی تاجروں میں خرید فروخت میں مقابلہ وغیرہ سے تجارت پر برا اثر پڑتا تھا۔

۱۸۷۶ء میں تاجروں، اُن کے ملازموں اور بار بردار جانوروں کی تعداد کا ایک نقشہ:

تاجر: ۳۸۰، ملازمین: ۱۵۶۸، عازمینِ حج: ۲۰۷، خواتین: ۱۹، بچے: ۵، کل: ۲۱۷۹۔ سامان لدے گھوڑے اور خچریں: ۵۸۲۴، سواری کے گھوڑے: ۳۴۳، فروخت کے لئے لائے ہوئے گھوڑے: ۵۶۲، کل گھوڑے: ۶۸۲۹۔ بار بردار یاک اور زو: ۱۷۳۶، بار بردار گدھے: ۲۲۷۲، بار بردار بھیڑیں اور بکریاں: ۸۹۳۲، بار بردار قلی: ۱۸۳۰۔ ایک کارواں کے مالک کے ساتھ ۳۰ سے ۴۰ گھوڑے اور ۵ سے ۸ ملازم ہوتے تھے۔

اُسی سال ترکستان سے وابستہ تاجروں کی تعداد ۱۱۱ اور اُن کے ملازمین کی تعداد ۳۰۷ تھی۔ تاجروں میں ۵ لداخی آرغون، ۷ کشمیری، ۱۴ کابلی اور قندھاری اور ۱۰ پنجابی تھے۔ اس کے دس سال بعد آرغون تاجروں کی تعداد ۹، کشمیری ۶، کابلی اور قندھاری ۱۳ اور پنجابی اور یورپین ۱۵ تھی۔ عازمینِ حج ۳۱۲ تھے۔

جن لداخیوں کے پاس لیہہ یا آس پاس کے گاؤں میں لوسرن Lucerene کی چراگاہیں ہوتیں وہ ترکی تاجروں کو بہ اخذِ قیمت اُن کے جانوروں کی چرائی کے لئے دے دیتے تھے۔ دراس اور کرگل کے ٹٹو رکھنے والے کرایہ کش اپنے ٹٹو پر تاجروں کا مال ڈھوتے تھے۔ یاک رکھنے والے لداخیوں کو بھی پنامیک سے لیہہ مال کی نقل و حمل سے آمدن تھی۔

پہلا یورپین تاجر اے. ڈلگلیش تھا، جو تیں گھوڑوں پر مال لے کر ترکستان گیا۔ انگریزی تجارتی مال بھی خطّے میں درآمد ہوتا تھا۔ جو سوتی اور ریشمی مصنوعات،

کھالیں اور چائے پر مشتمل تھا۔

عازمینِ حج کی تعداد بھی ہر سال سینکڑوں میں ہوتی تھی۔ ایک سال ایک ہزار سے بھی تجاوز کر گئی۔ ۱۸۸۰ء میں ۱۹۷ عازمینِ حج تھے جو لیہہ سے حجِ بیت اللہ پر جانے کے لئے بمبئی روانہ ہوئے تھے۔ لیہہ میں دو کارواں سرائیں تھیں۔ لیہہ، لاما یورو اور سپیول کی کوٹھیوں سے ترکی تاجروں کو ان کے جانوروں کے چارہ کے لئے جو فراہم کیا جاتا تھا۔ تجارتی مالیت میں بھی سال بہ سال اضافہ ہو رہا تھا۔ ۱۸۸۴-۸۵ء میں ۱۶۹۶۰۷۳۷ روپے کی مالیت کی تجارت ہوئی۔

اُن دنوں لیہہ میں جولائی سے اکتوبر تک ۱۳۰ دُکانیں کھلی رہتی تھیں۔ تاجروں کے واپس جانے کے بعد دو تہائی دُکانیں بند ہو جاتی تھیں۔ اُن دنوں پنڈت رادھا کشن کول لیہہ کا ناظم تھا۔ (بمطابق رپورٹ ۱۸۸۸ء)

۱۸۹۰-۹۱ء کے آس پاس ترکستان جانے والے ہندو تاجروں کی تعداد ۳۴ تک پہنچی تھی۔ ۱۸۹۳-۹۴ء میں درآمدات اور برآمدات کی مالیت ۳۹۹۱۶۲۷ روپے تھی جس میں ۲۱۸۸۸۶ روپے کی مالیت کی ادویات درآمد ہوئی تھیں۔ ۱۸۹۶ء میں ۶۲ لاکھ روپے تک پہنچ کر ریکارڈ قائم ہوا۔

برٹش جوائنٹ کمشنر نے ۱۸۹۰ء میں کشمیر کے گورنر کو ایک خط میں شکایت کی کہ لداخ کا وزیرِ (ناظم) امورِ تجارت میں دخل اندازی کرتا ہے اور اُسے باز رہنے کا حکم دے۔

یہ ستم ظریفی ہے کہ جہاں ترکستان سے چرس درآمد ہوتی تھی، وہاں لداخ کے راستے ترکستان اور چین افیون برآمد کی جاتی تھی۔ جس سے سماجی مسائل پیدا ہوتے تھے۔ راستہ ٹھیک ہونے کی وجہ سے ہندو تاجر ترکستان سے براہِ راست چرس لاتے تھے۔ پہلے وہ لیہہ میں اپنے مال سے اس کا تبادلہ کرتے تھے۔ اسی دوران چرس کا دام یک لخت فی سیر سو روپے سے تین سو روپے تک بڑھا تھا۔ ۱۹۰۲-۳ء میں چھ

ہزار من چرس درآمد ہوئی تھی۔ کہنے کو تو چرس اور افیون ادویات بنانے کے لئے درآمد ہوتی تھی لیکن بہت سارے لوگ ان سے نشہ کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۹۸ء میں خاقانِ چین نے ایک حکم جاری کیا کہ چین کی قلمرو میں کوئی افیون فروخت نہ کرے۔ اگر کسی کے پاس افیون ہو تو اُسے لداخ واپس لے جا کر فروخت کرے۔ اگر کسی کے پاس افیون پائی جائے یا چوری چھپے اسے فروخت کرے تو وہ سخت سزا کا مستوجب ہوگا۔ علاوہ ازیں افیون ضبط کر کے ضائع کی جائے گی۔ اس حکم کو مشتہر کرنے کے ایک سال بعد افیون فروشوں کے گھروں کی تلاشی لی گئی اور ضبط شدہ افیون جلادی گئی۔ چنانچہ ایک پنجابی تاجر لالہ کوٹھی مل کو چھ لاکھ روپے کا نقصان ہوا۔ چرس کے لین دین کی نگرانی کے لئے لیہہ میں چرس افسر اور اس کا عملہ ارکان تھا۔

کشتواڑ وغیرہ کے سوداگر لداخ میں افیون بیچتے تھے۔ کچھ تاجر ترکستان جا کر اسے فروخت کرتے تھے۔

۱۸۹۰ء میں کاشغر میں انگریز کونسل کا دفتر کھولا گیا اور سرینگر سمیت ترکستان کے تین شہروں یارقند، کارغالیک اور گوما میں ایک ایک اقسقال تعینات ہوا۔

لیہہ میں غالباً اقسقال پہلے ہی تعینات تھا۔ یہ برٹش جوائنٹ کمشنر کا دایاں ہاتھ ہوتا تھا اور تجارتی امور کی نگرانی میں مدد کرتا تھا۔ اقسقال ترکی لفظ ہے۔ اِس کا مطلب سفید ریش یا بزرگ ہے۔

لیہہ کے شمالی اور مغربی پھاٹک پر دو منشی تاجر برآمدات اور درآمدات کا ریکارڈ رکھتے تھے اور افسر بالا کو ماہانہ رپورٹ دیتے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں ریذیڈنٹ نے حکومتِ ہند کو لکھا کہ زوجی لا اور قراقرم کے درمیان مہاراجہ کی حکومت سے گودام تعمیر کرائیں تاکہ ان میں تاجروں کی سہولیت کے لئے خوراک اور چارہ سٹاک کئے جائیں۔ اِس کے لئے نو ہزار من غلہ درکار تھا لیکن لداخ کے لوگ اتنی مقدار میں غلہ فراہم کر نہیں سکتے تھے۔

جس طرح تبت غیر لداخیوں کو اپنے علاقے میں اُون اور پشمینہ فروخت نہیں کرتا تھا، اُسی طرح غیر لداخیوں کو تبّتی قلمرو میں تجارت کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ مئی ۱۹۰۵ء میں برطانوی ہند سرکار نے غالباً برٹش جوائنٹ کمشنر کی تجویز یا سفارش پر چند منتخب تاجروں کو تبت کے تجارتی قصبہ گرتوق میں تجارت کرنے کی اجازت دی۔ اُن میں ایک پنجابی تاجر شادی لال تھا جس کی لیہہ میں بڑی دکان تھی۔ حکام نے گرتوق میں شادی لال کو کاروبار کرنے کی اجازت نہیں دی اور اسسٹنٹ گورنر کے حکم پر چنگپا قبیلہ نے اُس کے مال کا بائیکاٹ کیا۔ خود شادی لال کو پندرہ روز کے لئے قید کیا۔ چنانچہ شادی لال نے بحالتِ مجبوری لوپچق مشن کے لیڈر کو ایک من اناج پانچ روپے کے حساب سے فروخت کیا اور موخر الذکر نے فوراً آٹھ روپے کے حساب سے بیچا۔

۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء میں خطّے میں ریکارڈ توڑ مالیت کی تجارت ہوئی۔ درآمدات کی کل مالیت ۱۲۲۸۴۶۵۲ روپے اور برآمدات ۱۰۰۲۴۱۷۱ روپے تھی اور مجموعی مالیت ۲۲۳۰۸۸۲۳ روپے تھی۔ اس کے ایک سال بعد ۸-۱۹۰۷ء میں مزید اضافہ ہوا۔ جب درآمدات ۱۴۸۹۲۹۱۳ روپے اور برآمدات ۱۱۶۹۹۷۵۳ روپے تک پہنچیں۔ دونوں کی مجموعی مالیت ۲۶۵۹۲۶۶۶ روپے بنتی ہے۔ آج کل کے روپیہ کی قیمت کے تناسب سے تب اربوں روپے کی تجارت ہوتی تھی۔ تب سے بہت ساری اشیاء کی قیمتوں میں بیسیوں گنا اور کئی چیزوں میں سینکڑوں گنا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن صورتِ حال ایک جیسی نہیں رہی۔ مختلف عوامل کی وجہ سے درآمدات اور برآمدات میں نشیب و فراز آتے رہے۔ حتیٰ کہ دُوسری جنگِ عظیم کے دوران کل مالیت تجارت صرف ۸۲۴۶۷ روپے کی معمولی رقم تھی۔ پھر ایک دن آیا کہ لیہہ کی تجارتی حیثیت ختم ہوگئی۔ میجر لاڈ لو آخری برٹش جوائنٹ کمشنر تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اُس کے حکم پر لیہہ سے سارا تجارتی ریکارڈ اور قیمتی سامان سرینگر لایا گیا۔

لداخ کی صدیوں پرانی تجارتی شاہراہیں اب بند پڑی ہیں۔ لیکن جغرافیائی افادیت قائم اور دائم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کبھی نہ کبھی یہ تجارتی شاہراہیں دوبارہ کھل جائیں۔ بھیڑوں، اُونٹوں، گھوڑوں اور یاک کی جگہ تب گاڑیاں اور ہوائی جہاز لیں گے اور یہ تجارت پہلے سے کہیں زیادہ بڑے پیمانے پر ہوگی۔

لیہہ کی یارقندی سرائے میں یارقندی، پنجابی اور لداخی تاجران
(یہ تصویر سن ۱۹۱۷ء میں لی گئی)

نظامِ حکومت

دسویں صدی سے پہلے لداخ میں بہت سی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ یہ جمہوریتیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ سکیت دے نیما گون نے دسویں صدی میں ان جمہوریتوں کو یکے بعد دیگرے فتح کیا اور سارا لداخ اپنے قبضے میں لایا۔

سکیت نیما گون نے مرکز میں ایک جمہوری نظامِ حکومت قائم کیا اور تمام دیہات کے نمائندے راج دھانی میں طلب کئے۔ یہ نظام اُس کے جانشینوں نے بھی قائم کیا۔ آج کی جمہوری حکومتوں سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ راجا کے اختیارات بہت زیادہ تھے۔ کچھ طاقت ور راجے بڑے خودسَر تھے۔ وزیروں اور گورنروں کی من مانیاں بھی بہت چلتی تھیں۔ ان میں کئی بڑے مغرور اور مفاد پرست تھے۔

ہر بڑے دیہات یا چند چھوٹے گاؤں پر مشتمل پنچایت یا دیہی کونسل ہوتی تھی۔ جس میں زیادہ سے زیادہ دس ممبر ہوتے تھے۔ یہ ممبران گاؤں کے نظم و نسق چلاتے اور لوگوں کے آپسی جھگڑوں کا فیصلہ کرتے تھے۔

لداخ میں کل ساٹھ کونسلیں تھیں اور ہر کونسل کی طرف سے جنرل کونسل کے لئے ایک نمائندہ نامزد کیا جاتا تھا۔ یہ غنمی یا غنتپو کہلاتے تھے۔ غنمی یا غنتپو کا مطلب بزرگ آدمی سے ہے۔ عموماً یہ عمر رسیدہ ہوتے تھے اور مقامی اور ملکی سطح پر ضروری فیصلے کرتے تھے۔ گیالپو سینگگے نمگیل نے اپنے خاندان، وزراء کونسل کے ممبروں اور ان کے اہلِ خاندان کی رہائش کے لئے لیہہ کا بڑا محل تعمیر کرایا۔ غنمی کے اُوپر ایک چیئر مین ہوتا تھا، جن کو غن ژو یا بزرگوں کا سربراہ کہا جاتا تھا۔

وزیرِ اعظم کے علاوہ کابینہ درجہ کے چار وزراء تھے۔ وزیرِ اعظم کلون چھنپو کہلاتا تھا۔ وزیرِ اعظم کے زیرِ نگیں نونو کلون (نائب وزیرِ اعظم)، چھغزوت (وزیرِ خزانہ)، لے پون (لیہہ کا گورنر)، چھاقشی گوبا (میئر یا شہر کا کوتوال) اور کاغاسترزی (رسالہ دار) کام کرتے تھے۔ یہ راج دھانی میں رہتے تھے۔

وزیرِ اعظم کا اِنتخاب بھی کیا جاتا تھا اور موروثی بھی ہوتا تھا۔ گیالپو سینگے نمگیل حکمران ہونے کے علاوہ وزیرِ اعظم کا کام بھی کرتا تھا۔

وزیرِ خزانہ کا عہدہ وزیرِ اعظم کے برابر مانا جاتا تھا۔ لداخ کے آخری خودمختار راجہ چھیپل تنڈوپ نمگیل کے وزیرِ اعظم کلون چھوانگ تنڈوپ نے وزارتِ خزانہ کا قلمدان بھی سنبھالا تھا۔ وہ بزرگوار رہنے والا تھا اور قابل مانا جاتا تھا۔

لداخ کے آخری خودمختار راجہ کے زمانے میں ستوق، بانکا اور سابو کلون مشہور تھے۔ لڑائیوں میں یہ فوج کے لئے اعلیٰ افسر فراہم کرتے تھے۔ اُنہیں دِنوں لے پون کا فریضہ شے لونپو سرانجام دے رہا تھا۔ اُس کے تحت آٹھ اہل کار تھے۔

ان کے علاوہ اہم منصب داروں میں شقسپون (چیف جسٹس)، مقسپون (فوج کا سربراہ) اور سوگم یا چھغزوت (چیف کسٹم افسر) تھے۔ عدلیہ کے دُوسرے افسران ٹھمس پون (مجسٹریٹ) تھے اور چیف کسٹم افسر کے تحت کسٹم افسر کا کام کرتے تھے۔

عدالت کھولتے اور بند کرتے وقت ٹھمس ڈُونگ یا قانونی گھنٹہ یا ڈھول بجایا جاتا تھا۔

۱۷۵۳ء میں لداخ کے خلسے اور سیکور بُوچن کے ٹق شوس سمیت لونپو حکومت کی مشاوراتی کونسل کے ممبر بھی ہوتے تھے۔ لڑائی میں یہ فوج کے لئے افسران کا اہتمام کرتے تھے۔

روایت کے مطابق لُونپو کو فصل کٹائی پر پہلی فصل کا اناج اور پہلی کشید کی گئی چھنگ بطور نذرانہ پیش کی جاتی تھی۔ یہ چھنگ تیز اور نشیلی ہوتی ہے۔

لونپو کے بعد ایک بڑا افسر ننکسو ہوتا تھا۔اس کا فریضہ مالیہ اور چارہ جمع کرنا تھا جو وہ سرکاری دربار میں پہنچاتا تھا۔محکمہ خزانہ اس کا حساب رکھتا تھا۔

متعدد گاؤں کے لئے ایک ننکسو ہوتا تھا۔اس کے ماتحت کئی ملازم کام کرتے تھے جنہیں لون رن کہا جاتا تھا۔

لیہہ میں دوسرے سرکردہ منصب دار لرداق اور اپچی (طبیب) تھے۔لرداق تقریبات میں گھوڑ دوڑ میں گھوڑسواروں کی قیادت کرتا تھا۔

لاموں کی سماج میں عزت اور انتظامیہ میں اثر ورسوخ تھا لیکن امورِ حکومت میں براہِ راست مداخلت نہیں کرتے تھے۔

ہر گاؤں میں گوبا یا نمبردار ہوتا تھا جسے کہیں کہیں ٹونکسپون یا سپون بھی کہا جاتا تھا۔اس کے تحت ڈوُ گا ژے یا دروغچی کام کرتا تھا۔

گاؤں کا ایک اور عہدہ دار خرپون (قلعہ دار) تھا۔

گاؤں میں کسی کو قانونی چارہ جوئی کرنا ہو یا شکایت ہو تو نمبردار سے رجوع ہوتا تھا یا لونپو تک رسائی حاصل کرتا تھا۔وہ پانچ یا سات مقامی غنمی کا پینل (فہرست ارکان) بناتا تھا۔اگر شکایت سنگین ہو تو راج دھانی میں چیف جسٹس کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا۔وہ پانچ یا سات غمنی کے علاوہ دو یا تین ٹھمس پون (مجسٹریٹ) کو بھی کمیٹی میں شامل کرتا تھا۔موخرالذکر قضیے کے تناظر میں ملکی قوانین کی وضاحت کرتے تھے۔

اُن کا فیصلہ عموماً حتمی ہوتا تھا اور اس کے خلاف مزید اپیل گیالپو سے کی جا سکتی تھی۔اس کے لئے عام لوگوں سے چار یا پانچ روپے کی فیس لی جاتی تھی اور امراء اور رُوساء کے لئے پچاس اور سو روپیہ کے درمیان فیس مقرر کی گئی تھی۔گیالپو کا فیصلہ حتمی ہوتا تھا۔

فیصلہ سنانے والے فریقین کے بیانات غور سے سنتے تھے۔پھر دونوں کو

باہر بھیج دیتے۔ آپس میں بحث کرتے تھے اور اس کے بعد فیصلہ سنایا جاتا تھا۔

گیالپو کی عدالت میں کابینہ کے وزراء عوامی نمائندے اور شاہزادہ ولی عہد بھی شرکت کرتا تھا لیکن اس کو بولنے کا حق نہیں تھا۔

ایک راجا نیما نمگیل نے مقدمات میں اِنصاف دِلانے کے لئے معززین کی ایک کونسل ُرگن سوم' بنائی۔

جب لداخی راجا چھوانگ نمگیل (۱۷۵۳-۱۷۸۲ء) کی داشتہ بی بی کے خلاف درباریوں اور لوگوں میں نفرت بڑھی تو غمنی کی ایک خصوصی مجلس منعقد ہوئی تھی۔ اس مجلس میں مسلمان تاجروں کے دو نمائندوں نے بھی شرکت کی تھی۔ غمنی کے فیصلے کے مطابق بی بی کو سرِ بازار ماتھے پر کیل ٹھوک کر ہلاک کیا گیا اور لاش کو عبرت کے لئے نمائش کی گئی۔ اس کے باپ نصیب علی کو ملک بدر کیا گیا۔

بی بی کرگل کے گاؤں سورو سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ بڑی حسین اور مغرور تھی۔ مورخ ایس. ایس. گیرگن کے مطابق وہ چینی ترکستان سے درآمد کیا ہوا بڑھیا کپڑا کوشین کا بنا ہوا پاجامہ پہنتی تھی اور ایک رات پہننے کے بعد دوبارہ اِستعمال نہیں کرتی تھی۔ یہی کپڑا اعلیٰ خاندانوں کے گھرانوں میں پہنچتا اور بی بی کو مضحکہ اُڑانے کا موقع ملتا تھا۔

لداخ گیالپو کے تحت آٹھ چھوٹے راجے تھے۔ اُن میں تین راجے پشکیوم، سوت اور سورو علاقے اور ایک دراس سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ چو کہلاتے تھے۔ باقی چار زنسکار گیاپو، نوبراہ کلون، سپیتی نونو اور گیا پاچو تھے۔ گیا پاچو کے آباواجداد لداخ کے حکمران رہے تھے اور اِسی لئے اس کو ستوت گیاپو بھی کہا جاتا تھا۔

گیالپو کے اپنے اہل کار تھے۔ سکوژھپس' گیالپو اور کلون کی غیر موجودگی میں جانشین ہوتا تھا۔ زیمس پون Master of the chamber راجہ کی طرف سے حاضرین کو خطاب کرتا تھا۔ ننگ نیر Inner steward مہتمِ اعلیٰ تھا جو رعایا کی طرف

سے گیالپو کو درخواستیں اور عرضداشتیں پیش کرتا تھا۔

خرپون (محل دار) محل کے اِنتظامات اور صفائی کا حاکمِ اعلیٰ تھا۔ نیرپا کھانے پینے کی اشیاء کا ناظم تھا۔

شینگ سپون محل میں اِستعمال کی لکڑی اور ایندھن کا نگرانِ اعلیٰ تھا۔ لکڑی رومبق، رُوچُونگ اور نوبراہ سے لائی جاتی تھی۔

ایگس پون سب سے بڑا منشی تھا اور راجہ کی طرف سے خطوط لکھتا تھا۔ قورپون محل کے ملازمین کا نگران اعلیٰ تھا۔ گیرگن کے مطابق قورپون راجہ کی اراضی کی آمدن جمع کر کے راجہ کے حوالہ کرتا تھا۔ ڈیکس پون اشیائے خوردنی کا تول کراتا تھا۔

خودمختار لداخ کے آخری دور میں آمدنی کا ایک بڑا وسیلہ چولھا ٹیکس تھا۔ زمین پر کوئی مالیہ نہیں تھا۔ بڑے مکانات کی تعداد ۴۰۰ تھی اور فی مکان سالانہ سات روپے ٹیکس تھا۔ درمیانہ درجہ کے ۱۶۰۰ مکانات تھے اور فی مکان ساڑھے تین روپے ٹیکس لیا جاتا تھا۔ چھوٹے مکانات کی تعداد سولہ ہزار تھی اور فی مکان پونے دو روپے کے حساب سے سالانہ اٹھائیس ہزار روپے کی آمدن تھی۔ کل آمدن ۳۲۴۰۰ روپے تھی۔

ان میں گنپوں کے اخراجات کے لئے ۴۰۰۰ مکانات وقف تھے۔ جن سے آٹھ ہزار روپے کی آمدنی تھی۔ گیالپو کو ایک ہزار اور گیالمویعنی رانی اور شاہی خاندان کو ایک ہزار مکانات سے بالترتیب دو دو ہزار روپے ملتے تھے۔

ڈوگرہ دورِ حکومت میں گنپوں کو نہ صرف اِن گاؤں کی آمدن سے محروم کیا گیا بلکہ ہمس، چیمرے، ٹھکسے، سپتیک، فیانگ اور لامایورو گنپوں سے سالانہ پانچ سو سے نو سو روپے اور باقی ۲۵ گنپوں سے ساٹھ روپے سالانہ ٹیکس وصول کئے جانے لگے۔

تجارتی محصولات سے سالانہ اٹھارہ ہزار روپے، دلال ٹیکس سے پانچ ہزار

سات سو روپے اور تحفے تحائف اور فیس سے پانچ ہزار روپے کی آمدن تھی۔

مقامی کشمیری اور بلتی تاجروں کے علاوہ مقامی اور غیر مقامی درمیانہ داروں سے بھی ٹیکس لیا جاتا تھا۔۱۶۸۳ء سے پہلے جب لداخ کے کچھ علاقوں سے سونا نکالا جاتا تھا، تو اس پر بھی کچھ ٹیکس عائد کیا جاتا تھا۔ سپیتی اور لاہول سے لوہے کی سلاخیں بطور محصول وصول کی جاتی تھیں۔

اُس زمانے میں روپیہ کی بڑی قیمت تھی۔ اندازاً ڈیڑھ دو روپیہ میں ایک بھیڑ یا بکری ملتی تھی جو آج کم سے کم دو ڈھائی ہزار روپے میں فروخت کی جاتی ہے۔

گیالپو کی آمدنی کہیں زیادہ تھی۔ وہ لداخ کا سب سے بڑا تاجر تھا۔ جسے سالانہ چالیس سے پچاس ہزار روپے کی آمدنی تھی۔ وہ تجارت پر کوئی محصول ادا نہیں کرتا تھا۔ علاوہ ازیں لداخ کے مختلف علاقوں سے جنس کی صورت میں اس کو ساری خانگی ضروریات مفت بہم پہنچائی جاتی تھیں۔

علاقہ نوبراہ کے ۲۴ دیہات چھ ماہ اور علاقہ شام اور مرکزی لداخ کے دیہات لامویورو، سکیور بوچن، ہتنگ موگنگ، سسپولا، بزگو، شے اور ٹھکسے باقی چھ ماہ کے لئے غلّہ کی ضروریات پوری کرتے تھے۔

گوشت روپشو، ٹانکچے اور علاقہ رونگ کے چند دیہات فراہم کرتے تھے۔ مکھن زنسکار سے آتا تھا۔ نیز روپشو، ٹانکچے اور رونگ سے بھی جزوی طور پر مکھن فراہم کیا جاتا تھا۔

چیلنگ سُمدو، خردونگ اور ہندرڈوق سے سالانہ ساڑھے تین ہزار من لکڑی آتی تھی۔ زمینداروں کو ہر دس بھیڑوں اور بکریوں پر ایک بھیڑ یا بکری گیالپو کو دینی ہوتی تھی۔

چائے کی ضروریات لوپچق خیر سگالی مشن پر لہاسہ جانے والا سربراہ پورا کرتا تھا۔ اِس کے معاوضے میں اُس کو لداخ سے لہاسہ تک باربرداری کے لئے جانور مفت

فراہم ہوتے تھے۔

گیالپو کی نجی اراضی کی کاشت بیگار پر کرائی جاتی تھی۔

ڈاک رسانی کا ذمہ دار گاؤں کا نمبر دار تھا۔ وہ ہر کارہ کے ذریعے ایک گاؤں سے دُوسرے گاؤں ڈاک بھیجتا تھا۔ جہاں ضرورت ہوتی، وہاں گھوڑ سوار ڈاک لیتا تھا اور ایک دن میں ۲۰ سے ۲۵ میل کا فاصلہ طے کرتا تھا۔ لیکن یہ سہولیات عام لوگوں کے لئے نہیں تھیں۔ تاجر خط و کتابت کے لئے خود ہرکارے کا اِنتظام کرتے تھے۔

عمومی طور فوج قومی ملیشیا کے طرز پر تھی اور فوجی خدمت جبری طور لی جاتی تھی۔ لڑائی کے دوران ہر کنبے کا ایک فرد فوجی خدمات سرانجام دتیا تھا۔ گھر کا دُوسرا آدمی اُس کا راشن یا ہتھیار اُٹھانے کے لئے ساتھ جاتا تھا۔ جس کے پاس اپنا گھوڑا ہوتا اُس کو دُوسرا آدمی لینے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ خوراک کا اِنتظام سپاہی کو خود کرنا پڑتا تھا۔

کچھ باقاعدہ فوج بھی تھی۔ جس میں رسالہ اور پیدل دونوں تھے۔ لیہہ میں مورکرافٹ (۱۸۲۰-۲۱ء) کی موجودگی کے دوران گھوڑ سوار فوجوں کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی اور بارہ سو پیدل فوجی تھے۔ لیکن اُن کو تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ کسانوں سے کچھ غلّہ مہیا کیا جاتا تھا۔

اکثر سپاہی تیر کمان اور تلوارں سے لیس تھے۔ کئیوں کے پاس توڑے دار بندوقیں تھیں۔ دُوسرے ہتھیاروں میں نیزہ، خنجر، گوپھن اور دفاع کے لئے زرہ بکتر، ڈھال اور لوہے کا خود تھا۔ اسلحہ اور سامانِ حرب سرکاری اسلحہ خانہ میں بھی جمع رہتا تھا اور لڑائی پر یہ اسلحہ فوج میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

بلندی سے بڑے بڑے پتھروں کا لڑھکانا بھی جنگی حکمت عملی میں شامل تھا۔ فوج میں مختلف درجہ کے افسر تھے۔ ایک ہزاری کو ستونگ سپون، سو کے کمانڈر کو

گیا سپون کہا جاتا تھا اور دس سپاہیوں کی کمان چُوپون کرتا تھا۔

فوج کا سربراہ شاہی خاندان کا ایک فرد یا کلون ہوتا تھا۔ یہ ذمہ داری عارضی طور عائد کی جاتی تھی۔ لڑائی کی صورت میں کلون سینکڑوں فوجی لاتا تھا اور ایک ہزاری کا خطاب پاتا تھا۔ ایک امیر اور بارسوخ نمبردار ۵۰ سے ۱۰۰ لشکر کا اہتمام کرتا تھا اور سو کا افسر کہلاتا تھا۔ عام نمبردار ۱۰ فوجی لاتا تھا۔

جنگ میں ''تھبسنا'' یا جنگی نغمہ بجایا جاتا تھا۔

سزائیں:

کئی جرائم کے لئے موت کی سزا تھی۔ اس کے کئی طریقے تھے۔ عام طور پر ہاتھ پیروں کو باندھ کر ایک بڑے پتھر کے ساتھ دریا کے گہرے پانی میں ڈبو دیا جاتا تھا۔ سولی پر بھی چڑھایا جاتا تھا۔

پوریگ میں قاتل مجرم کو مقتول کی لاش کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا اور چوبیس گھنٹے تنہا رکھ کر لاش سمیت دریا میں ڈبو دیا جاتا تھا۔

مبلیک میں مجرم کی ناک میں سوراخ کر کے اُس کو چٹان کے ساتھ تادمِ موت باندھ دیا جاتا تھا یا تاوقتیکہ راجہ اُس کی رہائی کا حکم دے اس کو چٹان کے ساتھ باندھ کر رکھا جاتا تھا۔

کئی جرائم میں پہلا جرم سرزد ہونے پر بایاں ہاتھ کاٹ کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ دوبارہ جرم کرنے پر دایاں ہاتھ بھی کاٹ دیا جاتا تھا۔ عبرت حاصل نہ کرے اور تیسری بار بھی جرم کا مرتکب ہو تو مجرم کو دریا میں ڈبو دیا جاتا تھا۔

۱۸۴۵ء میں لیہہ کے ڈوگرہ تھانیدار مگنا تھانیدار نے چھشوت کے ایک لوہار کے ہاتھ پیر باندھے اور گردن سے ایک بڑا پتھر لٹکا کر چھشوت کے پُل پر سے دریائے سندھ میں پھینک دیا تھا۔ اُس نے گنپوں کے دھارمک صحیفوں کے سونے کی روشنائی

سے لکھی تحریروں اور ستوپاؤں کے بالائی حصّے کا ملمع کیا ہوا سونا چرایا تھا۔ اس پاداش میں کوڑے کھانے کے علاوہ وہ جیل اور جرمانہ کی سزائیں بھگت چکا تھا' لیکن راہ راست پر نہیں آیا تھا۔ دریا برد کرنے سے پہلے اُس نے ہمس گنپہ کے ایک ستوپا کے بالائی سرے پر قلعی کیا ہوا تانبا چرایا تھا۔

ڈوگرہ تھانیداروں نے گائے مارنے اور کھانے کے جرم میں لیہہ، چھشوت، نیموں، دراس اور نوبراہ میں کئی افراد کو موت کی سزائیں دی تھیں۔

مجرم کو ملک بدر بھی کیا جاتا تھا۔ اسے پہلے دُرّے مارے جاتے تھے۔ اور ماتھے پر تقریباً ایک انچ لمبا لوہے کا ٹکڑا، جس پر کُتّے کے سر کا نقشہ بنا ہُوا تھا، داغا جاتا تھا۔ جس پر ''کتا چھاپ، ملک بدر شدہ'' تحریر تھا۔ ملک بدر کرتے وقت دماموں کی مخصوص تھاپ پر سیٹیاں بجاتے، گالم گلوچ دیتے اور سنگ باری کرتے ہوئے مجرم کو بھگایا جاتا تھا۔

اُنہی دِنوں ایک بچے کو مارنے پر ایک عورت کا ہاتھ کاٹا گیا اور ملک بدر کیا گیا۔

چوری کے لئے چور کو جرمانہ یا جیل یا دُرّے مارے جاتے تھے۔ اگر ملزم جرمانہ ادا کرے تو سزا سے بچ سکتا تھا۔ دُرّے زمین پر لٹا کر ننگے بدن کی پشت پر مارے جاتے تھے۔ جیل میں مجرم کے لئے کھانا پینا لانا اُس کے لواحقین کے ذمہ تھا۔

اگر چوری کا مال مل جائے تو مالک کو واپس کیا جاتا تھا اور چور کو اس مال مسروقہ کی مالیت کا جرمانہ سرکار کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ اگر مال مسروقہ برآمد نہ ہو تو اس کی مالیت کی رقم مالک اور سرکار دونوں کو بطورِ جرمانہ ادا کرنا پڑتی تھی۔ اگر چور دوبارہ چوری کرے تو بایاں ہاتھ کاٹا جاتا تھا۔ اس کے بعد بھی باز نہ آئے تو دایاں ہاتھ کاٹنے کی باری آتی تھی۔ پھر بھی چوری کی عادت نہ چھوٹے تو دریا میں ڈبو کر مار دیا جاتا تھا۔

سزا کی اپیل گیالپو سے کی جا سکتی تھی۔ اس کے لئے عام آدمیوں کو چار یا پانچ روپے اور امراء اور حکام کو پچاس سے سو روپے کی فیس ادا کرنی پڑتی تھی۔

اگر جرم ثابت نہ ہو تو پانسہ پھینک کر ملزم کے خلاف یا حق میں فیصلہ سنایا جاتا تھا۔ یا ایک آزمائشی سزا دی جاتی تھی۔ اس کے مطابق ملزم کو دھکتا ہوا سرخ گرم لوہا اپنے ننگے ہاتھ سے کھینچنا پڑتا تھا یا اُبلتے ہوئے گرم تیل میں سے ننگے ہاتھ ایک پتھر نکالنا پڑتا تھا۔ اگر ہاتھ جل جائے یا اُس پر زخم آئے تو اُس کو مجرم قرار دیا جاتا تھا اور سزا کا مستوجب ہوتا تھا۔

تبت میں بھی ایسی آزمائشی سزا مروّج تھی۔ گرم تیل کے ایک برتن میں ایک سفید اور ایک کالا پتھر رکھے جاتے تھے۔ ملزم کو اپنے ہاتھ سے کسی آنچ کے بغیر سفید پتھر نکالنا پڑتا تھا۔
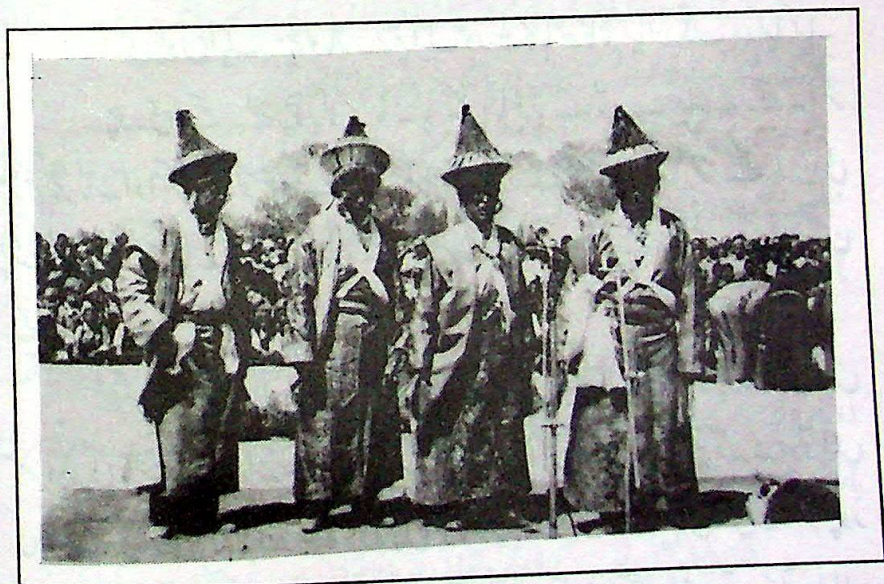
باراتی مخصوص پوشاک میں

(مضمون ''رسم ورواج'' ملاحظہ ہو)

مُغل اور لداخ

لداخ پر مغلوں کی عمل داری تقریباً ایک صدی تک رہی۔ تاہم یہ عمل داری عملی Physical نہیں تھی۔ مغلوں کا کوئی حاکم یا نمائندہ لداخ میں نہیں رہتا تھا البتہ لداخی راجے مغلوں کے باج گزار تھے اور مغلیہ حکومت کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے تھے۔

مغل حکومت کی مداخلت کی شروعات جہاں گیر (۲۷-۱۶۰۵ء) کے دورِ حکومت میں ہوئی۔ شاہجہان (۱۶۵۸-۱۶۲۷ء) کے زمانے میں مغلوں کا اثر ونفوذ بڑھا اور اورنگزیب کے عہد میں اس کی گرفت مضبوط ہوئی جب لداخ نے مغلوں کے اقتدارِ اعلیٰ کو من وعن قبول کیا۔ محمد شاہ کے بعد مغلیہ حکومت کو زوال آیا اور اس کے ساتھ لداخ میں مغلوں کا اثر ختم ہوا۔

جہانگیر سے بہادر شاہ تک لداخ میں چھ راجوں نے حکومت کی۔

سینگے نمگیل	۱۶۴۲ء-۱۶۲۴ء
دیلدن نمگیل	۱۶۹۴ء-۱۶۴۲ء
دیلیکس نمگیل	۱۶۹۱ء-۱۶۸۰ء
نیما نمگیل	۱۷۲۹ء-۱۶۹۴ء
دلیکیونگ نمگیل	۱۷۳۹ء-۱۷۲۹ء
پنچگ نمگیل	۱۷۵۳ء-۱۷۳۹ء

دیلدن نمگیل نے اپنی حیات کے دوران شاہزادہ ولیعہد دیلیکس کو ۱۶۸۰ء

میں تخت کا وارث بنایا۔ دیلدن اپنے بیٹے کے تین سال بعد فوت ہوا۔

جب لداخ کے ہمسایہ بلتستان اور اس کے علاقہ پوریگ (علاقہ کرگل) کے لوگ حلقہء بگوش اِسلام ہوئے تو مغلوں کو لداخ کی سیاسیات سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ جہانگیر کا دورِ حکومت تھا۔ سکردو بلتستان کے ایک مشہور راجا علی میر شیر خان کی بیٹی گُل خاتون سے بھی جہانگیر کا عقد ہوا۔ تب اکبرِ اعظم کی حکومت تھی۔ علی میر کا اکبر کے دربار سے رابطہ تھا۔ یہ سن ۱۵۸۶ء کی بات ہے۔ اس کے پانچ سال بعد ۱۵۹۱ء میں گل خاتون کی شادی ہوئی۔ مغل شاہزادہ ولیعہد سے ایک بلتی شاہزادی کی شادی ہونے پر بلتیوں کو بڑا ناز تھا۔ گل خاتون نے مغل موسیقی اور فن تعمیر سے سکردو کو روشناس کیا۔ جن سے بعد میں لداخ نے استفادہ کیا۔ جہانگیر نے بلتستان میں ایک فوجی مہم بھی بھیجی جو کامیاب نہیں رہی۔ مغل لداخ کو تبت، تبتِ کلاں اور تبتِ ''بزرگ'' کہتے تھے اور بلتستان کو تبت خورد کے نام سے پکارتے تھے۔ لداخ نے مغلوں کو ''ہور'' کہا ہے۔ تاریخِ لداخ (گیالربس) میں جابجا ہور کا ذکر ہے۔ چینی ترکستان کے باشندوں کو بھی لداخی ''ہور'' کہتے ہیں۔

جہانگیر سے پہلے مغلیہ حکومت اور لداخ کے درمیان کسی رابطے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے تاہم مغل حکمران اکبر لداخ اور تبت سے متعلق جانتا تھا۔ اکبر کے نورتن اور وزیر ابوالفضل نے ''آئینِ اکبری'' میں لداخ اور تبت کا ذِکر کیا ہے۔ آئین اکبری ۱۵۹۵ء میں تصنیف ہوئی تھی۔ کئی دفعہ مغل مورخین کی تحریروں سے تبت اور لداخ کی پہچان مشکل ہوتی ہے۔ اکبر نے سنا تھا کہ تبت یا لداخ میں کچھ لوگ دوسو سال یا اس سے زیادہ زِندہ رہتے ہیں۔ اکبر نے اُن کی تقلید میں حرم میں کم وقت دیا اور گوشت کم کھایا۔ ابوالفضل نے یاک کی شکل وصورت کو غیر معمولی بتایا ہے۔

اکبر کو کشمیر کے پشمینہ شال کی قدر و قیمت کا احساس تھا۔ مغل بیگمات اور درباری اِس کے بڑے قدردان تھے۔ یہ پشمینہ مغربی تبت اور لداخ کے راستے کشمیر

برآمد ہوتا تھا۔

بابر کے زمانے میں مرزا حیدر گورگان کسی خون خرابہ کے بغیر جب دوسری مرتبہ لداخ پر قابض ہوا تو مرزا نے یہ قبضہ بابر کے نام پر کیا۔ بابر سے مرزا کا رشتہ بھی تھا۔ لیکن یہ قبضہ عارضی تھا۔ مرزا کی پیٹھ مڑتے ہی اس کی عمل داری ختم ہوئی۔ مرزا نے پہلا حملہ ترکستان کے سلطان سعید خان کے ایما پر قراقرم کے راستے کیا تھا اور تین ماہ تک لداخ پر قابض رہا تھا۔

''شاہجہان نامہ'' میں عنایت خان نے لکھا ہے کہ جہانگیر (۲۷-۱۶۰۵ء) نے تبت اور لداخ پر مغل عمل داری قائم کرنے کا منصوبہ بنایا اور کشمیر کے گورنر ہاشم خان کو حکم دیا کہ فوج کشی کرے۔ ہاشم خان کامیاب نہیں ہوا۔

کئی مورخوں نے مغلوں اور لداخیوں کے آپسی رابطوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں عبدالحمید لاہوری کا ''بادشاہ نامہ''، محمد اعظم کی ''تاریخِ کشمیر''، ذکاء اللہ کی ''تاریخِ ہند''، حشمت اللہ کی ''تاریخ جموں و کشمیر، لداخ و بلتستان''، فرانکی کی ''دی ہسٹری آف ویسٹرن تبت''، لوکینو پیٹیک کی ''دی کنگ ڈم آف لداخ''، برنیر کا سفرنامہ اور دُوسری تصنیفات ''عالمگیر نامہ'' اور ''مآثر عالمگیری'' شامل ہیں۔

مولوی ذکاء اللہ اور عبدالحمید لاہوری نے شاہجہان کی مہم لداخ کا ذِکر کیا ہے۔ اوّل الذکر تاریخِ ہند میں لکھتا ہے:

''شاہجہان کے حکم پر ظفر خان حاکمِ کشمیر نے آٹھ ہزار سوار اور پیادے کی جمیعت سے حملہ کیا۔ یہ کرتسے کی راہ سے روانہ ہوا اور ایک ماہ کے عرصے میں اسکردو آیا۔ اُن دنوں بلتستان کا سلطان علی رائے پدرِ عبدال تھا۔ تبت کی دو راہیں ہیں۔ ایک کرتسے اور دوسری لار سے ہے۔ کرتسے کی راہ[1] لار سے چار منزل زیادہ ہے۔ ایک سوار سے زیادہ چل نہیں سکتا مگر لار کی راہ تکلیف دہ ہے۔ اس راستے پر ایک برفانی

---

[1] کرتسے لداخ کا ایک گاؤں ہے۔

پہاڑ ہے جسے عبور کرنا پڑتا ہے۔ یہ کشمیر سے ایک کوتل تیس کوس دُور ہے۔

ملک تبت میں اکیس پر گنے ہیں اور ستیس قلعے۔ پورے سال کے اناج یا خراج کا حاصل ایک لاکھ روپے ہے۔ اس دیار میں ایک ندی[1] ہے جس سے ہر سال دو ہزار تولہ سونا حاصل ہوتا ہے۔''

دُوسری جگہ وہ لکھتا ہے: ''سرزمینِ لداخ میں اکثر ویرانہ اور لا حاصل دشت ہیں جو کاشت کاری کے قابل نہیں اور ان سے کچھ محصول حاصل نہیں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی بادشاہ نے وہاں خطبہ وسکّہ جاری کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔''

''بادشاہ نامہ'' میں عبدالحمید لاہوری نے اِس حملے کا تذکرہ یوں کیا ہے:

''نئے مغل شہنشاہ شاہ جہاں (۵۸-۱۶۲۷ء) نے علی میر کے بیٹے عبدال اور آدم خان کے بیٹوں کی ناچاقی کا فائدہ اُٹھا کر ۲۸/اگست ۱۶۳۸ء میں ایک فوج بھیجی جو اسکردو میں داخل ہوئی اور آدم خان کو مغل شہنشاہ کے زیرِ نگیں تخت کا وارث قرار دیا۔''

اِسی اثنا میں لداخ کے نامور راجا سینگے نمگیل نے پوریگ (علاقہ کرگل) پر حملہ کر کے اُسے اپنے زیرِ نگیں لایا۔ اسکردو کے راجہ آدم خان نے کشمیر کے مغل گورنر علی مراد خان کو اِس سے آگاہ کیا اور مدد مانگی۔ علی مراد خان نے حسین بیگ کی سرکردگی میں پیدل اور سوار فوجی دستے روانہ کئے۔ ۱۶جون ۱۶۳۹ء کو یہ لشکر زوجی لا سے ہوتا ہوا لداخ کی حدود میں داخل ہوا۔ آدم خان اپنی فوج کے ساتھ اس لشکر سے آملا۔ بودھ کھربُو کے پاس لڑائی ہوئی۔ سینگے نمگیل کو ہزیمت اُٹھانی پڑی اور اُس نے کھربُو کے قلعہ میں پناہ لی۔ راجہ نے صلح کے لئے حسین بیگ کے پاس ایک قاصد بھیجا اور یہ وعدہ کیا کہ اگر اُسے صحیح وسلامت لیہہ واپس جانے دے گا تو شہنشاہ کو خراج ادا کرے گا۔ گیا لپو سینگے نمگیل کو زیر کرنے کے بعد حسین بیگ واپس کشمیر چلا گیا۔

---

[1] غالباً دریائے سندھ سے مراد ہے۔

فرانسیسی سیاح برنیر نے بھی اِس لڑائی کا ذکر کیا ہے۔ اُس نے کشمیر میں اپنی سیاحت کے دوران ۱۶۶۳ء میں یہ معلومات حاصل کی تھیں۔

برنیر کے مطابق مغل کمانڈر نے اگلی بہار میں مزید فوج کشی کا ارادہ کیا اور راستہ بند ہونے کے اندیشے کے تیئں واپس کشمیر چلا گیا۔ مفتوح قلعے میں فوج کا ایک دستہ رکھا لیکن غیر متوقع طور اس فوج نے دشمن کے خوف یا رسد کی قلت کی وجہ سے قلعے کو خالی کیا اور واپس چلی گئی۔ اس طرح لیہہ حملے سے بچ گیا۔

لداخ کی شاہی تاریخ ''گیالربس'' میں بھی اِس حملے کا ذکر ہے۔ لداخی تاریخ میں شاہ جہاں کو 'پادساسا جان' (پادشاہ شاہجہان) کہا گیا ہے اور متضاد حقائق دیئے گئے ہیں۔ ''گیالربس'' کے مطابق بلتی راجہ آدم خان نے پادساسا جان کی فوج لائی۔ کھربُو میں گھمسان کا رَن پڑا اور بہت سارے ہور (مغل) مارے گئے اور (سینگے نمگیل نے) دشمن پر مکمل فتح حاصل کی۔

تاہم مورخین اِس سے متفق نہیں ہیں۔ پٹیک، فرانکی، حشمت اللہ اور دُوسرے لکھتے ہیں کہ سینگے نمگیل کو اِس لڑائی میں شکست ہوئی تھی۔ اس کے بعد راجہ نے کبھی پوریگ کی طرف پیش قدمی نہیں کی۔

پٹیک لکھتا ہے کہ سینگے نمگیل نے مغلوں کو خراج ادا نہیں کیا۔ کشمیر سے لداخ میں کسی کا داخلہ ممنوع قرار دیا۔ تب وسطِ ایشیا سے کشمیر اور پنجاب وغیرہ کی تجارت اسکردو اور شگر کے راستے ہونے لگی۔ ہندوستان اور وسطِ ایشیا اور تبت کا تجارتی لین دین پٹنہ، نیپال اور لہاسہ منتقل ہوا۔ تجارتی شاہراہ بند ہونے سے لداخ کی تجارت کو دھکا لگا اور لداخیوں کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

پٹیک کا اندازہ ہے کہ ۱۶۳۹ء میں لیہہ - سرینگر شاہراہ بند ہونے کے بعد یہ دوبارہ پچیس چھبیس سال بعد کھلی، جب دیلدن نمگیل نے اورنگ زیب کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کیا۔

سینگے نمگیل کا جانشین دیلدن نمگیل تھا۔ اُس کے عہدِ حکومت میں جب اورنگ زیب کشمیر آیا تو راجہ نے شہنشاہ سے ملنے ایک وفد بھیجا۔ وفد نے اورنگ زیب سے وفاداری کا اظہار کیا اور مغل حکومت کو سالانہ خراج ادا کرنے اور لیہہ میں ایک مسجد تعمیر کرنے کا وعدہ کیا۔ ان دنوں برنیر سرینگر میں تھا۔ اُس نے وفد سے بات چیت کی۔ برنیر لکھتا ہے کہ دیلدن نمگیل نے محض حملے کے خوف سے مغل حکومت کے ساتھ دوستانہ جذبات کا اِظہار کیا۔

جب اورنگ زیب کشمیر سے لوٹا تو دیلدن نمگیل اپنے وعدے سے مُکر گیا۔ لیکن اورنگ زیب کو ٹالنا دیلدن نمگیل کے بس کی بات نہیں تھی۔ اورنگ زیب نے کشمیر کے مغل گورنر سیف خان کو حکم دیا کہ کسی لائق اور معتمد اہل کار کے ذریعے دیلدن کے پاس نصیحت آمیز پیغام بھیجے کہ وہ راہِ ضلالت سے باز آجائے، اطاعت قبول کرے اور شاہی سکّہ اور خطبہ جاری کرے۔ مسجد تعمیر کرے اور راہِ راست پر آکر بادشاہی عنایت کا اُمیدوار ہو۔ اگر وہ باتیں نہ مانیں تو اُس پر چڑھائی کی جائے گی اور اُس کے ملک کو پامال کر دیا جائے گا۔

راجا دیلدن نمگیل کو بھی الگ سے ایسا ہی فرمان بھیجا۔ جو سیف خان نے ایک اہل کار محمد شفیع کے ہاتھ تبت (لداخ) روانہ کیا۔ راجا نے پہلے رُوگردانی کی لیکن بعد میں تعمیلِ حکم میں اپنی بہبودی جانی۔ پہلے ہی جمعہ کو اہلِ شہر کو شہر کے باہر جمع کیا۔ بادشاہ محی الدّین اورنگ زیب عالمگیر کے نام کا خطبہ پڑھوا لیا اور خطیب کے سر پر سونے چاندی کے پھول نچھاور کئے۔ خلعتِ فاخرہ پہنائی اور مسجد بنوائی۔ دو ہزار اشرفیاں اور نو ہزار روپے عالمگیر کے نام تحفے میں بھیجے۔ فرمان کے جواب میں ایک عرضداشت معہ نذرانہ کمال عبودیت ظاہر کر کے محمد شفیع کے ہاتھ روانہ کی اور اس کے ہمراہیوں کی خوب خدمت کی۔[1]

---

[1] ''تاریخِ ہند'' جلد ہشتم، ذکاءاللہ

پٹیک نے لکھا ہے۔ راجا کو مغل سرکار نے ''تبت بزرگ کا زمیندار'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ راجہ کے عمّال نے لیہہ سے چھ میل دُور محمد شفیع کا سواگت کیا۔

''تاریخِ کشمیر'' کے مصنّف محمد اعظم نے اِس واقعہ کو مغلوں کے ہاتھوں تبتِ بزرگ کی فتح سے تعبیر کیا ہے جو غلط ہے۔

۱۹؍دسمبر ۱۶۶۵ء کو اورنگ زیب کو اِس کا علم ہوا۔ بعد میں اورنگ زیب کا دُوسرا فرمان آیا۔ اُس کا مضمون یہ ہے:

''سیف خان کی تحریر سے معلوم ہوا کہ تم نے اطاعت قبول کی ہے اور مُلک تبت میں خطبہ اور سکّہ ہمارے نام کا جاری کرنا اور مسجد بنانا تسلیم کر لیا ہے۔ لہذا خطابِ راجگی اور خلعت سے تم کو سرفراز کیا جاتا ہے۔''

راجا دیلدن نمگیل کی طرف سے بھی اورنگ زیب کو اطاعت کا خط ملا۔ اس کے جواب میں مغل شہنشاہ نے لکھا:

''تمہاری عرضداشت پہنچی کہ تم نے خطبہ و سکّہ ہمارے نام کا اپنے ملک میں جاری کر دیا ہے اور مسجد کی تعمیر بھی شروع کر دی ہے۔ سیف خان نے بھی اس کی تصدیق کی۔ لہذا خلعتِ فاخرہ اور خنجر مرصع تمہاری سرفرازی کی غرض سے بھیجا جاتا ہے۔''

یہ ۶۷-۱۸۶۶ء کا واقعہ ہے جب لیہہ کی مسجد تعمیر ہوئی یا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

منشی حشمت اللہ نے اپنے قیام کے دوران لیہہ میں یہ فرمان دیکھے تھے۔ اُنہوں نے ''تاریخ کشمیر جموں و بلتستان'' میں لکھا ہے:

''مجھے بادشاہ عالمگیر کے دو فرمان بنام دیلدن نمگیل لداخ میں دستیاب ہوئے۔ ایک تقریباً ۱۰۷۸ھ مطابق ۱۶۶۱ء کا ہے جبکہ دُوسرے کا سنہ نہیں پڑھا گیا۔''

لوکینو پٹیک رقم طراز ہے کہ اورنگ زیب نے دیلدن نمگیل کا نام بدل کر مُسلم نام عاقبت محمود رکھا لیکن فرانکی اور حشمت اللہ نے یہ نام دیلدن نمگیل کے بیٹے اور

جانشین راجا دے لیگس نمگیل سے منسوب کیا ہے۔ لیکن لداخ کی تاریخ میں اِس نام کے رکھے جانے کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے تاہم دہلی کی سرکاری خط و کتابت میں یہی نام ہے۔

''عالمگیر نامہ'' میں بتایا گیا ہے کہ اورنگ زیب نے اسکردو کے حکمران مراد خان کو بھی خلعت عطا کیا۔

۱۶۶۶-۶۷ء میں کشمیر کے مغل گورنر کے نمائندے شیخ محی الدّین کی نگرانی میں لیہہ کی جامع مسجد تعمیر ہوئی۔

۱۶۷۴ء میں لداخ نے پھر ایک مرتبہ بلتستان کے معاملات میں مداخلت کی۔ اسکردو کے حکمران نے کشمیر کے مغل گورنر کو اطلاع دی اور پوریگ تک فوج آئی لیکن لداخیوں نے اُس فوج کو روک لیا اور معاملہ ٹل گیا۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ لداخ کے سرکردہ تاریخ دانوں اور تاریخ نویسوں میں مذکورہ راجوں کے دورِ حکومت کے سن وسال سے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سینگے نمگیل کے دور کو لیجئے۔ چار سرکردہ مورخوں اور ''لداخ گیالربس'' کی تاریخوں میں جو فرق ہے وہ حسب ذیل ہے:

نام مصنف	راجا سینگے نمگیل کا سنِ حکومت
ایس. ایس. گیرگن	۱۵۶۹ء-۱۵۹۴ء
حشمت اللہ	۱۶۱۰ء-۱۶۴۵ء
فرانکی	۱۵۹۰ء-۱۶۲۰ء
پٹیک	۱۶۲۴ء-۱۶۴۲ء
لداخ گیالربس	۱۵۹۰ء-۱۶۳۵ء

راقم نے پٹیک کی دی گئی تاریخوں کا حوالہ دیا ہے۔ میری دانست اور تحقیق کے مطابق پٹیک کی دی گئی تاریخیں زیادہ مستند ہیں۔

راجا دیلدن نمگیل کے بیٹے اور جانشین راجا دے لیگس نمگیل کے زمانے میں

بھوٹان اور تبت کے درمیان بودھوں کے دو فرقوں کے نام پر جھگڑا ہوا۔ دے لیگس نمگیل نے اس جھگڑے میں اپنی ٹانگ اَڑائی اور بھوٹان کی حمایت کی، جہاں لوگ سرخ فرقہ کے ڈوگپا عقیدہ کو مانتے ہیں۔ لہاسہ پر اس کا سخت ردِ عمل ہوا اور تبّتی اور قلمق کی ایک مشترکہ فوج نے لداخ پر ہلّہ بول دیا۔ لداخیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ راجا کو لیہہ چھوڑ کر پچیس میل دُور بزگو میں پناہ لینا پڑی۔ جہاں فریقین کی فوجوں کے درمیان لمبی مدّت تک جھڑپیں ہوتی رہیں۔

آخر کار دے لیگس نمگیل نے کشمیر کے مغل گورنر ابرہیم خان سے مدد کی درخواست کی۔ اورنگ زیب نے حملہ آوروں کی سرکوبی کی ہدایت دی۔ ابراہیم خان کے بیٹے فدائی خان کی سرکردگی میں مغل فوج لداخ روانہ ہوئی۔ تبت اور قلمق کی مشترکہ فوج کو شکستِ فاش ہوئی اور ہتھیار اور سامان چھوڑ کر فرار ہوگئی۔

فرانسیسی سیاح برنیر نے اس سے پہلے اورنگ زیب سے سرینگر میں ایک لداخی وفد کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ برنیر تب کشمیر میں تھا۔

دے لیگس نمگیل نے شہنشاہ ہند کے اقتدارِ اعلیٰ کو قبول کیا اور سالانہ خراج دینا مان لیا۔ دُوسری روایت کے مطابق ہر تیسرے سال خراج دینے کا فیصلہ ہوا۔ اس کے تحت ابلق گھوڑے ۱۸، مشک نافہ ۱۸ اور یاک کی ۱۸ عدد دُم میں مغل گورنر کو پیش کرنے کا معاہدہ ہوا۔ کشمیر کے گورنر نے راجا کو سرینگر کے پاس نوشہرہ میں جاگیر عطا کی۔ جس سے سالانہ پانچ سو بوریاں چاول آتی تھیں۔ جب تک کشمیر پر مغلوں کی عملداری رہی، یہ جاگیر بھی قائم رہی۔ اِس حساب سے لداخی حکومت گھاٹے میں نہیں تھی۔

راجہ اور مغلوں کے درمیان ایک معاہدہ عمل میں آیا۔ کشمیر کو ایک گاؤں دیا گیا۔ اس گاؤں کی نشان دہی نہیں ہوئی ہے۔ شاید یہ سونمرگ کے پاس واقع گاؤں نیلا گراٹ ہے جہاں لوگ بلتی نسل کے ہیں اور زبان کلچر وغیرہ بلتی اور لداخی ہیں۔ کشمیر کو

پشمینہ اور اُون کی تجارت پر اجارہ داری حاصل ہوئی۔ ''مآثرِ عالمگیری'' اور ''تاریخ کشمیر'' کے مطابق یہ معاہدہ لگ بھگ ۱۶۸۵ء میں عمل میں آیا۔ میر عزت اللہ ۱۸۱۲ء میں جب لداخ آیا تو معاہدے پر عمل ہو رہا تھا۔ اِس کے دس سال بعد جب مور کرافٹ لیہہ پہنچا تو لداخ کا آخری راجہ تنڈوپ نمگیل اُس معاہدے پر کاربند تھا۔

معاہدہ کے بعد فدائی خان واپس کشمیر لوٹا اور اپنے ساتھ دے لیگس کے ایک بیٹے جکسپال اور چند معززین کو یرغمال بنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ پٹیک نے جکسپال کو دیلدن نمگیل کا بیٹا بتایا ہے۔ اس لڑائی کے دوران دیلدن زندہ تھا اور دے لیگس کے حق میں تخت سے دستبردار ہوا تھا۔

تبت کی راجدھانی لہاسہ میں لداخ اور مغلوں کے تعلقات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ چنانچہ لہاسہ کی حکومت نے چھٹے ڈوگچین رینگبو چھے کو لداخ روانہ کیا۔ اُنہوں نے راجا سے کہا۔ ''ہم ہم قوم اور ہم مذہب ہیں۔ اگر غیروں کو مداخلت کی اجازت دی گئی تو اِس کا نتیجہ ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ آئندہ کے لئے ہم اقرار کرتے ہیں کہ کبھی لداخ پر حملہ نہیں کریں گے۔''

راجا نے اِتفاق کیا اور کہا کہ کشمیر کی طرف سے کبھی فوج کشی ہوئی تو وہ اِس کی مدافعت کا ذمہ دار ہوگا۔

لداخی راجا اور تبت کے مابین ۱۶۸۳ء میں تِنگ موگنگ کا مشہور معاہدہ عمل میں آیا اور لداخ تبت کی سرحدوں کی حد بندی ہوئی۔ تب سے ان سرحدوں پر کوئی تغیر وتبدّل نہیں ہوا ہے۔

تبت کے مذکورہ سیاسی مشن کا مغلوں اور لداخ کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ لداخ اور مغربی تبت کے پشمینہ پر کشمیر کی اجارہ داری رہی اور لداخی راجا مغل گورنر کو خراج بھیجتا رہا۔

۹؍جنوری ۱۶۹۶ء کو اورنگ زیب نے دے لیگس نمگیل کے وارث اور

جانشین راجا نیما نمگیل کو مراسلہ بھیجا۔ جس کا متن حسب ذیل تھا:

''آپ کے دادا راجہ عاقبت محمود خان کی موت کی خبر سنی۔ تم کو خلعتِ فاخرہ سے سرفراز کیا جاتا ہے اور منصب یک ہزاری ذات و یک ہزاری سوار دو اسپ اِمتیاز بخشا جاتا ہے۔ فرقہ قلمق کو اپنے ملک میں داخل ہونے نہ دو اور اپنے ملک کے لوگوں کو راضی اور شاکر رکھو اور شعائرِ اسلام کی ترویج میں کوشش کرتے رہو۔''

لداخی مورخ ایس. ایس. گیرگن کے پاس اس خط کا فارسی متن موجود ہے۔ نیما نمگیل نے اپنے باپ کی طرح مغلوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے۔ اُس کے بیٹے اور جانشین دیسکیونگ نمگیل کی بھی یہی پالیسی رہی۔

۶ رجب ۱۱۴۷ھ مطابق ۱۷۳۵ء کو مُغل فرمانروا محمد شاہ نے راجا دیسکیونگ نمگیل کو خلعت سے نوازا اور وفادار رہنے کے لئے حسب ذیل فرمان بھیجا:

''تمہاری عرضداشت ملی، جس میں تم نے لکھا ہے کہ تم مراتب عقیدت پر خلوص کے ساتھ قائم ہو۔ اِس بنا پر خلعتِ فاخرہ سے تم کو افتخار کیا جاتا ہے۔ تم کو لازم ہے کہ شکر گزاری کے ساتھ فرمانبرداری و خدمت گزاری میں ثابت اور راسخ ہو۔''

لداخ کے راجا پنچگ نمگیل (۵۳-۱۷۳۹ء) کے دور میں راجا اور اُس کے چچا اور پوریگ کے حکمران ٹشی نمگیل کے درمیان کسی بات پر سخت اِختلاف ہوا۔ چچا اور بھتیجا دونوں نے مغل حکمران سے رجوع کیا اور کشمیر کے گورنر سے مدد کی درخواست کی لیکن مغل حکومت زوال پذیر تھی۔ اب ہندوستان میں احمد شاہ درانی کا بول بالا تھا۔ ۱۷۴۸ء میں مغل فوج کو ایک زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس لئے فریقین کی درخواست بےکار گئی۔

تبت، چینی ترکستان اور کشمیر کی طرح مغلوں سے لداخ کے سماجی، تجارتی، ثقافتی اور مذہبی رابطے نہیں رہے۔ مغل فوج آندھی کی طرح آئی اور بگولے کی طرح واپس گئی۔ تاہم مغلوں کا لداخ کے آرٹ اور دُوسرے فنونِ لطیفہ پر اثر پڑا ہے۔

جیسا کہ اُوپر ذکر آیا ہے کہ بلتستان میں مغل ساز سنگیت اور موسیقی لانے میں بلتی شاہزادی گُل خاتون کا ہاتھ ہے۔ ۱۵۹۵ء میں آگرہ سے موسیقار اسکردو لائے گئے اور بلتی موسیقار کو تربیت کے لئے دہلی بھیجے گئے۔ ۱۶۰۰ء میں لداخی راجہ جمیا نگ نمگیل کی شادی ایک بلتی شاہزادی گیال خاتون سے ہوئی اور شاہزادی کی بارات کے ساتھ بلتی موسیقار اور موسیقی کے آلات جیسے سرنائی اور دمامہ وغیرہ بھیجے گئے۔ جو مغلوں کے دین تھے۔ بہت سی بلتی دُھنوں کے لئے فارسی الفاظ ہیں۔ ظاہر ہے یہ دُھنیں مغلوں کی بنائی ہوئی تھیں۔ ایسی کئی مقبول عام دُھنیں لداخ منتقل ہوئیں۔ جو پولو، تیراندازی، گھوڑ دوڑ، تلوار ناچ، پھول میلا وغیرہ میں استعمال ہوتی ہیں۔

اسکردو میں مغلوں کے طرز کا ایک محل اور ایک باغ بنایا گیا اور مغل دربار کی طرح اسکردو کے راجا کے ہاں دن میں پانچ مرتبہ نوبت بجائی جانے لگی۔ مغلوں کا اثر بڑی سرعت سے پڑنے لگا۔ کہتے ہیں اکبر کے دربار میں تمبا کو پہنچنے کے دس سال بعد لداخ کا راجا اِس کے نمونے چن رہا تھا۔

۱۶۴۲ء کے لداخ تبت معاہدہ کے بعد لداخ نے پانچویں دلائی لاما کے دربار میں موسیقار بھیجے۔ اس طرح تبت کو پہلے پہل ساز سنگیت کے آلات اور مخصوص دُھن ''گارا'' سے روشناس کیا۔

کئی مستشرقین نے لداخ میں مغل آرٹ کی نشان دہی کی ہے۔ چارلس گینوڈ نے الچی وہار کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی کتاب Wall Paintings of Ladakh میں لکھا ہے: ''اویلو کیتیشورا کے لباس اور تارا کے ہم جلیسوں میں مغل آرٹ کا گہرا اثر ہے۔'' گینوڈ نے قیاس آرائی کی ہے کہ مصوّروں کے تیئں اورنگ زیب کی عدم سرپرستی کی وجہ سے چند مصوّر لداخ چلے گئے ہوں گے یا دے لیگس نمگیل کے عہدِ حکومت میں تبت اور لداخ کے درمیان لڑائی کے دوران فوج کے ہمراہ کچھ مصوّر بھی آئے ہوں گے، جو لداخ رُک گئے ہوں گے۔

ڈیوڈ سنیل گرو اور سکوروپسکی رقم طراز ہیں کہ کشمیر میں اسلام کی آمد کے بعد بھی لداخ میں مغل اور اس کے آرٹ کا اثر قائم رہا۔ لداخی راجوں نے مغل طرز کی پوشاک اختیار کی۔

منجیت سنگھ نے بھی الچی وہار کی مصوّری پر مغل آرٹ کے اثر کا ذکر کیا ہے۔

مورکرافٹ کے ایک منشی کے مطابق اُنیسویں صدی کے پہلے ربع میں وسط ایشیا اور ہندوستان کا مغل فیشن لداخ کے شاہی دربار میں مقبول ہو چکا تھا۔

لداخ کی مساجد اور امام باڑوں کے فنِ تعمیر میں اسلامی اور مغل آرٹ کا اثر نمایاں ہے۔ خطّے کے پرانے محلات وغیرہ کے جھروکوں میں Latticed یعنی دھات کی تاروں کا جو کام نظر آتا ہے، وہ مغلوں سے ورثہ میں ملا ہے۔

بلتی غزل سارے لداخ میں بڑی مقبول ہے۔ یہ فارسی شاعری کی دین ہے۔ فارسی مغلیہ حکومت کی سرکاری زبان تھی۔ لداخ کے راجوں نے کشمیر کے مغل گورنر سے فارسی میں خط و کتابت کے لئے منشی تعینات کیا تھا۔ کم سے کم ایک لداخی راجا چھیتن نمگیل (۱۸۲۰-۱۸۰۰ء) کی اچھی فارسی دانی کا تذکرہ تاریخ میں ملتا ہے۔ وہ کشمیری زبان بھی بخوبی جانتا تھا۔

گوشتابہ، روغن جوش، یخنی اور کباب جیسے گوشت کے پکوان کشمیر سے لداخ آئے، جو وسط ایشیا اور مغلوں کی خوراک ہیں۔

میری دانست میں مغلیہ حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے لداخ کو سیاسی طور برِ صغیر ہند کی چھتری تلے رکھا اور ہمسایہ ملکوں کی سیاسی ریشہ دوانیوں، توسیع پسندی اور دستبرُد سے محفوظ رکھا۔ مغلیہ حکومت اپنے زمانے میں ایشیا میں ایک بڑی طاقت تھی۔ اگر مغل حکمران لداخ کی علاقائی سلامتی سے دِلچسپی نہ رکھتے تو غالباً لداخ کی تاریخ آج مختلف ہوتی۔

لداخ اور بڑی طاقتوں کی سیاسی کشمکش

(تاریخی پس منظر)

جغرافیائی اور فوجی نقطۂ نظر سے لداخ کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اِس لئے یہ ماضی میں ہمسایہ طاقتوں کی سیاسی کشمکش کا گہوارہ رہا ہے۔ ساتویں صدی کے وسط سے نویں صدی کے آغاز تک لداخ سے گلگت تک کا پورا خطہ چین، کشمیر، تبت اور عربوں کی متصادم فوجوں کی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ ان لڑائیوں میں کبھی ایک فریق کا پلّہ بھاری رہتا تھا اور کبھی دُوسرے کا۔ اُس زمانے کے مشہور حکمرانوں میں تبت کے رونگ ژن گیا لپو، ٹھیرونگ دیستن، کشمیر کے للتا دتیہ، عربوں کے خلیفہ آل مہدی، ہارون الرشید اور مامون الرشید کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اُس زمانے میں چین میں تانگ خاندان کی حکومت تھی۔

تمدّنی اور تجارتی لحاظ سے بھی اس خطّے کو بڑی افادیت حاصل ہے۔ سکردو، خپلُو (بلتستان) خلسے، ٹانگچے (لداخ)، چیلاس، گلگت، ہُنزہ اور شاہراہِ قراقرم کے ساتھ ساتھ چٹانوں پر کھدی ہوئی برہمی، سنسکرت، کھروشتی، چینی، تبّتی، شاردا اور عربی تحریریں، ستوپاؤں، بدھ، بدھی ستوؤں، بودھ راہبوں، جانوروں، مندروں کی تصویریں اور نسطوری عیسائیوں کی بنائی ہوئی صلیب کی شبیہیں اِس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ یہ خطّہ ماضی میں مختلف قوموں کی سرگرمیوں کا مرکز اور آپسی میل جول کا سنگم تھا۔ ان میں کئی تصویریں قبل تاریخ ازمنہ اور کئی تحریریں قبل مسیح کی بتائی جاتی ہیں۔

اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے دوران لداخ ایک اور مرتبہ بڑی طاقتوں کی سیاسی کشمکش اور فوجی ریشہ دوانیوں کا شکار رہا۔ اب کی دفعہ لداخ کے نقشے پر رُوس، چین، افغانستان اور برطانوی ہند سرکار نظر آتی ہے۔ فریقین کی سیاسی کشمکش اور خاص طور پر رُوس کی توسیعی پالیسی کی وجہ سے لداخ کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوا۔ کوئی آدھی صدی تک رُوس اور برطانوی ہند (برٹش اِنڈیا) کے درمیان خطّے میں جنگ کے بادل منڈلاتے رہے اور کئی ایسے مرحلے آئے جب دونوں تصادم کے دہانے پر پہنچے۔ اس کی بازگشت لندن، پیرس، سینٹ پیٹرز برگ (تب ماسکو کے بجائے سینٹ پیٹرز برگ رُوس کی راجدھانی تھا) اور یورپ کے ملکوں کی دُوسری راجدھانیوں میں سنائی دے رہی تھی۔

چار صدیوں سے رُوس کی مقبوضہ سلطنت روزانہ پچپن مربع میل اور سالانہ بیس ہزار مربع میل کے حساب سے پھیل رہی تھی۔ اُنیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان میں برطانوی ہند اور رُوس کی سرحدوں کا فاصلہ دو ہزار میل تھا جبکہ اسی صدی کے اِختتام پر پامیر میں دونوں کی سرحدوں کے مابین صرف بیس میل کا فاصلہ رہ گیا۔

رُوس کی نظر ہندوستان پر تھی اور رُوسی فوج کی پیش قدمی کے لئے لداخ اور گلگت کو ایک دروازہ سمجھا جاتا تھا۔

رُوس کے شہنشاہ پیٹر دی گریٹ نے اٹھارویں صدی کی پہلی چوتھائی میں اپنے جانشینوں کو وصیت کی تھی کہ جب تک ہندوستان اور استنبول پر، جو اُن دنوں ترکی کا دارلخلافہ تھا، رُوس کا قبضہ نہ ہو آرام نہ کریں۔

۱۷۹۱ء میں رُوس کی ملکہ کیتھرائن نے انگریزوں سے ہندوستان چھیننے کا ایک منصوبہ بنایا تھا۔ ۱۸۰۰ء میں نپولین بونا پارٹ اور رُوس کے شہنشاہ زار پال اوّل کے درمیان ایک معاہدہ ہوا، جس کی رُو سے دونوں کے درمیان انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنا طے پایا۔ اِسی سلسلے میں ۲۹ رجنوری ۱۸۰۱ء کو بائیس ہزار رُوسی

فوجیوں کو ہندوستان کی سرحد کی جانب پیش قدمی کا حکم ملا۔ اسی حکمت عملی کے تحت نپولین کی چالیس ہزار فوج مصر پہنچی۔ اسی اثناء میں زار رُوس اوّل قتل ہوا اور رُوسی فوج واپس بلائی گئی۔

انگریزوں نے اس کے توڑ میں سفارتی راستہ اختیار کیا۔ طہران، کابل اور لاہور سفارتی مشن بھیجے۔ ایران اور ترکی سے معاہدے کیے۔ اس طرح عارضی طور ہندوستان پر رُوس اور فرانس کے مشترکہ حملے کا خطرہ ٹل گیا۔

اُس زمانے میں برطانیہ ایک مضبوط سامراجی طاقت تھا۔ تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس زمانے میں ہندوستان کی علاقائی یک جہتی قائم رکھنے کے لئے برطانوی ہند نے اہم کردار ادا کیا۔ روس اور برطانیہ کی رقابت اور کشمکش GREAT GAME کے نام سے مشہور ہوئی۔

۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی ہند سرکار اِس خطّے کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لینے لگی۔ اُسی سال مہاراجہ رنبیر سنگھ تخت پر بیٹھا تھا۔ بعد میں انگریزوں نے گلگت اور لیہہ میں غیر ملکیوں کی آمد پر پابندی لگانے کا فیصلہ کیا۔

اپنی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے لداخ کے خود مختار راجے کاشغر، لہاسہ کی سرکاروں اور کشمیر کے گورنر کے ذریعے دہلی کی حکومت کو اپنے ہمسایوں کی فوجی اور سیاسی صورت حال سے باخبر رکھتے تھے اور کئی دفعہ اپنی سیاسی مصلحت کوشی کے تحت غلط اِطلاعات فراہم کرتے تھے۔ چنانچہ لداخ کی حکومت کی طرف سے کبھی کشمیر کے مغل گورنر کو تبت یا چین کی فوجی نقل و حرکت کا گھڑا ہوا افسانہ سنایا جاتا تھا اور کبھی کشمیر یا سنکیانگ کی عسکریت پسندی کا قصہ سنا کر تبت سے یک جہتی اور دوستی کا دم بھرا جاتا تھا۔ اِس طرح لداخ اپنے پڑوسیوں میں اپنی حیثیت اور اعتماد برقرار رکھنے میں کامیاب رہتا تھا۔

لداخ میں ایک معمولی واقعہ پڑوسیوں کے لئے باعثِ تشویش تھا، جب

۱۸۲۰ء میں ایک انگریز مورکرافٹ کو لداخ کے راجہ چھپیل تنڈوپ نمگیل نے لداخ میں داخلہ اور گھومنے پھرنے کی سہولت دی تو لہاسہ اور کشمیر کے گورنروں کے علاوہ اسکردو کے راجہ احمد شاہ نے بھی اپنی تشویش کا اِظہار کیا۔ پنجاب کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مورکرافٹ کے خلاف ایسٹ انڈیا کمپنی سے شکایت کی۔

اُنیسویں صدی میں جب چینی ترکستان میں چین کے خلاف بغاوت ہوئی اور یعقوب بیگ برسرِ اِقتدار آیا تو شہنشاہ چین نے لداخ کے راجا کو ایک خط میں درخواست کی کہ کاشغر میں فوجی نقل وحرکت سے متعلق کوئی خبر ملے تو اِس کی اِطلاع لہاسہ کو دے۔ مورکرافٹ نے لیہہ میں اپنے قیام کے دوران یہ خط دیکھا تھا۔ اس پر چین کے شہنشاہ کی مہر تھی۔ چین سے لداخی راجہ کو بیش قیمت تحفے تحائف آتے تھے۔

تبت اور لداخ کو منگول حملوں کا بھی خطرہ رہتا تھا۔ اٹھارویں صدی کی شروعات میں لداخ سے ایک سیاسی مشن پیکنگ (موجودہ بیجینگ) روانہ ہوا اور منگول فوجوں کی یورش روکنے کے لئے مشترکہ قدم اُٹھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اُدھر منگولیا کی حکومت نے لداخی راجا کو لبھا کر اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی لیکن لداخ کی حکومت نے چینِ کو ترجیح دی۔

لداخ صدیوں سے اپنے پشمینہ کے لئے مشہور ہے۔ ہمسایہ علاقوں کی نظر اس کے پشمینہ پر رہتی تھی۔ مغربی تبت کا پشمینہ بھی لداخ کے راستے کشمیر جاتا تھا، جہاں اس کا مشہورِ زمانہ شال تیار کیا جاتا تھا۔ مغل بیگمات کو یہ شال بہت مرغوب تھا۔ مغل حکمران اکبر، شاہجہان اور اورنگ زیب لداخ سے درآمد ہونے والے پشمینے کی اہمیت سے باخبر تھے۔

۱۶۸۴ء میں لداخ کے راجا دیلیکس نمگیل کے زمانے میں تنگ موگنگ معاہدہ ہوا، جس کی رُو سے پشمینہ کی خریداری کی اجارہ داری صرف کشمیر کو حاصل ہوئی۔ یہ مغلوں کے سیاسی دباؤ کا نتیجہ تھا اور اس میں لداخیوں کا مفاد بھی تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی پشمینہ سے گہری دلچسپی تھی۔ برطانیہ اپنے ملک میں پشمینہ کی افزائش کا خواہاں تھا۔۱۷۷۴ء میں وائسرائے وارن ہیسٹینگز نے جارج بوگلے کو سیاسی اور تجارتی مشن پر تبت روانہ کیا۔ بوگلے کو دو پشمینہ بکریاں لانے کی ہدایت دی گئی۔ نو سال بعد ۱۷۸۳ء میں سموئیل ٹرنر اور ۱۸۱۱ء میں تھامس مائینگ سیاسی مشن پر تبت روانہ ہوئے۔ کمپنی کی طرف سے ۱۸۱۰ء میں ایک برطانوی تاجر گیل مان کو پشمینہ کا نمونہ یا شال لانے کے لئے تبت کے تجارتی قصبہ گرتوق بھیجا گیا۔ لداخ کے راجا کو اندیشہ ہوا کہ پشمینہ پر اِس کی اجارہ داری ختم ہوگی۔ چنانچہ اس نے گرتوق کے گورنر سے احتجاج کیا۔ گرتوق کے گورنر نے لوگوں کو حکم دیا کہ لداخیوں کے بغیر کسی کو پشمینہ فروخت نہ کریں۔ جس ملازم نے گلمان کو پشمینہ بکری اور پشمینہ فروخت کیا تھا، اُس کو پھانسی کی سزا دی۔ اس کے دو سال بعد گرتوق کے گورنر کو مورکرافٹ کو پشمینہ بیچنے کے جرم میں ہتھکڑی پہنا کر لہاسہ لیا گیا اور تین سال قید کی سزا دی۔ گرتوق مغربی تبت کی گرمائی راج دھانی تھا۔

اِیسٹ انڈیا کمپنی' رام پور (ہماچل) کو پشمینہ کی تجارت کا ایک مرکز بنانا چاہتی تھی۔ ۲۱-۱۸۲۰ء میں کمپنی نے وہاں ایک فیکٹری قائم کی۔ ۱۸۳۴ء میں رام پور میں پشمینہ کی درآمدات بہت کم تھیں لیکن اس کے تین سال بعد درآمد میں دو سو فیصد کا اضافہ ہوا۔ تاہم کمپنی کو اپنے مقصد میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ رام پور میں پشمینہ سمگل ہوتے دیکھ کر کشمیر کی ڈوگرہ حکومت کو کمپنی کی نیت پر شک ہوا اور زورآور سنگھ کو لداخ پر حملہ کرنے کی تحریک ملی۔ گلاب سنگھ کی نظر شروع سے پشمینہ پر تھی۔ وہ کشتواڑ کے راستے پشمینہ درآمد کرنا چاہتا تھا۔ جس میں وہ کامیاب نہیں ہوا۔

لداخ میں مورکرافٹ کے قیام کے زمانے میں ہندوستان میں انگریزوں کے قدم مضبوطی سے جم گئے تھے۔ مشیروں کی صلاح اور مورکرافٹ کی حوصلہ افزائی سے لداخ کا راجا چھپل تنڈوپ نمگیل انگریزوں سے دوستی کا خواہاں تھا۔ مورکرافٹ

نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک خط لکھا کہ لداخ کے ساتھ کمپنی کے مفاد کے لئے سیاسی اور تجارتی تعلقات قائم کرے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مور کرافٹ کی پُر زور مخالفت کی اور دہلی کے انگریز ریذیڈنٹ میڈ کلف سے شکایت کی کہ مور کرافٹ کمپنی کی اجازت کے بغیر لداخ کا دورہ کر رہا ہے اور اسکردو کے راجہ احمد شاہ سے مل کر ساز باز کر رہا ہے۔ کمپنی نے ۱۸۰۹ء میں مہاراجہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا جس کے تحت مہاراجہ کو دریائے ستلج کے شمال میں فوجی پیش قدمی کا حق ملا تھا۔ کمپنی اِس معاہدہ کی پابند تھی۔ اس لئے مور کرافٹ کی تجویز مسترد کی۔

اِس معاہدے کی آڑ میں اور کمپنی سے اجازت لے کر گلاب سنگھ کے جرنیل زورآور سنگھ نے ۱۸۳۴ء میں لداخ پر فوج کشی کی۔ اس حملے کی ایک بڑی وجہ پشمینہ کا حصول بتایا جاتا ہے۔ اس سے ایک سال پہلے ۱۸۳۳ء میں ایک انگریز سیلانی ہنڈرسن ایک مسلمان تاجر کا بھیس بدل کر لداخ آیا تھا۔ اُس نے اپنا نام اسمٰعیل خان رکھا تھا۔ زورآور کے حملے کے بعد لداخی حکومت نے اُس کو یرغمال بنایا اور زورآور سنگھ کے خلاف اُسے انگریزوں کی حمایت ڈھونڈنے کے لئے اِستعمال کرنا چاہا لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئی۔

۱۸۴۰ء میں جب وزیر زورآور سنگھ نے تبت پر حملہ کیا تو برطانوی ہند کو تشویش ہوئی۔ وہ چین کو کسی قسم کا اشتعال دینا نہیں چاہتا تھا۔ کھٹمنڈو میں برطانوی نمائندہ B.H. HODGSON کمپنی کے مفاد کے لئے گلاب سنگھ کی طرف سے چین کے خلاف کوئی اشتعال انگیز قدم لینے کے خلاف تھا۔ چنانچہ ۱۸۴۱ء میں کپتان اے. ڈی. کننگھم اور وین ایگنیو (VAN AGNEW) کو وزیر زورآور سنگھ کو روکنے کے لئے لداخ بھیجا لیکن اُن کے پہنچنے سے پہلے ہی وزیر زورآور سنگھ تبت کی مہم میں مارا جا چکا تھا اور ڈوگرہ فوج کو سخت ہزیمت اُٹھانی پڑی تھی۔ تب سے لداخ، تبت اور وسطِ ایشیا میں انگریزوں کی ڈپلومیسی اور سیاسی حکمت عملی کا آغاز ہوا۔ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ

کی ہدایت پر ۱۸۴۶ء میں الیگزنڈر کنینگھم اور دو ماہرین ڈاکٹر تھامس تھامسن اور ہنری سٹریچی لداخ پہنچے۔ ان کے ذمہ لداخ کا سروے کرنا، جاسوسی اور برطانوی ہند کے لئے تبت سے پشمینے کی درآمدات کے لئے راستہ وغیرہ حاصل کرنا تھا۔ انہوں نے برطانوی ہندسرکار کو اپنی خفیہ رپورٹ پیش کی۔ کنینگھم نے خطے سے متعلق "لداخ" کے عنوان سے ایک علمی اور تحقیقی کتاب لکھی۔ ڈاکٹر تھامس تھامسن ماہرِ حیاتیات تھا۔ اُس نے بھی ایک کتاب لکھی جس میں لداخ کی نباتات اور جڑی بوٹیوں کا ذکر ہے۔ وہ زنسکار بھی گیا تھا۔

۱۸۴۶ء میں برطانوی ہندسرکار نے سیاسی اور تجارتی مقاصد کے لئے لداخ کا سپیتی علاقہ اپنی تحویل میں لیا اور اِس کے عوض گلاب سنگھ کو جموں اور پٹھانکوٹ کے درمیان لکھن پور اور ہزارہ میں ایک چھوٹا سا علاقہ دیا۔

رُوس کی توسیع پسندی اور سرگرمیوں پر انگریزوں کی تشویش بڑھی۔ اسے ۳۶ سال پہلے لداخ میں اپنے قیام کے دوران مورکرافٹ کو رُوس کی توسیع پسندی اور لداخ کے راجا اور رنجیت سنگھ سے سفارتی تعلقات بڑھانے سے متعلق رُوس کی حکومت کی کوششوں کا علم ہوا تھا۔ اُن دنوں ایک یہودی آغا مہدی کے جعلی نام سے زار رُوس کے لئے لداخ میں کام کرتا تھا۔ مورکرافٹ کو اُس کی لائی ایک چٹھی بھی ملی جو رُوس سرکار نے پنجاب کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کو لکھی تھی۔ رُوس کو ہندوستان سے متعلق اچھی معلومات تھیں۔ ۱۸۴۱ء میں ایک سرکردہ رُوسی شہزادے A.D. SALIKOVA نے ہندوستان کی سیاحت کی تھی اور ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ ۱۸۴۷ء میں وہ دوبارہ ہندوستان آیا تھا۔

۱۸۶۰ء میں انگریزوں کی ایما پر مہاراجہ رنبیر سنگھ نے گلگت فتح کیا۔ ہُنزہ کا میر کشمیر سرکار کا باج گزار بنا۔

برطانوی سرکار کی طرف سے سنٹرل ایشیا اور تبت میں مخبری سروے اور مختلف

سیاسی اور تجارتی مشن پر وقتاً فوقتاً متعدد انتظامی اور فوجی افراد روانہ کئے گئے۔ اُن کی پہلی منزل لداخ تھی۔

شلیے گین ویٹ کمپنی کا پہلا مہم جو ملازم تھا جو ۱۸۵۷ء میں سنٹرل ایشیا کے تحقیقی دورے پر روانہ ہوا۔ وہ سنٹرل ایشیا میں پُراسرار طور مارا گیا۔ بعد میں اس کی اہم ڈائری دستیاب ہوئی جو کسی دُکاندار کو اونے پونے دام ردّی میں بیچی گئی تھی۔

۱۸۶۲ء میں گوڈوین آسٹین اور جانسن اور ۱۸۶۳ء میں RYALL اپنی مہم پر روانہ ہوئے۔ ٹی۔ جی۔ منٹگمری، جو ٹرگنومیٹریکل سروے آف انڈیا (TRIGNOMETRICAL SURVEY OF INDIA) کا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھا ۱۸۶۲ء میں لداخ آیا۔ اس نے کئی بھارتیوں کو مخبری اور راستوں کے سروے سے متعلق ٹریننگ دی۔ نین سنگھ اور مانی سنگھ نے شلیے گین ویٹ کے دو بھائیوں رابرٹ اور ہرمن کے ساتھ خطّے کا سفر کیا۔ یہ پہلے یورپی تھے جنہوں نے قراقرم اور کیون لین کے سلسلہ ہائے کوہ کو عبور کیا۔

منٹگمری کے زیرِ نگیں ۱۸۶۵ء تک لداخ اور سنکیانگ کے درمیان پہاڑی سرحدوں کا سروے ہوا۔ صورتِ حال کی نزاکت کے پیشِ نظر برطانوی ہند نے اُسی سال لندن اور ہندوستان کے درمیان تار کی لائن بچھائی۔

۱۸۶۵ء میں رُوس نے تاشقند پر قبضہ کیا۔ ۱۸۶۶ء میں قوقند اور ۱۸۶۷ء میں پانی گرگن پر اپنا تسلّط جمایا۔ رُوس کی یہ پیش قدمی برطانوی ہند کے لئے باعثِ تشویش تھی اور سرینگر اور لیہہ میں ڈوگرہ سرکار کی مخالفت کے باوجود اپنے پولیٹیکل آفیسر تعینات کئے۔ ہنری کیلے نے ۱۸۶۷ء میں پہلے برٹش جوائنٹ کمشنر کی حیثیت سے لیہہ میں اپنا عہدہ سنبھالا۔

۱۸۶۸ء میں رُوس نے سمرقند پر قبضہ جمایا۔ منٹگمری نے ۱۸۶۹ء میں لداخ کے راستے منشی محمد حمید کو چینی ترکستان جاسوسی اور سروے پر بھیجا۔ منشی سفر کے دوران فوت ہوا۔ تاہم اُس کی دستاویزات ہاتھ آئیں۔ اِس سے پہلے کوئی یورپی اس علاقے

میں نہیں پہنچا تھا۔ منٹگمری منشی کا بڑا مداح تھا اور رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کے ممبروں کے سامنے منشی کی کارکردگی کی سراہنا کی۔

۱۸۷۰ء میں ڈوگلس فورسیتھ کی قیادت میں ایک اہم تجارتی مشن چینی ترکستان روانہ ہوا۔ مشن کے ہمراہ کئی سائنس دان اور ماہرین تھے۔ اُن دنوں چینی ترکستان کا حکمران یعقوب بیگ تھا۔ اُسی سال کیلئے ایک سال بعد ۱۸۷۱ء میں منٹگمری اور ۱۸۷۳ء میں ٹروٹر نے سرحدوں وغیرہ کی سروے کا کام کیا۔ اسی دوران خشکی کے راستے تارلائن محفوظ نہ ہونے کے سبب سمندری راستے کیبل بچھایا گیا۔

اِدھر ۱۸۷۳ء میں خیوا پر رُوس نے قبضہ کیا اور رُوس فوج ہندوستان کی سرحد کے قریب پامیر تک پہنچی۔ جغرافیائی طور پامیر کی بڑی اہمیت تھی۔ یہاں سے تاریخی سلک روڈ کی کئی شاخیں گزرتی ہیں۔ رُوس، چین اور افغانستان تینوں پامیر کے دعوے دار تھے اور اُن کی فوجوں میں اِسی خطّے میں آئے دن جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔

۱۸۷۳ء میں ڈوگلس فورسیتھ کو دوبارہ فوجی نوعیت کی اطلاعات حاصل کرنے کے لئے سنٹرل ایشیا روانہ کیا گیا۔ فورسیتھ نے رپورٹ دی کہ رُوس پامیر سے حملہ کرے گا اور اس اندیشے کا اظہار کیا کہ اگر باراکھیل اور ایش کومان کے درّوں پر غنیم کا قبضہ ہو جائے تو چترال، گلگت اور یاسین کی وادیوں پر اس کی بالادستی قائم ہو جائے گی اور اس صورت میں جلال آباد، پنجاب اور پشاور کو خطرہ لاحق ہوگا۔ اس کے بعد کپتان J.BIDDULPH کو بھیجا گیا۔ اُس نے بھی فورسیتھ کی رپورٹ کی تصدیق کرتے ہوئے یہ اِطلاع دی کہ کرغیز کی جانب سے پامیر کے راستے کسی بھی مسلح فوج کو اندرونِ سرحد چند میل گھس آنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

برطانوی ہند نے ہندوستان کے ہمسایہ ملکوں بھوٹان، نیپال، سکم اور تبت کو بفر ریاستیں بنائیں اور چترال، ہُنزہ اور نگر کے لئے نئی پالیسیاں بنائیں۔ ایک انگریز افسر MACARTNEY نے قراقرم اور کیون لین کے درمیان ایک آزاد اور غیر جانبدار

ریاست بنانے کے امکان کا جائزہ لیا۔

یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا جاتا تھا کہ پامیر کے علاوہ ہندوستان پر حملہ کرنے کی صورت میں پنجاب کے میدانوں میں پہنچنے سے پہلے رُوسی فوج کو لداخ سے گزرنا پڑے گا۔ اُن دنوں رُوس کی طرف سے حملہ ناگزیر سمجھا جاتا تھا۔

تاہم سر ہنری رالنسن کا خیال مختلف ہے۔ وہ ۱۸۶۷ء میں لکھتا ہے:

''کوئی بھی فوج قراقرم درّے سے پنجاب تک پھیلے ہوئے اِن عظیم پہاڑوں کے سلسلے کو عبور کر کے فوج کشی کرنے کی کوشش کرنے سے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی جہاں ۱۵ ہزار سے ۱۹ ہزار فٹ کے درمیان متعدد اُونچے درّے ہیں۔ ہند کی شمال مغربی سرحد پر یہ سب سے دُشوار گذار خطّہ ہے۔ اِس لئے دونوں طاقتوں کے درمیان یہاں کسی ٹکراؤ کا امکان نہیں ہے۔''

اُس کے برعکس رابرٹ شا اور ایک انگریز فوجی افسر ہیوَرڈ نے حکومت کو یہ رپورٹ دی کہ لیہہ کے شمال مشرق میں واقع اٹھارہ ہزار فٹ بلند درّہ چنگ لونگ حملہ آوروں کو لداخ آنے کے لئے چور دروازہ کا کام دے گا۔ اِس لئے اس درّہ پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ رابرٹ شاہ بعد میں لیہہ میں برٹش جوائنٹ کمشنر رہا۔

لداخ کے دو برٹش جوائنٹ کمشنر NEY ELIAS اور کپتان ایچ رمزے نے کہا تھا کہ قراقرم سے شہید ولہ تک راستہ نہیں بنانا چاہئے تاکہ قراقرم یا چنگ چھنمو سے لداخ آنے کے راستے رُوسی جارحیت کے خلاف رکاوٹ بنے۔ اُن کی یہ دلیل تھی کہ راستہ بنانے کی صورت میں حملہ آور فوج کو نقل وحرکت میں آسانی ہوگی۔ شہید ولہ چینی ترکستان کے تجارتی شہر یارقند سے ۶۵ میل دُور ہے۔ یہاں سے لداخ اور چینی ترکستان کے درمیان تجارتی قافلوں کی آمد ورفت رہتی ہے۔

۱۸۷۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے گلگت میں ایک انگریز افسر ایجنٹ کے نام سے تعینات کیا۔

ڈوروتھی وُوڈمین اپنی کتاب HIMALAYAN FRONTIERS میں لکھتا ہے:

''کمپنی لداخ کو ایک قسم کا ELDORADO سمجھتی تھی۔''

ELDORADO ایک دیومالائی دیش ہے جہاں سونا بڑی کثرت سے ملتا ہے یا آسانی سے دولت پیدا کی جاسکتی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کے حکمران مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۸۵-۱۸۵۷ء) نے انگریزوں کی شہہ اور کبھی اپنی پہل پر سنٹرل ایشیا جاسوس اور سفارت کار بھیجے۔ درپردہ مہاراجہ انگریزوں کے بجائے رُوس کو ہندوستان پر قابض دیکھنا چاہتا تھا۔ ۱۸۶۴ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے قادر جُو اور میاں صلاح سنگھ کو سیاسی مشن پر چینی ترکستان کے شہر یارقند بھیجا۔ نیز اُس کے حکم پر سولہ خان بندوقی سنٹرل ایشیا میں چین کی فوجی طاقت کا جائزہ لینے لگا۔ مہاراجہ نے انگریزوں سے یارقند اور کاشغر میں فوجی مہم بھیجنے کے لئے اجازت مانگی۔ ایسا لگتا ہے انگریزوں نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔

رنبیر سنگھ نے لیہہ، یارقند، ختن، بدخشاں، قوقند اور شگر میں اپنے جاسوس رکھے تھے اور اُن کی رپورٹ وائسرائے کو بھیجتا تھا۔ جاسوس کی تربیت کے سلسلے میں سرینگر میں Russian Language School کے نام سے ایک ادارہ کھولا تھا جہاں رُوسی اور سنٹرل ایشیا کی دُوسری زبانیں سکھائی جاتی تھیں۔

برٹش سرکار کی پالیسی اور ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی وجہ سے مہاراجہ اندر ہی اندر تلملا رہا تھا لیکن مخالفت کرنے کی ہمت نہیں تھی اور نہ مزاحمت کی طاقت تھی۔ ۱۸۶۵ء میں مہاراجہ نے خفیہ طور دو قاصد سرفراز خان اور عبدالرحیم خان تاشقند بھیجے اور مہاراجہ کا خط تاشقند کے گورنر میجر جرنیل ایم. جی. چرنی اوف کو دیا۔ خط میں رُوس سے دوستی بڑھانے کی خواہش کا اِظہار کیا گیا تھا اور لکھا تھا کہ ہندوستان کے لوگوں میں انگریزوں کے خلاف بے چینی پائی جاتی ہے۔ چرنی اوف نے یہ خط اپنے افسرِ اعلیٰ اورین برگ کے گونر جنرل کو بھیجا۔ جس نے رُوسی حکومت سے

مشورہ کر کے یہ ہدایت دی کہ کشمیری سفارت کاروں کے سامنے انگریزوں کے خلاف کچھ نہ کہیں۔ دراصل وہ سفارت کاروں کی اصلیت کی جانچ کرنا چاہتا تھا۔ چھ ماہ تاشقند میں قیام کے دوران اُن پر کڑی نظر رکھی گئی۔ آخر کار اُنہیں اور اُن کے مشن کو صحیح قرار دیا گیا۔

لیہہ میں انگریز جوائنٹ کمشنر ہنری کیلئے آنے جانے والوں پر کڑی نظر رکھواتا تھا۔ اِس لئے مہاراجہ کے ایجنٹ کسی تجارتی قافلے کے ہمراہ یا بھکاری کے بھیس میں لداخ کے بجائے کابل وغیرہ سے سنٹرل ایشیا جانے لگے۔ خطوط بھی کوڈ میں لکھے جاتے تھے۔ رُوس کے لئے کوڈ لفظ احمد خان ترکی اور مہاراجہ کے لئے مرزا اسحٰق تھا۔

۱۸۶۵ء میں چینی ترکستان میں چین کے خلاف کامیاب بغاوت کا فائدہ لیتے ہوئے مہاراجہ نے لیہہ سے ۷۰ امیل دُور قراقرم درّہ سے آگے اہم مقام شہیدولہ پر قبضہ جمایا اور وہاں ایک قلعہ تعمیر کیا۔ انگریزوں کو یہ قبضہ راس نہیں آیا۔

۱۸۶۹ء میں مہاراجہ کے ایک معتمد اہل کار بابا کرم پرکاش نے تاشقند کے گورنر کو مہاراجہ کا خفیہ پیغام پہنچایا۔ تاشقند کے گورنر جنرل کاف مان نے مہاراجہ کے تئیں رُوس کی دوستی کا اِظہار کیا۔ کشمیر واپس آ کر بابا کرم پرکاش ایک اور مرتبہ اپنے مشن پر تاشقند روانہ ہوا۔ ایک شخص گلاب خان نے، جو غالباً انگریزوں کا ایجنٹ تھا، مہاراجہ کی طرف سے رُوسی گورنر جنرل کو بھیجے گئے خط کے متن کا اِنکشاف کیا۔ جس میں اور باتوں کے علاوہ یہ لکھا تھا۔ ’’ہم انگریزوں کی فرمان برداری اِس لئے کرتے ہیں کہ رُوس بہت دُور ہے۔ آپ جب ہندوستان آئیں گے تو ہم دل و جان سے آپ کی خدمت کریں گے۔ ہماری طرح ہندوستان میں سارے اہم لوگ انگریزوں سے بدظن ہیں۔‘‘

۱۸۷۲ء میں بابا کرم پرکاش نے مہاراجہ کے نام رُوسی گورنر جنرل کا ایک خط لایا جس میں مشروط طور یہ لکھا تھا کہ اگر کشمیر، نیپال اور گوالیار کے مہاراجوں سے گورنر

جنرل کو خطوط ملے، جن میں زار روس کی برتری تسلیم کی گئی ہو تو رُوسی فوج خط ملنے کے ایک سال بعد ہندوستان کی طرف پیش قدمی کرے گی۔ اگر ۱۸۷۵ء تک جواب نہ ملے تو رُوس ٹرکی پر یلغار کرے گا، جہاں وہ دو سال قابض رہے گا اور ایک سال آرام کرنے کے بعد ہندوستان پر بیک وقت لداخ، کابل، قندھار اور کشمیر سے حملہ کیا جائے گا۔

مہاراجہ نے بابا کرم پرکاش کو نیپال اور گوالیار روانہ کیا۔ تاہم اِس کا کیا نتیجہ نکلا اس کی تفصیل نہیں ملتی ہے۔

۱۸۷۲ء میں یعقوب بیگ کا سفارت کار سرینگر پہنچا۔ اُس کو برطانوی ہند نے بہت بُرا مانا اور مہاراجہ کو حکم دیا کہ رنبیر سنگھ برٹش انڈیا کے تحت ایک مقامی ریاست کے حکمران کی طرح رہے۔ انگریزوں کو مہاراجہ کی طرف سے سنٹرل ایشیا سفارت کار بھیجنے کی خبر اپنے مخبروں سے ملی تھی۔

۱۸۷۴ء میں مہاراجہ اور یعقوب بیگ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ ۱۸۷۷ء میں مہاراجہ نے یعقوب بیگ کے سفیر حاجی یعقوب تورا کو کشمیر میں جگہ دی۔

۱۸۷۶ء میں زار نے ہندوستان پر حملہ کرنے کا دوبارہ منصوبہ بنایا۔ فرغانہ کے گورنر جنرل سکوبے لیف نے کہا کہ ہندوستان میں انگریزوں کا زوال اِنگلستان کے زوال کا آغاز ہوگا لیکن یورپ میں رُوس اور ٹرکی کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور یہ منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ ۱۸۷۷ء میں یعقوب بیگ مارا گیا۔ اُس کے دو بیٹوں کے درمیان تخت کے لئے لڑائی ہوئی۔ اُس خانہ جنگی سے فائدہ لیتے ہوئے ۱۸۷۸ء میں چین نے دوبارہ چینی ترکستان پر قبضہ کیا۔ کچھ عرصے کے لئے اس سے لداخ کی تجارت پر بُرا اثر پڑا۔

یعقوب بیگ کی ہلاکت کے بعد رُوس تیزی سے پامیر کی طرف بڑھا۔ انگریزوں نے چین کو مشورہ دیا کہ وہ بھی پامیر کی جانب پیش قدمی کرے لیکن چین کے لشکر سوچیت سے آگے نہیں بڑھے۔ سوچیت، شہید ولہ سے ۶۰ میل دُور جنوب میں واقع ہے۔

لیفٹینینٹ کرنل گورڈن نے برطانوی ہند کی حکومت سے اپنے اندیشے کا اظہار کیا کہ رُوس، ہنزہ، یاسین اور چترال کی طرف بڑھے گا۔ مہاراجہ نے پانچ ہزار انگریزوں کی فوج کی مدد سے یاسین پر قبضہ کیا۔ لارڈ لٹن نے ۱۸۷۶ء میں وائسرائے کا عہدہ سنبھالنے کے بعد رُوس کی توسیعی پالیسی کا سامنا کرنے کے لئے کئی اقدام کئے۔ ۱۸۷۸ء میں ڈھائی ہزار رُوسی فوج ہند کی سرحد کی جانب کوچ کرتے دیکھی گئی۔ اِس لشکر کے ساتھ چھ توپیں تھیں اور اِس فوج کی منزلِ مقصود لیہہ بتائی جا رہی تھی لیکن کوئی ناشدنی واقعہ پیش نہیں آیا۔

ہُنزہ کا والی صفدر علی رُوس سے دوستی کا خواہش مند تھا۔ وہ انگریزوں کا بڑا مخالف تھا۔ اُس نے گلگت کے انگریز ایجنٹ کا سَر ایک طشتری پر لانے کے لئے کہا اور یہ دعویٰ کیا کہ انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ سونے کی گولیاں استعمال کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔ مہاراجہ اور انگریزوں نے اُس کے منصوبے کو ناکام بنا دیا اور صفدر علی کو معزول کر کے اس کے برادرِ نسبتی ناظم خان کو ہُنزہ کا میر (والی) بنایا۔

۱۸۷۷ء میں GRUM GRWMAILO نے پامیر خطّے میں ہنزہ تک سروے کیا۔ اُس کے بعد دریائے یارقند کی بالائی وادی کا جائزہ لیا۔

۱۸۸۵ء میں پھر رُوسی فوج کی پیش قدمی کی اطلاع ملی۔ خفیہ رپورٹ کے مطابق اِس بار بھی اس کی منزل لیہہ تھی۔

NEYALIAS کو چینی ترکستان اور بدخشاں بھیجا گیا تاکہ موقعے پر جا کر رُوسی فوج کی نقل و حرکت کا جائزہ لے۔ اُس نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ چترال جانے والے درّوں کو کھولنا راستہ کھولنے کے مترادف ہوگا۔ رُوس کی توسیعی مہم کو روکنے کے لئے آسان حل یہ ہے کہ شہید ولہ اور کیون لین کے درمیان NO MAN'S LAND پر قبضہ جما لیا جائے۔ اُس نے چین کی کوتاہی اور بے حسی پر غصے کا اِظہار کیا ہے اور اس کو بے عمل قوم کہا ہے۔ برطانوی ہند رُوس کی توسیعی پالیسی کا توڑ کرنے کے لئے

افغانستان اور چین کے سرحدی جھگڑوں کو جلدی حل کرنے کا خواہاں تھا۔

اِس دوران مہاراجہ رنبیر سنگھ کا رُوس سے اعتبار اُٹھ گیا تھا، جو اُن کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ مہاراجہ نے یہ خط ۱۸۸۰ء میں اپنے ایک قاصد جیون مل کی معرفت تاشقند کے رُوسی گورنر جنرل کو بھیجا تھا۔ خط میں یہ لکھا تھا:

''آپ چین سے جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ جب چین کو فتح کریں گے اور کاشغر اور میری سرحدوں کے پڑوسی علاقوں پر قابض ہونے کا ارادہ کریں گے، تب آپ جو کہیں میں کروں گا۔ ابھی آپ نے اپنی سرحد بھی پار نہیں کی ہے۔ جب تک آپ پیش قدمی نہ کریں میں کیسے ہنگامہ اُٹھا سکتا ہوں؟ ہماری ایک کہاوت ہے۔ 'آب ندیدہ' موزہ کشیدہ' یعنی پانی دیکھنے سے پہلے جراب اُتارنا۔''

خط کے متن سے یہ عیاں ہے کہ رُوس نے مہاراجہ کو انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے پر اُکسایا ہوگا۔

۱۸۸۵ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے اِنتقال کے بعد پرتاپ سنگھ تخت نشین ہوا۔ رُوسی فوج کی لیہہ کی طرف پیش قدمی کی رپورٹ کے باوجود یہ سال بھی کسی حادثہ کے بغیر گزر گیا۔

۱۸۸۸ء میں زار رُوس کا ایک فوجی افسر کپتان GROM BTCHEVSKY ہنزہ پہنچا تو گریٹ گیم پر نظر رکھنے والا ایک ماہر کرنل ڈورانڈ بولا:

''کھیل شروع ہو چکا ہے۔''

انگریزوں کو اُس کی آمد پر تشویش ہوئی۔ ۲۵ سالہ ایک فوجی افسر لیفٹیننٹ ینگ ہاسبنڈ کو پانچ گورکھا سپاہیوں اور لیہہ میں تعینات سترہ ڈوگرہ سپاہیوں کے ساتھ فوراً شہیدولہ بھیجا۔ ینگ ہاسبنڈ کی پارٹی میں کارواں لیڈر محمد عیسیٰ اور چند دُوسرے لداخی قلّی، گھوڑے والے اور خانساماں وغیرہ شامل تھے۔

نوبراہ میں ینگ ہاسبنڈ نے سُنا کہ رُوس کی ایک پارٹی یارقند پہنچی ہے، جس

کی منزل شہید ولہ یا کنجوٹ ہے۔ ینگ ہاسبنڈ' GROMBTCHEVSKY سے پہلے شہید ولہ پہنچنا چاہتا تھا۔ چونگ جنگل کے مقام پر ینگ ہاسبنڈ کو لیفٹینٹ بوور کا ایک خط ملا جس میں رُوسی کپتان کی لیہہ روانگی کی خبر تھی۔ بوور پہلے ہی میجر کمبرلینڈ کے ہمراہ جاسوسی کے لئے پامیر گیا ہوا تھا۔

۱۳/ اکتوبر کو ینگ ہسبنڈ اور رُوسی کپتان کے درمیان ملاقات ہوئی۔ کپتان کے روّیے میں حلیمی بھی تھی اور سینہ زوری بھی۔ کپتان نے کہا ''ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے وفادار نہیں ہیں۔ حملے کی صورت میں وہ اُن کے خلاف بغاوت کریں گے۔ رُوس چار لاکھ فوج کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کرے گا۔'' ینگ ہاسبنڈ نے پوچھا کہ ''اِس دشوار گذار علاقے میں اِتنی بڑی فوج کی نقل و حمل کیسے ہوگی؟'' کپتان بولا ''رُوسی سپاہی ٹرانسپورٹ اور سپلائی کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔ وہ راشن کے بغیر ہر قسم کی مصیبت برداشت کرنے کا مادہ رکھتے ہیں۔''

کپتان نے قزاق فوجیوں کو بلایا اور اُن سے پوچھا کہ کیا وہ ہندوستان پر حملہ کرنا چاہیں گے۔ فوجیوں نے تالیاں بجائیں اور کہا۔ ہم اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہیں گے۔

یہ خالی خولی دھمکی تھی۔ کپتان نے ینگ ہاسبنڈ سے اِستدعا کی کہ لداخ سفر کرنے کے لئے اُس کے حق میں سرینگر میں مقیم انگریز ریذیڈنٹ سے سفارش کرے۔ ینگ ہاسبنڈ نے جواب دیا۔ اُس کی بھی خواہش ہے کہ کپتان کو لیہہ جانے کی اجازت ملے لیکن اس سرحدی علاقے میں انگریز افسروں کے جانے پر بھی پابندی ہے۔

ینگ ہاسبنڈ نے برطانوی ہند سرکار کو رپورٹ دی کہ پامیر کے درّوں کا کنٹرول ضروری ہے۔ وہ اپنی کتاب Frontier of Kashmir میں رقم طراز ہے:

''گلگت پر حملہ یا پیش قدمی کرنے سے پہلے آسان ترین راستے کیلک اور میان تا کا کے درّے ہیں، جو گلگت سے بارہ کوس دور ہیں۔''

ہُنزہ کی فوجی اہمیت پر اُس نے یوں روشنی ڈالی ہے:

''روس کے قبضے میں ہُنزہ چلے جانے کے بعد دریائے ہُنزہ کی زیریں وادی میں مدافعت مشکل ہوگی۔''

ینگ ہاسبنڈ نے آمبان (چینی افسر اعلیٰ) کو آگاہ کیا کہ برطانوی ہند سرکار سرحدوں سے متعلق چین کی حکومت سے بات چیت کرنے کی خواہاں ہے۔ ینگ ہاسبنڈ تناؤ کم کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ دورے سے واپسی پر وائسرائے، فوج کے سربراہ اور وزارتِ خارجہ کے سکریٹری نے ینگ ہاسبنڈ کو اُس کی کارکردگی پر مبارک بادی کے تار بھیجے۔

۱۸۹۰ء میں انگریزوں کی ترغیب پر مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے شہید ولہ کو خالی کیا۔ اپنے دُوسرے دورے میں ینگ ہاسبنڈ نے ۵/ستمبر ۱۸۹۰ء کو بذاتِ خود کاشغر میں چین کے افسر اعلیٰ کو اِس سے آگاہ کیا اور قراقرم پر سرحد کے نشان کے لئے ایک ستون لگوایا۔

رُوس اور برطانوی ہند سرکار کے درمیان تناؤ جاری رہا۔ ۱۸۹۰ء میں لداخ میں تعینات برٹش جوائنٹ کمشنر نے سنٹرل ایشیا سے یورپیوں کی لداخ میں آمد پر سخت پابندی لگائی۔

جی. این. راؤ نے' جو ۱۸۶۰ء میں ہند چین سرحدی بات چیت میں بھارتی وفد کا صلاح کار تھا، اپنی کتاب THE INDIA-CHINA BORDER میں لکھا ہے:

''۱۸۹۰ء میں رُوس کا خطرہ ایک حقیقت بن گیا تھا۔ برطانوی ہند چاہتا تھا کہ افغانستان اور چین میں اِتحاد ہو اور رُوس کے خلاف ایک بغیر سٹیٹ قائم ہو۔''

برطانوی ہند نے اپنی مخبری اور تحقیقاتی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ۹۲-۱۸۹۱ء میں Bower، ۱۸۹۲ء میں لارڈ ڈینمور اور ۱۸۹۶ء میں لیفٹیننٹ ملکولم اور کپتان ویلبی کو سنٹرل ایشیا، چین اور تبت بھیجا۔ اسی طرح ڈیزی، ہے ورڈ، ڈریو، کیلے اور رابرٹ شاہ بھی مختلف مہمات اور مشنوں پر سنٹرل ایشیا گئے۔ ڈریو لیہہ میں ڈوگرہ انتظامیہ کا گورنر

بھی رہا۔

لارڈ ڈینمور کے ہمراہ ایک لداخی آرغون گلوان رسول بھی تھا۔ گلوان نے پامیر میں ایک جھڑپ کے بعد افغانستان اور رُوسی مجروح اور مرے ہوئے فوجیوں کو دیکھا۔ گلوان کی خودنوشت سوانح حیات میں اِس کا دلچسپ تذکرہ ہے۔

ایسا لگتا ہے رُوس ہندوستان پر فوج کشی سے متعلق اپنے فیصلے پر بابار نظرِ ثانی کرتا رہا۔ اُس نے پیش قدمی نہیں کی۔ غالباً برطانوی ہند سرکار کے تیور دیکھ کر وہ خطرناک مہم جوئی سے باز رہا۔

چین نے ۹۲-۱۸۹۱ء میں اپنے دو ماہرین ہے یون اور یو آنگ پینگ کی سرکردگی میں سرحدوں کی سروے کا دعویٰ کیا ہے لیکن یہ رپورٹ شائع نہیں ہوئی ہے۔

۱۸۹۳ء میں چین نے قراقرم پر ایک بورڈ نصب کیا۔ جس پر لکھا تھا:

"یہ بورڈ چین کے شہنشاہ کی قلمرو میں لگایا گیا ہے۔"

اِس کا ایک کھمبا قراقرم کی چوٹی پر تھا جبکہ دُوسرا لداخ کی جانب ۵۰ فٹ نشیب میں تھا۔

کشمیر سرکار نے چینی منتظمِ اعلیٰ سے اِس کے خلاف اِحتجاج کیا اور برطانوی ہند کی وزارتِ خارجہ نے چین کے اِس قدم پر تشویش کا اِظہار کیا۔

۱۸۹۵ء میں چین کو جاپان کے ہاتھوں شکست اُٹھانا پڑی۔ ایک سال بعد ۱۸۹۶ء میں چین اور ہندوستان کے درمیان کاشغر میں اکسائی چین سے متعلق بات چیت ہوئی۔

۹۷-۱۸۹۶ء میں برطانوی فوج کے محکمہ سراغ رسانی کے ڈائرکٹر SIR JOHN ARDEGH نے نئی سرحد بندی کا خاکہ پیش کیا۔ وائسرائے لارڈ ایلگن نرم پالیسی اختیار کرنے کے حق میں تھا۔ اُدھر رُوس تبت میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کی کوشش میں لگا تھا۔ ۱۸۸۹ء میں رُوس کی ایک تحقیقاتی مہم تبت کے لئے روانہ ہوئی۔

اُس کی قیادت میخائل واسی لودیچ پے ٹوسوف نے کی۔ برطانوی ہند کو یہ اندیشہ تھا کہ رُوس تبت کو ہند کے لئے بطور ایک ''دروازہ'' اِستعمال کرے گا۔

۱۸۸۸ء میں ہند سرکار، سکم اور تبت کے مابین ایک سرحدی تنازعہ کھڑا ہوا۔ تاہم تبت دستبردار رہوا۔ ۱۹۰۰ء میں یہ رپورٹ ملی کہ ایک شخص لاما دورجے نے تیرھویں دلائی لاما کا ایک خط زارِ رُوس کو پہنچایا ہے۔ دورجے پیدائشی طور بُریات (منگولیا) سے تعلق رکھتا تھا اور اُس کو رُوسی شہریت حاصل تھی۔ اِس کے علاوہ چین اور رُوس کے درمیان تبت سے متعلق خفیہ معاہدہ ہونے کی افواہیں گرم تھیں۔ اِدھر دلائی لاما نے زارِ روس کی دعوت قبول کی تھی۔ برطانیہ دلائی لاما کے رُوس جانے کے خلاف تھا۔

اِن عوامل کی وجہ سے ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرزن نے حکومتِ تبت کے خلاف کرنل ینگ ہاسبنڈ کی سرکردگی میں ایک فوجی مہم تبت بھیجی۔ دلائی لاما فرار ہوگئے۔ انگریز فوج فاتحانہ انداز میں لہاسہ میں داخل ہوئی۔ بعد میں انگریزوں نے تبت میں گیانکچے، گرتوق اور یاتونگ میں تجارتی ایجنسیاں قائم کیں۔

۱۹۰۷ء میں چین اور ہند کے درمیان اکسائی چین کے معاملے پر دوبارہ بات چیت ہوئی۔ رُوس اور برطانیہ نے اسی سال اپنے اختلافات ختم کیے۔

۱۹۱۱ء میں چین میں انقلاب آیا اور چینی ترکستان میں فسادات کی آگ بھڑک اُٹھی۔ ایک دفعہ پھر کاشغر پر رُوسی تسلّط کا خطرہ بڑھ گیا۔ اُنہی دِنوں ہنری میکموہن نے لکھا تھا کہ اگر رُوس نے چینی ترکستان پر زبردستی قبضہ کیا تو ہندوستان رُوس سے تاق دو مبش، سکم اور شہیدولہ پر اپنا حق جتائے گا۔ تاہم یہ نوبت نہیں آئی اور خطرات ٹل گئے۔

۱۹۱۴ء میں شملہ میں ہند سرکار، تبت اور چین کے درمیان سرحدوں سے متعلق بات چیت ہوئی۔ برطانوی ہند سرکار نے رُوس کو سہ فریقی معاہدے سے باخبر کیا اور معاہدہ پر دستخط ہونے سے پہلے رُوس کی رضامندی حاصل کی۔

۱۹۱۷ء میں رُوس میں سوشلسٹ انقلاب آیا۔ اس کے بعد تناؤ ختم ہوا۔

۱۹۳۶ء میں حکومتِ ہند نے ہُنزہ کے میر کو ہدایت دی کہ وہ چین کے ساتھ تحفے تحائف کے تبادلے کی رسم بند کردے۔

۱۹۴۷ء میں آزاد ہند سرکار نے سارے مسائل کا از سرِ نو جائزہ لیا اور ۱۹۴۹ء میں کمیونسٹ چین نے بھی اِقتدار میں آنے کے بعد سرحدی معاملات کا نئے سرے سے جائزہ لیا اور لداخ کی طرف یک طرفہ طور پیش قدمی کر کے اکسائی چین کے ایک بڑے حصّے پر قابض ہوگیا۔ ۱۹۶۲ء میں ہند اور چین کے درمیان سرحدی مسئلے پر لڑائی ہوئی۔

اِس خطّے میں ابھی تناؤ اور کھچاؤ ختم نہیں ہوا ہے۔ سو ڈیڑھ سو سال پہلے دُنیا ہتھیاروں اور نقل و حمل کے میدان میں آج کے مقابلے میں بہت پیچھے تھی۔ پھر بھی اُس زمانے کے فوجی ماہرین نے پامیر سے کسی بھی عسکری پیش قدمی کو خارج از امکان قرار نہیں دیا۔ آج پامیر کا نام زیادہ نہیں آتا لیکن اُس کے ہمسائے میں واقع سیاچن گلیشیر، اکسائی چین اور شاہراہ قراقرم عالمی توجہ کے مراکز بنے ہیں۔ اسی خطّے کے ملکوں میں ایک نئے ملک کے نام کا اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان جو کل تک برِ صغیر ہند کا ہی ایک حصّہ تھا۔ تادمِ تحریر ہندوستان اور چین سرحدی تنازعہ کو حل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔

دو مُسلم عورتیں سرپوش "جوگین" میں

لباس، رسم و رواج اور پکوان

کسی مُلک کے رسم و رواج اور پکوان پر اُس ملک کے محل وقوع، آب وہوا، جغرافیائی حالات اور ہمسایہ علاقوں سے لین دین اور تعلقات کا اثر پڑتا ہے۔ رسم و رواج میں لباس، رہن سہن، شادی بیاہ، تقریبات اور غمی کی رسمیں اور باتیں آتی ہیں۔

لداخیوں کے رسم و رواج خاص کر پکوان میں اِس کے پڑوسی ملکوں اور خطّوں کا گہرا اثر پڑا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں لداخ کو سیاحوں کے لئے واگذار کرنے کے بعد لداخیوں کی معاشرت اور فکر ونظر میں مزید تبدیلیاں آئی ہیں۔

ہم ذیل میں لداخ کے رسم و رواج اور پکوانوں کے چند نمایاں پہلو پیش کرتے ہیں۔

لداخی عورتیں اور مرد دونوں چغا پہنتے ہیں۔ مردانہ چغے کو ''گیازو'' اور زنانہ چغے کو ''سولما'' کہا جاتا ہے۔ ''گیا'' چین کے لئے لداخی زبان میں مخفف لفظ ہے اور ''زو'' کا مطلب سٹائل یا طرز ہے۔ ظاہر ہے لدخی مردانہ چُغا چین کی دین ہے۔ آج کل چین میں چغا مروّج نہیں ہے۔ منگولیا اور لداخی گیازو بالکل ایک جیسا ہے۔ تبت، بھوٹان اور سکم میں گیازو کے طرز کا لباس مروّج ہے لیکن اِس کے گلے پر چاک ہوتا ہے جبکہ لداخی گیازو کا گریبان بند ہوتا ہے۔ اِس سے یہ دیدہ زیب لگتا ہے۔ گیازو پر کمر بند باندھا جاتا ہے اور یہ عموماً گلے سے ایڑی تک پہنچتا ہے۔

کہتے ہیں لداخی مردانہ لباس موجودہ رُوپ میں لداخی حکمران سینگے نمگیل (۱۶۲۴-۱۶۴۲ء) کے دور میں مروّج ہوا۔ تب کپڑے پر چیتے کی کھال کے چتلے چتلے داغ بنانے کا رواج پڑا۔ اس کا محرّک ہمس کے بڑے لاما ستق سنگ راسپا کی شخصیت

تھی۔ ستق لداخی میں چیتا کو کہتے ہیں۔ سینگے شیر کو کہا جاتا ہے۔ ستق سنگ راسپا راج گورو بھی تھے۔ سینگے نمگیل اور ستق سنگ راسپا کی دوستی ضرب المثل بنی تھی۔ اُنیسویں صدی میں لداخ کے آخری خود مختار راجا کے زمانے میں بھی چتلے چتلے داغ والے لباس پہنے جاتے تھے۔ آج بھی کئی لداخی گھرانوں میں ایسے چغے موجود ہیں۔ چغا عام طور پر پٹو سے بنتا ہے۔ چینی ترکستان سے درآمد شدہ کپڑا چھمین سے بھی بنتا تھا۔ امیر گھرانے کے مرد عورتیں زربفت اور مخمل وغیرہ کے چغے زیب تن کرتے تھے۔ آج کل موسم کے مطابق مختلف قسموں کے کپڑے کا چغا اِستعمال ہوتا ہے۔

راجوں کے دورِ حکومت میں عام آدمی سفید یا سیاہ رنگ کے کپڑے پہنتے تھے۔ دُوسرے رنگوں کے کپڑے پہننے کی انہیں اجازت نہیں تھی۔ اپنی حیثیت کی شناخت کے لئے اُن کو سر کے سامنے کے بال کاٹنے پڑتے تھے۔ اُمراء ورُوساء عموماً سرخ رنگ کا لباس پہنتے تھے۔ پٹو سے ''سپورُوگ'' نام کا بڑھیا لباس بھی بنتا تھا۔ آج بھی زنسکار اور شکر چیکتن میں سپورُوگ عام بُنا جاتا ہے۔

لداخی لباس کے اِستعمال کے لئے اپنے لوازمات اور تکلّفات ہیں۔ اگر کوئی نیچے سفید اور اُوپر سرخ رنگ کا کپڑا پہنے تو ''سفید پر سرخ'' کہہ کر اچھا مانا جاتا تھا۔ اگر کوئی اندر سے پھٹا پرانا کپڑا پہنے اور بیرونی لباس نیا ہو، تو اسے نمود و نمائش سے تعبیر کی جاتی ہے اور اسے معیوب سمجھا جاتا ہے۔ پھٹے کپڑے اُوپر پہننا حلیمی اور اِنکساری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ مادّی خوشحالی کی وجہ سے آج پھٹے کپڑے پہننے والا آدمی نظر نہیں آتا ہے۔

سردیوں میں چغے کے اُوپر پوستین نما کپڑا پہنا جاتا ہے۔ اب اِس کی جگہ جاکیٹ نے لی ہے۔

مرد اپنے کمر بند یا پیٹی سے چقمق، سوئی دان، چاقو، بٹوا، چابیوں کا گچھا، سُوا، گوپھن، بنسری، گرہیں کھولنے کے لئے ایک جنگلی بکری Antelope کا ایک سینگ

اور رسی یا اُون بٹنے کے لئے ایک پتلی لکڑی کا ٹکڑا باندھتا تھا۔ اِن کے علاوہ اُون کا ایک گولا اور رسی کا ایک لچھا رکھتا تھا۔ مرد چلتا ہوا رسی باٹتا تھا۔ اگر راستے میں پاپوش وغیرہ پھٹ جائے تو موقعے پر سیتا تھا۔

آج کل تمدّنی پروگراموں میں اِن لوازمات کی جزوی طور نمائش ہوتی ہے۔

کمر بند کے لئے ایک بڑی چادر باندھی جاتی ہے جس میں عمر عیار کی زنبیل کی طرح بہت ساری چیزیں رکھی جا سکتی ہیں۔ مسلمان کمر بند سے ایک رُومال باندھتے تھے، جو وضو کے بعد پونچھنے کے لئے کام آتا تھا۔

ماضی میں سردی سے بچاؤ کے لئے گھٹنوں تک پیتاوا باندھا جاتا تھا۔ یہ ترکی پیتاوا کی نقل تھی۔ اس پر سیاہ دھاگے سے سوزن کاری کا کام ہوتا تھا اور باندھنے کے لئے دیدہ زیب ڈوریاں استعمال ہوتی تھیں۔ آج کل گرم جراب استعمال ہوتی ہے۔

مرد اور عورت دونوں اندر سے 'ٹیلین' پہنتے تھے۔ یہ لداخی قمیص ہے اور میل خور کا معنی دیتی ہے۔ آج ٹیلین سرے سے غائب ہے اور سبھی قمیص پہنتے ہیں۔

مردانہ پاجامہ کھلا ہوتا تھا اور اکثر پنڈلیوں کے دونوں طرف اسے کھلا رکھا جاتا تھا۔ عموماً مرد اور عورتیں دونوں کنٹوپ پہنتے تھے۔ سردیوں کے لئے گرم کنٹوپ استعمال ہوتی تھی۔ جس کے استر میں بھیڑ کے بچے کی بالوں والی کھال استعمال ہوتی تھی۔ کنٹوپ پوری طرح ختم نہیں ہوئی ہے۔ عام کنٹوپ مخمل، کمخواب اور زربفت سے بنتی ہے جس پر سوزن کاری اور کشیدہ کاری کا کام ہوتا ہے۔

بقولِ ایک انگریز کپتان فائٹ' اُنیسویں صدی کے وسط میں لداخی مسلمان نوابوں اور یورپ کے رئیسوں کی طرح بڑے بڑے پگڑ باندھے، ایڑی تک پہنچنے والے جھول جھکا چغا پہنے بازار میں اِترا اِترا کر چلتے تھے۔ اُن کو دیکھ کر نائٹ کو بونڈ سٹریٹ کا فیشن یاد آیا۔

مسلمان مراکشی سرخ ٹوپی بھی پہنتے تھے، جس پر سیاہ پھندنا جھولتا رہتا تھا۔ یہ

رومی ٹوپی کے نام سے مشہور تھی۔ کچھ تصویریں بتاتی ہیں تب مسلمان بودھوں کی طرح کنٹوپ بھی پہنتے تھے۔ مسلم عورتیں کنٹوپ عام پہنتی تھیں۔

پوریگ (علاقہ کرگل) میں ماضیءقریب تک پگڑی کا عام اِستعمال تھا۔

عورتیں کالے رنگ کی چھوٹی سی اُونی ٹوپیاں پہنتی ہیں۔

مونگوں سے سجی سجائی ایک ٹوپی بھی پہنی جاتی تھی، جو چند امیر آدمیوں تک محدود تھی۔ ''چُوتیپ'' نام کی یہ ٹوپی منگولیا سے آئی ہے۔ باراتیوں کی پہنی جانے والی ٹوپی ''پھوتیپ'' بھی مستعمل تھی۔ اس ٹوپی کی اِختراع روایت کے مطابق گیالپو سینگے نمگیل کے عہد میں ہوئی تھی۔ لداخ کی ایک مردانہ ٹوپی مغل فوج کا چھوڑا ہوا ایک توبرا کی نقل بتائی جاتی ہے۔

ہمارے بچپن میں بچوں کی ٹوپی بڑی دِلچسپ ہوتی تھی۔ اسے ''پنچُو'' کہا جاتا تھا۔ نر بچے کی ٹوپی کی پشت پر تیر اور کمان بنی ہوتی اور سامنے ایک زیور جڑا ہوتا۔ جبکہ بچّی کی ٹوپی پر سوئیاں اور ایک زیور یا فیروزہ جڑا ہوتا۔ ٹوپی کو زیور سے سجانے کا فلسفہ غالباً یہ تھا کہ بچہ نظرِ بد سے محفوظ رہے۔

زنانہ اور مردانہ پاپوش میں فرق ہوتا ہے۔ مردانہ پاپوش عموماً سادہ پٹو کا بنایا جاتا ہے۔ عورتوں کے پاپوش میں خوب سجاوٹ ہوتی ہے۔ پاپوش اُون سے بنایا جاتا ہے جس کے تلے پر چمڑا منڈھا جاتا ہے۔ جب ترکی کارواں آتے تو اُن کا لایا ہوا پاپوش ''چاروق''، مستعمل تھا۔ آج کل عموماً سبھی بوٹ اور جوتے پہنتے ہیں۔

نئی نسل چاروق، چوتیپ، چاپن وغیرہ سے انجان ہے۔ یہ گم بوٹ، ٹریکینگ شو، پی کیپ اور جین جاکیٹ سے واقف ہے۔ زنانہ چغا ایک ماورائی اور اساطیری مخلوق کی شکل وشباہت کا ہے جس سے لوگ مرعوب ہیں۔ زنانہ چغا میں درمیان میں سلوٹیں اور گرہیں ہوتی ہیں۔ اِسی وجہ سے اِس کا نام سولما پڑا ہے۔ عورتیں کبھی کمربند سے مردوں کی طرح ضرورت کی کئی چیزیں باندھتی تھیں۔ ان میں چمچی،

پتیل کا محدّب آئینہ، سوئی دان، چابیوں کا گچھا وغیرہ شامل ہیں۔ چھاتی کے پاس چغے میں پیالی اُٹھاتی تھیں تاکہ جہاں بھی چائے یا چھنگ ملے، اُسے استعمال کریں۔

ماضی میں کنواری لڑکیاں سفید پاجامہ پہنتی تھیں اور ایک شادی شدہ عورت کے لئے پہلا بچہ پیدا ہونے پر کالے رنگ کا پاجامہ پہننا لازمی تھا۔ چنانچہ عورتیں پانچ فٹ لمبا چُوڑی دار اُونی پاجامہ پہنتی تھیں۔ آج کل فیشن بدلا ہے اور لڑکیاں شلوار قمیص پہنتی ہیں۔ چوڑی دار پاجامہ اور پینٹ کا بھی چلن ہے۔ فیشن بدلتا رہتا ہے۔ بیل باٹم کا دَور آیا اور چلا گیا۔ فیشن کی ایک ہوا چلی تو لڑکیوں نے تبّتی زنانہ پوشاک ''پھومیت'' زیب تن کیا۔

ماضی میں عورتیں سفید لمبے بالوں والی بکری کی کھالیں پہنتی تھیں۔ کئی دفعہ گوشت، پائے، سر اور کھال کی قیمت برابر بنتی تھی۔ چنانچہ قصاب بال دار کھال دیکھ کر بکری کا دام چکاتا تھا۔ لمبے، چمکیلے سفید بالوں والی کھال معیاری اور حُسن کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ کھال کے استعمال کی محرک ابتداء میں لداخ کی سردی تھی۔ بعد میں یہ فیشن بن گیا۔

آج کل مردانہ اور زنانہ پیشواز یا چغا میں تراش خراش کی جانے لگی ہے اور مرد اور عورتیں جسم پر فٹ ہونے والے دیدہ زیب جامہ پہنتے ہیں۔

مونگے، فیروزے اور سونے کا چھ کون زیور جڑا کو برانما عورتوں کا سر پوش، پیرق، کبھی لداخی سماج میں نہ صرف مقبول تھا بلکہ بڑی حد تک لازمی بھی تھا۔ آج پیرق تقریبات اور شادی بیاہ پر پہنا جاتا ہے۔ ایک پیرق کی قیمت کئی ہزار روپے سے کئی لاکھ روپے تک جاتی ہے۔ گویا لداخی عورت ٹوپی نہیں، شاہانہ تاج پہنتی ہے۔

قدیم لداخ میں عورتیں پیرق نہیں پہنتی تھیں۔ اُن کی ٹوپی گول ہوتی تھی جو آج بھی پوریک میں مستعمل ہے۔ پیرق کیسے آیا؟ اِس سے متعلق یہ روایت ہے کہ ایک لداخی راجکمار کی شادی ایک ہمسایہ چھوٹی ریاست کی راجکماری سے ہوئی جہاں

پیرق پہنا جاتا تھا۔ راجکماری نے پیرق لایا اور یہ فیشن راجا سے پرجا تک پہنچا۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ ایک لداخی رانی کو کان کے درد کی شکایت ہوئی۔ اس نے اپنے پیرق کے ساتھ بھیڑ کے بچے کی کھال کا ایک ایک ٹکڑا دونوں کانوں سے لگا دیا۔ درباری خواتین نے اس کی پیروی کی۔ پھر یہ عام لوگوں تک پہنچا اور فیشن بنا۔ اب ہر پیرق میں Ear Flap یعنی کان کے ساتھ کپڑے کے ٹکڑے لگائے جاتے ہیں۔ پہلے امیر اور رئیس خاندانوں کی عورتیں اِس کے لئے سمور کے دُنبالے اِستعمال کرتی تھیں۔

مُسلم عورتیں پیرق کے بجائے جوگین نام کا سرپوش استعمال کرتی تھیں، جس کی پیشانی پر زیور جڑا ہوتا۔

لداخی عورتیں زیورات کی شوقین رہی ہیں۔ سونے کا بنا فیروزے اور نیلم جڑا گلے کا چھکون گہنا کافی بڑا ہوتا ہے، جو شادی بیاہ وغیرہ کی تقریبات میں پہنا جاتا ہے۔ کہتے ہیں پہلے زیور بڑا نہیں ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ایک رانی نے اپنے گلے کا گھینگا چھپانے کے لئے ایک بڑا زیور پہنا۔ تب سے بڑا زیور پہننے کا چلن ہوا۔ آج یہ چلن مقابلہ بنا ہے۔ ماضی میں عورتیں بطورِ بالی کانوں میں موتی پروئے بڑے بڑے کنڈل اور سنکھ کے کنگن استعمال کرتی تھیں۔

اُنیسویں صدی میں لداخی عورتیں نیلے، سرخ، دھاری دار اور داغ دار پیشواز پہنتی تھیں اور زیورات میں لدی پھندی رہتی تھیں۔ اُنہیں دیکھ کر انگریز مہم جُو مورکرافٹ نے لکھا تھا:

"لداخی عورت اپنے پورے لباس میں یورپ کی کسی راجدھانی کی تمام فیشن زدہ خواتین میں تہلکہ مچا سکتی ہے۔"

تب لداخی مرد کے لباس اور اُن کے لوازمات بھی کم عجوبہ نہیں تھے۔

آج کل نئی نسل کی عورتیں بڑے زیور کے بجائے سونے کا لاکٹ اور تتلی کی شکل کا سونے کا گہنا بطور ہار پہنتی ہیں، جس پر موتی کی لڑیاں پروئی ہوتی ہیں۔ اکثر لداخی عورتیں افزائش حُسن کے لئے بناؤ سنگار کرتی ہیں۔ پہلے شیمپو کے لئے ایک جڑی

بوٹی ''یومبوق'' استعمال کرتی تھیں جو بالوں میں بھوسی دُور کرنے، چمک اور نشو ونما کے لئے مفید تھی۔ چہرے کی جھریاں اور شکنیں دُور کرنے کے لئے ٹماٹر کی قسم کے رسیلے دانے والی ایک جڑی بوٹی استعمال کی جاتی تھی۔ غازہ کے بدلے ''چاشوق'' استعمال کرتی تھیں۔ یہ سرخ رنگ کا ایک کاغذ تھا جو تبت سے درآمد کی گئی چائے کی ٹکیوں پر لپیٹا ہوتا تھا۔ عورتیں اس کاغذ کو اپنے چہرے پر ملتی تھیں۔

آج سینٹ، کریم، غازہ، لپ سٹک وغیرہ استعمال کرتی ہیں اور بیوٹی پارلر جانا معمول بن گیا ہے۔

کبھی لڑکیاں بالوں میں یاک کے بال جوڑتی تھیں جن میں چاندی کے زیورات لگے ہوتے تھے۔ پہلے بالوں کی کئی چوٹیاں گوندھتی تھیں۔ پھر ایک وقت آیا' دو چوٹیاں گوندھنے لگیں۔ اب بالوں کی ایک چوٹی، پونی ٹیل، بوب کٹ بلکہ بوائے کٹ تک مروّج ہیں۔

لداخ میں شادی کی رسم جُداگانہ ہے۔ بودھوں میں شادی سے پہلے نجومی سے مشورہ کیا جاتا ہے اور تشفی ہونے پر لڑکے کا باپ چھنگ (مقامی شراب) اور سفید ریشمی رومال لے کر لڑکی کے گھر جاتا ہے۔ اگر لڑکی والے چھنگ قبول کرلیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ رِشتے سے رضا مند ہیں لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ چھنگ دوبارہ لی جاتی ہے اور اِس محفلِ مے نوشی میں لڑکی کے رشتہ دار شریک ہوتے ہیں۔ اس کے بعد چھنگ نوشی کی آخری تقریب منعقد ہوتی ہے جس میں فریقین کے رشتہ دار اور ہمسائے بھی شریک ہوتے ہیں اور لڑکی کے سر پر سفید ریشمی کپڑا بطور نیک فال باندھا جاتا ہے۔ اس کے بعد تحفے تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے اور شادی کی تاریخ مقرر ہوتی ہے۔

شادی کے دِن دُلہا، اس کا باپ اور باراتی دُلہن لینے جاتے ہیں۔ باراتی مخصوص لباس پہنتے ہیں اور ان کے سر پر تاج نما سنہری ٹوپیاں ہوتی ہیں، جسے مقامی زبان میں سونے کی پگڑی کہتے ہیں۔ دُلہا بھی باراتیوں جیسا لباس پہنتا ہے۔ اس

کے سر پر سفید ریشمی رُومال باندھا جاتا ہے۔ یہی رُومال اس کو باراتیوں سے ممیّز کرتا ہے۔ راستے میں عورتیں مختلف برتنوں میں چھنگ، دُودھ، آٹا پانی وغیرہ لئے باراتیوں اور دُلہا کا سواگت کرتی ہیں اور دُلہا کا ماموں یا چچا وغیرہ اُن کو نذرانے دیتا ہے۔

دُلہن کے مکان کے در پر باراتی گیت گاتے ہیں۔ دُلہن والوں سے سوال و جواب میں گیتوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ تحفے پیش کرتے ہیں اور پھر باراتیوں کو مکان میں داخلہ کی اجازت ملتی ہے۔ دُلہن کے گھر میں باراتی رقص کرتے ہیں اور عروسی گیت گاتے ہیں جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔

روایتی طور دُلہن آنسو بہاتی ہوئی رقّت انگیز انداز میں گیت گا کر اپنے ماں باپ، بہنوں، بھائیوں اور عزیز و اقارب سے سسرال جانے کی اجازت مانگتی ہے۔ جس سے ایک دردناک سماں پیدا ہوتا ہے۔ سب کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ باراتی بھی اشک بار ہوتے ہیں۔ تاہم وہ اپنے گیت میں دُلہن کو اپنے ساتھ لے جانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ گیت کا ایک بول ملاحظہ فرمائیے:

ہم اپنی نئی نویلی دُلہن لے کر اپنے گھر جا رہے ہیں
دُلہن آنگموں کو لے کر اپنے گھر جا رہے ہیں

چنانچہ وہ دُلہن لے کر ہی مکان سے نکلتے ہیں۔ اِدھر دُلہا کے دروازے پر بَلا دُور کرنے کے لئے ایک لاما مذہبی رسم انجام دیتا ہے اور سب کے سامنے مٹی کے ایک برتن کو پتھر مار کر توڑتا ہے۔ برتن کے جتنے زیادہ ٹکڑے ہو جائیں، وہ نوبیاہتا جوڑی کے لئے اُتنا زیادہ نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ اِس کے بعد ایک آدمی دُلہن کے جہیز کے سامان کی نمائش کرتا ہے۔ جہیز کے لئے پہلے کوئی شرط نہیں لگائی جاتی بلکہ دُلہن والے اپنی مرضی سے جہیز دیتے ہیں۔ ساتھ ساتھ جہیز کے سامان کی ایک فہرست بنائی جاتی ہے تاکہ دُوسرے لوگ بھی اِس سے باخبر ہوں۔ تبھی دُلہا دُلہن گھر کے اندر قدم رکھتے ہیں جہاں ایک سجے سجائے کمرے میں اُن کے لئے ایک مخصوص نشست بنائی گئی ہوتی

ہے۔ جس پر اناج کے دانوں سے سواستکا بنا ہوتا ہے۔ پھر دونوں کے سامنے کھانا رکھا جاتا ہے اور دونوں ایک دُوسرے کو کھلا کر کھانے کی شروعات کرتے ہیں۔

دُوسرے روز دُلہا کے ہاں دعوت ہوتی ہے۔ گرم کے ستّو کو چھنگ اور پانی میں گوندھ کر گنبد نما شکل کی ایک بڑی چیز بنائی جاتی ہے۔ اسے ازدواجی کیک سمجھ لیجئے کیونکہ مجلس کے اختتام پر اسے کیک کی طرح کاٹ کر مہمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ کیک دُلہا کی مالی حیثیت کے مطابق چھوٹا یا بڑا ہوتا ہے۔ کم سے کم چار من اور زیادہ سے زیادہ تیس من وزن کا ہوتا ہے۔ اسے شادی کے منڈپ کے درمیان میں رکھا جاتا ہے اور سبھی اس کے گرد دمامے کی تھاپ اور شہنائی کی لَے پر رقص کرتے ہیں۔ چھنگ کا دور چلتا ہے۔ ہنسی مذاق ہوتا ہے۔ گاؤں کے لوگ دُلہا دُلہن اور دُلہا کے والدین کو مبارکباد دیتے ہیں اور روایتی ریشمی رُومال پیش کرتے ہیں۔

شادی کی اِس روایتی رسم کے علاوہ بیاہ رچانے کا ایک اور مقبول عام طریقہ بھی ہے۔ جسے ''چوری کی شادی'' سے موسوم کیا گیا ہے۔ شادی کا یہ طریقہ درحقیقت، اخراجات اور رسومات سے بچنے کے لئے ایک یا ایک سے زیادہ ذہین اشخاص نے مروّج کیا تھا' جواب ایک رسم بن گئی ہے۔ لڑکی کے والدین اور عزیزوں کو عام طور پر شادی کا پورا علم ہوتا ہے لیکن ظاہری طور پر یہ انداز برتا جاتا ہے کہ اُن کی لاعلمی میں یہ شادی ہو رہی ہے۔ لڑکی کو چپکے سے اس کے کسی رشتہ دار کے گھر سے دُلہا کے ہاں لیا جاتا ہے۔ دُوسرے روز لڑکے والے چھنگ لے کر' اگر مسلمان ہوں تو چائے لے کر' لڑکی کے والدین کے گھر پہنچتے ہیں اور لڑکی کو چپکے سے لے کر شادی کرانے پر معافی مانگتے ہیں۔ لڑکی کے والدین غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ احتجاج کرتے ہیں۔ (محض اداکاری کرتے ہیں) کہ کیوں اُن کی لڑکی کو اغوا کیا گیا۔ یہ اُن کے خاندان کی توہین ہے۔ اگر شادی کرنی ہی تھی تو ہم بھی دو چار آدمیوں کو مدعو کرتے اور لڑکی بارات کے ساتھ جاتی۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ لڑکے والے کہتے ہیں (رٹے رٹائے جملے

دہراتے ہیں) یہ ہمیں معلوم ہے کہ آپ اپنی لڑکی کی شادی اِس طرح کبھی بھی نہیں کرتے لیکن ہم سے بھول ہوئی ہے۔ اِس لئے ہمیں معاف کریں۔ (کوئی کوئی بھلامانس حیل وحجّت نہیں کرتا۔)

آخر کار لڑکی والے چھنگ یا چائے قبول کرتے ہیں اور معاملہ ٹل جاتا ہے۔ اِس کے بعد کبھی کبھی شادی کی دعوت یا اِزدواجی رسم نبھانے کے لئے تاریخ مقرر ہوتی ہے لیکن رسم نبھانا یا دعوت دینا لازمی نہیں۔ یہ فریقین یا ایک فریق کی مرضی پر منحصر ہے۔

لداخ کے مسلمانوں میں شادی کی رسم بودھوں سے قدرے مختلف ہے۔ باراتی تکبیر کے نعرے بلند کرتے ہوئے دُلہن کو لاتے ہیں۔ راستے میں عورتیں بالے بچے برتنوں میں دودھ، آٹا، چاول وغیرہ لے کر سواگت کرتے ہیں۔ دُلہا کا ماموں ان کو نقد نذرانے دیتا ہے۔ رقص وسرود کے ہنگامے نہیں ہوتے۔

شادی پر پُر تکلّف دعوت دی جاتی ہے۔ گوشت کے کئی پکوان جیسے گوشتابہ، روغن جوش، طبق ماز، یخنی اور کباب اور دو تین سبزیاں پکائی جاتی ہیں۔ پہلے روز دُلہن اور دُوسرے روز دُلہا کے گھر ضیافت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

بودھوں کی طرح مسلمانوں میں بھی ''چوری کی شادی'' عام ہے۔

داہ سنسکار کی رسم بھی جُدا گانہ ہے۔ بودھ متوفی کی نعش کو کئی روز گھر میں رکھتے ہیں اور دِن دیکھ کر شمشان گھاٹ داہ سنسکار کے لئے لی جاتی ہے۔ کچھ لوگ زیادہ دن نعش گھر میں رکھتے ہیں۔ اس کا انحصار کچھ حد تک اہلِ خانہ کی حیثیت پر ہے۔ اِس دوران مرنے والے کے ثواب کے لئے پوجا ہوتی ہے۔ جب تک لاش گھر میں ہے، کھانے پینے میں پرہیز نہیں ہوتا۔ نعش کو لاموں کی قیادت میں ایک سجے سجائے تابوت میں رکھ کر شمشان پہنچاتے ہیں۔ آگے آگے برادری کے لوگ اور ہمسائے لکڑی لئے چلتے ہیں۔ متوفی کے رشتہ دار، احباب اور دُوسرے لوگ تابوت کے ساتھ جاتے ہیں۔ متمول لوگ زیادہ لاموں کا انتظام کرتے ہیں اور ایک بڑے لاما

اور بلند مرتبہ فرد کی نعش کے جلوس میں لامے پیتل کے مکھوٹے چہرے پر لگاتے ہیں۔

مردے کو تنور جیسے شمشان میں نذرِ آتش کیا جاتا ہے۔ چار روز بعد راکھ یا پھول کو دریا میں بہا دیا جاتا ہے۔ راجماش یا کوشوق کا پھول ایک ستوپا میں محفوظ رکھا جاتا ہے۔

ننھے بچوں کی لاش کو جلایا نہیں جاتا بلکہ صندوق یا برتن میں رکھ کر پہاڑ کی چوٹی پر دفنایا جاتا ہے۔

ماضی قریب تک لداخ کے علاقہ روپشو میں خانہ بدوش لوگ نعش ایک چٹان یا پہاڑ پر رکھتے تھے جہاں یہ جانوروں اور پرندوں کی خوراک بنتی تھی۔

بچے کی پیدائش پر خاص تقریب منائی جاتی ہے۔ اِس موقع پر رشتہ دار، ہمسائے اور لوگ باگ نقد اور جنس کی صورت میں تحفے اور نذرانے لے کر ملنے آتے ہیں۔ راگ رنگ اور رقص و سرور کی محفل جمتی ہے۔

ماضی قریب میں اکثر دیہات میں بچے کے جنم پر کھیتوں وغیرہ میں ماں باپ کی نقل و حرکت پر پابندی تھی۔

لداخ میں داستان گوئی لوگوں کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ ماہر داستان گو دیومالائی شخصیت گیالم کیسر کی طویل داستان موسم سرما کی لمبی راتوں کے دوران قسطوں میں سُناتے ہیں۔ کمرے میں الاؤ جلایا جاتا ہے اور اہلِ خانہ اس کے گرد بیٹھتے ہیں۔ اب داستان گوئی کی روایت قصہء پارینہ بن رہی ہے۔

پہلے ہر سال بھنڈارے کا انتظام کیا جاتا تھا، جس کے لئے لوگ چندہ دیتے تھے۔ بھنڈارے پر لوگوں میں کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔ لوگوں کا اعتقاد تھا کہ بھنڈارے سے بستیاں قدرتی آفات سے محفوظ رہتی ہیں۔

لداخ میں تبت، چین اور سنٹرل ایشیا کے کئی پکوان بنتے ہیں۔ ان میں موق موق، گیاتُوک Noodle، سموسہ اور گوشت کے کئی پکوان شامل ہیں۔ موق موق اور

گیاتوک لداخیوں کی مقوّی غذائیں ہیں۔موق موق گوندھے ہوئے آٹے میں کُٹا ہوا گوشت ڈال کر بھاپ کے ذریعے تیار کیا جاتا ہے۔اس کے لئے ایک مخصوص برتن ہے۔گیاتوک دو پتلے ڈنڈوں یا Chop sticks سے کھایا جاتا ہے۔گیاتوک گوشت انڈے اور میدہ کی آمیزش ہے۔گوندھے ہوئے میوے کو چکلے پر بیلن سے بیل کر بڑا بنایا جاتا ہے اور نوڈل مشین میں ڈال کر پتلی پتلی قاشیں نکالی جاتی ہیں۔انہیں اُبالا جاتا ہے۔دُوسری دیگچی میں مرچ مصالحے ڈال کر گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں پکائی جاتی ہیں۔نوڈل کو bowl میں ڈالا جاتا ہے اور اُن پر گوشت اور اس کا شوربہ ڈالا جاتا ہے۔ ہرے دھنیا، مولی اور پودینہ کی چٹنی کے ساتھ کھانے میں ذائقہ زیادہ مزادیتا ہے۔

لداخ کی اپنی خوراک سکیُو اور چھوتا گی ہیں۔یہ آٹا، گوشت، پیاز، آلو یا مٹر یا دونوں ساتھ ملا کر پکایا جاتا ہے۔پہلے فرائنگ پان یا دیگچی کے تیل میں پیاز تلی جاتی ہے اور اس میں نمک مصالحے اور گوشت ڈالے جاتے ہیں۔جب گوشت گل جائے تو اس میں آلو اور پانی میں بھیگا ہوا مٹر ڈالا جاتا ہے۔اس کے بعد گوندھے ہوئے آٹے کے بنے مخصوص شکل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈالے جاتے ہیں۔اس ملغوبے کو اُبالا جاتا ہے۔پانی کی اِتنی مقدار ہو کہ شوربہ باقی رہے۔لیجئے سکیُو تیار ہوا۔یہ سستا بھی ہے اور طاقت بخش بھی۔

سکیُو اور چھوتا گی بنانے کا ایک ہی عمل اور طریقہ ہے۔صرف آٹے کا ڈیزائن الگ ہے۔چھوتا گی کو یاجی بھی کہا جاتا ہے۔

ستّو لداخیوں کا مرغوب کھانا ہے۔اسے گاہے نمکین چائے میں مکھن اور کھانڈ سے گھلا ملا کر کھایا جاتا ہے۔ستّو مقوّی خوراک ہے۔کئی دفعہ طبیب مریضوں کے لئے ستّو کی خوراک تجویز کرتا ہے۔

''پاوا'' ایک اور خوراک ہے جو پسے ہوئے مٹر سے بنتا ہے۔اسے پانی میں اُبال کر گول یا تکون صورت میں ڈھالا جاتا ہے اور عموماً پسی ہوئی تیز مرچ میں گھلی لسی

میں بھگو کر کھایا جاتا ہے۔ پاوا طاقت بخش خوراک ہے لیکن معدے کے لئے ثقیل ہے۔
آج کل لداخ میں چاول عام استعمال ہوتا ہے۔ خاص کر نئی نسل چاول کھانے کی عادی ہوگئی ہے۔

مشروبات میں لداخی چائے اور چھنگ قابلِ ذکر ہیں۔ چائے میں دُودھ کے علاوہ مکھن بھی ڈالا جاتا ہے اور ہندوستان میں آبادی کے تناسب سے سب سے زیادہ مکھن لداخ میں استعمال ہوتا ہے۔ پہلے چائے کو خوب اُبالا جاتا ہے اور ایک لمبوترے برتن میں پانی ملا کر چائے میں مکھن کا ایک ڈلا ڈال کر خوب ہلایا جلایا جاتا ہے، جس سے گُر گُر کی آواز پیدا ہوتی ہے اور اسی وجہ سے یہ برتن گر گرا اور چائے گر گر چائے کہلاتی ہے۔ ہر لداخی گھر میں گُر گر چائے بنتی ہے اور ہر کوئی روزانہ چائے کی متعدد پیالیاں پیتا ہے۔ گُر گُر کے لئے دُوسرا لداخی لفظ دونکبو ہے۔

لداخی چائے پینے کے اپنے آداب ہیں۔ اِس کے لئے مخصوص پیالی، ڈھکن، کپ سٹینڈ، چائے دانی اور چائے گرم رکھنے کا برتن ہوتا ہے۔ پیالی میں کچھ چائے پئے بغیر رکھی جاتی ہے اور اسی میں گرم چائے ڈالی جاتی ہے۔

''چھنگ'' جَو سے تیار کی جاتی ہے۔ بہت سے بودھ گھرانوں میں چھنگ کشید کی جاتی ہے۔ نشہ پیدا کرنے کے لئے اِس میں ایک خمیر ''پھبس'' ملایا جاتا ہے۔ خمیر آئے ہوئے جَو کو مٹی کی ایک صراحی میں ڈالا جاتا ہے اور اِس کا منہ اچھی طرح بند کیا جاتا ہے تاکہ اِس میں ہوا نہ جائے۔ وہ صراحی بھوسے میں رکھی جاتی ہے۔ سردیوں میں اسے کئی روز بھوسے میں رکھنا پڑتا ہے۔ گرمیوں میں دو تین روز رکھنے کے بعد لکڑی کے ایک گول برتن میں ڈالا جاتا ہے اور اس میں پانی ملایا جاتا ہے۔ برتن میں ایک ٹونٹی لگی ہوتی ہے جہاں سے سیال مادہ ایک اور برتن میں خارج ہوتا ہے۔ یہی چھنگ ہے۔ یہ بڑی تیز اور نشیلی ہوتی ہے۔ برتن میں دوبارہ پانی ملایا جاتا ہے اور ٹونٹی سے نکالا جاتا ہے۔ تحلیل شدہ یہ چھنگ زیادہ تیز اور نشہ خیز نہیں ہوتی۔ تیسری دفعہ پانی

ڈال کر جَو کی شدّت کو مزید تحلیل کیا جاتا ہے اور چھنگ کا نشہ ہلکا ہوتا ہے۔ کبھی دُوسری اور تیسری قسم کی چھنگ میں پہلے سیال ملایا جاتا ہے تا کہ اس میں قدرے تیزی اور تیکھاپن آجائے۔

چھنگ پر لداخی زبان میں لوک گیت، محاورے اور جام دینا، ساغر و صراحی اور ساقی و کلال جیسی اِصطلاحات اور تلمیحات موجود ہیں۔ چھنگ نوشوں کے گھروں میں چھنگ سے وابستہ برتن، جام و سبو وغیرہ ہوتے ہیں۔ سماجی مصلحوں اور مذہبی رہنماؤں نے چھنگ نوشی کے خلاف بارہا مہم چلائی لیکن بہت کم کامیابی حاصل ہوئی۔

ایک لداخی کے لئے اِس کا کچن یا باورچی خانہ غیر معمولی اور اہم ہے۔ کچن بڑا ہوتا ہے اور کنبے کے سارے افراد اِس میں کھانا کھاتے ہیں، بیٹھتے ہیں اور گاہے گاہے مہمانوں کی خاطر تواضع کچن میں ہوتی ہے۔ کچن کے طاقوں پر چمچماتے ہوئے مختلف برتن، ہنڈیاں وغیرہ قرینے سے سجائے جاتے ہیں۔ ان میں کشمیر میں بنے طبق، کٹوریاں اور دیگچے، چین کے تھرماس فلاسک، پیالیاں، کٹورے، ملک میں بنی ہوئی سٹیل اور تام چینی کی کراکری، سنٹرل ایشیا سے ورثہ میں ملا موموبنانے کا برتن، جاپان میں بنی نوڈل کاٹنے کی مشین، ہماچل پردیش میں بنا مکھن اور چائے آمیزش کرنے کا لمبوترا برتن گُرگُرا اور لداخ میں بنی تانبے کی چائے دانیاں، ڈوئیاں، چاندی کی پیالیاں، پیتل کی صراحیاں اور لکڑی کے منقش ستّو دان شامل ہیں۔

لداخ اپنے گوناگوں کھانوں کے لئے صدیوں سے مشہور ہے۔ لداخ کے راجا نیما نمگیل نے اٹھارویں صدی میں بھوٹان کے ایک عالم جمیانگ نوانگ گیالچن کو لداخ مدعو کیا۔ اُن کی آمد پر راجا نے ایک پُرتکلّف ضیافت کا انتظام کیا تھا۔ اپنی سوانحِ حیات میں نوانگ گیالچن لکھتے ہیں کہ اُن کے لئے مختلف پھلوں سے بنائے ہوئے کھانے یکے بعد دیگرے لائے گئے اور سواں پلیٹوں کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوا۔

دیواری تصاویر

لداخ کی بودھ خانقاہیں (گنپے)، مورتیاں، تھنکے اور دیواری نقاشی mural کے لئے مشہور ہیں۔ گنپوں کے علاوہ ہر بودھ گھر کی عبادت گاہ کی دیواریں دھارمک تصاویر سے مزّین ہوتی ہیں۔ یہ رنگین تصاویر مذہبی نوعیت کی حامل ہیں۔ اکثر گنپوں میں مذہبی تصاویر کے ساتھ ساتھ دُنیاوی زِندگی کی جھلکیاں بھی تصویروں کی زبانی دِکھائی گئی ہیں۔

مدن جیت سنگھ نے اپنی کتاب HIMALAYAN ART میں لکھا ہے:

''ہمالیائی آرٹ مجموعی طور مذہبی آرٹ ہے جو صدیوں پرانے تصوّرات، لاموں کے عقائد، اُن کے سرپرستوں اور مقامی لوگوں کی زِندگی کی عکاسی کرتا ہے۔''

دیواری نقاشی میں بُدھ کے علاوہ حسب ذیل تصاویر عموماً نظر آتی ہیں:

پانچ دھیانی بدھ: بودھ عقائد کے مطابق تاریخی بدھ کے علاوہ پانچ بدھ کا تصوّر پیش کیا گیا ہے۔ یہ دھیانی بدھ کہلاتے ہیں اور اُن کے نام ویراکونا، امیتبھا، رتنا سمبھاوا، اکشوبھیا اور اموگھاسدھی ہیں۔ کئی گنپوں میں اُن کی مورتیاں اور تصویریں نظر آتی ہیں۔ اُن کے لداخی یا تبّتی متبادل نام بھی ہیں۔

تاریخی بدھ سکیامنی کی شبیہہ اور مورتی مختلف روپ میں ہر گنپہ میں موجود ہے۔ لیہہ کے نئے گنپہ میں سکیامنی کی زندگی کے بارہ اہم واقعات کو تصویروں کے ذریعے اُجاگر کیا گیا ہے۔

بدھی ستو: بدھ کے بعد مہایان بدھ مت میں بدھی ستو کا مرتبہ بلند ہے۔

بدھی ستو نے روشنی حاصل کی ہوتی ہے لیکن وہ ان دُوسرے جانداروں کے تئیں رحم کے جذبے کے تحت نروان حاصل نہیں کرتے ہیں جن کو ابھی Enlightenment روشنی نہیں ملی ہے۔ بدھی ستو کی تعداد چودہ ہے۔ ان میں اویلوکیتیشورا، منجوشری، منجو پانی اور میتر یا (آنے والا بدھ) اہم ہیں۔ اور ان کی دیوار گیر شبیہیں لداخ کے تمام گنپوں میں ہوتی ہیں۔ الچی وہار میں ایک مستطیل میں منجوشری کی ۳۶۴ تصویریں ہیں۔

ارہٹ: ارہٹ بدھ کے سولہ سرکردہ شاگرد چیلے ہیں۔ مختلف ارہٹوں کی تصاویر کے علاوہ بدھ کی تصویر کے دائیں بائیں عام طور پر ان کے دو اہم شاگرد شریپو اور موگیالانا نظر آتے ہیں۔

مہاسدھا: مہاسدھاؤں کی تعداد ۸۴ ہے۔ اُنہوں نے مختلف اَدوار میں اچھے کرموں کی وجہ سے روشنی حاصل کی ہوتی ہے۔ ان میں سماج کے ہر طبقہ کے لوگ تھے۔ ان میں راج کمار، موچی، لکڑہارے، ترکھان اور عارف شامل ہیں۔ مہاسدھا اِنسانِ کامل ہوتے ہیں۔ اُن کو روشنی ملی ہے۔ میں نے ہمس اور ٹھکسے گنپوں میں ۸۴ مہاسدھاؤں کی تصویریں دیکھیں۔ مہاسدھا دسویں اور گیارھویں صدیوں میں گزرے ہیں۔ تبت کے نامور صوفی منش شاعر مِلا ریپا، کرگیوت پا فرقے کے بانی تیلوپا اور اُن کے جانشین رشی مارپا مہاسدھا تھے۔

سرکردہ رشی اور مُنی: اکثر گنپوں میں تبت اور ہند کے ماضی کے سرکردہ اور اہم رشیوں اور منیوں کی تصاویر نظر آتی ہیں۔ ان میں پدما سمبھاوا، ناگ ارجن، اچاریہ دھرم پالا، اتیشا، سکیا پنڈت، ژونکھاپا، دلائی لاما، پنچن لاما، سکرماپا، ڈوکچین رینگبو چھے اور دُوسرے متعدد رِشی مُنی آتے ہیں۔

پدما سمبھاوا کو درجنوں رُوپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ تنگ موگنگ کے گنپہ میں اُن کی تصویر کے ساتھ اُن کی دو بیویوں کی تصویریں بھی ہیں۔

گنپوں کے ہیڈ لاما: لداخ کے بڑے گنپوں میں ہیڈ لاما یا گوشوق ہوتے

ہیں۔ بودھ عقائد کے مطابق یہ وفات کے بعد دوبارہ جنم لیتے ہیں۔ ننھے کُوشوق کی پہچان اور تصدیق کی لوازمات کی تکمیل کے بعد بڑے لاما کی حیثیت سے اُسے گنپہ میں لیا جاتا ہے۔ گنپہ میں حال سمیت ماضی کے تمام متعلقہ کُوشوق کی مورتیاں نصب کی جاتی ہیں اور دیواروں پر اُن کی تصویریں بنائی جاتی ہیں۔

دھرم پالا یا مذہب کے نگہبان: ہندو Pantheon دیو مالا کا بدھ مت پر گہرا اثر پڑا ہے۔ تمام گنپوں میں دھرم پالا کے بھیانک رنگ رُوپ والے دیوتاؤں کی مورتیاں اور تصویریں ہوتی ہیں جیسے یمن تاکا، مہا کالا، وجرا، بھیروا، یاماوغیرہ۔

کئی گنپوں میں وِشنو، برہما اور گنیش کی تصویریں بھی ہیں۔

گنپوں کا روایتی دیوتا: ہر گنپہ کا اپنا دیوتا ہوتا ہے اور وہاں اُس کی تصویر بنائی جاتی ہے۔

دیویاں: مختلف دیویوں کی تصاویر گنپوں کی زینت ہیں۔ اِن میں تارا مشہور ہے۔ سفید تارا اور سبز تارا دو دیویاں ہیں۔ اِن کے علاوہ متعدد دیوتاؤں اساطیری دیویوں اور پنکھ پھیلائے اپسراؤں کی تصویریں اور شبیہیں نظر آتی ہیں۔

ہر گنپہ میں اسمبلی ہال میں داخلہ سے پہلے دالان میں لوک پالا یا چاروں اطراف کے فرمانرواؤں کی تصاویر بنائی گئی ہوتی ہیں۔ مشرق کا فرمان روا بنسری بجا رہا ہے۔ مغرب کے فرمان روا کے ہاتھ میں ستوپا ہے۔ شمال والے کے ہاتھ میں پرچم اور جنوب کے بادشاہ کا سر ہاتھی کا ہے۔

منڈالا: ہر گنپہ میں منڈالا کی نقاشی ہوتی ہے۔ ان میں کالا چکرا اور جیون چکرا شامل ہیں۔ منڈالاؤں میں بدھ مت کے فلسفہ، خیروشر، جنت وجہنم، حیات و ممات، عمل تناسخ اور نروان کے نظریات پیش کئے گئے ہیں۔ منڈالا گول، مربع اور مستطیل شکلوں کا ہوتا ہے۔

گنپہ کے داخلہ پر دیواروں پر لاموں کے لئے قواعد اور ضوابط سے متعلق

تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

جنّات اور بدرُوحوں کی تصویریں بھی بنائی جاتی ہیں۔ ان میں ناگا، سیووا، مارا وغیرہ شامل ہیں۔ لمبی اور سپید داڑھی والے ایک خوبصورت عمر رسیدہ آدمی کی تصویر عام نظر آتی ہے۔

مذہبی تصویروں کے علاوہ کئی گنپوں میں دُنیاوی زندگی کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔ اس لحاظ سے الچی وہار قابلِ ذکر ہے۔ یہاں مورتیوں کے لباس پر تصاویر بنی ہیں۔ اویلو کیتیشورا کی دھوتی پر ایک شاہی محل کا منظر ہے۔ یہاں ایک رِشی اور اس کے چیلے نظر آتے ہیں۔ سانپ کا جسم والا ناگ اپنی دو بیویوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔

میتریا کی دھوتی پر بدھ کا جنم اور ننھے بدھ کے اشنان کو تصویروں میں اُجاگر کیا گیا ہے۔ منجوشری کی دھوتی پر تانترک جادوگروں اور عارفوں کی شبیہیں بنائی گئی ہیں جو یا تو رقص کرتے ہیں یا اپنے روزمرہ کے کام میں مگن ہیں۔ ایک کمرے میں ضیافت کا ایک منظر ہے۔ راجہ کے ہاتھ میں کلہاڑی ہے جو شاہی رُتبہ یا طاقت کی مظہر ہے۔ راجہ کی پوشاک پر شیروں کی تصویر ہے۔ کہیں گھوڑسوار نظر آتے ہیں۔

الچی آرٹ پر بودھ کشمیر کے آرٹ کا اثر ہے۔ اس کی تصویریں اور مورتیوں کے انسانی خدوخال اور ناک نقشے دُوسرے گنپوں سے مختلف ہیں۔ جن پر تبت کا اثر ہے۔ الچی میں ناک لمبی اور آنکھیں بڑی بڑی دکھائی گئی ہیں۔

مدن جیت سنگھ نے الچی کے شاہی کیمپ کی تصاویر پر بغداد آرٹ کا اثر بتایا ہے۔

یونسکو نے الچی وہار کو ایک عالمی یادگار قرار دیا ہے۔

لیہہ کے ژیموگنپہ میں ایک رنگین تصویر ہے۔ اس میں ایک محفلِ نشاط کا منظر دیا گیا ہے۔ شاہی دربار ہے۔ راجہ اور رانی تخت پر متمکن ہیں۔ ان کے دائیں بائیں راج کمار، راجکماریاں، وزراء، رُوساء اور اُمراء براجمان ہیں۔ اِرد گرد پرجا کی بھیڑ ہے۔ درمیان میں چند آدمی جھوم جھوم کر لداخی لوک ناچ پیش کر رہے ہیں۔ ایک

طرف چند موسیقار ساز بجا رہے ہیں۔ اس دیواری تصویر میں چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ مجلس کے تمام لوگوں کے سر پر دستار ہے اور ہر ایک نے لمبی داڑھی رکھی ہے۔ ان کی پوشاک اور وضع قطع میں چینی ترکستان کی اسلامی معاشرت کا حقیقی نمونہ ملتا ہے۔ اگر ان دو تمدنوں کے درمیان کوئی فرق ہے تو وہ شراب ہے۔ اس محفل میں شراب کا دور دورہ ہے۔ کئی محققوں نے اُن کے لباس کو مغل اثر بتایا ہے۔ یہ نادر تصویر لداخ کے راجہ ٹق ماپا بُوم دے (۱۴۰۰ء) کے دورِ حکومت کی بتائی جاتی ہے۔ فرانکی نے راجہ ٹشی نمگیل (سولھویں صدی) کے دور کی تصویر بتائی ہے۔

بزگو کے محل میں لداخ کے ایک راجہ چھوانگ نمگیل (۸۰-۱۷۶۰ء)، اس کے دو جانشین بھائی اور شاہی خاندان کی عورتوں کی تصاویر ہیں۔ یہاں بھی اُنھوں نے مغل لباس زیب تن کئے ہیں۔

بزگو گنپہ کے ایک حجرے کی دیوار پر تصویروں میں ایک محل اور کئی مسلم کردار نظر آتے ہیں۔ یہ حجرہ کبھی ایک مسجد تھا جس میں ایک لداخی راجہ کی مسلم بیگم گیال خاتون نماز پڑھتی تھی۔ اس گنپہ کے نگران لاما نے راقم الحروف کو بتایا کہ یہ تصویریں سترھویں صدی کے آغاز میں گیال خاتون کے والد نے بنائی تھیں۔

غاروں اور غار گنپوں میں بھی دیواری تصویریں اور نقاشی کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ لیہہ سے ساٹھ کلومیٹر دُور سسپول میں پانچ غار ہیں۔ ان میں بدھ امیتھبا، بدھی ستو، اویلو کیتیشورا، منجوشری، زرد فرقہ کے بانی ژونکھاپا، تانترک دیوتاؤں کی تصویریں اور منڈالا بنے ہوئے ہیں۔

لداخ میں منے دیواروں پر ہزاروں چپٹے پتھر رکھے گئے ہیں جن پر بدھ، بدھی ستو اور مقدس منتر کھدے ہوئے ہیں۔ الچی وہار کے پاس چٹانوں پر تیر انداز، جنگلی بکرے، ہرن، گھوڑے وغیرہ تراشے گئے ہیں جو دسویں صدی سے پہلے کے بتائے جاتے ہیں۔

لداخ کی دیواری نقاشی اور مصوّری پر مختلف ملکوں، خطّوں اور آرٹ سکولوں کا اثر ونفوذ ہے۔ ان ملکوں میں تبت، سنٹرل ایشیا، نیپال، ایران، چین، کشمیر اور آرٹ سکولوں میں گندھارا، مغل، بنگال اور بہار کے پالا اور سینا حکومتوں کے آرٹ کے اثرات ہیں۔ لداخ نے براہِ راست یا بالواسطہ یہ اثرات قبول کئے ہیں۔ خاص طور پر تبت اور کشمیر کا اثر نمایاں ہے۔ ان دو خطّوں نے بھی مختلف ممالک اور مکاتیبِ آرٹ سے استفادہ حاصل کیا ہے۔

آرٹ کے میدان میں مذکورہ ملکوں نے ایک دُوسرے سے اثر لیا ہے۔ اس کا آغاز قبل مسیح سے ہوتا ہے جب سنٹرل ایشیا میں بدھ مت پہنچا۔ سنٹرل ایشیا میں بدھ آرٹ لگ بھگ دُوسری صدی میں آیا۔ بعد میں یہاں چینی آرٹ کا اثر پڑا۔

ساتویں صدی اور نویں صدی کے درمیان سنٹرل ایشیا، چین، تبت، کشمیر اور عربوں کے درمیان مُلک گیری کے لئے رسہ کشی چلی اور فریقین میں سخت لڑائیاں ہوئیں۔ ان قوموں کے سرگرمیوں کے مراکز گلگت، بلتستان اور لداخ تھے۔ باہمی میل جول سے قدرتی طور پر فریقین کے آرٹ پر بھی اثر پڑا۔

اس زمانے میں تبت دُنیا کے اِس خطّے میں ایک بڑی طاقت بن کر اُبھرا۔ آٹھویں صدی میں لداخ اور بلتستان اس کے زیرِ نگیں تھے۔ تبت نے سنٹرل ایشیا کے مشہور شہر ختن کو فتح کیا۔ آرٹ میں ختن سکول سب سے اہم تھا۔ سولہویں صدی کے مشہور تبّتی مصور پدما کرپو نے تبت کے آرٹ پر ختن سکول کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شروع میں تبت پر اس سکول کا اثر سب سے زیادہ تھا۔

ختن کے علاوہ کاشغر بھی اہم بودھ مرکز تھا۔ ساتویں صدی میں کاشغر میں کئی سو بُدھ خانقاہیں تھیں۔

یہ غالباً ختن پر قبضہ کرنے سے پہلے کا واقعہ ہوگا کہ تبت کے ایک بادشاہ چھشوق چھیتین (دیستن) نے ختن کے حکمران کو وہاں کے ایک مشہور مصوّر کو تبت

بھیجنے کے لئے کہا اور ساتھ ہی یہ دھمکی دی کہ اگر مصوّر کو نہ بھیجا گیا تو تبت، ختن پر فوج کشی کرے گا۔ چنانچہ وہ مصوّر تبت گیا اور وہاں کام کرنے لگا۔

پالا دورِ حکومت میں بنگال اور بہار میں آرٹ کو فروغ حاصل ہوا۔ اس پر گپتا دور کے آرٹ کا اثر تھا۔ کشمیر، تبت اور نیپال نے یہ اثر قبول کیا۔ ساتویں صدی کے کشمیر کے مشہور حکمران للتا دتیہ نے اپنی فتوحات کے بعد بنگال اور بہار سے اپنے ساتھ کئی مصوّر کشمیر لائے تھے۔

سنٹرل ایشیا کی مصوری اور سنگ تراشی پر گندھارا، ایران اور بعد میں چین کا اثر پڑا۔ اس طرح اِس امتزاج سے وہاں کے آرٹ میں تغیر و تبدّل ہوا۔

۸۴۲ء میں جب تبت میں بادشاہت ختم ہوئی تو لداخ اور بلتستان اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ دسویں صدی میں تبت کا ایک شاہزادہ سکیت نیما گون لداخ پر قابض ہوا اور اُس کے خاندان نے آٹھ سو سال تک لداخ پر حکومت کی۔ لداخ نے آرٹ سمیت مختلف فنونِ لطیفہ میں تبت سے اِستفادہ کیا۔ اِس طرح لداخ کا آرٹ بھی مختلف خطّوں کے آرٹ کا اِمتزاج ہے۔

چارلس گینوڈ (Charles Genoud) اپنی کتاب BUDDHIST WALL PAINTING OF LADAKH میں لکھتا ہے: ''لداخ کی مصوّری کے سٹائل کو لداخی کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں کی مصوری پر کچھ براہِ راست اور کچھ بالواسطہ اثر پڑا ہے اور کئی دفعہ لداخ کی مصوّری پر دُور دراز علاقوں کی مصوّری کا اثر پڑا ہے۔

تبت نے اپنا سٹائل مروّج کرنے سے پہلے ہند، کشمیر، نیپال، ختن اور چین کا اثر قبول کیا۔ تبّتی حکمران رالپاچن نے ان ملکوں کے مصوّروں کو تبت مدعو کیا تھا۔

لداخ کے اِلچی اور منگیو گنپے، ہماچل پردیش کے سپیتی کے تابو گنپہ اور مغربی تبت کے ژھپرنگ اور تھولینگ گنپوں سمیت کئی گنپوں میں کشمیری آرٹ کا نمایاں اثر ہے۔ اِن گنپوں کی تعمیر رنچن زنگپو سے منسوب کی جاتی ہے۔ وہ سنسکرت اور تبّتی زبان

کے عالم تھے۔

رینچن زنگپو' کشمیر سے دسویں صدی میں معماروں کے علاوہ کچھ مصوّروں کو بھی اپنے ساتھ لداخ لائے تھے۔ جن میں چند مصوّروں کے نام دیئے گئے ہیں۔ مقامی روایت کے مطابق رینچن زنگپو نے زوجی لا سے مغربی تبت تک ایک سو آٹھ گنپے تعمیر کئے تھے۔ ان میں مذکورہ چند گنپے موجود ہیں۔ جبکہ بہت سے گنپوں کے کھنڈرات یا نام ہی باقی رہ گئے ہیں۔

رینچن زنگپو مغربی تبت کی ریاست کوگے کے رہنے والے تھے اور مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کشمیر گئے تھے۔

لداخ نے کشمیری آرٹ کا اثر براہِ راست قبول کیا۔

CULTURAL HERITAGE OF LADKAH کے مصنفین ڈیوڈ سنیل گرو اور ٹے ڈیوز سکورپسکی (Tedeusz Skorupski) لکھتے ہیں:

''کشمیر میں اِسلام کی آمد کے بعد بھی لداخ اور یہاں کے آرٹ پر مغل آرٹ کا اثر رہا۔ لداخ کے راجوں نے مغلیہ طرز کا لباس زیب تن کیا۔''

چارلس گینو' وڈ نے بھی لکھا ہے کہ لداخ کی چند دیواری تصاویر پر مغلوں کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ خاص کر الچی میں اویلو کیتیشورا کے چغا اور تارا کے ہم نشینوں میں یہ اثر نظر آتا ہے۔

تبت نے جہاں گوناگوں اثر لئے وہاں بقولِ چارلس گینو' وڈ چودھویں اور پندرھویں صدی میں اپنا ایک جداگانہ سٹائل بھی ایجاد کیا۔ یہ سٹائل تمام اثرات کا اِمتزاج ہے جو معمولی تبدیلی کے بعد اب تک قائم و دائم ہے۔

ایک اور مصوّر رمنلا تنڈوپ نے ایک سکول کی بنیاد ڈالی ہے جسے مندی (سکول) کہا جاتا ہے۔ ایک اور سکول کرماگادی ہے جس کی بنیاد سولہویں صدی میں نامکاٹشی نے ڈالی تھی۔

تبت کے مندری سکول کا لداخ پر اثر پڑا ہے۔ تبت نے جو کچھ پایا یا بنایا وہ بعینہ لداخ کو دیا۔ تاہم لداخ کے آرٹ میں اپنی انفرادیت ہے۔ بقولِ چارلس گینوؤ وڈ لداخ میں آرٹ کا اِرتقاء بالکل تبت کے طرز پر ہوا۔ تاہم علاقائی اثر کی وجہ سے لداخ کا آرٹ تبت سے کچھ جداگانہ لگتا ہے۔

PEAKS AND LAMAS میں مارکو پالِس لکھتا ہے:

''لداخ کو اگر چہ کلچر کے اہم گہواروں میں شمار نہیں کیا جاتا لیکن یہاں کے دیہات اور لیہہ میں سفر کے دوران ایک خالص اور کھری تہذیب کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے جو ہم یورپ کے ایک بڑے حصے میں نہیں پاتے۔''

گینوؤ وڈ کا خیال ہے کہ لداخی مصوری کا سٹائل نہایت پیچیدہ ہے۔ خاص کر تبت کے آرٹ کا اثر پانے سے پہلے اس میں بڑی پیچیدگی تھی۔

لداخ کے قدیم آرٹ کے نمونے سسپول اور الچی میں نظر آتے ہیں۔

مدن جیت سنگھ کا مشاہدہ ہے:

''آٹھویں صدی میں جب للتا دتیہ نے مشرقی ہند کی جانب اپنی حدودِ سلطنت کو وُسعت دی تو لداخ میں وجرانا دیوی دیوتاؤں پر پالا سٹائل کی مضبوط گرفت تھی۔ لامایورو گنپہ میں مابعد کرکوٹا دَور کی دیواری مصوّری کے خوبصورت نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔''

مصوّری کی ایک اہم خصوصیت اِس کا پائیدار اور نظر نواز رنگ ہے۔ تبتیوں کو رنگوں کی آمیزش کے فن میں بڑی صلاحیت حاصل ہے۔ یہ رنگ مختلف دھاتوں اور پودوں سے تیار کیا جاتا ہے اور بڑا دیرپا ثابت ہوتا ہے۔ رنگوں کی تیاری کے فارمولہ سے متعلق استاد اور شاگرد میں راز برتا جاتا ہے۔ آج کل آرٹسٹ اِن رنگوں کے فارمولہ سے لاعلم ہیں۔

الچی میں کشمیری آرٹسٹوں نے جو رنگ اِستعمال کئے ہیں، ایک ہزار سال

کے بعد بھی اُن کی چمک اور دِلکشی میں بہت کم فرق آیا ہے۔ کہیں کہیں بارش کے پانی سے دیواری تصاویر خراب ہوئی ہیں۔ حال میں اناڑی ہاتھوں سے مرمت کے نام پر جو رنگ آمیزی ہوئی ہے اُس سے اِلچی کی دیرینہ نقاشی کو ناقابلِ تلافی گزند پہنچا ہے۔

دیواری تصاویر بنانے کے طریقے یہ ہیں کہ پہلے دیوار پر ایک لیس دار مادہ کی ایک تہہ چڑھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد چونے اور گوند کے ملغوبے کی ایک تہہ لگتی ہے۔ تب دیوار پر تصویروں کے خاکے کھینچے جاتے ہیں۔ اِس کے بعد تصویریں بنانے کا مرحلہ آتا ہے۔ اہم تصویریں مذہبی صحیفوں کی روایت کے مطابق بنائی جاتی ہیں۔

تصویروں کی تکمیل پر مذہبی رسومات سرانجام پاتی ہیں۔ ان کا مقصد تزئین نہیں بلکہ گنپے کو صحیح معنوں میں مقدس کرداروں کے لئے ایک رُوحانی مسکن بنانا ہے۔ اسی طرح تھنکوں (کپڑوں پر بنی ہوئی تصویریں) کو بھی نمائش سے پہلے مذہبی طور پاکیزہ بنایا جاتا ہے۔ پاکیزگی کے لئے تھنکے پر آئینے کا عکس ڈالا جاتا ہے اور اس کی پُشت پر ایک مقدس منتر لکھا جاتا ہے۔

تبّتی آرٹ کا خالق عام طور پر گمنام ہے۔ تصویر یا سنگ تراشی کے شاہکاروں پر مصوّر یا سنگ تراش کے دستخط کرنے کی رسم نہیں ہے۔ تصویر بنانا یا پتھر تراشنا بذاتِ خود عبادت سمجھا جاتا ہے اور اسے اس کا ثواب ملتا ہے۔ فن پارے کی عظمت اور اُس کے رُوحانی تقدّس کے سامنے فن کار کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی تاہم کئی دفعہ ان تصویروں اور شبیہوں میں، جن میں بہشت کی نعمتوں یا رُوحانی عرفان کے حصول کی غمازی کی گئی ہے، مصوّر اور اس لاما کے نام لکھے جاتے ہیں جس کے مشورے سے یا جس کی رہبری میں یہ تصویریں اور شبیہیں بنائی جاتی ہیں۔

تبت اور لداخ میں ہر زمانے میں ممتاز اور سرکردہ مصوّر ہو گزرے ہیں جن کی تعداد ہزاروں ہے۔ تاہم اکثر گمنام ہیں۔ تبّتی کلچر کے ماہر ٹوچی لکھتے ہیں:

''تبت میں بارہا سفر کے دوران مجھے کل ساٹھ مصوّروں کے نام ملے۔''

پانچویں دلائی لامانے ایک مصوّر رتنڈوپ گیاژو کو عظیم مصوّر کے نام سے یاد کیا ہے۔ زوپا پلے لداخ کا مشہور آرٹسٹ تھا، جس نے ہمس گنپہ کا عظیم دیوار گیر تھنکا تیار کیا۔ اُس بلند و بالا تھنکے کی نمائش ہر بارھویں سال ہمس میلے کے موقعے پر کی جاتی ہے۔

زمانۂ حال میں لداخ میں کئی اہم اور سر کردہ مصوّر ہیں۔ اُن میں چھرنگ آنگدو کا نام سرِ فہرست ہے۔ اُنہوں نے کئی گنپوں کی شاہکار دیواری تصاویر بنائی ہیں۔ اِس کے علاوہ نوانگ چھرنگ اور سکلزانگ صنم بلند پائے کے مصور ہیں۔ اِن تینوں آرٹسٹوں کو مرکزی حکومت نے ان کی فن کارانہ صلاحیتوں کے لئے قومی ایوارڈ عطا کئے ہیں۔

لیہہ میں جرنیل کریاپا کی آمد-۱۹۴۸ء
تصویر میں صنم نربو، مسز نارمن ڈرائیور اور تنیت شاہ نظر آرہے ہیں
(مضمون ''لیہہ'' ملاحظہ کیجئے)

لیہہ قصبہ پندرھویں صدی سے لداخ کی راجدھانی ہے۔ اطالوی محقق ڈاکٹر فلیپو فلیپی نے بیسویں صدی کے شروع میں کہا تھا:

''لیہہ ایک اصلی دارالخلافہ ہے اور چھوٹا سا Cosmopolitan لیہہ دُنیا کے مرکز میں ہے۔''

لیہہ اصل میں ''لے'' ہے۔ اِس کا لفظی مطلب نخلستان ہے۔ دلدلی زمین کے معنی میں بھی ''لے'' استعمال ہوتا ہے۔ لداخ جیسے بنجر، اوسر اور چٹیل علاقے میں زمین کا ایک شاداب ٹکڑا ریگستان میں نخلستان لگتا ہے۔

پچھلی صدی کے شروع میں لداخ آنے والے ایک سیاح جین ڈنکن نے لکھا ہے: ''لیہہ بلند سلسلہ ہائے کوہ کے دامن میں صحرا میں ایک سبز رنگ کے فیتے کی طرح لگتا ہے۔''

ماضی میں مسافر جب پیدل یا گھوڑے پر کشمیر کی طرف سے لیہہ کے مغرب میں پانچ کلومیٹر دُور گاؤں سپتک کی کھریا مٹی کے ٹیلے کے موڑ پر پہنچتا تو دُور سے لیہہ ایک لمبی سبز لکیر کی طرح نظر آتا تھا۔ لیہہ صدیوں تک سنٹرل ایشیا کی تجارت کا مرکز اور مختلف قومیتوں کے لوگوں کا سنگم رہا۔

_ ایک بنگالی مصنف سبودھ چندرا بوس نے اپنی کتاب Land And People of the Himalaya میں لکھا ہے۔ ''لیہہ لداخی ثقافت کا مرکز ہے۔ اِسے چھوٹا لہاسہ کہا گیا ہے۔''

لیہہ لداخ کے متعدد دیہات اور بستیوں کے بعد آباد ہوا۔ بقولِ ڈاکٹر فرانکی لیہہ ایک چراگاہ تھا جہاں منگول نسل کے خانہ بدوش اپنی بھیڑ بکریاں چرانے ایک جگہ سے دُوسری جگہ جاتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ گلگت، چیلاس اور اسٹور سے آنے والے آریائی لوگ پوریگ اور اس کے آس پاس کی بستیوں میں آباد ہوئے اور تبت اور ہماچل پردیش کی طرف سے نقل مکانی کر کے آنے والے قدیم منگول اور مون نسل کے لوگ لداخ کے گیا، میرُ و اور رونگ علاقے میں بس گئے۔ ایسا لگتا ہے درمیان میں لیہہ بے آباد اور گمنام رہا۔

یہ امر دلچسپ ہے کہ آج سے ایک ہزار سال پہلے دُور اُفتادہ اور پسماندہ گاؤں گیا اور میرُ و کی زیادہ اہمیت تھی۔ ایک دردی گیت میں بتایا گیا ہے کہ ایک درد قبیلہ نے لیہہ کے مقابلے میں داہ میں بسنے کو ترجیح دی۔ گیا ایک ہزار سال پہلے لداخ کے ایک نامور حکمران گیا پاچو کی راجدھانی تھا۔

میرو سے متعلق لداخی میں ایک کہاوت ہے:

یُل لس سگا وا میرُ و   خر لاس سگا وا خلاثرے

(ترجمہ: سب سے پرانی بستی میرُ و ہے اور سب سے پرانا محل خلاثرے میں ہے۔)

گیارھویں صدی میں جب تبّتی شاہزادہ سیکت دے نیما گون' گیا پاچو کی دعوت پر لداخ آیا تو لیہہ منظر عام پر آیا۔ تب سے لیہہ نے بڑے نشیب و فراز دیکھے۔ یہاں سے مبلغ گزرے۔ گلے سے ٹنٹناتی گھنٹیاں بندھے اونٹوں اور گھوڑوں کی قطاریں اور اُون کے گٹھے اور نمک کی تھیلیاں اُٹھائے بھیڑ بکریوں کے ساتھ تجارتی قافلے آئے۔ حملہ آور آندھی کی طرح آئے اور بگولے کی طرح چلے گئے۔ لیہہ نے میر سیّد علی ہمدانی' زین شاہ ولی اور ستق سنگ راسپا اوّل نوانگ گیاژو کے قدم چھوئے۔

مقامی روایت کے مطابق ایک مرتبہ چینی ترکستان کی ایک حملہ آور فوج لیہہ

کے قریب واقع ایک پہاڑی سے واپس لوٹی۔ اس پہاڑی سے لیہہ نظر آتا تھا۔ خزاں کا موسم تھا اور لیہہ کے کھیتوں میں گندم اور جو کے کھلیان سجے سجائے تھے۔ حملہ آور فوج نے کھلیان کو فوجی سمجھا اور واپس لوٹ گئی۔ اِس پہاڑی کا نام ''مقلوق'' یا فوجوں کی واپسی یا پسپائی کی جگہ پڑا ہے۔ ماضی قریب تک اِس پہاڑی پر گھوڑے کی نعلیں اور کیلیں ملتی تھیں۔

لیہہ میں چند قدیم یادگاریں اور ان کے کھنڈرات موجود ہیں۔ یہاں لداخ کے دو قدیم ستوپا ہیں، جو تشی گومانگس اور منے سیر مو کے نام سے مشہور ہیں۔ لیہہ محل کے پاس پہاڑی پر ایک کھنڈر ہے جو ڈوقپا کھریا دردوں کے محل کے نام سے جانا جاتا ہے۔

لیہہ کے پاس گیا مچا میں ایک ہزار سال پرانا ایک عالیشان گنپہ تھا۔ اب ایک کھنڈر اِس کی شہادت دیتا ہے۔

لیہہ کی اہمیت تب بڑھی جب گیالپو ٹھی سوق دے نے چودھویں صدی کے آخر میں لیہہ کو اپنی راج دھانی بنایا۔ اُس کے جانشین گیالپو ٹق پابوم دے بڑا رحم دل تھا اور لداخ کے اُن گنے چنے چند اچھے حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے، جن کو تعمیر و ترقی سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس گیالپو نے پہاڑی پر سرخ گنپہ تعمیر کیا۔ جسے ریڈ کالج بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں میتریا کا ایک بڑا بُت نصب کیا۔

گیالپو نے لیہہ میں کرچے پہاڑی پر ایک گنپہ تعمیر کیا۔ ۱۸۲۰ء میں جب ایک انگریز مورکرافٹ لداخ آیا تو اس نے اس گنپہ کو دیکھا۔ وہ رقم طراز ہے: ''لیہہ کے پاس ہاتھی کی شکل والی ایک پہاڑی پر گیالپو نے ایک مورتی رکھنے کے لئے ایک گنپہ تعمیر کیا۔'' اس گنپے کو ۱۸۳۰ء کی دھائی میں ڈوگروں نے ڈھا دیا تھا۔

ٹق پابوم دے نے تیسُور وستوپا تعمیر کیا۔ ۵۵۰ فٹ بلند یہ لداخ کا بلند ترین ستوپا ہے۔ اِس میں ۱۰۸ چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ روایت کے مطابق لداخی راجہ نے بلائیں اور نحوست دُور کرنے کے لئے یہ ستوپا تعمیر کیا تھا۔ اُس کے عہد میں

مصلح اور گیلوگپا فرقہ کے بانی ژونکھاپا کے دو نمائندے لداخ آئے۔ راجہ نے لیہہ میں ایک بڑا اِجتماع بلایا جس میں نیچ ذات کے لوگوں کو شمولیت کی دعوت دی۔

ٹق پابوم دے کے ایک جانشین راجہ ٹشی نمگیل نے پہاڑی کی چوٹی پر سولہویں صدی میں چیمو محل تعمیر کیا۔

لیہہ کی خوبصورتی اور شان اُس وقت دوبالا ہوئی جب سترھویں صدی میں گیالپو سینگگے نمگیل (۱۶۲۴-۱۶۴۲ء) نے نومنزلہ لیہہ محل تعمیر کیا۔ راجا نے لیہہ میں پہلی مسجد تعمیر کرنے کے لئے زمین وقف کی۔ اُس کے زمانے میں پرتگال کے دو پادری فادر فرانسکوڈی آزیویڈو اور فادر اولیویرا آئے۔ لیہہ سے متعلق فادر آزیویڈو لکھتے ہیں:

''لیہہ قصبہ ایک پہاڑی ڈھلان پر واقع ہے۔ آدھا میل دُور نشیب میں دریا بہتا نظر آتا ہے جو لاہور جاتا ہے (آزیویڈو نے فاصلہ بتانے میں غلطی کی ہے۔ دریا قصبہ سے چار میل دُور ہے) قصبے میں پہاڑ سے آتا ہوا ایک نالا بہتا ہے جس پر بہت ساری پن چکیاں چلتی ہیں۔ کچھ درخت بھی پائے جاتے ہیں۔''

لیہہ کے مکانات سے متعلق وہ لکھتے ہیں: ''لیہہ میں مکانات پختہ بنے ہوئے ہیں اور کشادہ ہیں۔ یہ مقامی حالات کے مطابق موزوں ہیں۔''

دونوں پادری دستور کے مطابق شہر کے پھاٹک پر اپنے گھوڑوں سے اُترے اور راجہ سے شہر میں داخل ہونے کی اجازت مانگی۔

ایک لداخی گیت کے چند بند ملاحظہ ہوں

جب میں شہر کے پھاٹک پر پہنچا
اُنہوں نے میرے لئے پھاٹک بند کر دیا
اے لداخ کے گلاب
میں تمہیں سلام کرتا ہوں

۱۶۳۵ء میں راجہ سینگگے نمگیل کے جانشین راجا دیلدن نمگیل نے اپنی ماں

سکلزانگ رولما کی یاد میں ایک لمبی منے دیوار تعمیر کی۔ یہ ۱۹۳۲ فٹ لمبی، تقریباً ۴۰ فٹ چوڑی اور ۶ سے ۷ اعشاریہ ۸ فٹ اُونچی ہے۔ اِس کے اُوپر رکھی گئیں ہزاروں سلِوں اور چپٹے پتھروں پر مقدس منتر اور بدھ، بدھی ستو وغیرہ کی شبیہیں تراشی گئی ہیں۔

۶۷-۱۶۶۶ء میں لیہہ کی تاریخی جامع مسجد کی تعمیر عمل میں آئی۔

فادر آذیویڈو اور فادر اولیویرا کی آمد کے چوراسی سال بعد ۱۷۱۵ء میں دو اور پادری فادر ہپو لیٹے ڈیزی ڈیری اور فادر فریرے لیہہ آئے اور یہاں سے تبت چلے گئے۔ جب لداخ میں راجہ نیما نمگیل کی حکومت تھی۔ فادر ڈیزی ڈیری نے اپنے سفرنامہ میں لیہہ کو Lhata لہاتا کہا ہے۔ وہ لیہہ سے متعلق رقم طراز ہیں:

''لیہہ قصبہ چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا ایک پہاڑی ڈھلان پر واقع ہے۔ اور بڑے لاما کی رہائش گاہ اور راجہ کے محل تک پھیلا ہوا ہے، جو بڑی اور عمدہ عمارتیں ہیں۔ چوٹی پر ایک بڑا قلعہ ہے۔ جس کے ساتھ دُوسرا قلعہ ہے۔ (ڈیزی ڈیری نے گمپہ کو بھی قلعہ تصوّر کیا) نشیب میں اور کناروں پر قصبہ فصیلوں اور دفاعی پھاٹکوں کے ہالے میں ہے۔''

اُن دِنوں فصیل سے باہر کوئی مکان نہیں تھا اور لیہہ آنے والا ہر مسافر کو قصبہ پہاڑی پر نظر آتا تھا۔ فصیل کی وجہ سے پہاڑی کے نشیب میں واقع مکانات اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے۔

۱۷۶۵ء میں راجہ چھیتن نمگیل نے راجہ چھوانگ نمگیل کی یاد میں لمبی منے دیوار کے سامنے دُوسری منے دیوار تعمیر کی۔

فادر ڈیزی ڈیری کے لگ بھگ تریسٹھ سال بعد ۱۷۷۸ء اور ۱۷۸۰ء کے درمیان ایک رُوسی سیاح فلپ یاف رے موف لیہہ پہنچا۔ وہ لکھتا ہے:

''لیہہ ایک دریا کے پاس ایک پہاڑی کی ڈھلوان پر واقع ہے۔ کافی بڑا ہے اور اس کا رقبہ بخارا کا نصف ہے۔ مکانات خالص پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔''

اِس کے پندرہ سال بعد جارجیا کا ایک سیاح رافیل ڈینی بیگو لیہہ آیا۔ اس کو جارجیا کے بادشاہ نے کسی مشن پر ہندوستان بھیجا تھا۔ وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے:

"لیہہ اُونچے پہاڑوں کے ہالے میں پہاڑیوں پر آباد ہے۔ یہاں رائی کے بغیر کچھ نہیں اُگتا ہے۔" (لیہہ میں اُن دنوں جو اور گندم اُگائے جاتے تھے)

۱۸۱۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ایک ملازم میر عزت اللہ کو لداخ بھیجا۔ وہ کمپنی کے ایک ملازم ولیم مورکرافٹ کی لداخ کے راستے بخارا روانگی اور اجازت نامہ سے متعلق کچھ وضاحتیں ڈھونڈنے لیہہ بھیجا گیا تھا۔ جہاں کمپنی کے لئے گھوڑے خریدنے مطلوب تھے۔ میر لکھتا ہے:

"میں نے لیہہ میں کسی ہتھیار بند آدمی کو نہیں دیکھا۔ یہاں قتل، ڈکیتی، تشدّد اور خونریزی بالکل نہیں ہوتی۔"

اُس کے آٹھ سال بعد ۱۸۲۰ء میں مورکرافٹ اور ٹریبیک لیہہ پہنچے۔ وہ تقریباً دو سال لداخ میں رہے۔ ٹریبیک نے لیہہ قصبہ کا خاکہ بنایا جو مورکرافٹ نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ اس میں محل اور چند عمارتیں نظر آتی ہیں۔ جن میں وزیراعظم کے رہائشی محل اور گمپہ شامل ہیں۔ یہ ڈوگروں کے ساتھ لڑائیوں کے دوران تباہ ہوئے۔

جہاں آج پولو گراونڈ ہے، وہاں ڈوگروں نے چھاؤنی قائم کی تھی اور اُسی چھاؤنی سے گولہ باری کی تھی۔ یہ جگہ ماضی قریب تک چھاغون کے نام سے مشہور تھی جو چھاؤنی سے بگڑا ہوا لفظ ہے۔

مورکرافٹ نے فصیل کے باہر بھی چند مکانات دیکھے۔ فصیل کے باہر ایک محلّہ آج بھی "ستاغوپھی لوق" یا "پھاٹک سے باہر" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ البتہ فصیل کی حالت تب اچھی تھی لیکن اِس کے ۴۱ سال بعد جب ایک انگریز کرنل Torrens لیہہ آیا تو فصیل کئی جگہوں سے گر گئی تھی۔

مورکرافٹ نے سکراہ اور سپتک کے درمیان ایک بڑی عمارت کا کھنڈر دیکھا جو "چھتپے لہا کھنگ" یا "سزا کا دیوتا گھر" کہلاتا تھا۔ روایت کے مطابق ایک

لداخی راجہ نے دو مجرموں سے بطورِ سزا یہ عمارت تعمیر کرائی تھی۔

لداخی راجے کا قصبے میں نشیبی زمین پر کرزو کے نام سے ایک محل تھا۔ وہ اس میں بھی قیام کرتا تھا۔ ایک وزیر موروپ ستنزین نے اِس پر ایک گیت کہا ہے:

کرزُو باغ خوشیوں سے بھرا ہے

اِسے بنایا نہیں گیا بلکہ خود بخود وجود میں آیا

یہ دیوتاؤں اور سورج کا مسکن ہے

اِس کے شیر کے تخت پر

ایک مشہور اور مضبوط خاندان کا فرد براجمان ہے

یہ خاندان چھوسکیال چھیپل، اس کی ماں اور بیٹے پر مشتمل ہے۔

لیہہ میں لوگوں کے لئے ہمیشہ کچھ کشش رہی ہے اور اکثر لوگوں نے اِس کی تعریف کی ہے۔ ''گزیٹر آف کشمیر اینڈ لداخ'' میں لکھا ہے:

''دلکش اور جاذب نظر مناظر کے شائقین کے لئے لیہہ میں دِلکشی کا وافر سامان ہے۔''

ایک انگریز ڈاکٹر آرتھر نیوے ۱۸۸۲ء میں رقم طراز ہے:

''لیہہ ایک نمایاں شہر ہے۔ یہ آریاؤں اور منگولوں کی ملن کی جگہ ہے۔''

فریڈرک ڈریو ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۴ء کے درمیان چار سال کے لئے لداخ کا وزیر یا منتظمِ اعلیٰ تھا۔ وہ لیہہ سے متعلق اپنے تاثرات اِن الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''یہ انوکھا قصبہ سرسبز باغوں اور اناج کے کھیتوں کے پہلو میں چٹانوں سے گھرا ہوا ہے۔ جس کے پس منظر میں اُونچے پہاڑ ہیں۔ موسمِ گرما میں صبح کی دُھوپ کی چمک اور تازگی میں نہاتا ہوا منظر جب مجھے یاد آتا ہے تو مجھے مسرّت ہوتی ہے۔''

ڈوگرہ حکمران مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ۱۸۶۸ء میں اپنے ایک اہل کار مہتہ شیر سنگھ کو مخبری کے لئے لیہہ کے راستے سنٹرل ایشیا روانہ کیا۔ اُس نے لیہہ کو ''اچھے

مکانات والا ایک چھوٹا خوبصورت شہر'' بتایا ہے۔

لیہہ کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ ۱۸۷۵ء میں یہاں ڈاک خانہ کھولنے کا ہے۔ ڈاک خانہ کھولنے کے بعد لیہہ سے سرینگر تک ہر پڑاؤ پر ہرکارہ رکھا گیا اور ڈاک سرینگر سے لیہہ ایک ہفتہ میں پہنچنے لگی۔

لیہہ کی تاریخ میں دُوسرا اہم واقعہ سکول اور ڈسپنسری کے قیام ہیں۔ موراوین مشن نے ۱۸۸۷ء میں پہلا سکول کھولا اور اس کے ایک سال بعد ڈسپنسری کھولی۔ پہلا سرکاری سکول ۱۸۹۲ء میں کھولا گیا۔

۱۸۶۷ء میں ڈاکٹر کیلے لیہہ میں برطانوی ہند سرکار کا پہلا جوائنٹ کمشنر تقرر ہوا۔ اُس کے بعد لداخ میں غیر ملکی سیاح، شکاری اور محققین آنے لگے۔ پچھلی صدی کے شروع میں لیہہ کے ایک پادری ہیبر نے لکھا ہے:

''جو کئی لیہہ آتا ہے وہ یا تو اچھا آدمی ہوتا ہے یا انوکھا۔ زیادہ تر محقق، مہم جو، سائنس دان، فنکار اور قلم کار ہوتے ہیں۔''

اُن دنوں لیہہ آنے والے انگریز افسروں کا شاندار اِستقبال ہوتا تھا۔ قصبے کے رُوساء، حکّام اور اُمراء اُن کی پیشوائی کے لئے لیہہ سے آگے سپتیک یا پھیانگ ٹوقیو جاتے تھے۔ لیہہ پہنچنے پر زور آور قلعہ سے اُن کے اعزاز میں توپیں داغی جاتی تھیں۔ لیہہ بازار میں سکول کے بچے اور فوج کا ایک دستہ سلامی دیتا تھا۔ عورتیں صراحی میں شراب، تھالی میں آٹا وغیرہ لے کر روایتی طور سواگت کرتیں اور لامے گنپہ کے موسیقی کے آلات بجا کر خیر مقدم کرتے تھے۔ پھر اُن کی تفریح کے لئے پولو اور تماشے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔

برٹش جوائنٹ کمشنر کی آمد پر سرینگر تا لیہہ ہر پڑاؤ پر گاؤں میں یونین جیک لہرایا جاتا تھا۔ مہاراجہ کی حکومت انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھی۔ لوگ یورپیوں خاص طور پر انگریزوں کے دبدبے سے بڑے مرعوب تھے۔

کئی سیاحوں نے لیہہ کے پختہ مکانات کی تعریفیں کی ہیں۔ مکانات اچھے ہیں، لیکن مکین بھی تو برے نہیں ہیں۔ لیہہ کے باسیوں نے ہمیشہ اجنبیوں، سیاحوں، اپنوں اور پرایوں کو اپنی مسکراہٹیں پیش کی ہیں۔ ایک امریکی خاتون ہینر یتا سینڈ، جو ۱۹۳۰ء کی گرمیوں میں لیہہ آئی تھی، اپنا مشاہدہ یوں بیان کرتی ہے:

''لیہہ کے لوگوں کی آنکھوں میں خوشی جھلکتی ہے۔ جنہیں دیکھ کر ناچ اور قہقہے کا گمان ہوتا ہے۔ لیہہ میں کوئی بھکاری نہیں ہے۔''

اس سے پہلے ۱۹۱۸ء میں ایک یورپی خاتون مسز کرمپ لیہہ آئی تھی۔ وہ رقم طراز ہے: ''لیہہ کے لوگ بڑے خوش مزاج ہیں۔''

ایک اطالوی محقق ڈاکٹر فلیپی فلیپو، جو ۱۹۰۴ء میں لداخ آیا تھا، لکھتا ہے:

''سردیوں میں خوابیدہ اور اُداس سکردو کے مقابلے میں لیہہ میں زیادہ ہماہمی اور گہما گہمی رہتی ہے۔''

ایک ملکی مشاہد پنڈت امرناتھ کو لیہہ کی خاموش فضا میں شیکسپیئر کے ذیل کے مشہور اشعار یاد آئے، جس کا حوالہ اُنہوں نے اپنی کتاب An Echo of Unknown میں دیا ہے:

Tongues is trees
Books in running brooks
Sermons in stones
And good in every thing.

درختوں کے منہ میں زبانیں ہیں
بہتی ندیاں کتابیں ہیں
پتھروں میں پندونصائح ہیں
یہاں کی ہر چیز میں خوبی ہے۔

کئی سیاحوں نے لیہہ کو Sleepy سویا ہوا قصبہ کہا ہے۔ جب کارواں چلے

جاتے تو لیہہ شہرِ خموشاں لگتا ہے۔

ہینریتا سینڈ لکھتی ہے: ''میں رات کے دس بجے بازار میں گھومی۔ سب لوگ سو چکے تھے۔ کسی گھر میں روشنی نہیں تھی۔''

لیہہ نے صرف مسکراہٹیں ہی نہیں، آنسو بھی دیکھے ہیں۔ لیہہ کے باشندوں نے بڑے مصائب جھیلے ہیں۔ جب ہمسایہ علاقوں سے فوج کشی ہوتی۔ سنٹرل ایشیا میں نقصِ امن ہوتا یا لڑائیاں ہوتیں، یا جھیل خومدن پھٹ جاتا تو سیلاب آ جاتا۔ تب لیہہ کارواں نہیں پہنچتے تھے اور تجارت ختم ہو جاتی۔ اور جب تجارت نہیں ہوتی تھی تو قحط کا سماں ہو جاتا۔ تب لیہہ سنسان سنسان اور ویران ویران لگتا تھا۔ ایسے میں کئیوں نے لیہہ کو ''مُردوں کا شہر'' کہا ہے۔

۱۸۳۴ء میں وزیر زور آور سنگھ کے حملے کے بعد لداخیوں نے بڑے مصائب دیکھے۔ ان لڑائیوں اور بغاوتوں میں ہزاروں لداخی مارے گئے۔ پھر چیچک نے ہزاروں جانیں لیں۔ جنگ اور بیماری کا اثر بیس پچیس سال کے بعد دیکھا جا سکتا تھا۔

لیہہ کی تعمیر میں ڈوگروں کا بھی یوگ دان ہے۔ وزیر زور آور سنگھ نے لیہہ کا قلعہ تعمیر کیا۔ اس میں ہندوؤں کے مہابیر اور دیوی دوارہ مندر اور مسلمانوں کی پنج پیر مسجد تعمیر کی گئی۔ آزادی کے بعد اِس میں ایک گردوارہ اور ایک گنپہ کا اضافہ ہوا۔

۱۸۳۴ء اور ۱۸۴۲ء کے درمیان ڈوگرہ منتظمینِ اعلیٰ مہتہ بستی رام اور مہتہ منگل نے لیہہ بازار کو وسعت دی اور نیا بازار تعمیر کیا گیا۔ ۰۱-۱۹۰۰ء میں یہ مکمل ہوا تھا۔

ڈوگروں کا ایک اہم کام شجر کاری ہے۔ اُنھوں نے لیہہ میں کئی باغات لگائے جو وزیر باغ، تحصیل باغ، کیوگو باغ، کرزو باغ اور منگلے باغ کے نام سے مشہور تھے۔ لیہہ بازار اور لیہہ سے زور آور قلعہ تک سڑک پر سفیدہ اور بید کے پیڑ لگائے۔ لیہہ کے باشندے اور گاؤں سے لیہہ آنے والے ان سایہ دار درختوں اور وزیر باغ کے پیڑوں کی چھاؤں میں آرام کرتے تھے۔ تب لیہہ کی آبادی چار ہزار تھی۔ آج لیہہ

کی تقریباً تیس ہزار کی آبادی کے لئے کوئی باغ یا پبلک پارک نہیں ہے۔

۱۹۱۹ء میں دُوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ پر اتحادیوں کی فتح کی خوشی میں جشن ہوا۔ سرکردہ اشخاص نے گھوڑوں پر قصبے کا چکر کاٹا۔ ان میں تحصیل دار، تار بابو، ڈاک بابو، چرس افسر اور داروغہ شامل تھے۔ پہلی مرتبہ لداخ کی تاریخ میں آتش بازی کی پھلجڑیاں چھوڑی گئیں۔ پولیس کے ایک کانسٹیبل نے کچھ آتش بازی چرا کر اپنی جیب میں رکھی تھی۔ آگ کی چنگاری جیب سے لگی اور اس آدمی کے بدن سے رنگ برنگی آتش بازی کی پھلجڑیاں چھٹنے لگیں۔ وہ بھاگم بھاگ ندی میں جا کر پانی میں لیٹ گیا۔

۱۹۲۵ء میں جیپسی ڈیوی نام کا ایک انگریز اور اُس کی بیوی لیہہ کے پاس ایک پہاڑی پر چھ ماہ تنبو میں رہے۔ لیہہ والے حیران تھے کہ کڑاکے کی سردی میں انگریز میاں بیوی کو پہاڑی پر رہنے کی ضرورت کیوں پڑی؟ انگریزوں کا نام ری صاحب یا پہاڑی صاحب کے نام سے قصبے میں زبان زد عام ہوا۔ عام لوگوں کا کہنا تھا کہ ایک لداخی گوشہ نشین راہب نے ری صاحب کو اپنے رُوحانی علم یا جادو سے سونے کا ایک ہرن دکھایا تھا اور وہ اس سراب کے پیچھے پڑا تھا۔ جبکہ چند پڑھے لکھے لوگوں کا خیال تھا کہ انگریز میاں بیوی یورینیم کی کھوج میں پہاڑ پر مقیم تھے۔

اُن دنوں لیہہ میں پریر ویل گھماتے، تسبیح پھیرتے، اُون باٹتے اور کاتتے ہوئے مرد عورتیں جا بجا چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ مسلمان پگڑی لگاتے۔ کنٹوپ یا رومی ٹوپی پہنتے تھے۔ بودھ کنٹوپ پہنتے تھے۔ مرد اپنے کمر بند سے چاقو، سوئی دان، چقمق، بنسری، رسی کی گانٹھ کھولنے کے لئے مرگ کے سینگ، سُوا، گوپھن وغیرہ باندھتے جبکہ عورتیں چابیوں کا گچھا، چمچی، سوئی دان وغیرہ ساتھ رکھتیں۔ مرد اور عورتیں دونوں اپنی پیالی ساتھ رکھتے تھے۔ میزبان کو پیالی کا انتظام کرنا نہیں پڑتا تھا۔

گاؤں میں آئینہ، ٹارچ، دھوپ چشمہ، ماچس وغیرہ بہت سارے لوگوں کے لئے عجوبے تھے۔

آگ بنانے کے لیے چقمق بھی عام استعمال ہوتا تھا۔

بچّوں کے پاجامے اُٹنگے، موری پتلی، آستین لمبے، پیر ننگے اور سر پر بڑی سی ٹوپی ہوتی تھی۔

ایک رُوسی پی ایس نازاروف نے ۱۹۲۴ء کے لیہہ سے متعلق لکھا ہے:

''چھوٹی چھوٹی لڑکیاں پیرق پہنتی ہیں۔ ایک روز لیہہ میں تیز اندھی میں پتے گرے۔ بچے بازاروں اور گلیوں میں پتے جمع کرنے نکلے۔ پانچ، چھ سالہ بچیوں نے پیرق (فیروزے جڑے گاؤدم شکل کا سرپوش) پہنے تھے اور اُن کی پیٹھ پر چھوٹی چھوٹی کھلونا نما ٹوکریاں تھیں۔''

اُن دونوں سبزیاں کم اُگائی جاتی تھیں۔ سرینگر سے پندرہ سولہ روز کا سفر کرنے کے بعد جب یورپی سیاح لیہہ پہنچتے تو اُن کو موراوین مشن کے باغ میں اُگائی گئی تازہ سبزیاں دستیاب ہوتیں تو سب کا جی خوش ہوتا اور وہ اپنے آپ کو مہذب دُنیا میں پاتے تھے۔ مسز کرمپ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مشرقی ممالک میں لیہہ کی سبزیاں بہترین ہیں۔

میر عزت اللہ نے لکھا ہے کہ لیہہ میں بہت عمدہ شلغم اُگایا جاتا ہے۔ آج بھی لداخ کا شلغم بیرونِ لداخ پسند کیا جاتا ہے۔ البتہ میر عزت اللہ نے لیہہ کے پانی کو خراب بتایا ہے۔

لیہہ کی سماجی زندگی سے متعلق ایک انگریز فوجی افسر ایم۔ ایل۔ اے گمپارٹنر رقم طراز ہے:

''لیہہ میں زِندگی اکثر معاملات میں قدیمی ہے۔ اس کا تجربہ ہمیں اُس دن ہوا، جب ہم نے گھر کی بنی روٹی کھائی۔ گھر میں تیار کردہ مکھن اور مربّہ استعمال کیا۔ اُن دنوں لیہہ میں کوئی نانبائی نہیں تھا۔''

پچھلی صدی کی چوتھی دہائی تک صرف لیہہ اور کرگل میں دُکانیں ہوتی

تھیں۔ جب پنڈت رادھا کرشن، سن ۱۸۸۳ء سے ۱۸۸۷ء تک لیہہ کا وزیر تھا، تو قصبہ میں صرف ۱۳۰ دُکانیں تھیں۔ جن میں دو تہائی دُکانیں سردیوں میں بند رہتی تھیں۔

بیسویں صدی کے شروع میں لیہہ میں دو دُوکانیں مشہور تھیں۔ ایک خواجہ نصر شاہ کی نوادرات کی دُکان اور دُوسری پنجابی تاجر موہن لال کی مختلف اشیائے ضروریات کی دکان تھی۔ دونوں دکانیں یورپیوں کے لئے اہم تھیں۔ خواجہ نصر شاہ کے خاندان کو بعد میں ''لوپچق''، یعنی سالانہ سفارتی مشن کی قیادت کی مراعات ملی۔ یہ مشن ہر سال حکومت کی طرف سے لہاسہ بھیجا جاتا تھا۔

ڈوگرہ دورِ حکومت میں لیہہ میں دسہرہ منایا جانے لگا۔

لداخی راجوں کے دورِ حکومت میں ایک پتلا، جو بدی کی علامت تھا، جلوس کی صورت میں لیہہ کے مضافات میں لیا جاتا تھا۔ وہاں اسے تلوار سے کاٹ دیا جاتا تھا اور نذرِ آتش کیا جاتا تھا۔ ڈوگرہ حکومت نے اس دستور کو قائم رکھا۔ یہ پتلا آپو گرم سنگھ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ایک ڈوگرہ منتظمِ اعلیٰ جانسن نے ۷۴-۱۸۷۳ء میں تلوار کی جگہ پتلے پر گولیاں چلانے کا سلسلہ قائم کیا جو ۲۰۰۲ء تک جاری رہا۔

لیہہ کی آبادی میں نہ صرف ایک جمود رہا ہے بلکہ آبادی میں نشیب و فراز آئے ہیں۔ ۱۶۳۱ء میں فادر آزیویڈو نے لکھا ہے کہ لیہہ قصبہ میں ۸۰۰ گھرانے ہیں۔ اگر فی کنبہ اوسطاً چار نفر ہوں تو آبادی ۳۲۰۰ نفوس ہوتی ہے۔

الیگزنڈر کننگھم نے ۱۸۴۶ء میں لیہہ کی آبادی چار ہزار بتائی ہے۔ اس کے ایک سال بعد تھامسن نے پانچ ہزار دکھائی ہے۔ اس کے ۴۳ سال بعد ۱۸۹۰ء میں ''گزیٹر آف انڈیا'' کے مطابق قصبے کی آبادی صرف ۲۱۰۰ تھی۔

دراصل قصبے میں کبھی قاعدے سے مردم شماری نہیں ہوئی ہے۔ ۱۹۹۱ء سے حکومتِ ہند نے ہر دس سال بعد باقاعدگی سے مردم شماری کرائی۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۶۱ء تک لیہہ کی آبادی ۲۸۹۵ سے ۳۷۷۰ افراد کے درمیان رہی جبکہ ۱۹۷۱ء کی مردم

شماری کے مطابق آبادی میں قدرے اضافہ ہوا تھا اور ۵۵۱۹ تک پہنچی۔ 1981ء میں ۸۷۱۸ تک بڑھی۔ آج علاقے کی آبادی اٹھائیس ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔

آبادی میں جمود کی ایک بڑی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ماضی قریب تک مختلف بیماریوں سے بچوں کی ہلاکتوں کی شرح بہت زیادہ رہی ہے۔

گرمیوں میں جب کارواں آتے تو لیہہ کی آبادی میں اضافہ ہوتا تھا۔ آج ملکی غیر ملکی سیاحوں، مزدوروں اور کاریگروں کی وجہ سے لیہہ کی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے۔

لداخ خطّے میں قحط سالی، بیماری اور بلاؤں سے نجات پانے کے لئے لیہہ میں ہر سال بھنڈارے کا اہتمام کیا جاتا تھا اور ساسا اور ابلا دور کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

اُن دنوں بھوت پریت، جنّات، پری، بالشتیا وغیرہ کا بڑا چرچا تھا اور لیہہ ان افواہوں کا مرکز تھا۔ ایسے میں قصبہ میں سنسنی پھیل جاتی تھی۔

سنٹرل ایشیا اور تبت میں کوئی خاص واقعہ پیش آتا تو اس کی خبر پہلے لیہہ بازار میں پہنچتی۔ لیہہ بازار افواہوں کا گڑھ بھی تھا۔

۱۹۳۰ء کی دہائی میں والٹر اسبو لیہہ میں پادری تھے۔ دُنیا کے مختلف ملکوں سے اُن کو انوکھے خطوط آتے تھے اور انوکھی فرمائشیں کی جاتی تھیں۔ ایک انگریز نے فرمائش کی تھی کہ وہ لیہہ سے چند میل دُور ایک مقام پر جائیں اور رسی کی مدد سے ایک چٹان پر چڑھیں۔ چٹان پر ایک کھوہ میں کالے رنگ اور سرخ چونچ کے ایک نایاب پرندے نے انڈے دیئے ہوں گے۔ اگر انڈے پانچ ہوں تو اُن کو اُٹھالیں، اگر چار ہوں تو انہیں اپنی جگہ رہنے دیں کیونکہ یہ اصلی پرندے کے انڈے نہیں ہوسکتے۔

دُوسری جنگِ عظیم سے دو سال پہلے ۱۹۴۱ء میں سنٹرل ایشیا سے تین ہزار کیرغیز قزاق فرار ہو کر لیہہ آئے۔ ڈوگرہ فوج نے لیہہ سے چند میل دُور اُن کو اپنے کنٹرول میں لایا۔ اُنہوں نے مغربی تبت سے لوٹ کھسوٹ کر کے بہت ساری بھیڑ

بکریاں لائی تھیں۔ بعد میں ایک روٹی کے عوض ایک بھیڑ بکری فروخت کرنے لگے۔

نومبر میں اُن کو کشمیر بھیجا گیا۔ جہاں بہت سارے قزاق پناہ گزین زوجی لا پر برف و باد سے مر گئے۔ ۱۹۳۱ء میں بھی سنٹرل ایشیا سے پناہ گزیں لداخ بھاگ آئے تھے۔

اِس سے پہلے بھی مفرور دُونگن قزاق اور اوگیور ترکی پناہ لینے لداخ آئے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں کمیونسٹ چین کی حکومت کے قیام کے بعد کئی ہزار قزاق اور ترکی بھاگ کر لداخ پہنچے۔

لیہہ میں تبدیلیاں عموماً بتدریج آئی ہیں اور یک لخت بھی آئی ہیں۔ بیسویں صدی کے شروع میں سائنس کی عام روزمرہ کی چیزیں لیہہ میں دستیاب نہیں تھیں۔ کیمرہ، ہتھ گھڑی، پیٹرومیکس، تھرمس فلاسک، پریشر کوکر، سائیکل وغیرہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی اور چوتھی دہائی کے درمیان لیہہ آئے۔ جب ۱۹۳۰ء میں سائیکل آئی تو اس کا نام ''چقستا'' لوہے کا گھوڑا پڑا۔

اِسی اثناء میں جب تیر اندازی کی شام کی ایک تقریب میں پیٹرومیکس جلائی گئی تو اُس رات لوگ گھروں میں آکر بولے۔ آج ایک ایسی تیز روشنی والی لالٹین جلائی گئی تھی کہ آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔

لیہہ کے سکول میں اُستاد کو فاؤنٹین پین سے لکھتے دیکھ کر بچے چلاتے تھے۔ ارے وہ دیکھو دوات کے بغیر لکھنے والا قلم۔

جب اکّا دُکّا گھروں میں پریشر کوکر آیا تو ایک دُوسرے کو بتانے لگے کہ فلاں کے پاس ایک ایسا برتن ہے جس میں جلدی کھانا پکتا ہے۔

۱۹۴۶ء کے پاس لیہہ کے پادری نارمن ڈرائیور کے پاس ریڈیوگرام تھا۔ عام لوگوں کے لئے یہ جادو کا پٹارہ تھا۔ لوگ باگ کہتے تھے کہ صاحب کے پاس ایک ایسا صندوق ہے جس سے اُن کو ساری دُنیا کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔

پہلے پہل ۲۵ رمئی ۱۹۴۸ء کو لیہہ میں ہوائی جہاز اُترا۔

اگست ۱۹۵۰ء میں پہلے پہل ایک فوجی طیارہ میں لیہہ ایک جیپ لائی گئی جو قصبہ کی چند کلومیٹر لمبی سڑک پر صبح شام فراٹے بھرتی تھی۔ یہ قصبہ میں پہلی گاڑی تھی۔

۱۹۵۰ء میں لیہہ کے زور آور سنگھ قلعہ میں پہلی فلم دِکھائی گئی اور اِس کے سات سال بعد قصبہ میں ایک سنیما ہال کھولا گیا۔

اگست ۱۹۶۲ء میں لیہہ - سرینگر کی سڑک کی تکمیل پر لیہہ گاڑیاں پہنچیں۔

اکتوبر ۱۹۶۴ء میں لیہہ میں ۵۰ لائن والا ٹیلی فون ایکسچینج قائم ہوا۔

۲ر جنوری ۱۹۶۵ء کو لیہہ کو ڈیزل جنریٹر سے بجلی فراہم ہوئی۔

۱۹۷۰ء میں لیہہ میں ریڈیو سٹیشن قائم ہوا۔

۱۹۷۴ء میں لیہہ اور خطّے کے کچھ علاقوں کو سیاحت کے لئے واگذار کیا گیا۔

یکم اگست ۱۹۸۴ء کو لیہہ کے سینکڑوں کنبوں کو گیس چولھا فراہم کیا گیا۔

۷ر ستمبر ۱۹۸۴ء کو لیہہ میں دُوردرشن کیندر نے کام کرنا شروع کیا۔

جون ۱۹۸۷ء سے ستقنا پن بجلی گھر سے دن کو بھی بجلی کی سپلائی ہوئی۔

۱۹۹۴ء میں لیہہ کا ڈِگری کالج کھلا۔

۲۰۰۱ء میں لداخی فن کاروں نے پہلی فیچر فلم بنائی۔

کرگل

اِنسان نے اپنی گزر بسر اور رہنے کے لئے ایک بہتر جگہ کی تلاش میں ایک جگہ سے دُوسری جگہ سفر کیا ہے۔ جہاں ایک نالہ بہتا ہو، کھیتی باڑی کے لئے زمین کا ٹکڑا ہو اور فصل پک سکتی ہو وہاں دھرتی کو چیر کر اس نے بیج بوئے اور رہنے کے لئے چھوٹا سا مکان بنایا۔ اس جگہ کا اس نے ایک نام رکھا۔

اِنسان ہمیشہ اکٹھے رہنا پسند کرتا ہے۔ اِس لئے ہر اِنسان کے ساتھ اس کے اہلِ خاندان، عزیز و اقارب اور دُوسرے ہم جنس افراد بسنے کے لئے اس جگہ آتے ہیں۔ لیہہ اور کرگل میں ایسی بیسیوں بستیاں ہیں جو زبانِ حال سے ماضی کی اس امر داستان کو سُناتی ہیں۔

آج کی دُنیا میں جب ہر مُلک نے اپنی سرحدیں تعیّن کی ہیں اور ہر خِطّہ جغرافیائی حد بندی کے بندھن میں بندھا ہُوا ہے۔ ایک انسان کا ایک مُلک سے ہجرت کر کے دُوسرے مُلک میں بس جانا اس کی مرضی نہیں رہی ہے۔ لیکن ماضی میں یہ بندھن نہیں تھا۔

زمانہء قدیم میں گلگت سے تین بھائی بے سروسامانی کے عالم میں پوریگ (علاقہ کرگل) آئے۔ اُن کے نام تھے سمیان کرگی، برور اور پونئ۔

سیمان کرگی موجودہ کرگل کے مقام پر بس گیا اور اِس کا نام کرگی رکھا۔ بعد میں کثرتِ استعمال سے یہ کرگل بن گیا۔

پونئ نے دریائے سورو کے پار ایک بستی بسائی جو اُس کے نام کی مناسبت

سے پوئی سے پوئن بن گیا۔

تیسرا بھائی برور پیچھے نہیں رہا۔ اُس نے اپنے بھائی کرگی کی نئی بستی کے سامنے ایک اور جگہ آباد کی جو موجودہ بارُو ہے۔

ہمیں یہ معلومات وزیر حشمت اللہ نے اپنی تحقیق و تدقیق سے پچھلی صدی کے پہلے رُبع میں فراہم کیں۔ کرگل کا مطلب ''گر اور سکیل'' یعنی ''ہر طرف سے مرکزی مقام'' بھی لیا جاتا ہے۔

کرگل نام کی ایک جگہ چینی ترکستان موجودہ شِن جیانگ میں ہے اور لیہہ نام کا ایک مقام امریکہ میں ہے۔ تاہم ہمارے کرگل اور لیہہ سے اُن کا کوئی تاریخی تعلق یا ثقافتی مناسبت نہیں ہے۔

آیئے ہم کل کے کرگل کی کچھ باتیں کریں۔ اُنیسویں صدی سے پہلے ہمارا کرگل قصبہ آج کی طرح مشہور نہیں تھا۔ اس سے کہیں زیادہ پشکیُوم جانا پہچانا تھا۔ یورپی سیاحوں کے سفر ناموں میں پشکیُوم اور مولبیک کا ذِکر زیادہ ملتا ہے۔ پشکیُوم میں ایک چو یارا جا رہتا تھا۔ ۱۸۲۱ء میں جب انگریز ڈاکٹر ولیم مور کرافٹ لیہہ سے دراس آیا تو اُس نے یہ لکھا:

''لیہہ اور کشمیر کے درمیان سب سے اہم جگہ پشکیُوم ہے۔ اگرچہ پشکیُوم میں کوئی باقاعدہ بازار نہیں ہے، تاہم یہاں کئی دکانیں ہیں جہاں آٹا، مکھن، چاول اور دُوسری چیزیں خریدی جاسکتی ہیں۔ گاؤں میں ایک پولو گراؤنڈ ہے۔ یہاں ایک راجا رہتا ہے۔''

۱۸۶۰ء میں ایک انگریز سیلانی کپتان نائٹ نے پشکیُوم میں ایک پولو میچ دیکھا۔ نائٹ لکھتا ہے کہ پچاس ساٹھ گھوڑ سواروں نے پولو مقابلہ میں حصہ لیا۔ اور تعریف کرتا ہے کہ میچ کے اختتام تک گھوڑے سے کوئی نہیں گرا۔ گھوڑ سوار اُترے بغیر زمین سے گیند اُٹھا کر سٹک سے مارتے ہیں۔

اِختتام پر نائٹ نے عورتوں کا ایک ناچ دیکھا۔

کرگل میں نائٹ نے ایک روپیہ دس آنے میں دو عمدہ بھیڑیں خریدیں۔ اُن دنوں روپیہ کی بڑی قیمت تھی۔ ایک سپاہی دو یا ڈھائی روپے تنخواہ پاتا تھا۔

پچھلی صدی کے آغاز میں کرگل قصبہ کی اہمیت غالباً اِس لئے بڑھی کہ ڈوگرہ حکومت نے کرگل، سکردو اور لداخ پر مشتمل وزارتِ لداخ کی تشکیل عمل میں لائی اور کرگل قصبہ کو تحصیل کرگل کا صدر مقام بنایا۔ اِس سے پہلے گلگت بھی اِن تینوں خطّوں میں شامل تھا اور پورا خطّہ فرنٹیر ڈسٹرکٹ یا سرحدی ضلع کہلاتا تھا۔ ۱۹۰۰ء میں لیہہ کے انگریز جوائنٹ کمشنر اے۔ ایل۔ کے نیون KENNION اور سرینگر میں مقیم اسسٹنٹ ریذیڈنٹ کی پہل اور سفارش پر مہاراجہ نے گلگت کی الگ وزارت قائم کی۔

نئی لداخ وزارت میں زنسکار کو تحصیل کرگل میں شامل کیا گیا۔ پہلے زنسکار تحصیل کشتواڑ کا حصہ تھا۔

شروع میں نظم و نسق چلانے کے لئے لداخ وزارت کا منتظمِ اعلیٰ، جو وزیر کہلاتا تھا، چار ماہ لیہہ میں، چار ماہ کرگل اور چار ماہ سکردو میں گزارتا تھا۔ بعد میں وزیر گرمیوں کے چھ ماہ لیہہ اور باقی ماہ سکردو میں گزارنے لگا۔

لداخ کے ایک وزیر پنڈت رادھا کرشن نے ۱۸۸۴ء میں سکردو کو ضلع لداخ (وزارتِ لداخ) کا صدر مقام بنانے کی تجویز رکھی تھی۔

۱۴-۱۹۱۳ء میں اِٹلی کا ایک عالم ڈی فلیپی کرگل سے گزرا۔ وہ کرگل کے بارے میں لکھتا ہے:

''چھوٹا سا بازار، سرائے، ڈاک گھر، تار گھر، ایک عمدہ بنگلہ اور وزیر وزارت کا ایک چھوٹا سا بنگلہ یہاں ہیں۔ ڈوگروں کا قلعہ دریا کے کنارے ہے۔ دریا پر ایک جھولا پل ہے۔''

گیوٹو ڈینیلی (GIOTTO DAINELLI) فلیپی کا ہم سفر تھا۔ وہ اپنے

سفرنامہ میں ''بلتستان اور لداخ کے درمیان'' کے عنوان سے لکھتا ہے:

''کرگل اہم مرکز ہے۔ یہاں سے سکردو، زنسکار اور لیہہ راستے جاتے ہیں۔'' آگے وہ لکھتا ہے۔ ''اس اہمیت کے باوجود تاریخی طور قصبہ کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ سابق چھوٹے راجوں کا مرکز (پایہ تخت) اسوت میں تھا۔''

فلپی کے غالباً دو تین سال بعد ایک انگریز فوجی افسر میجر گومپارٹنر کرگل سے گزرا۔ وہ ایک سے زیادہ مرتبہ لداخ آیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

''کشمیر سے نکلنے پر لداخ میں راستے میں صرف دو جگہوں کرگل اور لیہہ میں دکانیں ہیں۔ باقی مقامات پر دودھ، انڈے اور چوزے کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ کرگل میں مٹی کا تیل، بمبئی اور مانچسٹر کے سوتی کپڑے ملتے ہیں۔''

۱۹۳۶ء میں ایک انگریز مارکو پالیس کشمیر سے ہوتا ہوا کرگل کے راستے لیہہ آیا۔ مارکو پالیس کرگل سے متعلق رقم طراز ہے:

''قصبہ کرگل کشمیر سرکار کے افسرِ اعلیٰ کے رہنے کا ایک مرکز ہے۔ جس کے ذِمہ دُوسرے فرائض کے علاوہ لیہہ جانے والے مسافروں کے پروانہ رہداری کی جانچ پڑتال کرنا ہے۔ یہ تیز رو دریائے سورو کے ساتھ ایک کھلی جگہ پر واقع ہے۔ یہاں خوشحالی کی فضا ہے اور دراس کے آس پاس کے خستہ حال گاؤں کے سفر کے بعد ایک خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ زیادہ تر باشندے بلتی ہیں جو بھورے رنگ کے اُونی کپڑے اور اس سے میل کھاتی ہوئی چپٹی ٹوپی پہنتے ہیں۔''

وہ مزید لکھتا ہے۔ ''کرگل کے بازار کی دکانوں میں ہندوستان اور ترکستان سے لایا ہوا مال ملتا ہے۔''

تیس کی دہائی میں ایک رُوسی پی ایس نذاروف لیہہ سے سرینگر روانہ ہوا۔ کرگل سے متعلق وہ اپنا مشاہدہ یوں بیان کرتا ہے:

''اکثر غیر ملکی شکاری کرگل آتے ہیں۔'' کرگل سے آگے اُس نے راستے

میں معاش کی تلاش میں جانے والے بلتستان کے بلتی دیکھے جو انگریزی حرف T کی شکل کے لکڑی کے اوزار پر مکھن وغیرہ اُٹھائے ہوئے گزر رہے تھے۔

علاقہ کرگل پوریگ کے نام سے مشہور ہے۔ کرگل پوریگ کی راجدھانی رہا ہے۔ پوریگ میں سوت، چیکتن، پشکیوم، سورو، کرتسے، پھوکر، مولبیک، واکا، کوکشو، شرگولا اور متعدد دیہات شامل ہیں۔

پوریگ کی ایک مقبول اور معروف وجہ تسمیہ ''پوت ریگس''، یعنی تبّتی نسل کے لوگ ہے۔ علاقے کے لوگوں کا بھی یہی دعویٰ ہے اور اس کا تاریخی جواز بھی ہے۔ تاہم مختلف نسلوں کی آمیزش سے کرگل کے باشندے شکل و شباہت سے خالص تبّتی نہیں لگتے۔

لداخ کی تاریخ اور تمدّن کے ایک محقق ڈاکٹر فرانکی نے پوریگ کو بوریگ کا بگڑا ہوا لفظ بتایا ہے۔ جس کا مطلب ''بہادر نسل'' ہے۔ اِس کی وضاحت فرانکی یوں کرتے ہیں: ''پرانے زمانے میں پوریگ دردوں کا علاقہ تھا اور یہاں کے لوگ بڑے بہادر اور جفاکش تھے۔ اِسی نسبت سے یہ خطّہ بوریگ کے نام سے مشہور ہوا' جو بعد میں بگڑ کر پوریگ بن گیا۔

ایک اور وجہ تسمیہ جس کا بہت کم حوالہ دیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ علاقہ کرگل نلکی Tube کی شکل کا ہے اور اِسی مناسبت سے یہ پوریگ کے نام سے مشہور ہوا۔

زمانہ ءقدیم سے کرگل میں ہمسایہ علاقوں کے باشندوں کی آمد و رفت رہی ہے۔ گلگت سے درد، پورانگ سے منگول بلتستان سے بلتی، تبت سے تبّتی، کرجا سے مون اور لداخ سے لداخی آئے۔

ساتویں اور آٹھویں صدیوں میں تبت فوجی لحاظ سے ایک مضبوط ملک تھا اور چین تک اس کی قلمرو پھیلی ہوئی تھی۔ لداخ، کرگل، گلگت اور بلتستان اس کے زیرِ نگیں تھے۔ چین کے ساتھ جنگ کے دوران کرگل سے تبّتی فوجوں کی نقل و حرکت رہتی تھی۔

یہ فوج زنسکار سے ہوتے ہوئے کرگل آتی تھی۔

دریا پار کرنے کے لئے جھولا پل بنے تھے۔ جو زمانہ حال تک مستعمل تھے۔ کچھ مسافران پلوں کو پار کرنے سے ڈرتے تھے اور انہیں قلی اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر نکالتے تھے۔

پوریگ کی لمبی تاریخ میں ایک اہم نام ٹھاٹھا خان ہے۔ وہ تیرہ سو سال پہلے گلگت سے لداخ آیا تھا۔ جسمانی لحاظ سے اس کو بہت طاقت ور بتایا گیا ہے۔ ٹھاٹھا خان نے سوت میں حکومت قائم کی اور کرتسے، سورو، پشکیوم، ٹیسپون وغیرہ اپنے مفتوحہ علاقوں میں شامل کئے۔ اس نے قدرے دشوار گذار اور گمنام مقام کو آباد کر کے اپنی راجدھانی بنائی۔ جس طرح گیاپاچو نے بظاہر بہتر مقامات چھوڑ کر سرحدی گاؤں گیا کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس کی منتخب جگہ کا نام کوس کاشو پڑا۔ جو دردی زبان میں چوپاؤں کی آبادی ہے۔ بعد میں کثرتِ استعمال سے یہ کوکشو بنا۔

کرگل کی تاریخ اس سے بہت پرانی لگتی ہے۔ لیہہ کے علاقہ لائن کی طرح کرگل نے بھی پتھر کا زمانہ دیکھا ہے۔ گزشتہ صدی کی اسی اور نوّے کی دھائیوں میں علاقہ لائن کے خلسے اور نیموں دیہات کے درمیان محکمہ آثارِ قدیمہ اور جیولوجیکل سروے آف انڈیا کے ماہرین کو پتھر کے اوزار ملے اور اِسی کی روشنی میں اُنہوں نے لکھا کہ اِن دیہات میں ہزاروں سال پہلے اِنسان بستے تھے اور پتھر کے اَوزار استعمال کرتے تھے۔

۱۹۳۴ء میں دو یورپی محققوں جے ہاکس اور ایچ ڈی ٹیرا کو کرگل میں ایک ڈھلوان جگہ پر پتھر کا ایک اوزار ملا۔ اُنہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ کشمیر سے آئے ہوئے کچھ مسافروں نے یہ اوزار اپنے ساتھ لایا ہوگا اور وہاں چھوڑ دیا ہوگا۔ کشمیر میں اس سے پہلے ہاروان میں پتھر کے اوزار ملے تھے۔ حالیہ دریافتوں سے اب یہ واضح ہوا ہے کہ کرگل کے قدیم باشندے پتھر کے زمانے سے تعلق رکھتے تھے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ کرگل بھی لداخ کے دوسرے علاقوں کی طرح ایک بڑی جھیل تھا۔ جھیل سوکھ گئی اور انسان بستے گئے۔

علاقہ کرگل میں اسلام کی اشاعت غالباً پندرھویں صدی میں ہوئی۔ عام خیال ہے کہ خطّے میں اِسلام بلتستان سے آیا۔ چینی ترکستان اور کشمیر سے آئے ہوئے علماء نے اسے مزید فروغ دیا۔ روایات کے مطابق برگزیدہ علمائے کرام میر سیّد علی ہمدانی، سیّد نور بخش اور میر شمس الدّین ایراکی (ایراک ایران میں ہے اور میر شمس الدّین ایران سے تعلق رکھتے تھے) سرزمینِ کرگل تشریف لائے تھے۔

بعد میں پوریگ میں مقامی سرداروں نے کشمیر سے علماء کو مدعو کیا۔ اُنہیں آباد کرایا اور اپنی بیٹیاں اُن کے عقد میں دیں۔ اُنہوں نے سرداروں کی اولاد کو دینیات سکھائی اور لوگوں کو دین سے روشناس کیا۔ اُن علماء کے مقبرے پوریگ میں ہیں۔

بُرو خانقاہ مرجع خاص و عام ہے۔ کاچو سکندر خان کے اندازے کے مطابق یہ میر شمس الدّین ایراکی کے زمانے میں تعمیر ہوئی تھی۔

کرپوکھر میں سیّد میر ہاشم کا مزار ہے اور یوغما خربُو میں میر سیّد حسن شاہ کا مقبرہ ہے۔ اِن دونوں آستانوں پر عقیدت مندوں کا اجتماع رہتا ہے۔

کرگل قصبہ سمیت پوریگ کے متعدد گاؤں میں عالیشان مساجد اور امام باڑے تعمیر کئے گئے ہیں، جن کے گنبد و مینار اسلامی فنِ تعمیر کے دین ہیں۔

پوریگ میں بودھوں کی بھی یادگاریں ہیں، اگرچہ امتدادِ زمانہ سے ان کی حالت خستہ ہوگئی ہے۔

چیکتن میں لوڑ ادار ینچن زنگپو کا تعمیر کردہ لہا کھنگ، پشکیوم میں گیال بُوم دے کا محل، مولبیک میں چٹان پر میتریا کی شبیہہ، ملدُوق کھر، ٹاقپا بوم دے کے کتبے اور شرگولا میں لونپوریکپا چن کا مکان ہے۔ اگرچہ ان کی حالت شکستہ ہے۔

شرگولا کا مطلب صبح کا تارا ہے۔ لونپوریکپا چن ساتویں صدی میں تبت کے

مشہور بادشاہ رونگ ژن گیا لپو کا وزیر اور سفیر رہا تھا۔

لداخ کے شاہی خاندان اور پوریگ کے راجوں کے درمیان خونی رِشتہ ہے۔ راجہ نیا نمگیل کی شادی چیکتن کی ذی ذی خاتون سے ہوئی۔ راجہ چھوانگ نمگیل کی شادی سوت کے راجہ کی بیٹی بیگم وانگمو سے ہوئی۔ چیکتن اور پشکیوم کے راجہ خورچو خان نے لداخ کے ایک راجہ کی بیٹی اور راجکماری سے شادی کی تھی اور اس کے پوتے راجہ آدم خان کی شادی بھی لداخ کے شاہی خاندان کی ایک راج کماری سے ہوئی۔

لداخ کے آخری راجہ تنڈوپ نمگیل کی شادی پشکیوم کے راجہ کی بیٹی زہرہ خاتون سے ہوئی۔ راجہ کے بیٹے راجکمار چھوانگ رفتن نمگیل کی بیوی بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور اس کا نام بھی زہرہ خاتون تھا۔ سورو کرتسے کے مسلم راجہ ٹھی محمد سلطان نے لداخی راجکمار نیا نمگیل کو گود لیا۔

کرگل نے چند اچھے حکمران پیدا کئے۔ اُن میں اٹھارویں صدی کے سورو کرتسے کے حکمران ٹھی محمد سلطان اور چیکتن کے راجہ چھرنگ مالک کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ سولھویں صدی میں انہوں نے چیکتن محل تعمیر کرایا تھا۔ اس کا معمار ژندن علی سینگے تھا، جس نے لیہہ کا محل تعمیر کیا تھا۔

لداخ پر وزیر زور آور سنگھ کی فوج کشی کے دوران لیہہ کی طرح کرگل کے لوگوں کو بھی سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لداخیوں نے کئی مرتبہ بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ ایک بغاوت کی رہنمائی پوریگ کے ایک سرکردہ شخص سُگمیر نے کی تھی۔ بغاوت کچلنے کے بعد سُگمیر پکڑا گیا اور سخت ایذائیں دے کر ہلاک کیا گیا۔ اُس کے ایک ہاتھ کو کاٹ کر لوگوں کی عبرت کے لئے خلسے کے پُل پر لٹکایا گیا۔ سُگمیر کے حامیوں نے ہاتھ کو وہاں سے چُرا لیا اور خلسے کے خوفزدہ لوگوں نے ڈر کے مارے ایک مرے ہوئے آدمی کا ہاتھ کاٹ کر پُل پر لٹکا دیا۔

اِن حالات کے بعد پوریگ کے لوگوں کے حوصلے بڑے پست ہو گئے

تھے۔ ۱۸۶۰ء میں انگریز سیاح کپتان نائٹ پہنچا تو بقولِ نائٹ اُس کو دیکھ کر سنکو کے ہر گھر سے عورتیں اپنے بچوں کو خرگوش کے بچے یا مرغی کے چوزے کی طرح اپنی بغل میں دبا کر فرار ہوئیں اور آن کی آن میں سارے مکانات خالی ہوئے۔

لداخ کے سرد ریگستان میں وادی نوبراہ کی طرح کرگل کی شادابی کا چرچا رہا ہے۔ ''امپیریل گزیٹر آف انڈیا'' میں کرگل کو ایک ''دِل خوش کن نخلستان'' لکھا گیا ہے۔ WHERE THREE EMPIRES MEET کے مصنف ای. ایف. نائٹ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ لداخ کے لوگ کرگل کو دُنیا میں ایک زرخیز خطّہ سمجھتے ہیں۔ بلاشبہ یہ تبت میں ایک جنت کی طرح ہے۔ وہ مئی ۱۸۹۱ء میں لداخ آیا تھا۔

مارکو پالیس اِس ضمن میں رقم طراز ہے:

کرگل گرد و نواح میں اُگی فصلوں اور خوبصورت پیڑوں سے بھری پری زرخیز زمین کے ہالے میں واقع ہے۔ اُنیسویں صدی کے ایک انگریز سیاح ایچ ڈبلیو. بیلو نے کرگل کو سورو اور پشکیوم کے سنگم پر ایک جاذب نظر جگہ قرار دی ہے۔

ایک پرانے ریکارڈ میں کرگل کے پاس دریائے سورُو میں سیلاب کا ذِکر ہے۔ یہ سن ۱۸۹۴ء کا واقعہ ہے۔ کرگل قصبے کا پُل سیلاب سے بہہ گیا تھا۔ انگریز جوائنٹ کمشنر گاڈفری، جنہیں لیہہ جانا تھا، پل بہہ جانے کی وجہ سے کرگل میں پھنس گیا تھا اور دُوسرے افسران کے ساتھ چھالے سسکو کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ کئی لداخیوں نے دریا پار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ڈُوب گئے۔ پانی کے شور کی وجہ سے دریا کے آر پار آواز نہیں جاتی تھی۔ تب ایک آدمی کو ایک تدبیر سوجھی۔ اُس نے تیر اور کمان لائی۔ تیر پر ایک چٹھی باندھ کر کمان کے چلّے سے لگا کر دریا کے پار چھوڑا لیکن تیر دریا میں چلا گیا۔ پھر دُوسرا تیر آزمایا جو دریا کے پار گیا۔ اِس طرح پیغامات اور اگلے منصوبوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ دونوں طرف سینکڑوں قلی جمع ہوئے۔ کرگل میں سامان جمع کیا جانے لگا۔ اِس کے بعد رسیوں کے ذریعے آر پار پیغامات کا تبادلہ ہونے لگا۔

آخر کار پُل بن گیا اور ۲۶ر جولائی کو پُل آمد و رفت کے لئے کھول دیا گیا۔

۱۳را اگست کو کپتان گوڈفری لیہہ پہنچا۔

اُس سال نوبراہ میں دریائے شایوک اور دریائے نوبراہ میں سخت سیلاب آیا تھا۔

کرگل میں پہلا سرکاری سکول ۱۹۰۱ء میں کھولا گیا۔ لیہہ میں اِس سے آٹھ سال پہلے پرائمری سکول کھولا گیا تھا۔

مور کرافٹ کے مطابق اُنیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں کرگل کے ہر گاؤں میں مکتب تھا۔ جہاں قرآن خوانی ہوتی اور دینیات پڑھائی جاتی تھی۔ ہر گاؤں میں ایک یا دو ہندوستانی اور فارسی دان ملتے تھے۔ اُن دِنوں فارسی کا بڑا چلن تھا۔ کشمیر اور پنجاب کی یہ سرکاری زبان بھی تھی۔

۱۹۳۰ء میں کرگل کے پرائمری سکول کو مڈل کا درجہ دیا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں کرگل اور لیہہ کی تحصیلوں میں پانچ پانچ سکول تھے۔ ۱۹۴۷ء میں کرگل، سکردو اور لیہہ کی تینوں تحصیلوں میں تین مڈل سکول اور پینتالیس پرائمری سکول تھے۔ ایک اور ریکارڈ میں ۴۶ پرائمری سکول دیئے ہیں۔

کرگل قصبے میں ایک ڈسپنسری اور حیوانات کا ایک شفاخانہ بھی تھا۔ تار گھر تو پہلے تھا۔ ۱۹۳۲ء میں لیہہ اور کرگل میں ٹیلی فون لائن لگانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اِس کے محرّک منشی عبدالستار تھے، جنہوں نے لیہہ میں شخصی راج کے خلاف چپکے چپکے ایک تحریک چلائی تھی۔ منشی عبدالستار سے لئے گئے اِنٹرویو میں اس کا مزید تذکرہ ہے۔

آرکائیوز ریکارڈ کے مطابق کشمیر کے مہاراجہ امر سنگھ کی نوٹس میں یہ بات آئی کہ کرگل میں ایک گاؤں میں سونا نکلتا ہے۔ گاؤں کا نام Sheilatang دیا گیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ۱۹۰ پونڈ کی مالیت کے سونے کے ڈلے یہاں سے لئے گئے ہیں۔ یہ سن ۱۹۰۲ء کی بات ہے۔ چنانچہ ایک غیر ملکی ماہر OSTERLOB کو کرگل روانہ کیا گیا کہ وہ اس سونے کی کان کا پتہ لگائے۔ شروع میں اس کی رپورٹ مثبت ہوتی ہے لیکن

بعد میں اس منصوبے کا کچھ پتہ نہیں چلا۔

۱۹۰۶ء کی بات ہے۔ کرگل سب ڈویژن کا اسسٹنٹ انجینئر لیہہ کے وزیر کو لکھتا ہے کہ وہاں کوئی انگریزی دان نہیں ہے۔ اِس لئے خط وکتابت فارسی میں کرے۔ اُن دنوں انگریزی جاننے والے خال خال تھے۔ اُدھر لیہہ سے وزیر جواب دیتا ہے کہ لیہہ میں کوئی فارسی دان نہیں ہے۔

۱۹۱۲ء میں لیہہ، کرگل اور سکردو تینوں تحصیلوں میں ملازموں کی کل تعداد ۱۶۵ تھی۔ زیادہ تر ملازم جموں، پنجاب اور کشمیر سے آئے تھے۔ اکثر لداخی ملازم جمعدار، چپراسی اور ترازو بردار تھے۔ ریکارڈ کے مطابق کرگل سے صرف خالو جمعدار، رحیم چپراسی اور جعفر چپراسی کے نام ملتے ہیں۔

آزادی سے پہلے کئی یورپی محققوں نے لداخ خطّے میں پائے جانے والے پرندوں، جنگلی جانوروں اور جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کیا ہے۔

کرگل میں متعدد اقسام کی جڑی بوٹیاں، جھاڑیاں اور پودے پائے جاتے ہیں۔ آر. آر. سٹیورٹ نے سُورُو اور ساپی میں پائی جانی والی ۱۴۵ قسموں کی جڑی بوٹیوں اور پودوں کی ایک فہرست بنائی ہے۔ نیز نامی کا اور فوتو لا پر ۵۴ اقسام کے خودرو پھولوں کی گنتی کی۔

۱۳۵ ۷ میٹر بلند نُن اور ۷۰۷۷ میٹر بلند کُن کی برفانی چوٹیاں کرگل کے سر پر خوبصورت تاج ہیں۔ ماضی میں بھی یہ چوٹیاں کوہ پیماؤں کے لئے خاص کشش رکھتی تھیں۔

لیہہ اور کرگل کے لوگ عام طور پر اجنبیوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں۔ کرگل میں ۱۹۴۷ء میں ایک امریکی نیکل سمتھ پہنچا تو بازار میں دُکان داروں نے سلام کیا۔ سمتھ لکھتا ہے:

'میں نے فخر سا محسوس کیا۔ نیویارک کے فِفتھ ایونیو میں کوئی دکاندار آج

تک میرے ساتھ اِس طرح پیش نہیں آیا۔

یہ ہے کل کے کرگل کی کہانی ——— تب سے دریائے سُورُو میں بہت پانی بہا ہے۔ کرگل میں دُوررس تبدیلیاں آئی ہیں۔ معاشی طور پر لوگ پہلے سے خوشحال ہیں اور سماجی طور پر باشعور ہیں۔

آج کا کرگل ہمارے لئے ایک کھلی کتاب ہے، جو بذاتِ خود ایک لمبی کہانی ہے۔

پوریگ، کرگل کی ایک مُسلم خاتون روائتی لباس میں

دراس

لداخ کا علاقہ دراس اپنے قدرتی حُسن، کڑاکے کی سردی، غیر معمولی برف باری اور جداگانہ تمدّن کی وجہ سے بہتوں کے لئے توجہ اور دلچسپی کا باعث بنا ہے۔

یہاں کے ۱۷ دیہات میں آٹھ ہزار کے قریب لوگ رہتے ہیں۔ ان موضعات میں خاص دراس کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں سرکاری دفاتر، شفا خانہ اور ہائر سکینڈری سکول ہیں۔ ان بستیوں کے درمیان پیچ و بل کھاتا ہوا دریائے دراس بہتا ہے۔

دراس میں درد نسل کے لوگ آباد ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ بلتی اور کشمیری نسل کے لوگ بھی بستے ہیں۔ دراس کے لوگ بڑے جفاکش، غیور اور مزاجاً صاف گو ہیں۔ اُن کی زبان شینا ہے۔ دُنیا میں پانچ چھ لاکھ لوگ شینا بولتے ہیں۔

دراس کا اِبتدائی نام ہیم بس ہے۔ یہ شینا لفظ ہیُو بس ہے۔ جس کا مطلب ''برف کا گھر'' یا ''برف گرنے کی جگہ'' ہے۔ دراس والے آج بھی دراس کو ہیم بس کہتے ہیں۔ یہاں کسی کسی سال پچیس تیس فٹ اُونچی برف گرتی ہے حتیٰ کہ برف مکانوں کی چھتوں سے بلند ہو جاتی ہے۔ تار کے کھمبے برف میں غائب ہو جاتے ہیں۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ ماضی میں آج سے کہیں زیادہ برف پڑتی تھی۔ ہمسایہ ہمسایہ سے کٹ جاتا تھا اور کئی روز تک مل نہیں پاتے تھے۔ برف اِتنی اُونچی ہوتی تھی کہ سیڑھی کے بغیر برف کے تودوں سے چھت پر جا سکتا تھا۔ ایسے میں اِنسانوں اور مال مویشیوں کے لئے پینے کا پانی لانا دوبھر ہو جاتا تھا اور برف پگھلا کر اِستعمال میں لائی جاتی تھی۔

آج بھی کسی کسی سال بھاری برف باری ہوتی ہے۔ تاہم اوسطاً آٹھ نو فٹ اُونچی برف پڑنا ہر سال کا معمول ہے۔

دراس میں کڑاکے کی سردی پڑتی ہے اور سائبیریا کے بعد دُنیا کا دُوسرا سرد ترین علاقہ کہا جاتا ہے۔ یہاں سردیوں میں درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے منفی پچاس پچپن درجے تک گرتا ہے۔ منفی ۳۰ درجہ حرارت میں عموماً مرغی دڑبوں میں اور گائیں گاؤ خانوں میں مرجاتی ہیں۔ درختوں کی شاخیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ چنانچہ لیہہ میں بھی کسی کسی سال سردیوں میں درختوں کی شاخیں ٹہنیاں ٹوٹنے کے متعدد واقعات پیش آتے ہیں۔

ذرا سوچئے، بھلا منفی ۵۰ درجے میں اِنسان کیسے جئے؟

جی ہاں، لیکن دراس کے باشندوں نے غیر معمولی سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے ترکیب بنالی ہے۔ اُن کے مکانوں میں تہ خانے بنے ہوتے ہیں۔ سردیوں میں مکین اور مال مویشی الگ الگ تہ خانوں میں رہتے ہیں۔ تب دراس کا ایک کنبہ دُنیا اور مافیہا سے بے خبر خاموش اور تنہائی کی زندگی گزارتا ہے۔ ایک غیر ملکی جیکسن نامی شخص کے الفاظ میں:

''تب شاید (دراس میں) کسی بھیڑیا کی غراہٹ، ایک Marmot کی سیٹی جیسی سریلی آواز یا ایک برفانی چیتے کی چیخ اِس سناٹے کو توڑتی ہے۔''

کئی لحاظ سے ایک دراسی اور ایک اسکیمو کی زندگی میں گہری یکسانیت ہے۔ ایک کو سمندر اور دُوسرے کو پہاڑ سے پالا پڑتا ہے۔ تاہم دونوں کی راہ میں یخ اور برف ہیں۔ ایک دراسی سردیوں کے چھ ماہ کے لئے اپنی ضروریات کا سارا سامان اور خوراک گھروں میں رکھتے ہیں۔

بدلتے ہوئے حالات میں اہلِ دراس کے طرزِ معاشرت میں تبدیلیاں آئی ہیں۔ اب لوگ چھتوں پر ٹین لگانے لگے ہیں۔

دراس کی بلندی ۱۰۶۰۰ فٹ ہے' جو لگ بھگ لیہہ کے برابر ہے۔ آخر دراس میں اِتنی برف باری اور سخت سردی کیوں؟

دراس زوجی لا کی تلہٹی میں واقع ہے۔ لداخ کی طرف آنے والی مون سون کی شدّت زوجی لا پر آ کر تقریباً ختم ہو جاتی ہے اور دراس اُس کی زد میں آ جاتا ہے۔ چنانچہ برف اور سردی کی سوغات دراسیوں کا مقدر بن گیا ہے۔

دراسیوں کو زوجیلا کا عقاب اور گدھ بھی کہا گیا ہے۔ ماضی میں دراس کے لوگ زوجیلا پر بطور رہبر، ڈاک کے ہرکارے اور مزدور کام کرتے تھے۔ دراس والے باربرداری کے لئے ٹٹو پالتے تھے اور کرایہ کش تھے۔

کڑاکے کی سردی سے قطع نظر' دراس کا اپنا حُسن ہے۔ اپنی جاذبیت اور اپنی دِلکشی ہے۔ گرمیوں میں جب برف پگھل جاتی ہے تو ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔ پہاڑوں پر بیسوں اقسام کے جنگلی پھول کھلتے ہیں۔ غیر ملکیوں نے اِن پھولوں کی گنتی بھی کی ہے۔ چنانچہ زوجیلا سے لیہہ آتے ہوئے درّے پر لیہہ کے پادری فادر ہیبر نے ستر اقسام کے پھول گنے۔ تب اُنہوں نے زوجی لا کو پھولوں کا ایک بڑا باغ قرار دیا۔ ۱۹۲۲ء میں ایک اور سیلانی لیلن سٹار نے یہاں ۷۰ قسموں کے پھول دیکھے۔

دراس کے سبزہ زاروں میں چشمے اور آبشار پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ پہاڑوں کی بلندی سے شور مچاتی اور گیت گاتی ہوئی تیز وطرار ندیوں کا پانی بڑا صاف اور شفاف ہوتا ہے۔

"THIRTY YEARS IN KASHMIR" کے مصنّف آرتھر نیولے کے بقول:

''دراس کی اپنی دلکشی ہے۔'' وہ اس کی وسیع کھلی جگہ، پہاڑوں کے بدلتے ہوئے رنگوں اور برفانی چوٹیوں کی تعریف کرتا ہے۔

لیکن بہار کا یہ موسم بڑا مختصر ہوتا ہے۔ خزاں جلدی دستک دیتی ہے اور سردی اور برف کا پیام لاتی ہے۔ تب قدرت کے یہ حسین نظارے، سبزہ زار اور ندیاں آن کی آن میں بہار کو الوداع کہتے ہوئے یخ اور سفید دبیز برف کا جامہ اوڑھ لیتی ہیں۔

زوجی لا سے ۱۷ کلومیٹر آگے علاقہ دراس شروع ہوتا ہے۔ تب وادیٔ کشمیر کی

شادابی اور ہریالی ختم ہو جاتی ہے۔اور ننگے اور برف پوش پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

پہلی بستی مٹائن ہے۔ یہاں کشمیری اور درد نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں: مٹائن —— مدائن سے نکلا ہے جو ایران کا ایک مشہور شہر ہے۔ اِسی نسبت سے کچھ لوگ مٹائن کے دردوں کو ایرانی نسل کے بتاتے ہیں۔

ویشنو دیوی کا تیرتھ مٹائن سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو یہاں سے ویشنو دیوی گئے تھے۔ یہ سن ۱۹-۱۹۱۸ء کی بات ہے۔ پنڈت جی نے دراس کے ڈاک بنگلے میں رات گزاری تھی۔ اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اُنہوں نے یہاں کے پہاڑوں اور قدرت کے ننگے حسن کی تعریف کی ہے۔

مٹائن سے آگے ایک پہاڑ کے دامن میں پن دراس ہے۔ پن دراس سے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ پائین دراس کا بگڑا ہوا نام ہے۔ پائین فارسی لفظ ہے، جس کا مطلب نچلا ہے۔ پائین دراس خاص دراس کے نیچے واقع ہے۔

دراسی درد نسل کے ہیں، جو پرانے زمانے میں گلگت، چیلاس اور شینگو سے آ کر یہاں آباد ہوئے۔

پن دراس سے آگے کوٹھیار کی چوٹی ہے۔اس کی بلندی ۱۷۹۸۵ فٹ بتائی جاتی ہے۔کوٹھیار کی اُبھری ہوئی بڑی چٹان دُور سے ایک محل کی طرح لگتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں چوٹی کے پاس ایک مسجد، ایک آستانہ اور ایک محل ہے، جو حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ کے ایک اہم مقلد اور بزرگ مرید سے وابستہ ہیں۔

ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ کوٹھیار پر دروپدی کا مندر ہے۔کوروؤں اور پانڈوؤں کے زمانے میں ایک راجہ نے یہاں پناہ لی تھی اور ایک مندر اور محل تعمیر کئے تھے۔

کوٹھیار کے نیچے ایک گہری جھیل ہے۔ کوٹھیار کی چوٹی سے متعلق مقامی روایت ہے کہ اس کی بلندی پر کوئی نہیں پہنچا اور کئی آدمی چوٹی پر چڑھنے کی کوشش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔آج مسافر گاڑی میں سے اِس چوٹی پر ایک جھلملتی

ہوئی نظر ڈال سکتے ہیں۔

کرگل کی لڑائی کے دوران دراس بھی منظرِ عام پر آیا۔ دراس کی بالائی پہاڑوں کی چوٹیاں بھی محاذِ جنگ بنیں۔ جن میں ''ٹائیگر ہل'' کو تاریخ میں ایک دائمی مقام ملا ہے۔

دراسیوں کی مادری زبان اگرچہ شینا ہے لیکن یہ بلتی، اُردو، لداخی اور کشمیری زبانیں بھی بولتے ہیں۔ اس کی وجہ دراس کا جغرافیائی محل وقوع ہے۔ دراس زوجیلا کے دہانے پر واقع ہے اور یہاں سے کشمیر نزدیک ہے۔ دراس اور کشمیر کے درمیان تجارتی، سیاسی اور فوجی تعلقات رہے ہیں۔

یہاں سے بلتستان نزدیک ہے اِس لئے بلتیوں سے اُن کا نہ صرف میل جول رہا ہے بلکہ بلتیوں نے دراس پر حکومت بھی کی ہے۔ وزیر زور آور سنگھ نے دراس کی طرف سے بلتستان پر بڑا حملہ کیا تھا اور اسے اپنے قبضے میں لایا تھا۔

دراس پر زیادہ مدّت لداخی راجوں کا تسلّط رہا۔ اس لئے لداخی ان کی ثانوی زبان بن گئی ہے۔

دراس کی تاریخ بڑی دلچسپ اور طویل ہے۔ یہاں پچھلے تیرہ سو یا پندرہ سو سال کے دوران بڑے نشیب و فراز آئے۔

دراس کے لوگ چیلاس کے فرمانروا شان ٹھاٹھا خان کی اولاد بتائے جاتے ہیں۔ اس کی اولاد میں سات جوان اپنے وطن سے نقل مکانی کر کے پوریگ اور دراس آئے۔ ان میں مون چوٹو دیوسائی کے راستے دراس پہنچا اور آباد ہوا۔ ایک اور شخص ڈوم پا اِس کے نزدیک گوڑ میل کے مقام پر آباد ہوا۔ بعد میں گوڑ میل سیلاب میں تباہ ہوا۔

ڈوگرہ دورِ حکومت میں گوڑ میل کو دوبارہ بسایا گیا اور اس کا نام مہاراجہ رنبیر سنگھ کے نام پر رنبیر پورہ رکھا گیا۔

مون چوٹو کے خاندان سے کھوم لیو اور کھوم سنگ نے دراس میں کئی گاؤں بسائے۔ اِبتداء میں دراس میں یہی قبیلے حکومت کرتے تھے۔ ان میں تین قبائل کی دھاک تھی۔ انہوں نے اپنی حفاظت کے لئے قلعے تعمیر کیئے جو آج بھی دراس کے مختلف حصوں میں کھنڈرات کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ کبھی یہ قبائیل آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ جس سے یہ کمزور ہوگئے۔ اُن دنوں دراس کی آبادی ایک ہزار افراد پر مشتمل تھی۔

جب پوریگ میں لداخ کے راجوں کی حکومت قائم ہوئی تو دردوں اور لداخیوں میں ٹکراؤ ہوا۔ لداخی راجہ نے دراس پر یلغار کی اور اسے فتح کرکے لداخ کی قلمرو میں لایا۔

لداخی فاتح کمانڈر نے ایک دردلڑکی سے شادی کی اور دراس میں اس کے لئے دریا کے کنارے ایک اُونچی چٹان پر محل تعمیر کیا۔ اُس لڑکی کا نام بیرو تھا۔ یہ محل بیرو کھریا بیرو محل کے نام سے مشہور ہے۔ آج بھی اُس کے کھنڈر کو اِسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کمانڈر نے اپنی پہلی بیوی کے لئے دریا کے دُوسرے کنارے پر ایک اور بلند چٹان پر ایک محل تعمیر کیا جو گیا لموکھر یارانی محل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دریا کے آرپار جانے کے لئے ایک جھولا پل بنایا۔ یہاں ایک جھولا پل ماضی قریب میں بھی موجود تھا۔

ان محلات سے ذرا دُور لبِ سڑک پتھر کے دو بُت ہیں۔ ان پر شاردا تحریریں ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اندرونِ ہند سے آنے والے سنگ تراشوں کا کام ہے، جو کشن خاندان کے دور میں یا اس کے بعد آئے تھے۔ روایتی طور یہ کہا جاتا ہے کہ دو بت لداخی کمانڈر کی رانیوں نے نصب کیئے تھے۔

ان دو مورتیوں کے درمیان ایک پتھر پر ایک گھوڑسوار کی تصویر ترشوائی گئی ہے جس کے ہاتھ میں ایک تلوار ہے۔ ایک پتھر پر ایک گول شبیہہ ہے۔

علاقہ دراس میں ان محلوں کے علاوہ کئی اور محلات ہیں، ایک محل سینگے کھریا

شیر محل کے نام سے مشہور ہے۔

بیرورانی اور پہلی رانی کے درمیان گہری ناچاقی تھی۔ اس سے فائدہ اُٹھا کر اسکردو کے راجہ علی خان مقپون نے دراس کو اپنے قبضے میں لایا۔ اُس کی ایک اولاد شہزادہ مراد نے مراد باغ گاؤں آباد کیا۔

دراس میں اسلام کی اشاعت کا سہرا غالباً اُن عالموں اور بزرگوں کے سر ہے، جنھوں نے پوریگ میں اسلام پھیلایا۔ وزیر حشمت اللہ نے قیاس لگایا ہے کہ خطے میں اسلام گلگت اور استور سے آیا تھا۔ بعد میں کشمیر سے وقتاً فوقتاً علما آتے رہے اور مذہب اسلام کو تقویت پہنچائی۔

جب سکردو میں حالات نے پلٹا کھایا تو دراس بلتستان کے دُوسرے صوبے کرتخشہ میں شامل ہوا۔ یہ حکومت قائم نہیں رہی اور گونڈ کنگن سے محمود ملک نے آکر دراس کو اپنے قبضے میں لایا۔

پھر راجہ کھرمنگ نے حملہ کر کے محمود ملک کو قتل کیا تاہم وہ دراس کو اپنے قبضے میں نہ لا سکا اور محمود ملک کی جگہ اس کے چھوٹے بھائی رسول ملک نے لی۔

ادھر جب دراس میں غیر مستحکم اور غیر یقینی صورتِ حال باقی رہی تو لداخ گیالپو دوبارہ دراس پر قابض ہوا۔

بعد میں گیالپو نے دراس کو پشکیوم کے راجہ آدم خان کو جہیز میں دیا، جس کے ساتھ گیالپو کی بیٹی کی شادی ہوئی تھی اور دراس پشکیوم میں شامل ہوا۔ تاہم ایسا لگتا ہے کہ دراس پر لداخ کے گیالپو کی جزوی عمل داری وزیر زورآور سنگھ کے حملے تک قائم تھی۔

اِس دوران بھی دراس کے لوگوں کے مصائب ختم نہیں ہوئے۔

میر عزت اللہ جو لداخ کے آخری حکمران گیالپو تنڈوپ نمگیل کے عہد میں دراس پہنچا تھا۔ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے:

''دراس کا گورنر خرپون ہے' جو لیہہ سے بھیجا جاتا ہے۔ مٹائن سے دراس خاص تک مکانات کی حالت خستہ تھی اور یہ مکینوں سے خالی تھے۔ ایک سال پہلے یہاں حملہ ہوا تھا اور ان کو غلاموں کی طرح فروخت کیا جاتا تھا۔ بعد میں کشمیر کے گورنر نے دراس میں چند بندوق بردار رکھے۔ جس کے عوض نصف مالیہ کشمیر کے گورنر کو دینا قرار پایا۔ دراس کا ہر گھر لداخ کے حکمران اور محمود ملک کو ایک ایک روپیہ اور کچھ گرم بطور ٹیکس ادا کرتا تھا۔''

اِس کے کچھ عرصہ بعد ۱۸۲۱ء میں جب مورکرافٹ دراس پہنچا تو معلوم ہوا کہ اُس روز حسورہ کے لوگوں نے دراس پر حملہ کیا تھا۔ مورکرافٹ نے رات کو اپنے ملازموں سے ہوائی فائر کرائے۔ جس کی وجہ سے دُوسرے روز صبح سویرے حسورہ کے حملہ آور بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن جاتے جاتے وہ اپنے ساتھ ۸۰۰ مال مویشی، ۵۰۰ گھوڑے اور دس ہزار کے قریب بھیڑ بکریوں کے علاوہ گھریلو سامان، کپڑے لتے اور زیورات لے گئے۔

اُنہوں نے محمود ملک کے بھائی رسول ملک کو بھی ہلاک کیا۔

مورکرافٹ لکھتا ہے۔ اُن دِنوں نونو کلون بھی لیہہ سے دراس میں ایک قلعہ کی تعمیر کے سلسلے میں چندہ جمع کرنے آیا تھا۔

لگتا ہے ڈوگرہ دورِ حکومت میں دراس پر گرد و نواح کے علاقوں کے حملے بند ہو گئے۔

دراس کے لوگ پولو اور گھوڑ سواری کے بڑے شوقین رہے ہیں۔ ۱۸۷۴ء میں جب ایک انگریز کاؤلے لمبرٹ دراس سے گزرا تو اس کی تفریح کے لئے ایک پولو میچ کی نمائش کی گئی۔ وہ لکھتا ہے:

''کھلاڑی گھوڑے سے اُترے بغیر گیند اُٹھاتا ہے اور ہوا میں اچھال کر ہٹ لگاتا ہے۔'' اِسی طرح کئی غیر ملکیوں نے اپنے سفر ناموں میں دراس میں پولو مقابلوں

کا ذکر کیا ہے۔ پولو عموماً فصل پکنے پر کھیلا جاتا تھا۔ تیراندازی بھی ایک مقبول مشغلہ تھا، جو آج بھی کم وبیش جاری ہے۔

دراس کے دردناچ گانوں کے بھی شوقین تھے۔ ماضی کی یہ دلچسپیاں قصہء پارینہ بن چکی ہیں۔

سردیوں کی لمبی راتوں کے دوران گھروں میں الاؤ جلایا جاتا تھا۔ اہلِ خانہ اِس کے اردگرد بیٹھتے تھے اور رات دیر گئے تک داستان سرائی اور قصہ گوئی ہوتی تھی۔ اب نہ وہ الاؤ جلتا ہے، نہ داستان سرائی باقی ہے۔ ہاں تعلیم کا چرچا ہے۔

داہانو کے دردیوں کی طرح دراس میں بھی لوک گیتوں کا انمول سرمایہ ہے، جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوا ہے۔

آج دراس ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ لوگوں کے فکر ونظر میں تبدیلی آرہی ہے۔ تعلیم، صحت، بجلی، پینے کا صاف پانی سمیت دوسری سہولیات کی فراہمی اور خطّے کی ترقیات کے لئے حکومت کوشاں ہے۔

سردیوں میں زندگی کتنی ہی کٹھن سہی، ایک دراسی کو دراس کی دھرتی سے گہرا لگاؤ ہے جو اس کے آباواجداد نے صدیوں پہلے انتخاب کی تھی۔ اس کے سینے کو چیر کر اناج اُگایا تھا اور آج بھی اُگایا جارہا ہے۔ لداخی میں ایک کہاوت ہے:

غیر کے دیش میں غیر پیارا ہے

داہنو کی بستی میں درد پیارا ہے

کسی زمانے میں دراس میں محبت کرنے والے دو جوان دِل تھے۔ لڑکی کے محبوب کو غالباً اپنی محبوبہ کے کسی کام کے سلسلے میں لیہہ جانا پڑا۔ اُن دنوں راستہ بڑا دُشوار گزار تھا اور سفر کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ لیکن محبوب کے دل میں سفر کی تکلیف کا ذرہ بھر بھی ملال نہیں تھا، بلکہ محبوبہ کی جدائی کا غم تھا۔ وہ اپنی محبوبہ سے جس کا نام ستی تھا، ایک گیت میں یوں مخاطب ہوتا ہے ۔

''ہیم ہس کا یہ آبائی پہاڑی راستہ
ہاں یہ پہاڑی راستہ بہت ہی کٹھن ہے
مجھے اپنی جان کی قسم
میں اِس کٹھن پہاڑی راستے سے نہیں گھبراتا
اے میری ستم شعار محبوبہ سُتی!
تم سے جدا ہونے کے دُکھ سے میں گھبراتا ہوں
پوریگ کا تیز و تُند نالہ
ہاں یہ نالہ بڑا دُشوار گذار ہے
مجھے اپنی جان کی قسم
میں اِس تیز و تُند پانی سے نہیں گھبراتا
اے میری ستم شعار محبوبہ سُتی!
میں تم سے جدا ہونے کے دُکھ سے گھبراتا ہوں۔''
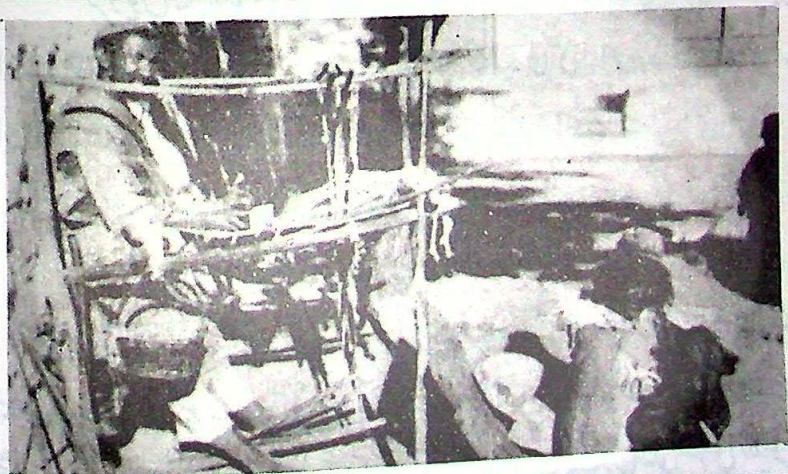
بلتی جولاہا لیہہ میں، فوٹو۔۱۹۱۷ء
(مضمون ''ثقافت اور بیرونی اثرات'' ملاحظہ ہو)

لداخ کے دیہات

وادیوں، ٹیلوں، پہاڑوں، گھاٹیوں، میدانوں اور پہاڑوں کے دامن میں آباد لداخ کے اِن دیہات کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ جہاں کہیں زمین کا ایک ٹکڑا اور بہتا ہوا پانی ہو، وہاں انسان آباد ہوتا ہے۔ جو ازل سے اِنسان کی جبلی فطرت ہے۔

گلیشیروں سے برف پگھل کر بیچ گھاٹی میں نالے کی صورت میں بہتی ہے اور گاؤں کے کھیتوں اور باغیچوں کو سیراب کرتی ہے۔

کہیں کہیں دیہات کھلے اور ہموار میدان میں آباد ہیں اور دریا کا پانی اُنہیں سیراب کرتا ہے۔

اِن گاؤں کو دیکھ کر لداخ میں تعینات ایک برٹش جوائنٹ کمشنر رابرٹ شا نے لکھا تھا کہ یہ بستیاں کسی اور ملک سے قینچی سے تراش کر لداخ کے ریگستان میں چپکائی ہوئی لگتی ہیں۔

گاؤں ایک آئینہ کی طرح ہوتا ہے، جس میں جھانک کر ہم اپنی تاریخ اور ماضی کو دیکھ سکتے ہیں۔ گاؤں کے ناموں سے اُن کے جغرافیائی حالات، زمینی ساخت اور خصوصیات، مذہبی، تاریخی اور سماجی پس منظر، گاؤں کی شکل و شباہت، اہم یادگاروں اور ان میں بسنے والوں کے مزاج کا پتہ چلتا ہے۔

محافظ خانہ کے ریکارڈز میں بہت سارے گاؤں کی وجہ تسمیہ یا ناموں کی وجوہات دی گئی ہیں اور ایف. اے. پیٹر نے جو ۴۰-۱۹۳۰ء میں لیہہ میں پادری رہے تھے، لداخ کے اہم گاؤں پر ایک معلوماتی مضمون لکھا ہے، ہم یہاں اُن کا

حوالہ دیتے ہیں۔

لداخ خطّہ میں ۲۴۰ گاؤں ہیں۔ ان میں ۱۱۲ گاؤں ضلع لیہہ میں ہیں۔ باقی ضلع کرگل میں ہیں۔ لداخ آنے والی مختلف نسلوں کے لوگوں، قوموں اور حکمرانوں نے یہ گاؤں بسائے۔ لداخ کے ایک تاریخ دان ایس. ایس. گیرگن کے مطابق سب سے پہلے لداخ میں بسنے والے آریائی نسل کی مون ذات کے لوگوں نے جو گاؤں بسائے اُن کے نام کے آخری حروف اکثر ''چے'' پر ختم ہوتے ہیں۔ جیسے تیرچے، ٹانکچے، لیکچے، مرچے لنگ وغیرہ۔

درد قوم کے بسائے گئے اکثر گاؤں کے نام ''ہ'' سے شروع ہوتے ہیں۔ جیسے ہیم ببس، ہینسکو، ہنو، ہیمیا، ہیپتی، ہیمالینگ وغیرہ۔

ان پرانے گاؤں میں اکثر کا مطلب معلوم نہیں ہوتا ہے۔

لداخ کے اکثر گاؤں کے نام تبت کی زبان اور ثقافت کی دین ہیں۔ دسویں صدی سے تبت کے ایک راجکمار سکیت دے نیما گون اور اُس کی اولاد نے لداخ پر حکومت کی۔ ساکٹی، اپچی، تنگ موگنگ، سپیتک، ماٹھو، شے، چھشوت وغیرہ تبتی نام ہیں۔

رنبیر پور، پرتاپ پور، رام پور اور گنڈ منگل پور ڈوگرہ دورِ حکومت کی یادگار ہیں۔ رنبیر پور مہاراجہ گلاب سنگھ کے بیٹے مہاراجہ رنبیر سنگھ، پرتاپ پور، رنبیر سنگھ کے بیٹے مہاراجہ پرتاپ سنگھ اور رام پور راجہ رام سنگھ کے نام پر قائم کئے گئے ہیں۔ رام سنگھ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا بھائی تھا اور ڈوگرہ سرکار میں وزیر اعظم، سپہ سالار اور حکمران رہا تھا۔ وہ آخری ڈوگرہ حکمران مہاراجہ ہری سنگھ کا باپ تھا۔ گنڈ منگل پور مہتہ منگل نے بسایا تھا۔ وہ لداخ میں ڈوگرہ ناظم رہا تھا۔ کشمیر، سنٹرل ایشیا، بلتستان اور لداخ کے درمیان صدیوں سے تجارتی اور ثقافتی تعلقات رہے ہیں۔ منی مرگ، چھنا گُنڈ اور تھس گام کے نام کشمیر سے وابستہ ہیں۔

بہت سارے مقامات جیسے ہورلم، ہوری برانگسا، ہورکھر، دولت بیگ اولدی، وہاب جیلگا، سلطان چھوسیکور، چھونگ تھش، چنگ جینگا، قراقرم وغیرہ لداخ اور چینی ترکستان کے ماضی کے صدیوں پرانے تعلقات کی عکاسی کرتے ہیں۔

بلتی برانگسا، بلتی پُولُو اور کم سے کم ایک گاؤں آیُو لداخ اور بلتستان کے قدیم تعلقات کی یاد دِلاتا ہے۔ ایس. ایس گیرگن کے مطابق ایک لداخی راجا نے آیُو ایک عمر رسیدہ بلتی عورت کو عطا کیا تھا۔ وہ عورت ایُوم کہلاتی تھی۔ اِسی نسبت سے آیُوم نام پڑا، جو بعد میں بگڑ کر آیُو ہوا۔

لداخ کی موجودہ آبادی تین نسلوں کی اولاد ہے۔ یہ تین نسلیں منگول، درد اور مون ہیں۔ صدیوں کے میل جول کی وجہ سے ان مخلوط نسلوں کا اثر گاؤں کے ناموں پر بھی پڑا ہے۔ دراس کا دُوسرا اور پرانا نام ہیم ببس ہے۔ ہیم شینا زبان میں برف کو کہتے ہیں۔ یہ اصل سنسکرت لفظ ہے۔ اس پر "ببس" لداخی صفت جڑی ہے۔ جس کا معنی گرنے کی جگہ ہے۔ یعنی برف گرنے کی جگہ۔ اسی طرح ایک گاؤں ہیمالینگ میں ایک لفظ دردی اور دُوسرا لداخی ہے۔

دردسردار، گل سینگے داہ نام کے گاؤں کا بانی تھا۔ داہ لداخی لفظ ہے اور اس کا مطلب تیر ہے۔ اُس نے ایک نالے میں ایک تیر چھوڑا تھا، جہاں یہ اٹک گیا، وہاں سے بستی شروع کی تھی۔

گاؤں کی شکل وشباہت اور محل وقوع پر پڑنے والے چند نام ملاحظہ ہوں، جیسے نے، شانگ، نیوما، بزگو، ستقنا، ایگو، نانگ، شے اور نیموں۔

نے "نیا" کا بگڑا ہوا ہے۔ "نیا" لداخی میں مچھلی کو کہتے ہیں۔ گاؤں مچھلی کی شکل کا ہے اور اسی سے یہ نام پڑا۔

بزگو کا اصل نام "بم گو" یا "گائے کا سر" ہے۔ گاؤں میں ایک پتھر گائے کا سر جیسا لگتا تھا اور اسی نام سے گاؤں مشہور ہوا۔ جو کثرت استعمال سے بزگو بن

گیا۔ بزگو ایک تاریخی گاؤں ہے۔ یہاں ایک بڑا گنپہ ہے۔

ستقنا کی پہاڑی کی شکل چیتے کی ناک کی طرح لگتی ہے۔ ''ستق'' سے مراد چیتا اور ''نا'' ناک کو کہتے ہیں۔ اور اسی پہاڑی شکل پر گاؤں کا نام پڑا۔ پہاڑی پر گنپہ تعمیر کیا گیا ہے۔

دو پستان جیسی پہاڑی نے گاؤں کا نام نیوما دیا۔ نیوما چنگ تھنگ سب ڈویژن کا صدر مقام ہے۔ یہاں چوموکھنگ یا راہبہ خانہ ہے۔ گاؤں میں ایک چٹان پر پرانی تحریر منقوش ہے۔ پہاڑی پر پرانے قلعے کا کھنڈر ہے۔ گاؤں میں ڈسپنسری اور ہائر سکینڈری سکول ہیں۔

ایگُو لداخی الفاظ ایبس گُو کا مرکب ہے۔ ایبس پوشیدہ اور گو کا مطلب نو کا ہندسہ ہے۔ گاؤں ایک تنگ نالے میں نو جگہوں پر گھومتا ہوا آباد ہے۔ اسی وجہ سے ایبس گو کہا گیا جو بگڑ کر ایگو بنا۔

نانگ لداخی میں اندرون کا معنی دیتا ہے۔ یہ گاؤں عام شاہراہ سے دُور پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ نیموں کا نام لیہہ کے نزدیک ہونے کی وجہ سے نیموں یا نزدیک پڑا ہے۔

شے کی وجہ تسمیہ سے متعلق سرکاری ریکارڈ میں لکھا ہے کہ گاؤں کے سامنے کا پہاڑ شیشے کی مانند ہے۔ اس لئے گاؤں کا نام شیل پڑا۔ جو بعد میں شے کے نام سے زبان زدِ عام ہوا۔

شے دسویں صدی سے پندرھویں صدی تک لداخ کا دارالخلافہ رہا۔ یہاں پہاڑ کی چوٹی پر پرانے قلعہ کا کھنڈر ہے۔ لبِ سڑک ایک بڑی چٹان پر دھیانی بدھ کی تشبیہیں تراشی گئی ہیں، جو ایک ہزار سال پرانی ہیں۔

گاؤں میں شاہِ ہمدانؒ سے منسوب لبِ دریا ایک خوبصورت مسجد ہے۔ شاہ ہمدانؒ کی نسبت سے اِس مسجد کو ایک زیارت گاہ کا درجہ ملا ہے۔

یہاں دو گنپے اور سترھویں صدی میں تعمیر کیا گیا ایک محل ہے۔ گاؤں میں کئی تاریخی ستوپا ہیں۔

شے میں ٹراٹ مچھلیوں کی افزائش ہوتی ہے۔

اپنی تاریخی یادگاروں کی وجہ سے شے سیاحت کا ایک اہم مرکز ہے اور اپنی شادابی اور لبِ دریا واقع ہونے کی وجہ سے پک نک کا ایک دلکش مقام بھی ہے۔

لامایورو، ٹھکسے، ستوق، دمجوق، چمشن، الچی، شرگولا، انلے اور سپیتک کے نام مذہبی افادیت کے حامل ہیں۔

لامایورو میں ایک ہزار سال پہلے ایک بڑے لاما نارو پا نے ایک گپھا میں گیان دھیان کیا تھا۔ روایت کے مطابق اُنہوں نے یہاں اناج کے جو دانے پھینکے، وہ بزبانِ لداخی یونگ ڈورُونگ یا سواستیکا کے رُوپ میں اُگے۔ تب نارو پا نے کہا تھا کہ اس جگہ سواتیکا نام کا گاؤں آباد ہوگا۔ شروع میں گاؤں کا نام یون ڈونگ تھا۔ بعد میں ڈوگرہ دورِ حکومت میں گنپہ اور اس کے لاموں کی وجہ سے گاؤں لامایورو کے نام سے مشہور رہا۔

سپیتک دو لداخی الفاظ ''سپے'' اور ''تھوپ'' سے بنا ہے، جس کا مفہوم مثالی ہے۔ مترجم اور عالم رینچن زنگپو نے گیارھویں صدی میں یہاں کہا تھا کہ اس گنپے کا سنگھا سب کے لئے ایک نمونہ ہوگا۔ چنانچہ گنپہ اور گاؤں دونوں کا نام سپے تھوپ پڑا لیکن زمانہ اور لوگوں نے اسے سپیتک بنادیا۔

دمجوق دیچھوق یا تانترا بدھ چکرا سمبھوا سے ماخوذ ہے۔ یہاں اِدم دے چھوق کا تیرتھ استھان ہے۔

نوبراہ کا گاؤں چمشن کا اصلی نام چمس چھن ہے۔ بڑا میترا یا یعنی مستقبل میں آنے والا بدھ۔ یہاں گاؤں کی نشیبی وادی میں ایک چٹان پر بدھی ستوامیترا یا کی ایک بڑی شبیہہ تراشی گئی ہے۔

الچی کا اصلی نام انچی بتایا جاتا ہے۔ یہاں کے باشندے پہلے ڈیگونگ کرگیوت پاسکول کے پیروکار تھے۔ اور اس فرقے کے دیوتا انچی پر گاؤں کا نام رکھا گیا تھا۔

ٹھکسے ٹھی شے کا مرکب ہے۔ جس کا مطلب دس ہزار اور چوٹی ہے۔ روایت کے مطابق یہاں کے گنپے میں کبھی دس ہزار لامے تھے۔ اور گنپہ پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔ اسی مناسبت سے گاؤں اور گنپے کا نام پڑا ہے۔

ستوق گاؤں: توق لداخی زبان میں کسی چیز کے بالائی حصے کو کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ستوق گاؤں کے ایک ستوپا کا اندرونی اُوپری سرا سونے کا بنا تھا۔ اسی وجہ سے گاؤں کا نام پہلے توق پھر ستوق پڑا۔

انلے و ملے کا بگڑا ہوا لفظ ہے۔ لفظ وم کال چکرا کی ایک علامت ہے۔ شر گولا یعنی، صبح کے تارے کا دیوتا۔ یہ مذہبی ہونے کے ساتھ شاعرانہ نام بھی لگتا ہے۔

خلسے، کھرو، ٹاغر، خلسر، خردونگ، خرنق اور دوکھر گاؤں کے نام قلعہ یا قلعوں کی وجہ سے پڑے ہیں۔ ان گاؤں میں ایک یا ایک سے زیادہ پرانے قلعے ہیں۔

خلسے کا اصلی نام خرژا یا دامنِ قلعہ ہے۔ گاؤں بالائی زمین پر پہاڑی قلعہ کے دامن میں واقع ہے۔ اسی نسبت سے یہ نام پڑا ہے۔ لداخی میں ایک کہاوت ہے۔ سب سے پرانا قلعہ خلسے کا ہے۔ سب سے پرانا گاؤں میرو ہے۔

تاریخی اعتبار سے بھی خلسے چٹانوں پر تحریری اور سنگ تراشی کے نمونوں، قلعوں اور اپنے محل وقوع کی وجہ سے لداخ کا ایک اہم ترین گاؤں ہے۔ تحریریں برہمی، کھروشتی، شاردا اور تبّتی میں خلسے پُل اور گاؤں کے درمیان ملی ہیں۔ کھروشتی لداخ پر کشن خاندان کے اثر و نفوذ اُجاگر کرتی ہے۔ اِس خاندان نے پہلی صدی سے پانچویں صدی تک ہندوستان پر حکومت کی تھی۔ شاردا تحریریں آٹھویں صدی سے تعلق رکھتی ہیں۔ گاؤں کے پاس ایک ستوپا میں گپتا دَور کی اِبتدائی تحریریں ملی ہیں، جو پانچویں صدی عیسوی سے متعلق ہیں لیکن سب سے پرانی تحریر برہمی میں ہے۔ جس

سے متعلق اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ قبل مسیح دوسو سال پرانی ہے۔ نیز دردوں کی بنائی ہوئی تصاویر بھی ملی ہیں۔

زمانہ حال میں سڑک، پُل اور عمارتوں وغیرہ کی تعمیر کے پتھروں کے لئے یہ چٹانیں آتش گیر مادہ استعمال کر کے توڑ پھوڑ دی گئی ہیں۔

خلسے میں پتھر کے زمانے کے اوزار بھی ملے ہیں۔ ڈاکٹر فرانکی نے پچھلی صدی کے شروع میں خلسے کے باشندوں کے پاس پتھر کی کلہاڑی، چاقو، دوات، دیئے اور ہڈی کی مالائیں دیکھیں جو اُن کو پرانے محلات بلوکھر، ڈوقپا گھر وغیرہ کے کھنڈرات سے ملی ہیں۔

خلسے علاقہ لائن کا سب ڈویژن صدر مقام ہے۔ یہاں ہائر سیکنڈری سکول، شفاخانہ اور دوسرے محکموں کے ذیلی دفاتر ہیں۔

کھرو سے مراد نو قلعے ہے۔ کھرو گاؤں اور اس کے آس پاس ماضی میں نو قلعے تھے۔

ٹیگر کا اصلی نام ستیاہ سگر ہے۔ ستیاہ کا مطلب ناف اور سگر کا معنی قلعہ ہے۔ ناف لداخی زبان میں تشبیہاً مرکز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ٹیگر نوبراہ میں مرکزی جگہ پر ہے، اِس لئے اِس کا نام ستیاہ سگر رکھا گیا۔ جو بگڑ کر ٹیگر اور ٹاغر بن گیا۔ غیر لداخی اِسے اب ٹائیگر بھی کہتے ہیں۔ جس طرح ایک گاؤں ساکٹی کو شکتی یا طاقت کہا جاتا ہے۔

خردونگ کا نام بھی قلعہ پر پڑا ہے۔ اس کا مطلب قلعہ کے سامنے ہے۔ غالباً گاؤں کے سامنے ماضی میں ایک قلعہ تھا۔ جبکہ خرنق کا لاقلعہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ گاؤں کے قلعے کا نام کالاقلعہ پڑا تھا۔ اسی طرح دونکھر کا نام بھی قلعہ کا دین ہے۔

چند گاؤں کے نام پھولوں، نباتات اور جڑی بوٹیوں کے عطا کردہ ہیں۔ ان گاؤں میں سسپول، چغلمسر، گیرامانگیو، من، ہمس شوکپاچن، سس پوچے، سپانگم وغیرہ شامل ہیں۔

سسپول کا اصلی نام چھسپا ہے۔ جس کا لفظی مطلب باغبان ہے۔ چھس باغ کو اور پا مالک کو کہا جاتا ہے۔ گاؤں میں سبوں کے پاس باغ تھے، اِسی وجہ سے یہ نام پڑا لیکن چھسپا کا مقبول نام سسپول بن گیا۔

لیہہ کے پاس واقع گاؤں چغلمسر کا اصلی نام چوک ژھل ہے۔ چوک کے معنی تنبو اور ژھل کے معنی جنگل ہے۔ پہلے یہاں درختوں اور کانٹوں کی جھاڑ اُگتی تھی، جو تنبو کی طرح نظر آتی تھی۔ چغلمسر کیوق لم سا یا موڑوں والے راستے کے معنی میں بھی لیا جاتا ہے۔ یہاں سے مختلف اطراف کو راستے جاتے تھے۔

آج کل چغلمسر ایک قصبہ کا رنگ روپ اختیار کر رہا ہے۔ گاؤں کے مضافات میں سنٹرل اِنسٹی ٹیوٹ فار بدھسٹ سٹڈیز، تبّتی پناہ گزینوں کی کالونی اور کئی ادارے کھلے ہیں۔ یہاں کی دکانوں میں ہر چیز دستیاب ہے۔

گیرا مانگیو گاؤں کا اصلی نام سیکترا سمانگیو تھا۔ سیکترا یعنی خوشیوں کا باغ۔ سمن گیو، دوائیاں بنانے کی جڑی بوٹیوں والا۔ یہ خوبصورت لمبا نام گاؤں کے پھل پھول اور جڑی بوٹیوں کی پیداوار کی نشان دہی کرتا ہے۔

سمن لداخی میں دوائی کو کہتے ہیں اور تقریباً اسی نام سے جھیل پنگونگ کے کنارے ایک گاؤں ہے۔ پہلے اس گاؤں میں جڑی بوٹیوں کی بھرمار تھی، جن سے ادویات بنائی جاتی تھیں۔ اسی طرف ایک گاؤں سپنگمِ ہے، جس کا اصلی نام سپنگ جونگ یعنی سبز دوب کے درمیان واقع بستی ہے۔ اور تو اور اب یہ شاعرانہ نام گاؤں والے بھی نہیں بولتے ہیں۔

سسپوچے گاؤں میں ایک خود رو جھاڑی برژے بہتات سے پیدا ہوتی ہے۔ جو جلانے کے کام آتی ہے۔ اسی جھاڑی نے گاؤں کو نام دیا۔

ہمس شُوکپا چن میں شُوگپا یعنی چُگلی (Pencilcedar) پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی خوشبودار جنگلی جھاڑی پر گاؤں کا نام رکھا گیا۔

مال مویشی اور جنگلی جانوروں پر بھی گاؤں کے نام پڑے ہیں جیسے کورزوق

گاؤں ہے۔ اصلی نام کورزود ہے۔ کور مال مویشی اور زود گودام یا خزینہ کو کہتے ہیں۔ اس گاؤں میں بھیڑ بکریاں اور مال مویشی بہت پائے جاتے ہیں۔ اس لئے سارا گاؤں ایک مویشی خانہ کے سماں ہے۔

اسی طرح رُوپشو' رُوشُود کا بگڑا ہوا نام ہے۔ جس کا مطلب مویشی کی بہتات ہے۔ اس گاؤں کے لوگوں کا وسیلہء معاش بھیڑ بکریاں اور مویشی ہیں۔

کل کا کوکس گاشودر دزبان میں چوپایوں کی بستی ہے۔ یہ گاؤں درد حکمران ٹھاٹھاخان کی راجدھانی رہا ہے۔ آج کل یہ بگڑ کر کوکشو بن گیا ہے۔

کوکشو ماہرینِ عمرانیات کے لئے ماضی قریب تک ایک دلچسپ اور انوکھا گاؤں رہا ہے۔ یہاں ایک ہی کنبے میں بودھ مسلمان اکٹھے رہتے تھے۔ محرم، عید اور بودھوں کا سالِ نو ایک ساتھ مناتے تھے۔ ان کے ناموں میں بودھ مسلم دونوں الفاظ ہوتے ہیں جیسے علی ٹشی، رحیم چھرنگ، صنم ابراہیم وغیرہ۔

لینگشیت اور ہیما لینگ دیہات کا مفہوم شکار گاہ ہے۔ اِن ناموں سے ظاہر ہے کہ ان گاؤں میں کبھی جنگلی جانوروں بہت پائے جاتے ہوں گے اور یہاں عام شکار ہوتا ہوگا۔

اِسی زمرے میں ونلا گاؤں بھی آتا ہے، جس کا اصلی نام وم دا ہے۔ یہاں ایک مخصوص کمان سے جنگلی جانوروں کا شکار کیا جاتا تھا۔ دا تیر کو کہتے ہیں۔

ونلا میں بارھویں صدی میں راجہ لہاچھن نغلوک کے زمانے میں ایک قلعہ تعمیر ہوا۔ یہاں گیارھویں صدی میں تعمیر کیا ہوا ایک گنپہ بھی ہے۔

سیکور بوچن کا اصلی نام سکین برُوس چن ہے۔ یعنی Ibex کیل کے لئے کھدا گڑھا کا مقام، اس نام کا پس منظر دلچسپ ہونا چاہئے۔

وادیٔ نوبراہ کے ایک گاؤں کا نام دِگر ہے۔ اس کا صحیح تلفظ ڈی گر ہے۔ ڈی، ڈیمو یا مادہ یاک کا مخفف ہے اور گر کا مطلب رکھنے کی جگہ ہے۔ یہاں یاک اور

مادہ یاک پالے جاتے ہیں۔

تغمہ ماچیک کا مطلب ایک عدد تغمہ ہے۔ تغمہ ایک جنگلی جانور کو کہتے ہیں۔ یہاں ایک مرتبہ یہ نادر جانور ملا اور ایک لداخی راجا کو پیش کیا گیا۔ اسی نام سے یہ گاؤں مشہور ہے۔

کئی گاؤں کے نام پُراسرار اور دیومالائی ہیں جیسے پنامیک کے نام کے پیچھے ایک آدم خور کی کہانی ہے اور اس کے پڑوس کے گاؤں کو بید کا اصلی نام گُونبس بتایا گیا ہے، جس کا مطلب آدم خور کے خوف سے چھپنا چھپانا قرار دیا گیا ہے۔

پنامیک گرم پانی کے چشمے کے لئے مشہور ہے، جو کئی امراض کیلئے مفید ہے۔

علاقہ رونگ کے گاؤں تیری کا اصلی نام ستیر ری ہے، جس کا مطلب پہاڑ میں چھپا ہوا خزانہ ہے۔ اس کے پیچھے بھی ایک دلچسپ واقعہ یا کہانی ہوگی۔

ساکٹی سیرٹھی سے بگڑ کر بنا ہے۔ جس کا مطلب سونے کا تخت ہے۔ روایت کے مطابق گاؤں میں سونے کا ایک تخت تھا۔

ساکٹی کو چنگلا پیر کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ جہاں سے ماضی میں تبّتی تاجر بھیڑ بکریاں، اون، نمک وغیرہ لے کر ساکٹی آتے تھے۔ اسی درّہ سے ۱۶۸۰ء میں منگول حملہ آور لداخ آئے تھے۔

ساکٹی میں ہائی سکول اور ڈسپنسری ہیں۔

لیکیر لُوکھیل کا بگڑا ہوا نام ہے۔ روایت کے مطابق اس جگہ ایک ناگ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اس جگہ ایک ہزار سال پہلے گنپہ تعمیر کیا گیا۔ لیکیر گنپہ لداخ کے بڑے گنپوں میں ایک ہے۔ یہاں ہر سال تیوہار منایا جاتا ہے۔

کم سے کم لداخ کے ایک گاؤں کا نام اس کے معدنی ذخیرے کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ یہ گاؤں وادئ نوبراہ کا چراسا ہے، جو اصل میں چقس راسا یعنی لوہے کی مٹی ہے۔ یہاں لوہے کی ایک کان تھی۔

اپنے بچوں کے لئے خوبصورت نام رکھنا انسان کی فطرت ہے۔ کئی گاؤں کے معاملے میں بھی یہی پیمانہ اختیار کیا گیا ہے۔ نوبراہ وادی کے گاؤں دیسکیت، کھمی اور ماٹھو اس کی مثال ہیں۔ دیسکیت سے مراد خوبصورت اور خوشحال ہے۔ دیسکیت بلاشبہ ایک خوبصورت گاؤں ہے۔ اس کے ساتھ دریا بہتا ہے اور اس کے نواح میں دریائے نوبراہ اور دریائے شایوک کا سنگم ہے۔

دیسکیت نوبراہ کا صدر مقام ہے۔ یہاں ہائر سکینڈری سکول اور ہسپتال ہیں۔ گاؤں میں ایک خوبصورت بازار بھی ہے، جس کی دکانیں ہر قسم کے سامان اور اشیائے خوردنی سے بھری رہتی ہیں۔ دیسکیت ایک قصبے کی رُوپ ریکھا لئے ہوئے ہے۔ دیسکیت میں ایک عالیشان گنپہ ہے جو گیلوکپا فرقہ کی نمائندگی کرتا ہے۔

کھمی کا اصلی نام سکیت می لینگ ہے۔ سکیت کا معنی فارغ البال، می انسان اور لینگ رہنے کی جگہ ہے ـــــ فارغ البال اِنسانوں کے رہنے کی جگہ۔ بدنصیبی سے اِس خوبصورت نام کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور بے معنی کھمی ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی طرح ماٹھو مانگٹو سے بنا ہے جس کا مطلب خوشیوں کی بہتات ہے۔

لداخ کے بہت سارے دیہات کا نام اس کی زمین کی خصوصیات، پانی وغیرہ کی وجہ سے پڑے ہیں۔ ان میں لیہہ، سابو، چھشوت، فوتوکسر، کنجی، تیاہ، چھوُ ما تھنگ، چُھو شُول، شاچُو کُل، تنگ موگنگ، سمور، دربوگ، شایوق، صمد روقچن، لرگیاپ، بغدانگ، شرا، شرنوس، پُھو کیے، اچی ناتھنگ وغیرہ آتے ہیں۔

لیہہ کے کئی معانی نکالے گئے ہیں۔ ایک معنی میں دلدلی جگہ لی ہے۔ جہاں لوگ مال مویشی چراتے تھے۔ قدیم زمانے میں خانہ بدوش یہاں بھیڑ بکریاں چراتے تھے۔ ایس. ایس. گیرگن نے لیہہ کا معنی نخلستان دیا ہے۔ لیہہ کے چاروں طرف ننگے میدان ہیں اور بیچ میں سبزہ ہے۔

سابو، سا پھوت سے بنا ہے، جس کا مطلب اچھی مٹی اور زرخیز زمین ہے۔

سابُو لداخ کا ایک قدیم گاؤں ہے۔ یہاں لداخی راجہ لھاچن شیرپ کا قلعہ اور سینگے محل کے کھنڈرات ہیں۔ یہ راجہ چودھویں صدی میں گزرا ہے۔ جولائی ۲۰۰۳ء میں صدر جمہوریہ نے گاؤں کا دورہ کیا تھا اور ریاستی سرکار اسے ایک ماڈل گاؤں بنانا چاہتی ہے۔

چھشوت: چُھو اور شوت کا مرکب پانی اور نشیبی زمین کا معنی دیتا ہے۔ گاؤں دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے اور آبادی اور رقبے کے لحاظ سے لداخ کا سب سے بڑا گاؤں ہے۔ کچھ لوگ چھشوت کا مطلب پانی کا دباؤ قرار دیتے ہیں۔

چھشوت میں بلتی مسلمان آباد ہیں، جو سولہویں صدی اور اس سے پہلے بلتستان سے نقلِ مکانی کر کے لداخ آئے تھے۔ گاؤں میں ہائر سکینڈری سکول اور ڈسپنسری ہیں۔

چھوشُول؛ چُھو اور شُول سے بنا ہے اور اس کا مطلب پانی اور اس کی نشانی ہے۔ یہاں کبھی جھیل تھی جو سوکھ گئی ہے۔ یہ تبت اور لداخ کی سرحد پر واقع ہے۔ گاؤں سے ذرا آگے گیٹ وے آف اِنڈیا ہے، جہاں سے تبت کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ ۱۹۶۲ء میں اِس گاؤں کے پاس چین اور ہند کے درمیان لڑائیاں ہوئی تھیں۔ یہاں ایک ہوائی اڈہ بھی ہے۔

چُھو ماتھنگ: یہ نام پانی اور میدان کے سنگم کو اُجاگر کرتا ہے۔

اچی ناتھنگ کا لفظی مطلب دامنِ کوہ ہے۔ گاؤں لداخ کے بہت سارے گاؤں کی طرح پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔

شراہ اور شرنوس کے معانی مشرق اور اصلی مشرق ہیں۔ لیہہ کے مشرق میں ہونے کی وجہ سے دونوں گاؤں کے نام مشرقی گاؤں زبان زدِ عام ہوئے ہیں۔

تِنگ موگنگ: یہ نام گاؤں کے ارضی نشیب وفراز کی عکاسی کرتا ہے۔ لداخ کا ایک اہم گاؤں ہے۔ راجہ ٹُق پابوم دے نے پندرھویں صدی میں تِنگ موگنگ کو

زیریں لداخ کی راج دھانی بنایا تھا۔ یہاں کے گنپہ میں بودھی چوتھے ماہ کی پندرھویں تاریخ کو ہر سال مذہبی اجتماع ہوتا ہے اور لداخ کے مختلف علاقوں سے یاتری یاترا کے لئے آتے ہیں۔

گاؤں میں ڈسپنسری اور ہائی سکول ہے۔

سمُور، سُم یُوریا تین ندیوں پر آباد ہوا۔ اور اسی نام سے مشہور ہوا۔

فتوکسر پُھوتوسا کا بگڑا ہوا نام ہے جس کا مطلب بلندی پر واقع زمین یا بستی ہے۔

تیاہ یا ستیاہ ناف کو کہتے ہیں۔ گاؤں کی مرکزی حیثیت کی بنا پر یہ نام دیا گیا۔

پُھو کچے دراصل پُھو چے ہے۔ نالہ کے سرے پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ نام موزوں لگا۔

شاچُوکل کا اِبتدائی نام شرچھو کُھل ہے۔ یعنی مشرق کے پانی سے سیراب اندرونِ واقع گاؤں۔

شایوق یعنی کنکریلی زمین والا گاؤں۔

صمروچن کا لفظی مطلب ''زمین کے زیریں حصے کے بڑے خانہ بدوش'' ہے۔

بغدانگ، بیادانگ کا بگڑا ہوا نام ہے۔ اس کا مطلب مرغی خانہ یا مرغیوں کا دڑبا ہے۔ اس نام کا محرّک گاؤں کے دڑبا نما چھوٹے چھوٹے کھیت ہیں۔

کنجی، سکن جی سے بنا ہے جس کا مطلب ہے چار اُبھری ہوئی جگہوں پر بسی ہوئی بستی۔ یہ گاؤں چار پہاڑیوں پر آباد ہے۔

ٹنگیار بلندی پر واقع ایک گاؤں ہے۔ یہاں سخت سردی ہوتی ہے۔ اِسی لئے گاؤں کا نام ٹنگیار یعنی گرمیوں میں بھی سردی پڑنے والا گاؤں ہے۔

کویُول شاید واحد گاؤں ہے، جس کا منفی نام ہے۔ یہ گوت یُول سے نکلا ہے اور اِس کا مطلب 'بےکار بستی' ہے۔ شاید یہ نام گاؤں کے باہر کے کسی آدمی نے رکھا ہوگا۔

کہتے ہیں سُمد و، خرمنگ کے میاں سُمد و کا بسایا ہوا ہے۔ کرگل، پوئین اور بارُو کی طرح کسی آدمی کے نام پر یہ گاؤں بسایا گیا ہے۔ جبکہ چیلینگ کا لفظی مفہوم اس بات کا غماز ہے کہ کبھی اِس گاؤں میں کشمیری لوگ بستے تھے۔ یہ دراصل چھے لینگ ہے۔ چھے خاچھے کا مخفف ہے، جو کشمیری یا کشمیریوں کو کہا جاتا ہے، جبکہ لینگ کا مطلب بستی ہے۔

ہُندر غالباً وادی نوبراہ کا سب سے قدیم گاؤں ہوگا۔ آرکائیوز ریکارڈ میں اِس کا اصلی نام سٹوُن تر دیا ہے، یعنی سب سے پہلے آباد ہونے والی بستی۔

ہُندر ایک خوبصورت گاؤں ہے۔ نوبراہ جانے والے سیاح ہندر ضرور جاتے ہیں۔ گاؤں میں متعدد ہوٹل اور گیسٹ ہاؤس ہیں۔ یہاں لداخی رانی گیال خاتون کا مقبرہ تھا' جو سیلاب سے بہہ گیا۔

فیانگ کو لداخ کا سب سے پرانا گاؤں قرار دیا گیا ہے۔ تاہم اس کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں ہوسکی۔ یہاں کا گنپہ مشہور ہے۔ گنپہ کے سامنے ایک اُونچے کھمبے پر ایک دھارمک جھنڈا لہراتا ہے۔ اِس سے متعلق یہ دلچسپ روایت ہے کہ جو قیدی یہاں تک بھاگ کر پہنچ جاتے تھے، اُن کی سزا معاف ہوتی تھی۔ راجہ ٹشی نمکیل نے یہ جھنڈا نصب کرایا تھا۔

سُورو گاؤں کرگل اور زنسکار کے راستے پر واقع ہے۔ یہاں سے نُن کُن کی چوٹیاں نظر آتی ہیں۔

پدم، زنسکار کا صدر مقام ہے۔ گاؤں میں پرانے قلعے کا کھنڈر، جامع مسجد اور گنپہ ہیں۔ یہاں شفاخانہ اور ہائی سکول ہیں۔

ٹانکچے لداخ کا پرانا گاؤں ہے اور اندازاً مون نسل کے لوگوں نے اسے آباد کیا تھا۔ یہاں ایک چٹان پر سریانی میں مندرجہ ذیل جملہ تراشا گیا ہے۔

''سمرقند کے چارن سر سے ۲۱۲ پڑاؤ طے کر کے تبت پہنچے۔'' یسوع کے لفظ

کے اُوپر صلیب کا نشان ہے۔ یہ ایک سے زیادہ نسطوری عیسائیوں کا کام تھا، جو اندازاً نویں صدی میں یہاں سے گزرے تھے۔ حال میں روہیت وو ہرانے ٹانگچے کے پاس چند عربوں کے نام اور ایک قرآنی آیت چند بڑے پتھروں پر تراشی دیکھی، جو آٹھویں یا نویں صدی سے متعلق ہیں۔

چیگتن بھی تاریخی گاؤں ہے۔ اِس گاؤں نے کئی منجھے ہوئے داستان گو، گیت کار اور گلوکار پیدا کئے ہیں۔ یہاں کا محل، جواب کھنڈر بن چکا ہے لداخی فنِ تعمیر کی اعلیٰ ترین نشانی ہے۔

چیگتن زمانہ حال تک بودھ مسلم مشترکہ ثقافت کی علامت رہا ہے۔
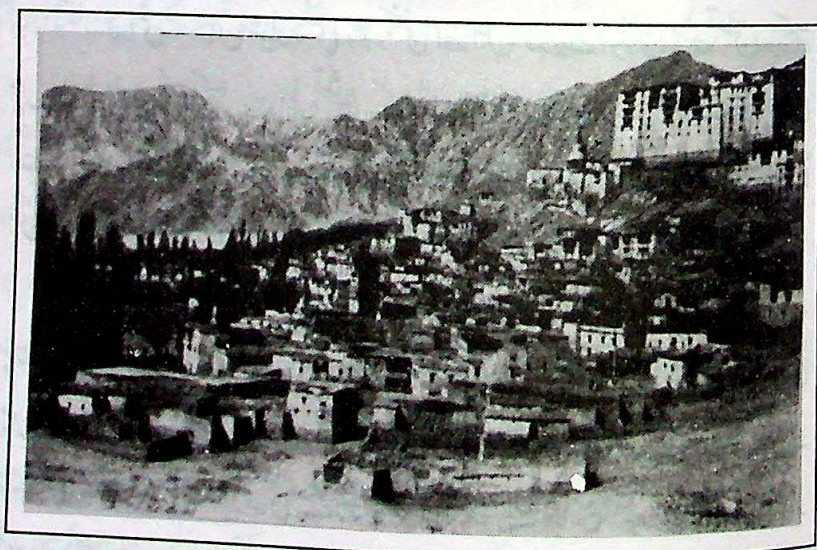
لیہہ قصبہ ۱۹۱۷ء میں
(مضمون ''لیہہ'' ملاحظہ فرمائیے)

لداخ کے مسلمان

(مختصر تاریخ)

لداخ، کرگل اور لیہہ ضلعوں پر مشتمل ہے۔ لیہہ ضلع میں بودھوں اور کرگل ضلع میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور دونوں مذاہب کی آبادی لگ بھگ برابر ہے۔ ۰۲-۲۰۰۱ء کے ریکارڈ کے مطابق لداخ کی کل آبادی ۲۳۲۸۶۴ افراد ہے۔ اس میں ۱۱۵۲۲۷ ضلع کرگل اور ۱۱۷۶۳۷ افراد ضلع لیہہ میں بستے ہیں۔

لداخی مسلمان شیعہ، سُنی، نوربخشی اور اہلِ حدیث فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت اہلِ تشیع کے اثنائے عشریہ مکتبۂ خیال کی ترجمانی کرتی ہے اور سُنی مسلمان حنفی مسلک کے ہیں۔ نسلی اور سماجی لحاظ سے لداخ میں مسلمان بلتی، پوریکپا، دردی اور آرغون قبائیل سے تعلق رکھتے ہیں۔

لیہہ ضلع میں لیہہ قصبہ کے علاوہ مسلمان ضلع کے ۲۵ گاؤں میں آباد ہیں۔ چند دیہات کے مسلمان مُلک کے بٹوارے کے بعد پاکستان چلے گئے۔ خطّہ لداخ میں اہلِ سنت الجماعت کی ۱۱۱ مساجد ہیں جبکہ ضلع کرگل میں سینکڑوں مسجدیں ہیں۔ دُور افتادہ زنسکار کی راجدھانی کے سو گھرانوں کے لئے جامع مسجد کے علاوہ دو اور مسجدیں بھی ہیں۔

کشمیر کی طرح لداخ اور بلتستان میں اِسلام کی اشاعت کا سہرا میر سیّد علی ہمدانیؒ کے سر باندھا جاتا ہے۔ ۱۳۸۱ء یا ۱۳۸۲ء میں وہ لداخ کے راستے چینی ترکستان گئے تھے۔ کشمیر کے کئی مورخین اور نسل در نسل پہنچی ہوئی روایات کے مطابق

لداخ میں اُنہوں نے تبلیغِ دین کا کام بھی کیا۔ شے مسجد کے علاوہ کئی مساجد تعمیر کیں۔ پروفیسر مجیب کے مطابق اُنہوں نے زنسکار کی راجدھانی پدم میں بھی مسجد تعمیر کی۔

روایات کے مطابق شاہ ہمدانؒ بلتستان بھی تشریف لے گئے جہاں علاقے کے قدیم ترین مسجدوں کی تعمیر کا سہرا اُن کے سر باندھا جاتا ہے۔

تاہم ساتویں اور آٹھویں صدیوں میں جب سنٹرل ایشیا، گلگت اور گرد و نواح کے خطّے معرکہ آرائیوں کے مرکز بنے تھے تو لداخ میں عرب فوجوں کی نقل و حرکت اور غالباً تاجروں کی آمد و رفت تھی۔ لداخ کے ٹانکچے علاقے میں چٹانوں پر ایک قرآنی آیت اور چند عرب نام تراشے ہوئے ہیں۔ ان میں ناصر ابنِ صالح لوُ منصور، ابوالآیات اور زِکریا ابنِ قاسم چند اہم نام ہیں۔ ایک محقق روہیت ووہرا کے مطابق سنٹرل ایشیا کے مذکورہ معرکوں میں بطور فوجی کمانڈر یا ناظم اُن کے جیسے نام ملتے ہیں۔ اس لمبی جنگ میں چین، تبت اور عربوں کے علاوہ کشمیر کے حکمران للتادتیہ بھی شامل ہوا تھا۔

لداخ کے ہمسایہ ملکوں اور خطّوں میں اِسلام کے پھیلنے سے لداخ اور بلتستان میں اسلام کی اشاعت کو تقویت ملی۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں مشہور عرب جرنیل قتیبہ بن مُسلم نے ۷۰۵ء میں پائین ترکستان فتح کیا۔ ۷۵۱ء میں عربوں نے دریائے طالاس پر چینی فوج کو فیصلہ کُن شکست دی اور سنٹرل ایشیا پر چین کی گرفت ختم ہوگئی۔ نویں صدی میں سارا سنٹرل ایشیا حلقۂ بگوشِ اسلام ہوا۔

لداخ اور اس کے ہمسایہ علاقوں میں اِسلام کا پہلا ذکر عباسی خلیفہ المامون (۸۱۳-۸۳۳ء) کے دور حکومت میں ملتا ہے۔ دو کتبوں میں جو افغانستان میں دستیاب ہوئے، بولور (بلتستان) اور اقصائے تبت پر اسلامی فتوحات کا ذِکر ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا گیا ہے۔

عرب مورخین مسعودی، البیرونی، یعقوبی، طبری، عسقلانی اور ابنِ خلدون

نے اپنی کتابوں میں تبت کا تذکرہ کیا ہے۔ یعقوبی کے مطابق خلیفہ المہدی (۷۷۵-۷۸۵ء) نے تبت سمیت کئی حکمرانوں سے خراج مانگا تھا۔ اُن دِنوں لداخ اور بلتستان پر تبت کا تسلّط تھا۔

تیرھویں صدی میں کشمیر میں اِسلام کی اشاعت ہوئی۔ شروع میں اس کا سہرا سنٹرل ایشیا کے ایک خدارسیدہ بزرگ سیّد شریف الدّین کے سر ہے، جو کشمیر میں بلبل شاہؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔ پہلے پہل اُن کے ہاتھوں اِسلام قبول کرنے والا ایک لداخی شاہزادہ ریچن تھا جو سلطان صدر الدّین کے نام سے کشمیر کا پہلا مسلمان حکمران بنا۔

سولہویں صدی کی شروعات میں بلتستان کے راجوں نے اِسلام قبول کیا۔ حضرت شاہ ہمدانؒ نے جو پودا لگایا تھا اُس کی آبیاری ایک صوفی منش اور برگزیدہ عالم سیّد نور بخش نے کی۔ وہ ۱۵۰۰ء میں بلتستان اور کرگل آئے اور تبلیغی کام کیا۔ اُن کے پانچ سال بعد ۱۵۰۵ء میں شمس الدّین ایراکی خطّے میں وارد ہوئے۔ ایراک ایران کا ایک شہر ہے۔ اُن کے ہمراہ ۵۰ مبلغین تھے۔ وہ شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے ہاتھوں بلتستان اور پوریگ میں ہزاروں لوگوں نے شیعہ مسلک اِختیار کیا۔ غالباً دراس میں بھی اُنہی دِنوں شینا بولنے والے دردوں نے اِسلام قبول کیا تھا۔

کرگل کے بلتی سرداروں نے کشمیر اور سنٹرل ایشیا سے وقتاً فوقتاً عالموں اور مبلغوں کو اپنے بچوں کو دینیات پڑھانے اور رعایا کو اِسلامی تعلیمات سے رُوشناس کرانے کے لئے مدعو کیا۔ اپنی بیٹیاں اُن کے عقد میں دیں اور اُنہیں بسنے کے لئے زمین، مکان اور دُوسری مراعات دیں۔

پندرھویں صدی میں لداخ خطّے میں پہلی مرتبہ بودھ ناموں کے ساتھ اِسلامی نام ملتے ہیں۔ لداخی راجہ لوٹوس چھوغدن کے ایک بھائی کا نام ٹونکپا یا ڈونپا علی تھا۔ درد سردار بغدار سکیاپ کے بڑے بیٹے کا نام علی دُوسکیا اور بیٹی کا نام خاتون تھا۔

تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ اُنھوں نے اسلام اختیار کیا تھا یا نہیں۔

سترھویں صدی کے آغاز میں لیہہ خطّہ میں اِسلام کو فروغ ملا، جب لداخی راجہ جمیا نگ نمگیل (۱۵۹۵-۱۶۱۶) کی شادی بلتی شہزادی گیال خاتون سے ہوئی۔ گیال خاتون کے ساتھ مُسلم موسیقاروں کی ایک منڈلی آئی۔ یہ موسیقار خرمون یا شاہی موسیقار کے نام سے مشہور ہوئے۔ اُن کو لداخ میں بسایا گیا۔

بلتستان اور کرگل میں اِسلام کی اشاعت علمائے کرام اور بزرگانِ دین کی تبلیغ کی رہینِ منّت ہے، جبکہ لیہہ میں چند مسلمانوں کو لداخ کے خودمختار راجوں نے مختلف امور سرانجام دینے کے لئے لیہہ، پدُم اور ستوق میں آباد کیا تھا۔ تجارت کے سلسلے میں کشمیر سنٹرل ایشیا سے لیہہ آنے والے متعدد مسلمان وقتاً فوقتاً لیہہ میں شادی کر کے مستقل طور پر بس گئے۔ نیز ڈوگرہ فوج میں فوجی خدمات دینے والے چند مسلمان بھی لداخ میں رُک گئے تھے اور یہیں بس گئے۔ اُن کی اولاد متعدد خاندانوں میں بٹ گئی اور آج کل لیہہ اور مختلف گاؤں میں بڑی تعداد میں آباد ہیں۔

مسلمان، چینی ترکستان اور کشمیر سے صدیوں سے تجارت کے سلسلے میں لداخ آتے تھے۔ قرائن سے لگتا ہے کہ سولھویں صدی میں کچھ کشمیری مسلمان عارضی طور پر لیہہ میں بس گئے تھے۔ گیالپو جمیا نگ نمگیل نے تجارت پیشہ چھ مسلمانوں کو لیہہ قصبہ میں مکانات تعمیر کرنے کے لئے زمین دی اور تجارت کے سلسلے میں کچھ مراعات دیں۔ ریلی، شنکو، خل سوار، بنارس، سوتے اور ہنگول نام کے اِن خاندانوں کی اولاد متعدد کنبوں میں منقسم ہے۔ اِن کے علاوہ چھشوت اور شے گاؤں میں صدیوں سے ہزاروں بلتی نسل کے مسلمان آباد ہیں۔

لیہہ کے اکثر مسلمان آرغون کہلاتے ہیں۔ آرغون سے مراد مخلوط النسل ہے۔ جس کی ماں لداخی اور باپ غیر لداخی ہے۔ باپ کی طرف سے آرغون چینی ترکستانی، کشمیری، پٹھان، تاتاری، ڈوگرہ، مغل اور دُوسری کئی نسلوں کی اولاد ہیں۔

آرغون اور لداخی بودھوں میں خونی رِشتہ ہے اور یہ ایک دُوسرے کے دُکھ سکھ میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ ایک یورپی نے اُنیسویں صدی میں اِس ضمن میں اپنے تاثرات اِن الفاظ میں پیش کئے ہیں:

''آرغون مسلمانوں اور بودھ عورتوں نے رِشتہء ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد ایک دُوسرے کے مخصوص رنگ ڈھنگ کے سانچے میں اپنے کو ڈھال لیا ہے اور ایک دُوسرے کے سماجی تعصّبات کے سامنے سرخم کئے ہیں۔''

رجسٹرار جنرل آف انڈیا کی سروے رپورٹ کے مطابق شادی کے بعد لداخی بودھ عورتیں اور آرغون مسلمان باہمی طور ایک دُوسرے کے طور طریقے اختیار کرتے ہیں۔

مرد اپنی بیوی کی خوراک، لباس اور طرزِ معاشرت اپناتے ہیں اور ان کے بچے ماں کی زبان سیکھتے ہیں اور کبھی باپ کی زبان سیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

لداخ کے راجوں کی طرف سے لیہہ میں بلائے افراد میں خواجہ خاندان مشہور ہے۔ لداخ مغلیہ حکومت کا باج گزار رہا ہے۔ لداخی راجہ کو کشمیر کے مغل گورنر سے خط و کتابت کے لئے ایک فارسی دان منشی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے غالباً سترھویں صدی میں لداخی راجہ نے خواجہ خاندان کے ایک فرد کو کشمیر سے لیہہ مدعو کیا اور بسنے کے لئے قصبہ میں زمین دی۔ بعد میں اس خاندان نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا اور بڑی ترقی کی۔ تبت میں لہاسہ، شیگاتزے اور گرتوق کے علاوہ چینی ترکستان میں ان کے مکانات اور جائدادیں تھیں۔ حکومتِ انگلشیہ نے اس خاندان کے چار افراد کو مختلف خدمات کے صلے میں خان بہادر کا خطاب دیا۔ ڈوگرہ دورِ حکومت میں اس خاندان کو لمبی مدّت کے لئے تبت جانے والی اہم تجارتی اور سفارتی مشن لوپچق کی قیادت کا موقع ملا۔

خواجہ خاندان کا اپنا یہ کہنا ہے کہ اُن کا پہلا بزرگ لداخ میں تبلیغِ دین کے

سلسلے میں کشمیر سے لیہہ آیا تھا اور یہ راڈو خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

ایک لداخی راجا نے کشتواڑ کے ایک شخص اسلم ٹاک کو منشی کا کام کرنے کے لئے لیہہ میں بلایا۔ سترھویں صدی میں اسمٰعیل زرگر نامی ایک کشمیری غالباً راجہ دے لیگس نمگیل نے سکّہ ڈھالنے کے لئے لیہہ میں بسایا۔ یہ سکّہ دے لیگس نمگیل کے اسلامی نام پر ڈھالا گیا ہے۔ ملک ذات کے ایک مسلمان کو بھیڑ بکریاں ذبح کرنے کے لئے ستوق گاؤں میں بسایا تھا۔ ان تینوں اشخاص کی اولاد آج متعدد خاندانوں میں بٹی اور پھیلی ہوئی ہیں۔

مور کرافٹ کے لیہہ میں (۱۸۲۰-۱۸۲۱ء) قیام کے دِنوں میں غریب طبقے کے آرغون مسلمان قصاب، باورچی اور خوردہ فروشی کا کام کرتے تھے۔ عام آرغون تجارت پیشہ تھے۔ بعد میں جب کپتان رمزے بطور برٹش جوائنٹ کمشنر لیہہ آیا تو آرغون قصاب، بساطی، پھیری والا کے علاوہ درزی، لوہار اور سنار کا کام بھی کرتے تھے۔

مور کرافٹ کے منشی حاجی سیّد نجف علی کے مطابق لداخی حکومت نے سارے تجارتی امور آرغون مسلمانوں کو سونپے تھے اور کئی دفعہ آرغون ثالث اور مشیر کی حیثیت سے بھی کام کرتے تھے۔

مسلمانوں کا اثر ورسوخ تھا کہ ہنگری کے عالم سوماڈی کوروسو نے مُسلم نام سکندر بیگ رکھا۔ ایک انگریز ہینڈرسن، اسمٰعیل خان اور بعد میں ہیڈین حاجی بابا کے نام اِختیار کر کے لداخ وارد ہوئے۔

لداخ کی مہمات پر ڈوگرہ فوج کے ساتھ آئے ہوئے کچھ مسلم سپاہی بھی لیہہ میں بس گئے۔ اُن کی اولاد اِس وقت لداخ میں موجود ہیں۔

سرینگر میں عید گاہ اور ہَول میں مقیم اکثر تبّتی مسلمان لداخی مسلمانوں کی اولاد ہیں۔ اُن میں سے بہتوں کے اجداد تبت میں وزیر زور آور سنگھ کی فوج کشی کے

دوران قیدی بنائے گئے تھے۔ یہ لڑائی ۱۸۴۱ء میں تبت میں ہوئی تھی۔ تقریباً ایک ہزار لداخی، بلتی، ڈوگرہ سپاہی اور افسر اسیر ہوئے۔ بعد میں یہ قیدی تبت میں رہا کئے گئے اور بہتوں نے وہاں تبّتی عورتوں سے شادی بیاہ کئے۔ ان میں اُن ڈوگرہ فوجیوں کی اولاد بھی ہیں جو لداخیوں کے ساتھ قیدی بنائے گئے تھے اور بعد میں اُنہوں نے تبت میں اِسلام مذہب اِختیار کیا تھا۔ ڈوگروں کے اکثر ناموں کے ساتھ سنگھ ہونے کی وجہ سے لوگ آج بھی سینگھپا کہلاتے ہیں۔

پدم زنسکار میں کئی مسلم گھرانوں کے افراد ایک کشمیری رزاق جو کی اولاد ہیں۔ رزاق جو کی زنسکار روانگی کا واقعہ دلچسپ ہے۔ لداخ کے گیالپو سینگئے نمگیل نے زنسکار فتح کیا اور اپنے بیٹے دے چھوق نمگیل کو وہاں کا گورنر بنایا۔ دے چھوق نمگیل نے محلات میں پرورش پائی تھی۔ زنسکار کے بے رنگ اور بے کیف ماحول میں اُس کا دل نہیں لگا اور لیہہ واپس آنے کی اجازت کے لئے باپ سے تقاضے کرنے لگا۔ اُس زمانے میں ایک ظریف اور زِندہ دل کشمیری رزاق جُو تجارت کی غرض سے لیہہ آتا تھا۔ سینگئے نمگیل کی دُوربین نگاہوں نے تاڑ لیا کہ رزاق جُو اپنی شوخی اور ظرافت اور فہم و فراست سے دے چھوق نمگیال کو زنسکار میں رکھ پائے گا۔ چنانچہ راجہ نے رزاق جُو کو انعام واِکرام دے کر زنسکار میں تجارت کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ رزاق جُو اپنے مشن میں کامیاب ہوگیا۔ دے چھوق نمگیل نے اُس کی خوب قدر کی اور رزاق جو پدم میں شادی کر کے مستقل طور پر بس گیا۔

۱۶۸۱ء میں لداخ پر منگول فوج کشی سے اِسلام کو تقویت ملی۔ لداخ کا وزیر اعظم شکیا گیا ژو مغل گورنر سے حملہ آوروں کے خلاف مدد حاصل کرنے کشمیر گیا۔ مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے حکم پر نواب فدائی خان کی سر کردگی میں ایک بڑی فوج لداخ بھیجی گئی اور قابض فوج کو پسپا کیا گیا۔ تب لداخ اور مغلیہ حکومت کے اس تعاون کو تبت میں تشویش کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

لیہہ کے پاس چھشوت اور شے کے بڑے دیہات کے مسلمان بلتی مسلمانوں کی اولاد ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ اُن کی اکثریت گیالپو جمیانگ نمگیل کے زمانے میں بلتستان سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوئی۔ بہت سے اس سے پہلے دریائے شایوک میں سیلاب کی وجہ سے یہاں منتقل ہوئے۔ چھشوت آبادی کے لحاظ سے لداخ کا سب سے بڑا گاؤں ہے اور رقبے کے لحاظ سے بھی دریائے سندھ کے کنارے کئی میل تک پھیلا ہوا ہے۔

اٹھارویں صدی میں لیہہ میں بہت سارے کشمیری مسلمان آباد ہوئے تھے۔ پُرتگال کے دو پادری فادر ڈیزی ڈیری اور فادر فریرے ۱۷۱۵ء میں لیہہ کے راستے تبت روانہ ہوئے۔ فادر ڈیزی ڈیری نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے:

''بہت سارے کشمیری تاجر لداخ میں سکونت پذیر ہیں۔ یہ پشمینہ کی تجارت کرتے ہیں۔ اُن کو مسجدیں تعمیر کرنے اور مذہب کی پوری آزادی ہے۔''

۱۸۲۰ء میں مور کرافٹ جب لداخ آیا تو تبلیغی کام جاری تھا۔ وہ لکھتا ہے:

'بلتستان اور کشمیر کی سرحد پر اِسلام تیزی سے پھیل رہا ہے اور وہ دن دُور نہیں کہ سارا لداخ ایک اِسلامی ریاست بن جائے گا۔'' مور کرافٹ کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا ہے۔

مور کرافٹ آگے لکھتا ہے: ''لداخیوں کے عادات واطوار میں تبدیلی آرہی ہے۔ ایک خوشگوار اثر یہ پڑا ہے کہ چھنگ اور نشہ آور مشروب کے اِستعمال میں اعتدال اور اجتناب برتا جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی لوگوں میں اخلاقی بے راہ روی آئی ہے اور صدق وسچائی سے بے التفاقی برتی جاتی ہے۔''

ایک اور سیاح لیفٹیننٹ کرنل ٹوریز نے بھی اپنے سفرنامہ میں مور کرافٹ کے یہ الفاظ دہرائے ہیں۔ وہ ۱۸۶۱ء میں لداخ آیا تھا۔

بدھ مت اور اِسلام کی اِنسان دوستی، بھائی چارہ، خوش خلقی اور بلند کردار کی

اعلیٰ تعلیمات سے قطع نظر، لداخ، کشمیر اور چینی ترکستان کے باشندوں میں اپنی اپنی علاقائی خوبیاں اور کمزوریاں موجود تھیں۔ لداخ کا تمدّن اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یورپی سیاحوں کے چند سفر ناموں سے پتہ چلتا ہے کہ شروع شروع میں آرغون میں آبائی کمزوریاں بہت پائی جاتی تھیں۔

لداخی مسلمانوں کے ماضی کی تاریخ کے پس منظر میں بودھ مسلم اِتحاد کے دلچسپ تاریخی واقعات ملتے ہیں۔ لداخی بودھوں اور بلتی مسلمانوں کے درمیان ماضی میں متعدد لڑائیاں لڑی گئی ہیں جس میں کبھی لداخیوں کا پلہ بھاری رہا اور کبھی بلتی فتح یاب ہوئے۔ سکردو کے حکمران علی شیر خان نے بودھوں کے مقدّس مقامات کو نقصان پہنچایا لیکن لداخیوں اور بلتیوں میں جنگ وجدل کبھی ناچاقی کا باعث نہیں بنی اور نہ کبھی ان کے درمیان تلخی اور کدورت پیدا ہوئی۔ ہر لڑائی کے بعد فاتح اور مفتوح نہ صرف تعلقات بحال کرتے بلکہ اُنہوں نے وقتاً فوقتاً خونی رشتے سے یہ تعلقات مزید مستحکم کئے ہیں۔ اِس کے برعکس لداخیوں اور ترکوں اور ڈوگروں کی لڑائیوں سے بڑی تلخیاں پیدا ہوئی تھیں۔

لداخیوں اور بلتیوں کے خوشگوار تعلقات میں سیاسی مصلحتوں سے زیادہ نسلی ہم آہنگی اور تہذیبی مماثلت کو زیادہ دخل ہے۔

گیال خاتون کے علاوہ کئی لداخی راجاؤں نے بلتی شہزادوں سے شادیاں کیں۔ نیما نمگیل کی بیوی ذی ذی خاتون تھی اور حکومت کا سارا نظم ونسق اُس کے ہاتھ میں تھا۔ علی شیر خان نے گیالپو جمیا نگ نمگیل کی ایک بیٹی کو اپنی دُلہن بنایا۔ چھوانگ نمگیل کی شادی سوت (علاقہ کرگل) کے مسلم راجہ کی شہزادی بیگم وانگموں سے ہوئی جو لداخ میں کنزوم وانگموں کے نام سے مشہور ہوئی۔

چیکستن اور پشکیوم کے مسلم راجہ حور چو خان نے لداخ کے ایک راجہ کی بیٹی سے شادی کی اور اس سے حبیب خان پیدا ہوا۔ حبیب خان کے بیٹے آدم خان نے

اپنے علاقہ کا نظم ونسق سنبھالا تو اُس کی شادی بھی لداخ کے ایک اور راجہ کی بیٹی سے ہوئی۔ راجہ نے اپنی بیٹی کو دراس جہیز میں دیا۔

آخری خودمختار راجہ تنڈوپ نمگیل کی شادی بھی پشکیُوم کے چو خاندان سے ہوئی اور ان کے بیٹے جگمت ڈاڈُل نمگیل کی تیسری بیوی پشکیُوم کے راجہ کی بیٹی زہرہ خاتون تھی۔

سوروکرتسے (علاقہ کرگل) کے مسلمان حکمران محمد تھی سلطان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اُس نے اپنی بیگم کی خواہش کو نظرانداز کرتے ہوئے لداخ کے گیالپو کے بیٹے گیالپو نیا نمگیل کو گود لیا اور اپنی حکومت کا وارث بنایا۔

لداخ کے بودھ راجاؤں نے اپنی مُسلم بیگمات کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ لیہہ، شے اور بزگو میں اُن کے لئے چھوٹی چھوٹی مسجدیں تعمیر کی تھیں۔ اِسی طرح خپلو وغیرہ میں بلتی راجاؤں سے لداخی راجکماریاں بیاہی گئی تھیں اور وہ بھی اپنے دھرم کی پابند تھیں۔

خوشگوار تعلقات راجوں اور رئیسوں میں ہی نہیں تھے بلکہ معاشرے کی ہر سطح پر یگانگت تھی۔ ایک روایت کے مطابق کوشُوق ستق سنگ راسپا اوّل نے لیہہ جامع مسجد کے امام اور چھشوت یوغما کے متوّلی کو بطور جذبۂ خیر سگالی ایک ایک عصا پیش کیا۔ ایک مسلمان عالم نے ہمس گنپہ کو قرآن شریف کا ایک نادر قلمی نسخہ نذر کیا۔

ماضی کے پوریگ میں کئی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ چٹیا رکھنے والے بودھ اور بارلیش مسلمان کندھے سے کندھے ملا کر گنپہ اور مسجد کی تعمیر اور مرمت میں ایک دُوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

ایسے بھی گھر تھے جہاں ایک ہی چھت کے نیچے بودھ اور مسلمان اکٹھے رہتے تھے اور ایسے بھی لوگ تھے، جن کا آدھا نام مسلم اور آدھا بودھ تھا۔

نئے سال کے تیوہار لوسر اور میلہ دسموچھے پر راجہ کے جلو میں گھوڑسواروں کا

جلوس نکلتا تھا۔ اس کے بعد گھوڑ سوار لیہہ بازار میں گھوڑ دوڑ کرتے تھے۔ گھوڑ دوڑ کی قیادت کرنے والا بودھ رئیس ''لرداق'' اس سے قبل لیہہ کی جامع مسجد کے چراغ کے لئے بڑی عقیدت سے تیل چڑھاتا تھا اور نہا دھو کر اپنی سلامتی کی دُعا مانگ کر گھوڑ دوڑ کی قیادت کیا کرتا تھا۔

شری دھر ڈولو کے ایک مضمون کے مطابق کئی بودھ اپنے مسلم رشتہ دار کے بیٹے کو گود لیتے تھے اور زمین کا وارث بناتے تھے۔

ڈوگرہ دورِ حکومت میں ۱۹۴۷ء سے پہلے سکردو، بلتستان بھی وزارتِ لداخ میں شامل تھا۔ ۱۹۰۱ء سے ہر دس سال بعد لداخ میں مردم شماری ہوئی ہے۔ یہاں ۱۹۴۱ء کی فرقہ وارانہ مردم شماری کا گوشوارہ پیش کیا جاتا ہے۔

	مسلمان	بودھ	ہندو	عیسائی	دیگر اقوام
لداخ	۴۰۸۶	۳۱۸۶۶	۲۱۷	۱۲۹	۹
کرگل	۴۴۴۱۰	۸۲۹۸	۹۷	۶	۴۲
بلتستان	۱۰۵۹۹۶	-	۱۴۱	-	۱۳۴
کل میزان	۱۵۴۴۹۲	۴۰۱۶۴	۳۴۵	۱۳۵	۱۸۵

۱۹۴۹ء میں علاقہ لائن کے کئی دیہات نیموں، بزگو، سسپول اور خلسے کے مسلمان پاکستان چلے گئے۔ بزگو میں راہول سنکر وا تسائن کے سفرنامہ کے مطابق ۱۹۳۴ء میں ۱۹ مسلم کنبے تھے اور اُن کی مجموعی آبادی ۱۱۹/افراد پر مشتمل تھی۔

مسلمانوں نے لداخ اور لداخی بودھوں سے جہاں بہت کچھ حاصل کیا ہے، وہاں اِنھوں نے لداخ کو بہت کچھ دیا بھی ہے۔ چند مورخین نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے لداخ کو پولو اور موسیقی کے مختلف آلات سے روشناس کیا۔ سکردو کے حکمران علی میر شیر خان کی مغل حکمران اکبر اعظم کے دربار میں رسائی تھی۔ ۱۵۹۱ء میں اُس کی بیٹی گل خاتون کی شادی ولی عہد جہانگیر سے ہوئی۔ گل خاتون کے اثر و رسوخ

کی وجہ سے بلتی موسیقار تربیت کے لئے دہلی بھیجے گئے اور آگرہ سے موسیقار بلتستان آئے۔ بلتستان نے اِس ضمن میں جو کچھ پایا، وہ لداخ کو دیا۔ ۱۶۳۰ء میں موسیقی اور موسیقی کے آلات لداخ سے تبت پہنچے۔

سلطان زین العابدین نے پندرھویں صدی میں لداخ کو دف سے رُوشناس کیا۔

غزل، قوالی، منقبت، مرثیہ اور قصیدہ وغیرہ مسلمانوں ہی کی دین ہیں۔

آرٹ کے ماہرین نے لکھا ہے کہ لداخ کی مصوّری پر بغداد اور مغل آرٹ کا اثر ہے۔ پہلے پہل مسلمانوں نے سنٹرل ایشیا کے کئی مشہور پکوان لداخ لائے۔

لداخ کے مسلمانوں نے مختلف میدانوں میں کئی اہم شخصیات پیدا کی ہیں۔ قاسم علی مشہور سرنائی نواز تھا، جو اپنی سرنائی سے درجنوں دُھنیں نکال سکتا تھا۔

ژندن سینگے علی ایک ماہر معمار اور ترکھان تھا۔ لیہہ اور چیکتن کے محلات اُس کی رہنمائی میں تعمیر ہوئے تھے۔

رحیم اللہ اور عبدالرحیم منجھے ہوئے داستان گو تھے اور گیالم کیسر کی داستان بڑی مشاقی سے سناتے تھے۔

منشی علی حسین ایک مقبول شاعر تھا۔

جمیعتہ العلماء اِسلامیہ مدرسہ اور امام خمینی ٹرسٹ مسلمانانِ کرگل اور انجمنِ امامیہ اور انجمنِ معین السلام لیہہ ضلع کے مسلمانوں کی مذہبی اور سماجی تنظیمیں ہیں۔

خطّے میں مسلمانوں کے کئی پرائیویٹ تعلیمی ادارے ہیں۔ لیہہ کے پاس ٹھکسے کے مدرسہ القرآن میں قرآن مجید کے حفظ اور دینیات کی درس و تدریس کا انتظام ہے۔

خطّے کی چند اہم مساجد اور متبرک مقامات:

جامع مسجد لیہہ: جامع مسجد لیہہ غالباً لداخ کی سب سے بڑی مسجد ہے۔

یہ مغل شہنشاہ اورنگزیب اور لداخی راجہ دیلدن نمگیل کے مابین ایک معاہدہ کے تحت ۱۶۶۶-۱۶۶۷ء میں تعمیر کی گئی۔ تب سے اس کی کئی دفعہ مرمت اور توسیع ہوئی ہے۔ بیسویں صدی کے وسط تک اس کی تعمیر و توسیع میں لداخی فنِ تعمیر کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد اس میں حمام کا اضافہ کیا گیا اور مقبول اسلامی فنِ تعمیر کے مطابق گنبد اور مینار تعمیر کئے گئے ہیں۔ لیہہ میں اس سے پہلے ایک چھوٹی مسجد تھی، جس کی تعمیر کے لئے لداخی گیالپو سینگئے نمگیل نے زمین دی تھی۔

شاہ ہمدان مسجد شے: یہ مسجد لیہہ سے ۱۲ کلومیٹر دُور لداخ کی پرانی راج دھانی شے میں دریائے سندھ کے کنارے ایک پُر فضا مقام پر واقع ہے۔ اس کی تعمیر شاہ ہمدان سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس لئے اسے ایک آستانہ کا درجہ حاصل ہے۔ مسلمان یہاں اکثر عبادت کرنے کے لئے آتے ہیں۔

امام باڑہ چھُشوت یوقما: امام باڑہ چھُشوت یوقما سولہویں صدی میں تعمیر ہوا۔ لیہہ ضلع میں تاریخی لحاظ سے یہ سب سے مشہور اور سب سے بڑا امام باڑہ ہے۔ ۱۹۹۳ء میں اِس کی تعمیرِ نو عمل میں لائی گئی۔ یہاں عاشورہ اور شامِ غریباں کی مجالس اور سالانہ قرآنی خوانی کے علاوہ عیدین کے اجتماعات بھی ہوتے ہیں۔

کرگل ضلع میں متعدد عالیشان امام باڑے ہیں جن کے سبز گنبد اور اُونچے مینار اسلامی فنِ تعمیر کا نمونہ ہیں۔

بُرو خانقاہ: یہ بڑی مشہور خانقاہ ہے اور مرجع خاص و عام ہے۔ کاچُو سکندر خان کے اندازے کے مطابق یہ سیّد محمد نور بخشؒ یا میر شمس الدّین ایراکیؒ کے زمانے میں تعمیر ہوئی۔

مزار سیّد میر ہاشم: یہ مقدس آستانہ کرپوکھر میں واقع ہے اور مرجعِ خاص و عام ہے۔ حضرت سیّد میر ہاشم، راجہ ٹھی محمد سلطان (۱۷۰۰-۱۷۴۶ء) کی دعوت پر کشمیر سے چند علماء کے ساتھ پوریگ آئے تھے۔ علاقے میں تبلیغ کے علاوہ اُنہوں نے

سلطان کو دینیات بھی پڑھائی تھی۔

آستانہ میر سیّد حسین شاہؒ: کرگل کے یوقما کھر بو میں واقع ہے۔ حضرت میر سیّد حسین شاہؒ اپنے زمانے کے بڑے عالمِ دین تھے۔ اُن کے مزار پر سالانہ فاتحہ خوانی اور اجتماع ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ کرگل، دراس اور ترتوک میں کئی پرانی اور تاریخی مساجد ہیں۔ جن کے تذکرے کے لئے ایک اور باب درکار ہے۔

لیہہ کا ماڈل سکول۔ فوٹو: ۱۹۴۰ء

(تصویر میں لیہہ کے امام سیّد محمد سعید نظر آرہے ہیں۔ وہ ایک اُستاد بھی تھے۔ مضمون ''لداخ میں تعلیم کی کہانی'' ملاحظہ فرمائیے)

سنت اور لاما

کئی یورپیوں نے لداخ کو ''لاموں کا دیش'' بھی کہا ہے کیونکہ آبادی کا کچھ حصّہ لاموں پر مشتمل ہے۔ الیکزنڈر کننگھم نے اپنی کتاب ''لداخ'' میں لکھا ہے کہ ۱۸۴۷ء میں لداخ میں بارہ ہزار لامے تھے۔ آج کل لاموں کی تعداد پانچ ہزار بتائی جاتی ہے۔ یہ لداخ کے متعدد گنپوں میں اقامت کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ لامے ہمس گنپہ سے وابستہ ہیں، جن کی تعداد سینکڑوں بتائی جاتی ہے۔ لاما کا لفظی مطلب برتر یا اعلیٰ ہے۔

ماضی میں روایت کے مطابق ہر بودھ گھرانا ایک بیٹے کو لاما بناتا اور عموماً اس کے لئے سب سے چھوٹے بیٹے کا اِنتخاب کیا جاتا تھا۔ بہت ساری لڑکیاں NUNS یا بھکشونیاں بنتی تھیں، جن کو مقامی زبان میں چومو کہا جاتا ہے۔

لاما بودھ بھکشو کا تبّتی اور لداخی ہم معنی (لفظ) ہے۔ سکم، بھوٹان، منگولیا، تبت اور کئی مقامات پر بھکشو کو لاما کہا جاتا ہے۔ وہی شخص لاما کہلانے کا مستحق ہے جو ظاہری، باطنی اور علمی طور پر بودھ مذہبی علوم کا ماہر ہو اور اُن پر عمل پیرا ہو۔

لداخ میں تبّتی طرز کے بدھ مت کا اثر ہے۔ یہاں بدھ مت پر وجرایانا یا تانترک فلسفے کا گہرا پرتو ہے۔ وجرایانا کا لفظی مطلب ہیرے جواہر کی رہگذر (DIAMOND PATH) ہے۔ اس کے فلسفے کے پیچھے یہ تصوّر ہے کہ بدھ کی تعلیمات امر اور ناقابل شکست ہیں۔

تبّتی یا لداخی بدھ مت ایک مشکل موضوع ہے۔ پروفیسر ٹوچی نے، جو تبّتی

زبان، کلچر اور مذاہب پر چوٹی کے ماہر مانے جاتے ہیں، اپنی کتاب RELIGIONS OF TIBET میں لکھا ہے:

''تبّتی مذہبی ادب اور علوم کا ذخیرہ اتنا وسیع ہے کہ ایک زندگی میں ان پر عبور حاصل نہیں کیا جاسکتا۔''

ایک اور مشاہد اور قلم کار نے لکھا ہے کہ لداخی بدھ مت سمجھنے کے لئے کوئی مختصر راستہ (Short cut) نہیں ہے۔ یہ پوری زندگی مطالعہ چاہتا ہے۔''

بلاشبہ اِس پر دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ یہاں بدھ مت کے عقائد پر دیو مالائی اور اساطیری پرچھائیاں ہیں اور ماورائی تصوّرات کی چھاپ ہے۔

تبت میں بدھ مت سے پہلے بون مذہب مروّج تھا۔ اِس لئے اِس کا بھی اثر پڑا ہے تاہم حالیہ سالوں میں نئی نسل کے بودھ سکالروں نے لوگوں کے ذہن سے غیر بودھ عقائد ختم کرنے کے لئے اچھا کام کیا ہے۔ خاص کر موجودہ دلائی لامانے لداخ اور لداخ سے باہر اپنے اُپدیشوں میں بدھ کے بھائی چارہ کے آفاقی پیغام، سماجی خدمات اور اِنسان دوستی کی تعلیم پر زور دیا ہے، جس کا مثبت اثر پڑا ہے۔

بدھ مت میں تاریخی بدھ سکیامنی کے علاوہ پانچ دھیانی بدھ (MEDITATIVE BUDDHA) ہیں۔ سولہ بدھی ستوا ہیں جن میں مستقبل کا بدھ میتر یا، اویلو کیتیشورا، منجوشری اور وجراپانی قابل ذکر ہیں۔ اویلو کیتیشورا رحم، منجوشری دانائی اور وجراپانی مافوق الفطرت قوّت کے مظہر ہیں۔ سولہ ارہٹ ہیں جو بدھ سکیامنی کے سرکردہ شاگرد اور اُونچے مرتبہ کے سنت تھے۔ چوراسی مہا سدھا ہیں۔ جن میں ناروپا، مارپا، میلا ریپا جیسے بلند ریشیوں منیوں سمیت چھوٹے پیشوں کے افراد بھی تھے۔ ان کے علاوہ وہ بڑے بڑے سنت شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً تبت اور ہند میں پیدا ہوئے۔ ان میں پدما سمبھاوا، ژونکھاپا اور آتیشا شامل ہیں۔ گنپوں میں ان سب کی مورتیاں اور شبیہیں ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ دیوی دیوتاؤں اور دھرم پالاؤں، جن

میں مہا کالا اور یمن تا کا شامل ہیں' کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔ دیویوں میں تارا کو بڑی افادیت حاصل ہے، یہ اویلوکیتیشورا کی نسوانی مظہر ہے۔

گنپوؤں میں گُوشوق (ہیڈ لاما) اور ان کے پیشرو گُوشوقوں کی مورتیاں ترتیب سے نصب ہیں۔ ہر گنپہ میں مربع اور دائرے میں بنے منڈلاؤں سے کالا چکرا، جیون سمسارا وغیرہ کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ مورتیوں اور تصویروں کی توجیہات اور تاویلات مشکل اور تفصیل طلب ہیں۔ نیز ہر فرد کا اپنا ایک دیوتا (Deity) ہوتا ہے جسے YIDAM کہا جاتا ہے۔ بدھ کی طرح اِس کی بھی پوجا کی جاتی ہے۔ Yidam کو سرپرست یا محافظ دیوتا بھی کہا جاتا ہے۔

عموماً کہا جاتا ہے کہ لداخ میں لاموں کے دو فرقے ہیں۔ اِن کو زرد فرقہ اور سرخ فرقہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تاہم لداخی بدھ مت کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ یہاں بدھ مت کے چھ مکاتیبِ خیال کے پیروکار بستے ہیں۔ یہ قدیم سکول نیم اصلاح شدہ سکول (SEMI REFORMED SCHOOL) اور اصلاح شدہ سکول (REFORMED SCHOOL) سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ فرقے ہیں: ننیگماپا، گیلوگپا، سسکیاپا، سکرماپا اور کرگیوتپا۔ کرگیوتپا دو ذیلی فرقے ڈیگونگپا اور ڈُوگپا پر مبنی ہیں۔ ان فرقوں کا جنم وقتاً فوقتاً تبت میں ہوا تھا۔ تبت میں متعدد ذیلی فرقے بھی اُبھرے لیکن اُن میں سے کئی پنپ نہیں پائے۔

لداخ میں بدھ مت پر تبت کا گہرا اثر ہے۔ اگرچہ تبت میں بدھ مت لداخ کے بعد پہنچا۔ مہاراجہ اشوک کے زمانے میں کشمیر کے راستے لداخ میں بدھ دھرم کا پرچار ہوا۔ تبت میں اِس کے آٹھ سو سال بعد ساتویں صدی میں پہنچا۔ نویں صدی میں نالندہ یونیورسٹی کے بودھ عالم اور تانترک اُستاد پدما سمبھوا تبت آئے اور اُنھوں نے بدھ مت کو فروغ دیا۔ اِن کا فرقہ ننیگماپا کے نام سے مشہور ہے جس کا مطلب قدیم مقلدین ہے۔ مقامی روایت کے مطابق پدما سمبھوا لداخ بھی آئے تھے۔

تبت نے مختلف معاملات میں خاص طور پر مذہبی امور میں لداخی بودھوں کی رہنمائی کی ہے۔ بارھویں صدی سے لداخ سے مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اُمیدواروں کے تبت جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔

لداخی بودھوں نے بے کم و کاست ہر گام پر تبت کی رہبری قبول کی ہے۔ تبت میں وقتاً فوقتاً جو بھی مذہبی تحریک چلی اُس کا جھونکا لداخ پہنچا اور لداخیوں نے جزوی یا کُلّی طور اِس کا اثر لیا۔

ننگما پا سب سے قدیم سکول ہے۔ اِس مکتبہء خیال کا لداخ پر گہرا اثر پڑا۔ تاہم سترھویں صدی میں منگول جرنیل غلدن چھوانگ کی لداخ پر فوج کشی کے دوران ننگما پا فرقے کو دھکا لگا اور گیلوگپا سکول کو تقویت ملی۔ اس وقت گیلوگپا کے سب سے بڑے رہنما دلائی لاما ہیں۔

آج کل لداخ میں ننگما پا فرقے کا ایک ہی گنپہ ہے۔ یہ لیہہ سے ۴۲ کلو میٹر دُور ٹق تق گاؤں میں واقع ہے۔ تبت کے خم صوبہ کے ایک بڑے لاما چھوانگ نربو نے لداخ کے راجہ چھوانگ نمگیل کے عہد میں ننگما پا فرقے کی بنیاد ڈالی اور راجہ نے گنپہ تعمیر کیا۔ یہ سولہویں صدی کے دُوسرے نصف کا زمانہ تھا۔

اگر چہ یہاں ننگما پا مکتبۂ خیال کے لامے معدودے چند ہیں لیکن پدما سمبھاوا کا ہمہ گیر اثر موجود ہے۔ تقریباً ہر گنپہ میں پدما سمبھاوا کی مورتی اور تصویر ہے اور اُن کے نام پر دعائیہ مجلسیں ہوتی رہتی ہیں۔ اُنہیں چڑھاوے پیش کئے جاتے ہیں اور اُن کی سوانح حیات کے صحیفے کا وِرد کیا جاتا ہے۔ ماضی میں اُن کے نام پر منعقد ہونے والی ماہانہ مجلس چھیشو میں شراب بھی چلتی تھی، جو اَب بند کی گئی ہے۔

ہمس میلہ پدما سمبھاوا کے جنم دن پر منایا جاتا ہے اور رقاص نقاب (Mask) پہن کر اس عظیم گورو کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں۔

دُوسرا مشہور فرقہ قدمپا ہے۔ اِسے بنگالی بودھ عالم آتیشا نے تبت میں قائم

کیا۔ وہ ۱۰۳۸ء میں تبت آئے اور چودہ برس بعد لہاسہ کے قریب فوت ہوئے۔ کہتے ہیں کہ چند لداخی لاموں نے تبت سے واپس آکر قدمپا کے فلسفے سے لداخیوں کو روشناس کیا۔ چند عالموں کے مطابق اُن دنوں لداخ کے لامایورو اور لیکیر گنپے اس فلسفہ کا سرچشمہ تھے۔ لداخی بودھ رینچن زنگپو بھی اسی مکتبۂ خیال کے ہم نوا تھے۔ آج کل لداخ میں اس فرقے کا کوئی گنپہ نہیں ہے۔ تاہم آتیشا کا نام ایک سرکردہ سنت کی حیثیت سے مذہبی حلقوں میں بڑے احترام سے لیا جاتا ہے اور بہت سارے گنپوں میں آتیشا کی مورتیاں اور تصویریں ہیں۔

لداخ میں کرگیوتپا سکول کا گہرا اثر پڑا اور اس سکول کے دو ذیلی فرقے ڈوگپا اور ڈیگونگپا کا یہاں غلبہ ہے۔ یہ سرخ فرقے سے وابستہ ہیں۔ لداخ کے چار بڑے گنپوں کے لامے ڈوگپا مکتبہء خیال کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ ہمس، چیمرے، انلے اور ستقنا گنپے ہیں جو سترھویں صدی میں راجہ سینگے نمگیل کے زمانے میں ڈوگپا عالم کوشوق ستق سنگ راسپا اوّل نے راجہ کی مالی امداد اور تعاون سے تعمیر کئے۔ ستق سنگ راسپا اوّل کو سینگے نمگیل کے والد راجہ جمیا نگ نمگیل نے لداخ مدعو کیا تھا۔ وہ ۱۵۶۷ء میں لداخ آئے۔ اُن کا اصلی نام نوانگ گیاژو ہے اور شمبھوناتھ کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔ ستق سنگ راسپا سنسکرت کے بڑے عالم تھے۔ سنسکرت اور مذہبی علوم اُنہوں نے ہندوستان میں قیام کے دوران حاصل کئے تھے۔

آواگون عقیدے کے مطابق اُن کے incarnate لامالداخ میں جنم لیتے آئے ہیں اور وہی ہمس گنپہ کے ہیڈ لامایا گوشوق منتخب ہوتے ہیں۔ اُن کی وفات پر وہ دوبارہ لداخ میں کسی مقام پر ستق سنگ راسپا کے رُوپ میں جنم لیتے ہیں۔ موجودہ ستق سنگ راسپا تبت میں ہیں۔

لداخ کے نمگیل خاندان کے راجے اس فرقہ پر مہربان تھے اور اُنہوں نے فراخ دلی سے اِس کی سرپرستی کی۔

ڈیگونکپا فرقہ کی نمائندگی لامایورو، پھیانگ، شاچوکل اور شنگ کے گنپے کرتے ہیں۔ لداخ میں اِس سکول کا بڑا نمائندہ توغدن کہلاتا ہے۔ وہ مذکورہ گنپوں کے بڑے لاما ہیں۔

کرگیوتپا سکول کے بانی تیلوپا (۹۹۸-۱۰۶۹ء) تھے۔ اُن کے ہونہار شاگرد ناروپا (۱۰۱۶-۱۱۰۰ء) نے اسے مارپا (۱۰۱۲-۱۰۹۶ء) تک پہنچایا۔ جنہوں نے تبت کو اِس سکول سے متعارف کیا۔ اوّل الذکر دو سنت ہندوستان سے تعلق رکھتے تھے۔ مارپا نے صوفی منش شاعر اور درویش صفت سنت میلا رسپا (۱۰۳۸-۱۱۲۲ء) کو زبانی یہ پیغام دیا۔ میلا رسپا نے گمپوپا (۱۰۷۹-۱۱۵۳ء) کو یہ فلسفہ دیا۔ گمپوپا کے بعد یہ فرقہ کئی فرقوں اور ذیلی فرقوں میں تقسیم ہوا۔ تاہم سارے فرقے لداخ میں یا تو نہیں پہنچے یا مقبولیت حاصل نہیں کر سکے۔

سسکیاپا سکول کا لداخ میں ایک ہی گنپہ ہے اور اس سکول کے پیروکاروں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ ماٹھو گنپہ کے لامے سسکیاپا سکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس گنپہ کی بنیاد دسویں صدی میں سسکیاپا عالم ترونگپا دورجے نے ڈالی تھی۔ شاہی سرپرستی نہ ملنے کی وجہ سے یہ سکول لداخ میں پھل پھول نہیں سکا۔ دُوسرے فرقوں کی طرح یہ مکتبۂ خیال بھی تبت سے یہاں پہنچا۔ اِس کے بانی کھون کھون گیالپو (۱۰۳۴-۱۱۰۲ء) تھے۔ سسکیاپا سکول تبت میں ۱۰۷۱ء میں وجود میں آیا۔

گیلُوگپا سکول: عام طور پر گیلوگپا کو زرد فرقہ کہا جاتا ہے۔ لداخ میں گیلوگپا کے پیروکاروں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ سپتیک، ٹھکسے، سنکر، ریزونگ، لیکیر، سمستن لینگ، دیسکیت، ستقمو اور زنسکار کے کئی گنپے اِس مکتبۂ خیال کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ژونکھاپا نے چودھویں صدی میں اِس سکول کو قائم کیا تھا۔ ''تاریخِ لداخ'' میں لکھا ہے کہ اُنہوں نے بذاتِ خود لداخی راجا ٹق پابوم دے کے ہاں اپنے دو نمائندے روانہ کئے تا کہ راجہ اس سکول کو لداخ میں مروّج کرے اور فروغ دے۔ راجہ نے وفد کا

خیر مقدم کیا اور سپتک گنپہ تعمیر کیا۔ ژونکھاپا کے ایک عقیدت مند اور سکالر شیرپ زنگپو نے یہاں اِس کی تبلیغ کی اور اچھی کامیابی حاصل کی۔ دلائی لاما گیلوگپا فرقہ کے سب سے بڑے رہنما ہیں اور بدھی ستواویلوکیتیشورا کی تجسیم ہیں۔

یہ مکتبہ خیال اصلاحی تحریک کی پیداوار تھا۔ لاموں میں نظم وضبط کا فقدان تھا اور اخلاقی گراوٹ آئی تھی۔ اس لئے یہ تحریک چلائی گئی۔

گیالواژونکھاپا نے لاموں کے لئے قواعد وضوابط مرتب کئے۔ نجی جائداد ممنوع قرار دی اور مراقبہ لازمی قرار دیا۔

لداخ میں ریزونگ گنپہ گیلوگپا کی ایک مثالی عبادت گاہ ہے۔ گنپہ کے بانی لاما ژھولٹیم نیما نے یہاں کے لاموں کے لئے چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھانے کی حد تعین کی۔ دُوسرے گنپوں کی طرح اِس گنپہ کے احاطہ میں شراب اور گوشت کا استعمال ممنوع ہے۔ اس گنپہ کے ساتھ بھکشونیوں کے لئے ایک قیام گاہ بھی ہے۔

دلائی لاما کے علاوہ پنچن لاما گیلوگپا فرقہ کے رہنما ہیں۔ لداخ میں سپتک گنپہ کے ہیڈ لاما بکولہ رینکبو چھے ریزونگ گنپہ کے ہیڈ لاما راس رینکبو چھے اور ٹھکسے گنپہ کے ہیڈ لاما خانپور رینکبو چھے اسی سکول سے تعلق رکھتے ہیں۔

لامے اپنا زیادہ تر وقت گنپوں میں گزارتے ہیں۔ گنپوں کے ساتھ لاموں کے لئے اِنفرادی اور نجی رہائش گاہیں بنی ہیں۔ اُن میں ان کی ضروریات کا محدود سامان ہوتا ہے۔ ایک کمرہ عبادت کے طور پر اِستعمال کیا جاتا ہے۔ ایک لاما کا دن پوجا سے شروع ہوتا ہے، جب وہ بدھ کی مورتی کے سامنے تین دفعہ سر بہ سجود ہوتا ہے اور نذرانے پیش کرتا ہے۔ دوپہر کے وقت وہ گنپہ کے بڑے ہال میں اجتماعی پوجا میں شریک ہوتا ہے اور وہیں کھانا کھاتا ہے۔ شام کو بھی اجتماعی پوجا میں شامل ہوتا ہے۔ ایک لاما کو گنپہ کے ضابطوں (MONASTIC RULES) پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ بدھ

تعلیمات کے مطابق وہ شادی نہیں کر سکتا۔ (اگرچہ کسی کسی فرقہ میں اس کی چھوٹ ہے) وہ ذاتی جائداد نہیں رکھ سکتا۔ بڑے مکان میں نہیں رہ سکتا۔ آرام دہ اُونچی مسند کا بستر اِستعمال نہیں کر سکتا۔ بھڑکیلی اور زرق برق پوشاک نہیں پہن سکتا۔ لمبے بال نہیں رکھ سکتا۔ ایسے جوتے نہیں پہن سکتا جن کے تلے میں کیلیں لگی ہوں تاکہ چلتے وقت کیڑے مکوڑوں یا کسی چھوٹے اور غیر مرئی جاندار کو زک نہ پہنچے۔ ماسوائے دھارمک رقص کے کوئی اور تفریحی ناچ پیش نہیں کر سکتا۔ اُس کی زندگی میں کوئی عیاشی اور اوباشی کا سامان اور گنجائش نہیں ہے۔ لامے اِن اصولوں پر عمل کرتے ہیں لیکن اِنفرادی زندگی میں ظاہری اور باطنی طور پر ایک لاما اِن اُصولوں اور ضابطوں پر خلوصِ دل سے کس حد تک عمل پیرا ہوتا ہے، وہ بہت حد تک اس پر انحصار رکھتا ہے۔

لاما کے علاوہ ایک چومو یا راہبہ کے لئے بھی ایسے ہی قاعدے اور ضابطے بنے ہیں۔

ایک لاما بننے کے لئے تین تربیتی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ نو آموز کو چن جُونگ کہا جاتا ہے۔ دُوسرا مرحلہ طے کرنے پر وہ گیژ ُول بنتا ہے اور گیلونگ مکمل لاما ہوتا ہے۔ ایک گیژ ُول کو گنپہ کے ۲۵۳ ضابطوں میں سے ۱۱۲ ضابطوں پر عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ اگر کوئی لاما دینیات میں ڈاکٹریٹ حاصل کرے، وہ گیشے کہلاتا ہے۔

لاموں کا فریضہ صرف گنپوں تک ہی محدود نہیں بلکہ عام بودھوں کی غمی خوشی میں بھی اُنہیں شریک ہونا پڑتا ہے۔ شادی بیاہ، کریا کرم وغیرہ میں مذہبی رسومات کی انجام دہی کے لئے اُن کی شمولیت ناگزیر ہے۔ پوجا پاٹ، بیج بوائی اور فصل کٹائی کے موقعوں پر بھی وہ اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

اُصولی اور نظریاتی طور ایک لاما کا مرتبہ راجہ سے بلند ہے۔ پہلے وہ عام بودھوں کے لئے جیوتش، طبیب اور رہنما تھے اور عام بودھ ہر قدم پر اُن کی رہبری حاصل کرتے تھے۔

لداخ کے کئی بڑے سنتوں کا اُوپر ذکر آچکا ہے۔ اُن میں رینچن زنگپو، ستق سنگ راسپا اور شیرپ زنگپو کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ کئی اور مشہور نام بھی ہیں۔ چھولٹیم نیماں انیسویں صدی کا ایک اور اہم نام ہے۔ اُنہوں نے مشہور گنپہ ریزونگ کی بنیاد ڈالی۔ وہ ایک عام شادی شدہ خوشحال تاجر تھے جو اپنے گہرے مطالعے اور مشاہدے سے متاثر ہو کر بھکشو بنے تھے۔ لداخ میں ایسی مثال شاذ ہی ملتی ہے۔ اُن کی خودنوشت سوانح حیات اُن کے عہد کی تاریخ پر بصیرت افروز روشنی ڈالتی ہے۔

ریزونگ گنپہ کے گُوشوق لبزانگ چھولٹیم سرکردہ شاعر اور قلم کار تھے۔ ان کے علاوہ اہم سنتوں اور عالموں میں چند اہم اور قابلِ ذکر نام پصقسپا شیرپ، وانگ پھیُوگ شیرپ، موجودہ راس رینگبو چھے، گیشے ایشے تنڈوپ، گُوشوق بکولا، گیشے لوبزانگ زوتپا اور یورو گنپہ کے لاما تنچگ ستزین ہیں۔

بودھ سکولوں (مکاتیبِ خیال) کے عظیم ترین (Supreme) مذہبی سربراہ ۱۹۵۹ء کے بعد تبت سے ہندوستان منتقل ہوئے ہیں۔ چودھویں دلائی لاما کے علاوہ اُن میں دُوسرے مذہبی مکاتیب کے سربراہوں نے لداخ کا دورہ کیا اور اُپدیش دیئے۔ اُن میں ڈوگپا کرگیوت کے بارھواں بُروگپا رینگبو چھے، سولھواں گیالواسکرماپا، سسکیاپا سکول کے سسکیا گونگما، ننیگماپا سکول کے ڈیچوم رینگبو چھے اور بُروگپا کرگیوت جنوبی سکول کے زھب تُونگ نوانگ نمگیل شامل ہیں۔ بُروگپا یا ڈوگپا کرگیوت جنوبی سکول بھوٹان میں مروّج ہے۔ لداخ میں ستقنا اور مُوت گنپے اِس سکول سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

تبت اور لداخ کی گذشتہ ایک ہزار سالہ تاریخ میں چھٹواں، ساتواں اور آٹھواں ڈوگچین رینگبو چھے کے بغیر کسی اور سکول کے سربراہ لداخ نہیں آئے۔ ایک مرتبہ سیتو پنچن رینگبو چھے لداخ کے ہمسایہ علاقہ مغربی تبت سے کیلاش یاترا کے لئے

گزرے۔لداخی راجہ ٹشی نمگیل نے بذات خود اُن سے ملاقات کی۔اُن کے ہمراہ اُن کی رانی اور والدین بھی تھے۔اُنہوں نے پنچن کو لداخ مدعو کیا تاہم پنچن نے معذوری کا اِظہار کیا۔

بکولا رینگبو چھے (اُنیسواں کوشوق بکولا) خنپو رینگبو چھے، توغدن رینگبو چھے
اور مُسلم رہنما شیخ جمال الدین مرحوم
(مضمون ''گنپے اور ستوپا'' ملاحظہ ہو)

گنپے اور ستوپا

گنپہ کا لفظی مطلب ''تنہائی کی جگہ'' ہے۔ اکثر گنپے آبادی سے دُور پہاڑ کی بلندیوں پر واقع ہیں اور اکثر گنپوں کے فنِ تعمیر اور اس کے آرٹ پر تبت کا اثر ہے۔ ماہرین کے مطابق تبت نے اپنا مخصوص سٹائل اپنانے سے پہلے گندھارا، متھر ا اور پالا سٹائیلوں کے علاوہ نیپال، ختن اور چین سے اثر لیا۔ گنپوں میں سونا اور قیمتی پتھروں کے کام والی چاندی، پیتل اور تانبے کی مورتیاں اور ستوپا ہیں۔ کمخواب اور زربفت میں ملفوف بدھ کے احکامات اور تعلیمات پر مبنی کنگیور کی ۱۰۸ جلدیں اور اُن کی تفاسیر اور تشریحات پر تنجور کی ۲۲۵ جلدیں ہیں۔ دیواروں پر مصوّری کے اعلیٰ نمونے اور پرانے گرانمایہ تھنکا (کپڑے پر پینٹنگ) ہیں۔

گنپہ مذہبی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز ہے اور یاترا کے لئے متبرک تیرتھ ہے۔

لداخ میں گنپوں کی ملکیت میں ریکارڈ کے مطابق ۶۵ ہزار کنال رقبہ زمین ہے۔ جس کی کاشت کے لئے کاشتکار رکھے گئے ہیں۔

لداخ میں سولہ بڑے گنپے ہیں۔ ہر گاؤں میں کم سے کم ایک چھوٹا گنپہ ضرور ہے۔

ایک بڑے گنپے میں چھوٹے بڑے اسمبلی ہال اور متعدد عبادت گاہیں ہیں۔ ایک بڑے گنپے کے سامنے ایک بڑا دالان ہے، جس میں سالانہ تیوہار پر چھمز یا مذہبی رقص ہوتا ہے۔

یہاں ہم لداخ کے چند بڑے گنپوں کا اِختصار سے تذکرہ کرتے ہیں:

لامایُورو گنپہ: لامایُورو گنپہ لداخ کا ایک قدیم ترین گنپہ ہے اور لیہہ سرینگر قومی شاہراہ پر لیہہ سے ۱۲۶ رکلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ روایت کے مطابق بدھ کے ایک سرکردہ چیلا انندا کے ایک شاگرد ارہٹ نیما گوں یہاں آئے تھے۔ اُنہوں نے پیش گوئی کی تھی کہ اِس جگہ ایک گنپہ بنے گا۔

گیارھویں صدی میں یہاں ناروپا آئے اور ایک گپھا میں گیان دھیان کیا۔ یہ گپھا آج بھی موجود ہے۔ ایک مقبول روایت یہ ہے کہ ناروپا نے لامایورو گنپہ کی بنیاد ڈالی تھی اور گنپہ میں ڈیگو نگ کرگیُوتپا فرقہ مروّج کیا۔ اِس سے پہلے گنپہ کے لامے قدمپا فرقہ کے پیروکار تھے۔

لداخی کلینڈر کے مطابق بودھی دُوسرے ماہ کی ۲۸ اور ۲۹ تاریخوں کو گنپہ کا سالانہ میلہ منعقد ہوتا ہے جو عموماً اپریل میں پڑتا ہے۔

لیکیر گنپہ: لداخی راجہ لہا چھن گیالپو نے ۱۰۶۵ء میں لیکیر گنپہ تعمیر کیا۔ گنپہ میں مقیم لاموں کی تعداد سو ہے۔ لیکیر گنپہ گیلوگپا فرقہ کی نمائندگی کرتا ہے، جس کے بانی تبت کے ایک بڑے رشی گیالوا ژونکھاپا تھے۔

یہ گنپہ لیہہ سے قریباً ۵۲ رکلو میٹر دُور لیہہ سرینگر قومی شاہراہ سے چند کلو میٹر دُور واقع ہے۔

لیکیر گنپہ میں سالانہ دھارمک تیوہار منایا جاتا ہے۔

ریزونگ گنپہ: ریزونگ گنپہ ۱۸۲۹ء میں لاما چھولٹیم نیماں نے تعمیر کیا تھا۔ موصوف سسپول گاؤں کے ایک کامیاب تاجر تھے اور پولو کے اچھے کھلاڑی تھے۔ اُنہوں نے ایک خوشحال گھریلو زندگی کیسے چھوڑی اور کیونکر راہب بنے؟ اِس کے پس پشت ایک دِلچسپ واقعہ ہے۔

ایک روز اُنہوں نے ایک پیڑ پر ایک پرندے کے بچے کو دیکھا۔ اُنہوں نے سوچا جب یہ بے بال و پر نرم و نازک کمزور پرندہ مطمئن رہ سکتا ہے تو وہ گھر بار کو خیر باد کر

کے بھکشو کیوں نہیں بن سکتا؟ چنانچہ اُنہوں نے اپنا گھر بار، بیوی بچہ چھوڑ دیا اور لاما بن گئے۔ بعد میں اُنہوں نے ریزونگ گنپہ تعمیر کیا۔

اُنہوں نے گنپہ کے لاموں کے لئے کڑے ضابطے بنائے۔ گنپہ کے احاطے میں گوشت، تمباکو اور شراب کا استعمال ممنوع قرار دیا۔

یہ گنپہ بھی لیہہ سرینگر شاہراہ سے پانچ کلومیٹر دُور ایک گھاٹی میں پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ اِس گنپے کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ایک بڑی تصویر پہاڑ پر آویزاں کی گئی ہے۔

یہاں ایک راہبہ خانہ بھی ہے۔

سُپتیک گنپہ: سُپتیک گنپہ لداخ کے مشہور ترین گنپوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ لیہہ سے سات کلومیٹر کے فاصلے پر ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ گیارھویں صدی میں یہاں ایک گنپہ تعمیر کیا گیا۔ تب اِس گنپہ کے لامے قدمپا سکول سے تعلق رکھتے تھے۔ اِس سکول کے بانی دیپانگرا آتیشا تھے، جو بنگال سے تعلق رکھتے تھے۔

لامانوانگ لوٹوس نے موجودہ گنپہ تعمیر کیا اور یہ گیلوگپا مکتبۂ خیال کا ترجمان بنا۔ سُپتیک گنپہ میں مہاتما بدھ کا ایک بڑا بُت ہے۔ اِس کے شکم میں امی تایُوس بدھ کی اِنسانی اُنگلی برابر ایک چھوٹی سی مورتی ہے جسے ریفارمر ژونکھاپا نے پندرھویں صدی میں لداخی راجہ ٹقپا بوم دے کو بھیجی تھی۔ امی تایُوس دھیانی بدھ ایتابھا کے پائے کا بدھ ہے۔

گنپہ سے سولاما وابستہ ہیں۔

ٹھکسے گنپہ: ٹھکسے گنپہ گیلوگپا (زرد) فرقے کا ایک اہم گنپہ ہے۔ یہ لیہہ سے ۱۹ رکلومیٹر دُور ٹھکسے گاؤں میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر ہے۔ گنپہ کی عالیشان عمارت کے نیچے گنپہ میں مقیم لاموں کے حجرے ہیں جن کی تعداد ۸۰ ہے۔ گیلوگپا اصلاحی تحریک کی پیداوار تھا کیونکہ لاموں میں نظم وضبط نہیں رہا تھا۔

ٹھکسے گنپہ پندرھویں صدی کے وسطہ میں تعمیر ہوا۔ شروع میں اسمبلی ہال تعمیر کیا گیا۔ دریائے سندھ گنپہ کے پاس بہتا ہے۔ صدیوں پہلے ژونکھاپا نے کہا تھا:

"دریائے سندھ کے دائیں کنارے میری تعلیمات پھیلیں پھولیں گی۔"

اِس پیشن گوئی کی روشنی میں ژونکھاپا کے ایک چیلے شیرپ زنگپو نے ٹھکسے کے پاس ایک گنپہ تعمیر کیا اور ان کے بھتیجے نے ٹھکسے گنپہ کی بنیاد ڈالی اور بھکشو سنگھا قائم کیا۔

ٹھکسے گنپہ میں دُوسرے بڑے گنپوں کی طرح سالانہ دوروزہ میلہ لگتا ہے۔ اِس موقعے پر ایک کاہن Oracle کا ظہور ہوتا ہے اور وہ مستقبل سے متعلق لوگوں کے سوالات کا جواب دیتا ہے۔

گنپہ میں ایک سکول ہے جہاں نوآموز اور نوعمر لاموں کو مذہبی تعلیم کے علاوہ مروّجہ تعلیم دی جاتی ہے۔ خانپور ینگبو چھے گنپہ کے بڑے لاما ہیں۔

ہمس گنپہ: ہمس گنپہ لداخ کا سب سے مشہور، متموّل اور بڑا گنپہ ہے۔ اس گنپہ سے وابستہ لاموں کی تعداد ۵۰۰ بتائی جاتی ہے۔ جوڈوگپا کرگیوت سکول کے پیروکار ہیں۔ یہ کرگیوت فرقہ کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ تیرھویں صدی میں ایک بڑے یوگی اونپودورجے تبت سے لداخ آئے اور اُنہوں نے خطّے میں ڈوگپا کرگیوت سکول رائج کیا۔ عرفِ عام میں اِسے سرخ فرقہ کہا جاتا ہے۔

ہمس گنپہ کی تعمیر ۱۶۲۷ء کے آس پاس عمل میں آئی۔ گُوشوق ستق سنگ راسپا اوّل اِس کے بانی تھے۔

گنپہ لیہہ سے ۴۳ رکلومیٹر دُور ایک پہاڑی کے پیچھے ایک پُر فضا گھاٹی میں واقع ہے۔

ہمس گنپہ کے لئے گورو پدما سمبھاوا کی شخصیت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ گنپہ میں اُن کا ایک بڑا ابت ہے اور ہر بارھویں سال اُن کی ایک بڑی تصویر کی نمائش کی جاتی ہے جو ایک بڑے تھنکا پر بنی ہے۔ گنپہ کا میلہ بڑے گورو کے جنم دن پر منایا

جاتا ہے۔ پدما سمبھاوا برِصغیر ہند میں سوات کے مقام پر پیدا ہوئے تھے۔ گورولداخ بھی آئے تھے۔ یہ آٹھویں یا نویں صدی کی بات ہے۔

گنپہ میں تین بڑے اسمبلی ہال اور متعدد عبادت گاہیں ہیں۔

شے گنپہ: شے میں دو گنپے ہیں۔ پرانا گنپہ لداخی حکمران سینگے نمگیل نے سترھویں صدی کے پہلے نصف میں تعمیر کیا اور مہا تما بدھ کا تین منزلہ ایک بت نصب کیا۔ اس کے دونوں طرف بدھ کے سولہ ارہٹوں کی تصاویر ہیں۔

گنپہ میں آتیشا کی تصویر ہے۔ آچاریہ دیپانکارا آتیشا ۸۱۲ء میں موجودہ بنگلہ دیش میں ساہور کے مقام پر ایک شاہی خاندان میں پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں اُنہوں نے گیروا لباس پہنا اور وکرم سیلا یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور اپنی علمیت کی وجہ سے وکرم سیلا وہار کے سربراہ اور پیشوا بنے۔ وہ تبت بھی آئے اور قدمپا فرقہ کی بنیاد ڈالی۔

دُوسرا گنپہ سینگے نمگیل کے بیٹے راجہ دیلدن نمگیل نے تعمیر کیا۔ یہ گنپہ تانبے سے بنے ہوئے مہاتما بدھ کے اُس عظیم مجسمہ کے لئے مشہور ہے جسے دیلدن نمگیل نے سترھویں صدی میں اپنے والد کی آتما کو ثواب پہنچانے کے لئے نصب کیا۔ اس پر سونے کا ملّمع چڑھایا گیا ہے اور قیمتی پتھر جڑے گئے ہیں۔ اس ۴۰ فٹ بلند مجسمہ کو بنانے کے لئے راجہ نے نیپال کے چند کاریگروں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ بت کے سامنے ایک بڑا شمع دان ہمیشہ فروزاں رہتا ہے۔ اِس کا تیل پورا ایک سال چلتا ہے۔ چاندی کے بنے اس شمع دان پر فیروزے جڑے ہوئے ہیں۔

گنپہ کے پاس راجہ کا گرمائی محل ہے۔

نمگیل ژیمو: لیہہ آنے والا ہر سیلانی اور ہر اجنبی کی پہلی نظر پہاڑی کی بلندی پر واقع دو پرانی عمارتوں پر پڑتی ہے۔ چوٹی پر واقع عمارت محل اور متصلہ عمارت گنپہ ہے اور نمگیل ژیمو کہلاتا ہے۔ یہ محل سترھویں صدی کے پہلے ربع تک لداخ

کے راجوں کا مسکن تھا۔

نمکیل ژیمو کا مطلب ''فاتحانہ چوٹی'' ہے۔ ترکوں کے ساتھ ایک لڑائی میں فتح پانے کے بعد سولہویں صدی میں ایک لداخی راجہ ٹشی نمکیل نے یہ نام اختیار کیا تھا اور مفتوح فوج کی لاشیں مہا کالا کے بت کے نیچے دفنائی گئی تھیں۔ اسی راجہ نے گنپہ تعمیر کیا تھا۔ مورتیوں کو کپڑوں میں چھپایا گیا ہے۔ بانجھ عورتیں اپنی مراد کی برآوری کے لئے دھرم پالا مہا کالا کو نذرانہ چڑھاتی ہیں۔ یہاں ایک دُنیاوی نادر تصویر بھی ہے جواب دُھندلی ہوگئی ہے۔ اِس میں راجہ ٹشی نمکیل کے دربار کا منظر پیش کیا گیا ہے۔

محل اور گنپہ کے نیچے ایک اور پرانا گنپہ ہے جو سرخ گنپہ کے نام سے مشہور ہے۔ اسے پندرھویں صدی میں راجہ ٹق پابوم دے نے تعمیر کیا تھا۔ اس میں مستقبل کے بدھ میتریا کا تین منزلہ بلند بت ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں دھرم چکر اور بائیں ہاتھ میں برتن ہے۔

ٹق تق گنپہ: ٹق تق گنپہ لیہہ سے ۵۳ رکلومیٹر کے فاصلے پر ساکٹی گاؤں میں واقع ہے۔ گنپہ کی چھت اور دیواریں چٹان تراش کر بنائی گئی ہیں۔ اس لئے اس کا نام ٹق تق یا ''چٹان کی چھت'' پڑا ہے۔ اِسی بناء پر اس محلے کو ٹق تق کہتے ہیں۔

ٹق تق گنپہ تبت کے سب سے قدیم فرقہ ننگما پا سے تعلق رکھتا ہے اور لداخ میں یہ واحد گنپہ ہے جو اس فرقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس فرقے کی بنیاد تانترک کے ماہر استاد پدما سمبھوا نے ڈالی تھی۔

ننگما پا فرقہ لداخ دیر سے پہنچا۔ سولہویں صدی میں تبت کے کھم صوبہ سے چھوانگ نربو نام کے ایک رشی لداخ آئے۔ اُنھوں نے پدما سمبھوا کی تعلیمات سے لوگوں کو رُوشناس کیا اور ننگما پا فرقہ کی بنیاد ڈالی اور سولہویں صدی کے دُوسرے نصف میں ٹق تق گنپہ بنا۔

گنپہ کے قریب ہموار زمین پر نیا گنپہ تعمیر کیا گیا ہے۔ دلائی لامانے ۱۹۸۰ء

میں رسمی طور اس کی تقدیس کی اور ننیگما پا مکتبۂ فکر کے نام اِسے وقف کیا۔

پھیانگ گنپہ: پھیانگ گنپہ پونے پانچ سو سال پرانا ہے۔ لداخ کے عام گنپوں کی طرح اِس کے تقدس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اِسے ایک پہاڑی پر تعمیر کیا گیا ہے۔

پھیانگ گنپہ سرخ فرقہ کے ڈیگونگ مکتبۂ خیال کا ترجمان ہے اور لداخ میں اس سکول کا پہلا گنپہ ہے۔ یہ جگہ ڈیگونگ فرقہ کے ایک بڑے لاما چھورجے ڈنما کونگا نے اِنتخاب کی تھی۔ گنپے کا نام ٹشی چھوزنگ یا ''زندہ جاوید پوتر دھرم'' رکھا گیا لیکن یہ پھیانگ گنپہ کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔ توغدن رینگبو چھے گنپہ کے بڑے لاما ہیں۔

اِس گنپہ میں ستر لامے ہیں جن کے لئے گنپہ کے آس پاس کئی اقامت گاہیں بنی ہوئی ہیں۔

پھیانگ گنپہ کے دالان میں ایک اُونچے کھمبے پر ایک دھارمک جھنڈا لہراتا ہے۔ اس سے متعلق لداخ کی تاریخ بتاتی ہے کہ جو مجرم فرار ہو کر یہاں تک آنے میں کامیاب ہو جاتا تو اُس کو جرم اور سزا سے بری کر دیا جاتا تھا۔

پھیانگ گنپہ لیہہ سے ۱۷ر کلومیٹر کے فاصلے پر لیہہ سرینگر شاہراہ سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

ماٹھو گنپہ: ماٹھو گاؤں لیہہ کے جنوب میں ۲۶ر کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ گنپہ گاؤں کے کنارے ایک بلند و بالا پہاڑ پر تعمیر کیا گیا ہے' جہاں تک گاڑیوں کی آمد و رفت کے لئے سڑک جاتی ہے۔ یہ تاریخی گنپہ لداخ میں سسکیا پا فرقہ کا واحد گنپہ ہے۔

ماٹھو کا اصلی نام مانگٹو ہے' جس کا مطلب خوشیوں کی بہتات ہے۔

ماٹھو گنپہ آج سے لگ بھگ پانچ سو سال پہلے لاما ڈونگپا دورجے نے تعمیر کیا

تھا۔ اُن دنوں مرکزی اور مشرقی تبت میں سسکیا لاما پھقسپا کی حکومت تھی۔ تب لداخ کا راجہ لوٹوس چھوغدن تھا۔ پچھلے پانچ سو سال کے دوران گنپہ میں کئی دفعہ توسیع اور مرمت ہوئی ہے۔

گنپہ کے ساتھ ساٹھ لامے منسلک ہیں۔ دُوسرے بڑے گنپوں کی طرح ماٹھو گنپہ میں کوشوق یا بڑے لاما نہیں ہیں۔

ماٹھو کا تیوہار لہا یا Oracles کے لئے مشہور ہے۔ دو oracles (کاہن) وجد کے عالم میں انفرادی، اجتماعی، علاقائی اور عالمی مسائل پر پیش گوئی کرتے ہیں۔ لہا کا کردار دو لاما ادا کرتے ہیں۔ تیوہار سے پہلے یہ گوشہ نشینی میں دو ماہ کے لئے گیان دھیان کرتے ہیں۔

دیسکیت گنپہ: دیسکیت گنپہ نوبراہ کا سب سے بڑا گنپہ ہے۔ یہ وادی نوبراہ کے صدر مقام دیسکیت میں واقع ہے۔ شیسرپ زنگپو نے ۱۴۲۰ء میں اس کی اساس ڈالی تھی۔ خنپو رینگبو چھے اِس گنپہ کے بڑے لاما ہیں اور تقریباً سو لاما اس گنپہ سے وابستہ ہیں۔

کرشا گنپہ: کرشا گنپہ زنسکار کا سب سے بڑا گنپہ ہے۔ مترجم پھقسپا شیرپ نے اِس کو تعمیر کیا۔ موجودہ گنپہ دورجے شیسرپ کا کام ہے۔ گنپہ میں سو سے زیادہ لاما سکونت پذیر ہیں اور گیلوگپا سکول کے پیروکار ہیں۔ دُوسرے بڑے گنپوں کی طرح یہاں سالانہ تیوہار منعقد ہوتا ہے۔

اِس کے علاوہ زنسکار کے بڑے گنپوں میں باردن، ستونگدے اور رنگدُوم شامل ہیں۔

الچی چھوسکور: الچی چھوسکور یا وہار ہموار زمین پر تعمیر کیا گیا ہے اور اس کی بنیاد دسویں صدی میں مشہور مترجم لوژاوا رنیچن زنگپو نے ڈالی تھی۔ بعد میں نئی عبادت گاہوں کا اضافہ کیا گیا۔ الچی وہار رنیچن لہا کھنگ (دیوتا گھر) لوژا لھا کھنگ، منجوشری

مندر اور سوم ژق لہا کھنگ پر مشتمل ہے۔ لاکھنگ سوما تیرھویں صدی میں تعمیر کیا گیا۔ دُوکھنگ غلدن شیرپ کا کام ہے۔ اُنہوں نے قلعہ اور پل بھی تعمیر کیئے۔

الچی وہار کی مصوّری اور چوب تراشی پر کشمیر کا اثر ہے۔ لوڑاوا نے اپنے ساتھ کشمیر سے چوب تراش، مصوّر اور کاریگر لائے تھے۔

الچی وہار کے پاس رینچن زنگپو کا لگایا ہوا ایک پیپل کا درخت ہے۔ وہار کے ستوپا میں رینچن زنگپو کے علاوہ، اُن کے اُستاد اور اُن کے ساتھی پنڈتوں کی شبیہیں بھی بنائی گئی ہیں۔ یہ اُن کی خدمات کے اعتراف میں بنائی گئی لگتی ہیں۔

الچی وہار کو عالمی سطح کی ایک تاریخی یادگار کی افادیت حاصل ہے۔ ہر سال ہزاروں ملکی اور غیر ملکی سیاح اِسے دیکھنے آتے ہیں۔

ستسقنا گنپہ: ستسقنا گنپہ لیہہ سے ۲۵ رکلومیٹر دُور ہے۔ گنپہ تبت کے بڑے سکالر اور رشی چھوسجے جمیا نگ پالکھر سے منسوب ہے۔ اُنہیں ۱۵۸۰ء میں لداخی راجہ جمیا نگ نمگیل نے لداخ مدعو کیا تھا۔ گنپہ میں اویلو کیتیشورا کی ایک نادر مورتی ہے۔

ستسقنا ٹولکوُ گنپہ کے ہیڈ لاما ہیں۔

لداخ کے جن چند گنپوں کو محکمہ آثارِ قدیمہ نے بطور قومی یادگار اپنی تحویل میں لیا ہے اُن میں الچی وہار، لیہہ کے ژیمو گنپہ اور سرخ گنپہ، شے گنپہ اور ہمس گنپہ شامل ہیں۔ ہزاروں ملکی اور غیر ملکی سیاح ہر سال لداخ کے گنپوں کے دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ خاص کر الچی وہار، ٹھکسے، سپتیک، ہمس، شے اور ژیمو گنپوں میں سیاحوں کے لئے بڑی کشش اور دِلکشی ہے۔

خطّے میں چند تاریخی اور اہم ستوپا ہیں جن میں شانتی ستوپا، تی سورو اور ٹشی گومانگس ستوپا قابلِ ذکر ہیں۔

شانتی ستوپا لیہہ کے ایک پہاڑ کی بلندی پر واقعہ ہے۔ اِس میں بدھ کے

تبرکات محفوظ رکھے گئے ہیں اور بودھوں کا ایک اہم تیرتھ ہے۔

شانتی ستوپا کی تعمیر عالمی شہرت کے جاپانی بھکشو فوجی گوروجی نے لداخی بودھوں کے تعاون سے اگست ۱۹۹۱ء میں مکمل کی۔ ستوپا ایک نیم کھلا پدما پھول کی شکل پیش کرتا ہے۔ بدھ دھرم اور ہندومت دونوں میں پدما پھول مقدس سمجھا جاتا ہے۔

ستوپا کی دیواروں پر بدھ کے جنم، نروان اور راکھشسوں کی شکست کو شبیہوں میں اُجاگر کیا گیا ہے۔ حال میں دیواروں پرنئی دھارمک تصاویر بنائی گئی ہیں۔

ستوپا تک ایک سڑک جاتی ہے۔ گرمیوں میں خاص کر یہاں سیاحوں اور یاتریوں کا بڑا جمگھٹا رہتا ہے۔ لداخ آنے والا ہر سیاح ایک دفعہ ضرور شانتی ستوپا جاتا ہے۔ شانتی ستوپا سے لیہہ قصبے کا بڑا حصہ پورے حسن و جمال کے ساتھ نظر آتا ہے۔ نیز یہ لیہہ اور اس کے گردونواح کا بڑا دلکش اور حیرت انگیز نظارہ پیش کرتا ہے۔ شمال کی جانب ساڑھے اٹھارہ ہزار فٹ بلند خردونگ کی برفانی چوٹی نظر آتی ہے اور جنوب کی طرف زنسکار سلسلہ ہائے کوہ کی تین برفانی چوٹیاں نظر آتی ہیں جن کی بلندیاں ۱۸۰۰۰ سے ۲۱۰۰۰ فٹ کے درمیان ہیں۔ اِن کے آگے نشیبی وادی میں دریائے سندھ بہتا نظر آتا ہے۔

شانتی ستوپا پر ایک چھوٹا سا گنپہ بھی ہے جس میں ایک جاپانی دیوتا نیچی رین کی ایک مورتی ہے۔

یہاں سیاحوں کے لئے ایک ریستوران اور رہائشی کمرے بنے ہیں۔

تی سُورُو ستوپا: لیہہ قصبہ میں واقع تی سُورُو لداخ کا سب سے بڑا اور اُونچا ستوپا ہے۔ اِس کی بلندی ۵۵۰ فٹ ہے۔ تی سُورُو لداخی الفاظ ''ٹیگوسیرو'' کا بگڑا ہوا نام ہے جس کا مطلب زرد خچر ہے۔ اِس مقام پر خچر کی شکل کی زرد رنگ کی ایک بڑی چٹان تھی۔ روایت کے مطابق ایک مرتبہ ایک لداخی رانی کی نظر چٹان پر پڑی اور بیمار ہوگئی۔ چنانچہ اِس چٹان کو منحوس قرار دیا گیا اور اِس کے اُوپر ستوپا تعمیر کیا گیا۔ اور اس کا

نام ٹشی اوتسل ،''امر روشن'' رکھا گیا لیکن یہ مقام تی سُورُو کے نام سے زبانِ زد عام ہوا تھا۔ اِس لئے نیا نام مقبول نہیں ہوسکا۔ ایک اور روایت کے مطابق اِس میں ایک جن قید ہے جس نے تب لیہہ میں دہشت پھیلائی تھی۔

لداخی راجہ ٹق پا بوم دے نے چودھویں صدی کے آخر یا پندرھویں صدی کے آغاز میں اِسے تعمیر کیا تھا۔ زمانہ کے ہاتھوں اب یہ کئی جگھوں سے منہدم ہوگیا ہے اور آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے ایک قومی یادگار کی حیثیت سے اِسے اپنی تحویل میں لیا ہے اور جزوی طور اس کی تعمیر وتجدید کی ہے۔

اِس کا نچلا ڈھانچا گول ہے۔ اِس کے چاروں طرف داخلہ کے لئے دروازے بنے تھے۔ جن میں اُوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی تھیں۔ گول ڈھانچا کے اُوپر تین طبقہ دار چبوترے بنے ہیں۔ اِس کے بالائی حصے پر گنبد نما ڈھانچہ تھا اور ستوپا میں روایت کے مطابق ۱۰۸ حجرے تھے۔ ۱۰۸ کا ہندسہ بودھوں میں متبرک سمجھا جاتا ہے۔

ستوپا کو لداخی میں چھورتن کہا جاتا ہے۔ یہ ثواب، خوشحالی اور ترقی کے لئے تعمیر کیا جاتا ہے۔ لداخ میں مہاراجہ اشوک اور کنشک کے دور سے وابستہ قدیم ستوپا ہیں۔ دسویں صدی میں لوڑا اور نیچن زنگپو نے متعدد ستوپا تعمیر کئے تھے۔

ستوپا بودھ دھرم کی پہچان ہے۔ بدھ نے ستوپا بنانا قبول کیا ہے۔ اس کی آٹھ قسمیں بتائی گئی ہیں۔ ستوپا کا اپنا فلسفہ ہے۔ اِس کے زیریں چار طبقے خوش اخلاقی، گیان دھیان، دانائی اور مدھامیکا کو اُجاگر کرتے ہیں۔

بالائی حصے میں ستوپا کا کلس ہوتا ہے۔ اِس میں بتدریج دس درجوں کی نشان دہی کی گئی ہے، جو بدھی ستو کا مرتبہ حاصل کرنے کی دس پوڑیوں کی علامتیں ہیں۔ ستوپا کے سب سے اُوپری سرے پر ہلال بنا ہوتا ہے۔ ہلال نے اپنی قوس میں سورج کو لیا ہے۔ اِس کے اُوپر چھاتا سا ہے یہی ستوپا کی معراج ہے اور آخری اور حتمی نصب العین

کی شناخت ہے۔

ستوپا کے ڈھانچے کی اور وضاحتیں بھی دی گئی ہیں۔ سب سے زیریں مستطیل چبوترہ دھرتی بتایا گیا ہے۔ اِس کے اُوپر گلوب جیسا حصہ پانی کی علامت ہے۔ تکونی رُوپ کا کلس آگ کی نشانی ہے۔ ہلال جیسا بالائی حصہ پانی کو ظاہر کرتا ہے اور بتدریج پتلا ہوتا ہوا شعلہ نما سرا ایتھر کی نشان دہی کرتا ہے۔ اِس طرح ایک ستوپا پانچ اہم عناصر کی ترجمانی کرتا ہے۔

ٹشی گومانگس ستوپا: لداخ کا ایک اور اہم ستوپا ٹشی گومانگس ستوپا ہے۔ یہ لیہہ کے ایک محلّہ چنکسپا میں واقع ہے۔ اِس پر دروازہ نما محرابیں بنی ہیں۔ اِس لئے اِس کا نام ٹشی گومانگس چھورتین یعنی متعدد دروازوں والا نیک شگون ستوپا پڑا ہے۔ ایک تاریخ دان کا خیال ہے کہ جہاں محرابیں بنی ہیں وہاں کبھی مورتیاں ہونی چاہئیں۔

بڑے ستوپا کے گرد ایک سو آٹھ چھوٹے ستوپا ہیں۔

ٹش گومانگس ستوپا چھ منزلوں تک پتھروں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کے چاروں طرف تین چھوٹے چھوٹے دروازے یا محرابیں ہیں۔ جن میں درمیانی محراب تنک آنگنوں کی سمت میں واقع ہے۔ نچلی منزلوں کی دیواروں کے عقب میں ایک راستہ ہے اور مستحکم اور مضبوط چبوترہ ہے۔

یورپیوں نے ٹشی گومانگس ستوپا کو King's stupa یعنی ''شاہی ستوپا'' کے نام سے یاد کیا ہے۔

ستوپا کے اِردگرد مکانات بنے ہیں۔ ماضی میں یہ کھلی جگہ پر ہونا چاہئے۔ اس کی قدامت سے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ فرانکی کا خیال ہے کہ اِسے ہزار سال اور ڈھائی ہزار سال کے درمیان مون یا درد لوگوں نے بنایا ہے۔ تاہم عام خیال یہ ہے کم سے کم پندرھویں صدی سے پہلے کا بنا ہوا ہے۔

اِسی نوعیت کا ایک ستوپا شے گاؤں میں ہے جو چالُونگ خاشور کے نام سے

جانا جاتا ہے۔ اِس سے متعلق یہ دلچسپ روایت ہے کہ اسے سترھویں صدی میں منگول حملہ آوروں نے ایک چشمے کے اُوپر تعمیر کیا تھا۔ جس کے پانی میں یہ تاثیر تھی کہ اسے پی کر اِنسان رُستم اور پہلوان بن جاتا تھا۔ منگول نہیں چاہتے تھے کہ لداخ میں رُستم یا پہلوان کا جنم ہو۔

کسی کسی ستوپا سے منسلک منے دیوار Mane-wall ہوتی ہے۔ لیہہ میں ایسی دو بڑی منے دیواریں ہیں۔ ایک کو سترھویں صدی میں لداخی راجہ دیلدن نمگیل نے اپنی ماں سکلزانگ رولما کی یاد میں تعمیر کیا تھا۔ اِس کی لمبائی ۱۹۳۲ فٹ ہے۔ اُونچائی چھ سے سات اعشاریہ آٹھ فٹ ہے۔ اِس کے ساتھ دُوسری منے دیوار ہے۔ اسے اٹھارویں صدی میں راجہ چھیتن نمگیل نے راجہ چھوانگ نمگیل کی آتما کے ثواب کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ اِس کی لمبائی ۳۵۰ قدم ہے۔ ان دونوں منے دیواروں کے اُوپر منتر، دُعائیں اور بدھ، بدھی ستوؤں وغیرہ کی شبیہیں تراشی گئی ہزاروں سلیں اور چپٹے پتھر ہیں۔ ماضی میں لداخی بودھ گوناگوں مرادوں کے ساتھ یہ پتھر تراش کر منے پر چڑھاتے تھے۔ لداخ کو سیاحت کے لئے کھولنے کے بعد منے دیواروں سے بہت ساری سلیں غائب ہوئیں ہیں۔

جہاں گنپوں، ستوپاؤں اور منے دیواروں کا تذکرہ ہوا، وہاں لیہہ کے تاریخی محل کا ذِکر بے جا نہ ہوگا۔ محل جو لداخ میں لھاچھن سپالکھر کے نام سے جانا جاتا ہے، سترھویں صدی کے پہلے نصف میں تعمیر ہوا۔ اِس کی تکمیل میں تین سال لگے۔ اس کے لئے پتھر فیانگ کے ایک کھنڈر کے علاوہ شے اور ٹھکسے سے لائے گئے۔ مٹی لیہہ قدموچھے، عمارتی لکڑی الم تیلا، چھت کے لئے کڑیاں نوبراہ اور پلستر کے لئے مٹی چھشوت سے لائی گئی۔ روایت کے مطابق ہزاروں لوگوں نے قطار میں رہ کر مٹی اور پتھر ڈھوئے۔ اِس کا بڑا معمار شینکن ژندن تھا، جو بلتستان کا رہنے والا تھا۔

اِس نومنزلہ اُونچے محل میں دیوانِ عام اور دیوانِ خاص کے علاوہ لگ بھگ سو

کمرے ہیں۔ جن کی عمومی حالت خستہ ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ نے اسے اپنی تحویل میں لیا ہے اور اس کی تجدید اور مرمت کے لئے کام کر رہا ہے۔ آج کا محل مکین کے بغیر سُونا سُونا لگتا ہے۔

لداخ آنے والے اکثر غیر ملکیوں نے اپنی کتابوں اور سفر ناموں میں محل کا ذِکر کیا ہے اور بہتوں نے اِس کی تصویر شائع کی ہے۔ محل لیہہ قصبے کی شان ہے اور اس کے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ ۱۸۹۴ء میں ایک انگریز ADAIR نے لکھا ہے: ''لیہہ محل قدیم مصر کا مندر pylon کی شکل کا نظر آتا ہے۔''

ایک رُوسی سیاح فلپ یاف رے موف نے اسے ''چھوٹا پوتالا'' کہا ہے۔

محل کے بڑے دروازے سے داخل ہونے پر تیسری منزل میں پہنچتا ہے۔ چوتھی منزل کے ایک کمرے میں تارا دیوی کی مورتی اور ساتھ سرکاری دفاتر ہیں۔ پانچویں منزل میں دیوانِ عام، چھٹی منزل میں شاہی خاندان کی قیام گاہیں، ساتویں منزل کے ایک خاص کمرے میں گیالپو کا تخت، آٹھویں منزل میں سات کمرے اور نویں منزل میں پوجا گھر ہے۔ نچلی منزلوں میں نوکروں کی رہائش گاہیں اور سامان اور اشیائے خوردنی رکھنے کے لئے گودام اور سٹور ہیں۔ ماضی میں محل میں شاہی خاندان کے علاوہ چند مہینوں کے لئے وزراء، گورنر اور ساٹھ عوامی نمائندے قیام کرتے تھے۔ تب محل سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہاں رقص و سرور کی محفلیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔

ایک غیر مُلکی مبصر نیل ہاورڈ نے محل پر یوں تبصرہ کیا ہے: ''محل کی متناسب دِل آویز سادگی، کاریگرانہ مہارت کا نہایت ہی عمدہ میعار، اس کی دیواروں کا اُبھرا ہوا تناسب، اسے ایک دِلنشیں وقار بخشتا ہے۔ جس کی نظیر پوتالا کے بغیر تبت کی کسی عمارت میں نہیں ملتی۔'' ہاورڈ نے اِس کی بڑی ڈیوڑھی کو لداخی آرٹ کا ایک شاہکار بتایا ہے۔ اِس کے اُوپر لکڑی کے تین شیر بنے ہوئے ہیں۔

لداخ میں موراوین مشنری

کی علمی وسماجی خدمات

لیہہ کے ننگے پہاڑوں اور فضاؤں میں صدیوں سے سنکھ اوراذان کی صدائیں بلند ہوتی رہی ہیں۔ آج سے ایک سوبیس سال پہلے اِس صدا میں ایک گھنٹی کی ٹنٹناہٹ کا اضافہ ہوا۔ گھنٹی کی یہ آواز عیسائی کلیسا کی تھی۔ ۱۸۸۵ء میں لیہہ میں موراوین مشن کی شاخ قائم ہوئی اور اِس کے ایک سال بعد ۱۸۸۶ء میں ایک خوبصورت گرجا گھر تعمیر ہوا۔ چند سال بعد لداخ کے دو دیہات شے اور خلسے میں گرجے تعمیر کئے گئے۔

شروع میں موراوین مشن کے اکثر پادری جرمنی سے تعلق رکھتے تھے۔ مسیحی مشنری کا نصب العین عیسائیت کی تبلیغ ہے۔ اِس مقصد کے تحت لیہہ میں موراوین مشن قائم ہوا۔ مشن کے جفاکش اور مہم جُو پادری تبلیغی کام کے ساتھ علمی اور سماجی خدمات سرانجام دیتے تھے۔ اکثر پادری عالم، محقق اور فنونِ لطیفہ کے شیدائی تھے۔

تبلیغی میدان میں اُنہیں لداخ میں معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ تاہم علمی، سائنسی اور تحقیقی میدانوں میں اُن کے کارناموں اور خدمات کی صدائے بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ اے. ایچ. فرانکی کی لداخ پر لکھی تاریخی کتابیں اور تحقیقی مقالے آج بھی لداخ کی تاریخ، کلچر، ادب اور فنون پر کلیدی ماخذ ہیں اور لداخ کی تمام تاریخی تصنیفات پر اُن کا براہِ راست یا بالواسطہ اثر پڑا ہے۔ ایچ. اے. یشکے (Heinrich August Jacschke) کی تبتی، انگریزی لغت آج بھی اِس موضوع پر ایک مستند

تصنیف ہے اور آج بھی متعلقہ علمی حلقوں میں اِس سے اِستفادہ کیا جاتا ہے۔

مشن نے لداخ میں پہلا اخبار نکالا جو ریاست سے نکلنے والا دُوسرا سب سے پُرانا اخبار ہے۔ لداخیوں کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کے ساتھ مشن نے اُنہیں طبی سہولیات بھی بہم پہنچائی ہیں۔ جہاں ان لوگوں نے سب سے پہلے لداخیوں کو مختلف سائنسی ایجادات جیسے ریڈیو، پریشر کوکر، پٹرومیکس، کیمرہ، سلائی مشین، گراموفون، میجک لنٹرن، دُوربین وغیرہ سے متعارف کرایا' وہیں آلو، پھول گوبھی اور گوبھی جیسی سبزیوں سے بھی رُوشناس کرایا۔ مشن نے ہی لداخ میں دستکاریوں کا پہلا ٹریننگ سنٹر بھی کھولا۔

مشن کے قیام سے بیس سال پہلے ۱۸۵۵ء میں دو پادری ایڈورڈ پاگیل اور ویلیم ہیڈے زنسکار سے ہوتے ہوئے مشن کا ایک مرکز قائم کرنے کے ضمن میں تحقیقی مشن پر لیہہ پہنچے۔ لیکن مہاراجہ کی حکومت نے مشن کھولنے کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ ہماچل پردیش کے علاقہ لاہول میں کیلانگ کے مقام پر مشن کا ایک سنٹر کھولا گیا۔ ۱۸۸۴ء میں فادر ریڈسلوب برطانوی ہند کے وائسرائے لارڈ رِپن سے ملا اور لیہہ میں مشن کی شاخ قائم کرنے کے لئے مہاراجہ پر اپنا اثر ورُسوخ استعمال کرنے کی درخواست کی۔ وائسرائے نے مہاراجہ سے رابطہ قائم کیا اور مہاراجہ نے مشن کھولنے کی اجازت دے دی۔ فادر ریڈسلوب مشن کے پہلے پادری کی حیثیت سے سکونت پذیر ہونے کے لئے لیہہ آئے۔

۱۹۸۵ء میں لیہہ میں مشن کی صد سالہ سالگرہ منائی گئی جس میں اِنگلینڈ سے آئے ہوئے موراوین مشن کے نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ اس موقعے پر مشن کی سرگرمیوں سے متعلق تصاویر کی ایک نمائش کی گئی۔

مذکورہ دو پادریوں سے پہلے لداخ کے راستے کئی پادری تبت روانہ ہوئے تھے۔ راجہ سینگے نمگیل کے زمانے میں ۱۶۳۱ء میں فادر آزی وِیڈ و اور فادر اولیور الیہہ

آئے۔ وہ پرتگال سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۷۱۵ء میں فادر ڈیزی ڈیری اور فادر فریرے لیہہ سے ہوتے ہوئے تبت روانہ ہوئے۔ اُن دِنوں لداخ میں نیماں نمگیل کی حکومت تھی۔ یہ سب تبلیغی مشن پر گھر سے نکلے تھے۔

اِس سے پہلے ۱۶۲۵ء میں فادر انٹونیوڈی اندریدا نے لداخ کے پڑوس میں مغربی تبت کی ریاست کوگے کی راجدھانی ژھپرانگ میں ایک مشن قائم کیا۔ کوگے کبھی لداخ کا حصہ تھا۔ مشن میں پانچ ارکان تھے۔ کوگے کے راجہ نے اُن کو تبلیغ کی پوری اجازت دی تاہم لوگوں نے مشن کی مخالفت کی اور فوج بغاوت پر اُتر آئی۔ لداخ کے راجہ سینگے نمگیل کو کوگے پر حملہ کرنے کی دعوت دی گئی۔ سینگے نمگیل نے راجہ اور دو پادریوں کو قیدی بنالیا اور اُنہیں لیہہ لے آیا۔ بعد میں پادریوں کو رہا کیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۶۳۰ء میں پیش آیا اور اس کے چند برس بعد ۱۶۳۵ء میں مشن بند ہوگیا۔

یہ تو تھی مختصراً مسیحی مشنریوں کی کہانی۔ تاہم اُن کی علمی، سائنسی اور سماجی خدمات کی داستان کافی طویل ہے۔

مشن نے سب سے پہلے لداخ میں علم کی شمع روشن کی۔ اپنے قیام کے دو سال کے اندر مشن نے لیہہ میں ایک سکول قائم کیا۔ اُس زمانے میں لیہہ یا لداخ کے کسی بھی حصّے میں کوئی سکول نہیں تھا لیکن لیہہ کے باشندوں نے شروع میں اِس کا خیر مقدم نہیں کیا۔ قصبے میں یہ بے بنیاد افواہ گشت کرنے لگی کہ مشن اُن کے بچوں کو انگلینڈ لے جائے گا اور وہاں اُن کو عیسائی بنائے گا۔ لداخ کے وزیر (منتظمِ اعلیٰ) پنڈت رادھا کرشن نے لیہہ کے باشندوں کو ہدایت دی کہ جس کنبے میں ایک سے زیادہ بچے ہوں وہ اپنے باقی بچوں کو مشن سکول میں داخل کریں۔

بعد میں لداخ کے دو اہم دیہات خلسے اور شے میں بھی سکول کھولے گئے۔ یہاں بھی ماں باپ اپنے بچوں کو سکول بھیجنے سے کترانے لگے۔ خلسے میں ڈاکٹر فرانکی گھر گھر جا کر لوگوں سے تعلیم کی خوبیاں بیان کرتے۔ رفتہ رفتہ اُن سکولوں میں طلباء کی

تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ خلسے میں بچوں کی تعداد تیس تک پہنچی۔ تاہم بچوں کی آبادی کے مقابلے میں یہ تعداد بہت کم تھی۔ سردیوں میں زیادہ تر بچے سکول میں حاضر رہتے لیکن گرمیاں آتے ہی بچوں کی تعداد گھٹ جاتی کیونکہ بہت سارے ماں باپ اپنے بچوں کو بھیڑ بکریاں چرانے بھیجتے تھے۔

لیہہ میں پہلا سرکاری سکول ۱۸۹۲ء میں کھولا گیا لیکن یہ لوگوں میں مقبول نہیں ہوا۔ لیہہ کے عیسائی پروٹسٹنٹ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مشن سکول ۱۹۶۰ء میں بند ہوا۔ بیس سال بعد ۱۹۸۰ء میں یہ دوبارہ کھولا گیا۔ اب یہ لیہہ کے بہترین ہائی سکولوں میں سے ایک ہے۔

لداخ میں پہلی ڈسپنسری بھی مشن نے ہی کھولی۔ جرمنی سے اپریل ۱۸۸۷ء میں ڈاکٹر کارل مارکس لیہہ پہنچے۔ وہ مشن سے وابستہ تھے۔ اُنہوں نے آتے ہی لیہہ میں ڈسپنسری اور کلینک قائم کیے۔ اُس ڈسپنسری میں ہر سال ہزروں مریض شفایاب ہوتے تھے۔

ڈسپنسری کے قیام کے دو سال کے اندر اس کے اِنڈور وارڈ میں ۳۸ لداخی، ۱۷ بلتی، ۸ کرگلی، ۴ یارقندی اور دُوسرے کئی مریض تھے۔ مشن کے ڈاکٹر دیہی علاقوں کا دورہ کرتے اور مریضوں کا علاج کرتے تھے۔ اُن دنوں ٹائفس اور موتیابند کی شکایت عام تھی۔ ٹائفس کا علاج کرتے ہوئے ڈاکٹر شا اور ڈاکٹر مارکس خود اِس بیماری کے شکار ہوئے اور چل بسے۔ لیہہ کے مسیحی قبرستان میں اُن کی قبریں آج بھی اُن کی قربانیوں کی یاد دِلاتی ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مشن کی ڈسپنسری میں کام بڑھ گیا۔ ۱۹۱۷ء کے اعداد وشمار کے مطابق اُس سال ڈسپنسری میں سات ہزار سے زیادہ مریضوں کا علاج ہوا۔ پردہ نشین یارقندی خواتین کے لئے ایک زنانہ وارڈ بھی قائم کیا گیا۔

مشن کے ڈاکٹر ہمدردی، محنت اور جذبہ سے کام کرتے تھے۔ آج بھی عمر

رسیدہ لوگ موراوین مشن کی ڈسپنسری کی کارکردگی اور ڈاکٹروں کی خدمتِ خلق کی تعریف کرتے ہیں۔

موراوین مشن کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے لداخی زبان، ادب، تاریخ اور کلچر کی بڑی خدمت کی۔ اِس سے وابستہ کئی پادری بڑے عالم اور محقق تھے۔ اُنہوں نے لداخی اور تبّتی زبانیں سیکھیں۔ ڈاکٹر فرانکی کا نام اُن میں سرِ فہرست ہے۔ فرانکی ۱۸۹۶ء میں لیہہ آئے۔ اُنہوں نے لداخ پر کئی اہم تاریخی کتابوں کے علاوہ ایک سو پچاس تحقیقی مقالے لکھے۔ اِن مقالوں میں لداخ کے قدیم گیتوں سے لے کر سنگ تراشی کے نمونوں کے تذکرے شامل ہیں۔

ڈاکٹر فرانکی کی دو کتابیں The History of Western Tibet اور Antiquities of Indian Tibet (دو جلدیں) لداخ کی تاریخ اور تاریخی ورثہ پر دو اہم تصنیفات ہیں۔

فرانکی نے ۱۹۰۴ء میں لداخی میں ایک اخبار جاری کیا۔ اِس اخبار کا نام لداخ گی اخبار تھا۔ یہ مشن کے لیتھو پریس کے ذریعے چھپایا جاتا تھا۔ اخبار کے ایک حصے میں خبریں ہوتیں، دُوسرے حصے میں ایک سلسلہ وار کہانی چھپتی اور تیسرے میں لداخی کہاوتیں پیش کی جاتی تھیں۔ یہ اخبار تقریباً پچاس سال تک شائع ہوتا رہا۔ اُن دِنوں خبروں کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور یہی اخبار لداخیوں کے لئے خبروں اور معلومات کا خزینہ تھا۔

ڈاکٹر مارکس نے لداخ کی شاہی تاریخ کے تین حصوں کا بودھی سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ سموئل ریباک (Samuel Ribbach) (۹۳-۱۸۹۲ء) نے BROGHPA NAMGYAL- THE LIFE OF A VILLAGER کے نام سے فکشن کے انداز میں جرمنی زبان میں ایک دلچسپ کتاب تصنیف کی جو لداخ کی مختلف رسومات اور تمدّن پر اچھی خاصی روشنی ڈالتی ہے۔ جان بیرے (John Bray) نے

انگریزی میں اِس کتاب کا ترجمہ کر کے CULTURE AND SOCIETY IN LADAKH کے نام سے چھپائی ہے۔ جان بیرے نے مشن کی تاریخ پر اچھا تحقیقی کام کیا ہے۔

Heinrich August Jacschke نے اپنی تبّتی - انگریزی ڈِکشنری ۱۸۸۱ء میں مکمل کی۔ ڈِکشنری کی تالیف کا کام کرنے کے علاوہ اُنھوں نے ریسرچ کا کام بھی کیا۔ ۱۸۷۵ء میں یشکے نے لیہہ کے پاس ستوق گاؤں میں مشن کے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے تین ماہ گزارے۔

ہیبر اور اُن کی اہلیہ کیتھرائین ہیبر کی تصنیف HIMALAYAN TIBET بھی اس صدی کے پہلے ربع کی لداخی زندگی پر اچھی خاصی روشنی ڈالتی ہے۔ پچھلی صدی کے اوائل میں اُنہوں نے متعدد سال مشن کے لئے کام کیا۔ وہ دونوں ڈاکٹر تھے۔ ہیبر کا مشاہدہ تھا کہ لداخی صحت مند ہیں اور بہت کم بیمار ہوتے ہیں۔ اِس لئے اُن کے لئے کل وقتی طور پر مشن کے ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں وہ مستعفی ہوگئے۔ اُنہوں نے بارہ سال ہسپتال میں کام کیا تھا۔

مشن کے ایک اور پادری والٹر اسبو لداخ کے تمدّن سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ اُنہوں نے ایک ہزار لداخی ضرب الامثال کا لداخی سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ رائل انتھروپولوجیکل سوسائٹی کے نامہ نگار بھی تھے اور باقاعدگی سے مضامین بھیجتے تھے۔

ایک اور پادری ایف.اے. پیٹر نے لداخ کے دیہات اور مختلف مقامات پر ریسرچ کی اور اُن کی وجہ تسمیہ اور تاریخی اہمیت کو ایک طویل مقالے میں پیش کیا ہے۔

آزادی سے پہلے والٹر اسبو لیہہ میں کرسچن سرائے کے سامنے دو تختوں پر ''السٹریٹیڈ ویکلی آف لندن'' کے باتصویر تراشے چسپاں کرتے تھے۔ ان تصویروں اور خبروں سے لداخیوں کو دُوسری جنگ عظیم وغیرہ سے متعلق جانکاری حاصل ہوتی تھی۔

کرسچن سرائے بلاتمیز مذہب سب کے لئے کھلی تھی۔ اُن دِنوں لیہہ میں مسافروں کی رہائش کے لئے سرائے، ہوٹل، گیسٹ ہاؤس اور مسافرخانے نہیں تھے۔

مشن اپنے لیتھو پریس کی مدد سے تبتّی میں مذہبی لٹریچر شائع کرتا تھا۔ مشن نے Old and New Testaments ''عہد نامہ عتیق اور جدید'' کا لداخی میں ترجمہ کیا۔ اِس کام میں یشکے، ریڈسلوب اور فرانکی کے علاوہ لداخی عالم جوزف گیرگن اور کئی لداخی پادریوں نے کام کیا۔

مشن نے کتائی اور بنائی کی طرف بھی خاصی توجہ دی۔ والٹر اسبو نے ۱۹۳۹ء میں لیہہ میں دست کاری کا ایک سکول کھولا جہاں کتائی، بنائی وغیرہ کی تربیت دی جاتی تھی۔ آج بھی لداخ میں دستانے، جرابیں، بنیان وغیرہ کی بنائی جرمن طرز پر کی جاتی ہے۔ یہ ہنر مشن کے جرمن پادریوں اور ان کی زوجاؤں کی دین ہے۔

سردیوں میں زیرِ زمین سبزیاں محفوظ رکھنے کا طریقہ بھی لداخیوں کو مشن کے پادریوں نے ہی سکھایا۔ اُن پادریوں کو باغبانی سے بڑی دِلچسپی تھی۔ وہ مشن کے کمپلیکس کے احاطے میں سبزیاں اُگاتے تھے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی گرمیوں میں یورپ سے کچھ سیاح لداخ آیا کرتے تھے اور مشن کی عمارت میں قیام کرتے تھے جہاں اُن کو طویل اور مشقت آمیز سفر کے بعد کھانے کو تازہ اور ہری سبزیاں دستیاب ہوتی تھیں۔ کئی سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں اِس کا بڑی دلچسپی سے ذِکر کیا ہے۔

لداخ آنے والے اِن یورپیوں میں سیلانی اور شکاری ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ جغرافیہ دان، کوہ پیما، پرندوں، تتلیوں، جڑی بوٹیوں کے محققین اور ماہرین نباتات، حیاتیات، طبعیات، بشریات وغیرہ بھی ہوتے تھے۔

گرجا کے ساتھ ایک لائبریری تھی۔ لداخ پر جو بھی کتاب لکھی جاتی تھی اُس کی ایک یا ایک سے زیادہ کاپیاں اِس لائبریری کو ضرور بھیجی جاتی تھیں۔ چنانچہ مشن کی لائبریری میں لداخ سے متعلق انمول کتابیں تھیں۔ اِس لائبریری سے اب اکثر

کتابیں غائب ہیں۔ جن میں کئی کتابیں اب بالکل نایاب ہیں۔ مشن کے موجودہ پادری ایلی جاہ گیرگن نے لائبریری کی باقی کتابوں اور ریکارڈ کو محفوظ رکھا ہے۔

مشن نے لداخ میں فنِ تعمیر میں خوشگوار تبدیلیاں لانے میں بھی اپنا کردار بخوبی ادا کیا۔ مکانات میں بڑی کھڑکیاں اور دروازے لگانے کا رواج ڈالا اور مقامی لوگوں کو روشن دان والے ہوادار کمروں کی اہمیت سے عملی طور آگاہ کیا۔

لیہہ کی خوابیدہ اور خاموش زِندگی میں مشن کا چرچ اِنقلابی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ باعثِ رونق بھی تھا یہاں میجک لنٹرن پر تصویریں دکھائی جاتی تھیں اور بلاتمیز مذہب وملت لوگ چرچ کے احاطہ میں شو دیکھنے آتے تھے۔ گاؤں میں بھی اس قسم کے شو کا اہتمام کیا جاتا تھا جو عام طور پر تبلیغی نوعیت کے ہوتے تھے۔

مشن نے لداخ میں سماجی بیداری لانے، تعلیم کا اُجالا پھیلانے اور اپنے تمدّن اور ثقافت کے تیئں لگاؤ بڑھانے کے لئے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ماضی میں لداخ کے عیسائیوں کی چھوٹی سی آبادی تعلیم اور دُوسرے میدانوں میں دُوسروں سے آگے تھی۔ عیسائی اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دِلانے کے لئے سرینگر بھیجتے تھے۔ عیسائی عورتیں صحت وصفائی اور جامہ زیبی کے لئے مشہور تھیں اور اِس ضمن میں اُنہوں نے دُوسرے فرقوں کے لئے اچھی مثال قائم کی ہے۔

ایک یارقندی تاجر
(مضمون ''تجارتی افادیت'' ملاحظہ ہو)

لداخ میں تعلیم کی کہانی

لداخ میں تعلیم کی کہانی طویل اور دِلچسپ ہے۔ اِس ضمن میں لداخ کی تاریخ کو حسبِ ذیل تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ راجگانِ لداخ کا دور

۲۔ ڈوگرہ حکومت کا دور

۳۔ آزادی کے بعد کا دور

راجگان کے زمانے میں حکومت کی طرف سے رعایا کے لئے تعلیم و تدریس کا کوئی اِنتظام نہیں تھا۔ عام طور پر ایک لداخی بودھ کنبہ ایک بیٹے کو ثواب کے لئے لاما بنانے کی نیت سے گنپہ میں بھیجتا تھا جہاں بودھی (لداخی) میں لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ چند لوگ اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے تبت جاتے تھے۔ کئی مذہبیات میں گیشے یا ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ لداخ میں بہت سارے مذہبی عالم تھے۔ تبت میں حصولِ تعلیم کے لئے جانے کا سلسلہ بارھویں صدی میں راجہ لھاچھن موروپ گون کے زمانے سے ہوا۔

متعدد لوگ ضرورت کے مطابق واجبی سی بودھی سیکھتے تھے۔ اِس سلسلے میں کسی گنپہ سے رجوع کرتے تھے یا کسی بودھی دان لاما کے پاس جاتے تھے۔ ایسے خیر خواہ افراد موجود تھے جو رضا کارانہ طور پر بودھی لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے۔ بودھی سیکھنے کے شائقین میں تاجر اور گڈریئے شامل تھے۔ تاجر لین دین کا حساب کتاب رکھنے اور گڈریئے اپنی بھیڑ بکریوں کی گنتی کا حساب رکھنے کے لئے بودھی میں شد بد حاصل کرتے تھے۔ زیادہ تر لوگ دھارمک کتابوں کا وِرد کرنے کے لئے بودھی سیکھتے

تھے۔ تاہم آبادی کی اکثریت ناخواندہ ہوتی تھی۔

دورِ وسطیٰ کا لداخ تعلیم میں زیادہ آگے تھا۔ جب بالائی لداخ کے حکمران لہالاما ایشے اود نے لیہہ سے ۱۶ کلومیٹر آگے نیرما کے مقام پر ایک مذہبی یونیورسٹی قائم کی۔ اس میں ایک ہزار طلبا تھے۔ زنسکار، سپیتی اور نوبراہ سمیت لداخ کے تمام علاقوں سے طلباء تعلیم حاصل کرنے کے لئے یہاں آتے تھے۔ غالباً مغربی تبت سے بھی طالب علم آتے ہوں گے کیونکہ مغربی تبت بھی ایشے اود کی قلمرو میں شامل تھا۔ یونیورسٹی کے پرنسپل نامور مترجم اور عالم رینچن زنگپو تھے۔ جن سے متعلق اِس کتاب میں ایک مضمون بھی شامل ہے۔

نیرما کی یونیورسٹی کب اور کیوں بند ہوئی؟ اس بارے میں تاریخ خاموش ہے۔

ناخواندہ لوگ جن میں قرض دہندہ زمیندار اور مقروض کسان شامل تھے، گھر میں دیوار پر کوئلے سے الف یا ایک جیسا ہندسہ لکھ کر اپنا حساب کتاب رکھتے تھے۔

ایک دِلچسپ طریقہ یہ تھا کہ ایک چپٹی لکڑی پر چاقو سے الف یا ایک کے ہندسے سے دوہرے نشانے تراش کر لین دین کا حساب رکھا جاتا تھا۔ یہ درمیان میں کاٹا جاتا تھا۔ آدھا قرض دہندہ اور آدھا قرض خواہ کے پاس رہتا تھا اور جب قرض ادا کیا جاتا تو لکڑی کے دونوں ٹکڑوں کو ملایا جاتا تھا۔ ظاہر ہے لکھت پڑھت سے یہ عمل بڑا پیچیدہ تھا۔

تبت میں حصولِ تعلیم کے بعد لامے لداخ آکر گنپوں میں اپنا فریضہ سر انجام دیتے تھے۔ نیز آج کل کی طرح اُن کے ذمہ چند سماجی فرائض بھی تھے۔ اِس لئے اُنہیں لوگوں سے رابطہ رکھنا پڑتا تھا۔ جیسا کہ اُوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اُس زمانے میں متعدد عالم تھے، جن کو کلاسیکل تبّتی یا کلاسیکل لداخی پر عبور حاصل تھا۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر فرانکی کے ایک بیان کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اُنیسویں اور بیسویں صدی کے شروع میں موراوین مشن کے پادریوں اور چند لداخیوں نے بائبل (انجیل مقدس) کا

کلاسیکل لداخی میں ترجمہ کیا۔ ان لداخیوں میں یوسیب چھیتن گیرگن اور چھومبیل شامل تھے۔ یوسیب گیرگن نے کلاسیکل تبّتی کے علاوہ ٹنڈل بسکو سکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ چھومبیل لہاسہ کے ٹشی لُومبو گنپہ میں لامارہے تھے۔

دارجیلنگ میں جب ڈیوڈ میکڈونلڈ نے اُن کے مترجمہ بائبل کی دُرستی کی تو اِس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرانکی نے کہا تھا:

''مسٹر میکڈونلڈ کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ لداخ میں بہت سارے عالم لاما ہیں جنھوں نے لہاسہ کے ٹشی لومبو گنپہ میں ڈگری حاصل کی ہے۔ ان میں ایک نے عیسائی مذہب اختیار کیا ہے۔''

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ماسوائے چند تاجرین کے کسی نے بودھی سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ صرف دو مسلمانوں کے نام لئے جا سکتے ہیں جنھوں نے کلاسیکل لداخی سنجیدگی سے سیکھی۔ ایک بابا قادر علی اور دُوسرے بابا غلام رسول تھا۔ اوّل الذکر امچی (طبیب) اور دُوسرا مال مویشی کا علاج کرتا تھا۔ اُنہوں نے یہ حکمت کلاسیکل تبّتی کی نصابی کتابوں سے سیکھی تھی۔

راجگانِ لداخ کے زمانے میں پوریگ (کرگل کا علاقہ) کے ہر گاؤں میں ایک مکتب تھا۔ جہاں اُستاد، جس کو آخون کہا جاتا تھا، دینیات اور قرآن خوانی سکھاتا تھا۔ مورکرافٹ نے لکھا ہے کہ پوریگ میں ہر گاؤں میں ایک یا دو آدمی ایسے نکلے جو فارسی اور ہندوستانی میں بات چیت کر سکتے تھے۔ مورکرافٹ ۲۱-۱۸۲۰ء میں لداخ میں تھا۔

لیہہ میں بھی ذِی حیثیت مسلمان بچوں کو غالباً گھروں پر دینیات، قرآن خوانی اور فارسی پڑھاتے ہوں گے۔ سون ہیڈین نے پچھلی صدی کے آغاز میں لیہہ کے ایک بڑے تاجر خواجہ غلام رسول سے فارسی میں تبادلہء خیال کیا تھا۔ رسول گلوان نے بھی اپنی کتاب SERVANT OF THE SAHIBS میں لکھا ہے کہ لیہہ میں امیروں نے (اُنیسویں صدی میں) بچوں کو تعلیم دِلانے کے لئے گھروں پر اُستاد

رکھے تھے۔

ماضی میں لکھنے کے لئے کاغذ کا بڑا مسئلہ تھا۔ کچھ کاغذ ایک قسم کی گھاس سے مقامی طور بنایا جاتا تھا جسے "شُوک رژا" یا "کاغذ سازی کی گھاس" کہا جاتا تھا۔ کاغذ ڈھالنے کے لئے سانچہ بنا تھا لیکن یہ کاغذ قدرے کھردرا ہوتا تھا۔ تبت اور زنسکار میں بھی کاغذ سازی کی گھاس پائی جاتی تھی اور کاغذ بنایا جاتا تھا۔ تب لداخ میں تبت اور کشمیر سے کاغذ درآمد کیا جاتا ہوگا۔

کاغذ کی اُس دور میں بڑی قدر و قیمت تھی۔ گیلونگ پلدن نے راقم الحروف کو بتایا کہ پھٹے ہوئے کاغذ کو اُنہوں نے دھاگے سے سِلا ہوا دیکھا یا پٹواری کے پیلے رنگ کے کاغذ چپکا کر پھٹا ہوا کاغذ چھپایا گیا ہے۔

ڈوگرہ دورِ حکومت میں تعلیم:

ڈوگرہ دورِ حکومت میں ۱۹۳۰ء کی دہائی تک تعلیم کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ لداخ پر قابض ہونے کے بعد ڈوگرہ اِنتظامیہ نے پہلا پرائمری سکول لیہہ میں آدھی صدی کے بعد کھولا جبکہ کرگل میں ساٹھ سال بعد کھولا۔ اس سے پہلے صرف سنسکرت سکھانے کے لئے لیہہ میں ایک پاٹھ شالہ کھولی گئی، جو نہیں چل سکی۔

لیہہ میں دستیاب ریکارڈ کے مطابق پہلا مکتب مسلمانوں نے کھولا۔ اِس کے پیچھے ایک واقعہ ہے۔ لداخ میں ڈوگرہ ناظمِ اعلیٰ سیّد اکبر علی (۱۸۶۶-۱۸۷۱ء) کی عدالت میں ایک مقدمہ کے سلسلے میں ایک دفعہ چند مسلمانوں کو بطورِ گواہان پیش کیا گیا۔ سیّد اکبر علی نے اُن سے بطورِ شہادت کلمہ پڑھنے کے لئے کہا لیکن اُن میں کوئی بھی کلمہ نہیں پڑھ سکا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر ناظم کو حیرت بھی ہوئی اور دُکھ بھی ہوا اور لیہہ جامع مسجد کے امام سے کہا کہ قصبے کے مسلمان اِسلام کے بنیادی ارکان سے نابلد لگتے ہیں۔ اُنہوں نے لیہہ میں ایک مکتب کھولنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ایک مکتب کھولا گیا اور دینیات پڑھانے کے لئے ایک اُستاد مقرر کیا۔ یوں لگتا ہے کہ یہ مکتب کئی دفعہ

عارضی طور پر بند ہوا۔ اِس کی بڑی وجہ اُستاد کی نایابی ہوتی تھی۔

۱۸۷۴ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے لیہہ میں ایک شاستری سکول کھولا، جس میں سنسکرت پڑھائی جانے لگی۔ اِس کے لئے کشمیر سے ایک اُستاد بھیجا تھا۔ لیکن یہ سکول شروع سے ٹھیک طرح نہیں چلا کیونکہ لوگ عمومی طور حصولِ تعلیم اور خصوصی طور سنسکرت سیکھنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ اگر سنسکرت کے ساتھ لداخی زبان پڑھائی جاتی تو سکول کامیاب رہ سکتا تھا۔ لیہہ میں متیعنہ برٹش جوائنٹ کمشنر کے مطابق وہ اُردو کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ جزوی طور پر خطّے میں اُردو کا چلن تھا۔ لوگوں کو یہ شک بھی ہو گیا کہ مہاراجہ اپنی ثقافت اور زبان لوگوں پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ ۱۸۸۲ء میں لیہہ میں متیعنہ انگریز جوائنٹ کمشنر نے یہاں تک لکھا:

"سنسکرت سکول جو چند سال پہلے قائم ہوا تھا، آج عملی طور بند ہو گیا ہے۔ صرف ۵ طلبا رہے ہیں۔ سکول کو کشمیر کے موجودہ مہاراجہ نے بودھوں کو ہندو بنانے کے لئے قائم کیا ہے۔"

(Diary of JC from 1st to 15th Oct. 1882, Govt. of India, FGN-A, Political-E Nov,1882 55-58)

تاہم کشمیر میں آفیسران سپیشل ڈیوٹی میجر پی.ڈی. ہنڈرسن نے جہاں اپنی رپورٹ میں یہ لکھا کہ مہاراجہ کا لیہہ میں قائم سکول بالکل مقبول نہیں ہے، جس کا مہاراجہ کو علم ہے، وہاں اُس نے یہ بھی اِنکشاف کیا کہ مہاراجہ کشمیری پنڈتوں کو بدھ مت کی تعلیمات سے متعارف کرنا چاہتا ہے۔ (جس طرح لداخی بودھوں کو سنسکرت کے ذریعے ہندو دھرم سے روشناس کرنا چاہتا ہے)

نتیجہ یہ ہوا کہ شاستری سکول بند ہو گیا۔

مہاراجہ کی حکومت کو تجارتی محصولات، ذاتی تجارت اور مالیہ سے اچھی خاصی آمدنی تھی جس کی مالیت آج کے روپیہ میں کروڑوں روپے بنتی ہے۔ لیکن

مہاراجہ چند ہزار روپے خرچ کر کے ایک پرائمری سکول کھولنے سے کتراتا تھا۔ البتہ مالیہ جمع کرنے اور اِنتظامیہ کی مدد کے لئے مقامی اُمیدواروں کو ملازم بھرتی کرنا چاہتا تھا تاکہ اخراجات میں بچت ہو۔ چنانچہ ایک انگریز اے. شارپ کی رپورٹ بتاتی ہے۔

''کشمیر دربار کی یہ پالیسی تھی کہ دردستان (گلگت) اور لداخ میں کم گریڈ کی آسامیوں کے لئے اِن علاقوں کے مقامی لوگوں کو ٹریننگ دی جائے۔ بہت ساری آسامیوں جیسے Lavy منشیوں، پٹواریوں وغیرہ کے لئے کشمیر اور ہندوستان کے لوگوں کو اِن ضلعوں میں کام کرنے کے لئے بڑی مشاہرہ کا لالچ دینا پڑتا ہے۔ وقت آنے پر اِن ضلعوں کی یہ آسامیاں مقامی لوگوں سے پُر کی جاسکیں گی جس سے ریاست کے اخراجات میں بڑی کمی ہوگی۔ اِس ضمن میں گلگت کے انگریز ایجنٹ کرنل ڈورانڈ نے گلگت میں فارسی، ہندوستانی اور ریاضی پڑھانا جاننے والے ایک مسلمان اُستاد کی تقرری کے لئے کشمیر کے ریذیڈنٹ کی معرفت درخواست کی۔ مہاراجہ کی سرکار نے ۱۸۹۲ء میں یہ تجویز منظور کی۔''

۱۸۹۲ء میں لیہہ میں پرائمری سکول کھولا گیا۔ سکول کھولنے کا محرّک مذکورہ بالا مقصد ہوگا۔ لیکن سکول کو ٹھیک طرح چلانے کی طرف توجہ نہیں دی۔ جزوی طور اس کا علم فرانکی کی رپورٹ سے ہوتا ہے۔

اِس سے پہلے لیہہ کی جرمن مشنری موراوین مشن نے ۱۸۸۷ء میں پہلا سکول کھولا تھا۔ اس سے دو سال پہلے فادر فریڈرک اڈولف ریڈسلوب نے لیہہ میں مشن کا ایک سنٹر کھولا۔ سرینگر کا مشہور ٹنڈل بسکو سکول لیہہ مشن سکول سے چھ سال پہلے ۱۸۸۱ء میں قائم کیا گیا تھا تب یہ چرچ مشنری سوسائیٹیز مشن سکول کے نام سے جانا جاتا تھا۔ مشن سکول لیہہ میں شروع کے دو سال میں کوئی لداخی طالب علم یا بہت کم لڑکے سکول میں پڑھنے آئے اور یہ بند رہا۔ ۱۸۸۹ء میں اِسے دوبارہ کھولا گیا۔ اس دفعہ لیہہ کے وزیر (ناظم اعلیٰ) پنڈت رادھا کرشن نے حکم جاری کیا کہ ہر خاندان، جس

میں ایک سے زیادہ بچے ہوں، ایک بچہ موراوین سکول بھیجے گا لیکن مقامی آبادی نے بچوں کو سکول بھیجنے میں پس و پیش کی۔ اُنہیں شک تھا کہ اُن کے بچوں کو انگلینڈ بھیجا جائے گا جہاں اُنہیں زبردستی عیسائی بنا دیا جائے گا۔ اُن کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ یہ بچے جب زیادہ تعلیم یافتہ ہوں گے تو ہاتھ کا کام کرنا پسند نہیں کریں گے۔

پھر بڑے لاما (غالباً ہمس کے ستق سنگ راسپا ہوں گے) لیہہ قصبہ کے ہر گھر میں گئے اور مکینوں کو ہدایت دی کہ ایک سے زیادہ بچے ہوں تو ایک بیٹے کا داخلہ مشن سکول میں کریں۔ بہتوں کے لئے اُن کی ہدایت پر عمل کرنا ناگزیر تھا۔

سکول کے نصاب میں لداخی، اُردو، انگریزی، جغرافیہ، سائنس، نیچرل سٹڈی، ریاضی اور جیومٹری شامل تھی۔ اِس کے علاوہ کوئی بھی اپنی مرضی سے بائبل کا مطالعہ کر سکتا تھا۔

یوسیب گیرگن لداخی زبان، ڈاکٹر کارل مارکس انگریزی، جغرافیہ اور سائنس، ٹی۔ڈی۔ شرائیوے SHRIEVE انگریزی، ریاضی اور جیومٹری اور لیہہ میں برٹش جوائنٹ کمشنر کپتان رمزے کا منشی اُردو پڑھاتا تھا۔

شرائیوے کیلانگ اور پوُسٹیشن کے پادری تھے اور لیہہ مشن کی مدد کے لئے آئے تھے۔

شروع میں سکول کے لئے لیہہ بازار میں ایک کمرہ لیا گیا لیکن شور و غل کی وجہ سے وہاں سے چرچ کے احاطہ میں منتقل کیا گیا۔

مشن کی ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ مسلمان اور (لیہہ کی) تھوڑی سی ہندو آبادی تعلیم کے فوائد کی قائل ہے۔ اکثریتی بودھ آبادی کو' جو تقریباً کسان ہے' اپنے باپ دادوں سے یہ نظریہ ورثہ میں ملا ہے کہ جنہوں نے کتابیں پڑھنا نہیں سیکھی ہیں، وہ بہترین کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔

مشن کی رپورٹ کے مطابق اگر سمجھ دار مسلمان اور ہندو اپنے بچوں کو سکول

بھیجیں تو سکول میں طلبا کی تعداد ۶۰ تک پہنچ سکتی ہے۔

۱۸۸۸ء میں رومن کھیتولک مشنری کے ایک پادری فادر دانیال کیلٹی لداخ آئے اور اپنے ذاتی مکان میں چند مقامی بچوں کو پڑھانے لگے۔ اس ادارہ کا نام سینٹ پیٹر مشن رکھا۔ ۱۸۸۹ء کے موسمِ بہار کے آغاز میں وہ بیمار ہوئے۔ اُسی سال ۲۳/اپریل کو ۴۲ سال کی عمر میں چل بسے اور یہ سکول بند ہو گیا۔ فادر دانیال کیلٹی نے لداخی زبان میں ایک لغت مرتب کی تھی۔

رسول گلوان نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جب مشن سکول کھلا تو اُس نے اپنی ماں سے سکول جانے کی خواہش کا اِظہار کیا۔ ماں بولی، ''رسول! پڑھنا لکھنا امیروں کا کام ہے، ہم جیسے غریبوں کا نہیں۔''

رسول لگ بھگ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوا تھا۔ لیہہ میں مشن سکول کے قیام کے وقت وہ نو سال کا ہونا چاہیے۔

۱۸۹۱ء تک مشن سکول میں بچوں کی تعداد تسلی بخش تھی۔ اُن میں اکثر مسلمان بچے تھے لیکن فادر ریڈسلوب اور ڈاکٹر کارل مارکس کے اچانک اِنتقال پر سکول اور تعلیم دونوں کو دھکا لگا۔ دونوں ٹائفس زدہ لداخی مریضوں کا علاج کرتے ہوئے ٹائفس کے شکار ہوئے اور چل بسے۔ سکول کے مخالفین نے اِس سانحے کا استحصال کیا۔ اس کے ایک سال بعد سرکاری سکول کھلا اور کئی مسلم سکول (مکتب) کھلے۔ مسلمانوں کا ایک مکتب پہلے بھی تھا۔ ایک مرحلے پر فادر ریڈسلوب اس کے نگراں تھے۔ شاید قرآن خوانی کے علاوہ بھی مکتب میں اور مضامین پڑھائے جاتے تھے۔

فادر ریڈسلوب اور ڈاکٹر کارل مارکس کے اِنتقال کے بعد جب پادری جولیس ویبر مشن کا کام سنبھالنے کے لئے پوسٹیشن سے لیہہ پہنچے تو مشن سکول میں صرف ۲۰ طلباء رہ گئے تھے۔ باقی طلبا سرکاری سکول اور مسلم مکاتیب گئے ہوں گے۔ ویبر نے ۲۰ کے رول کی تعداد قائم رکھی۔ اُن کے چلے جانے کے بعد صرف ۱۰ طلباء رہ گئے۔

مشن نے اپنی ایک رپورٹ میں طلباء کی تعداد میں کمی کی ایک بڑی وجہ تعلیم کے تئیں لداخیوں کی بے اعتنائی اور نئی نسل کی کاہلی قرار دی ہے۔ گرجا کے احاطہ میں سکول کا ہونا بھی بچوں کے داخلہ میں ایک رکاوٹ بنی تھی۔ گھروں میں گھڑی نہ ہونے کی وجہ سے طلباء وقت پر سکول نہیں پہنچتے تھے۔

بودھ لڑکے کھیتی باڑی کے کام میں جٹے رہتے تھے۔ مشن کی رپورٹ کے مطابق وہ اپنے بچوں کو تبھی سکول بھیجنے کا فیصلہ لے سکتے تھے جب انہیں اس کے لئے مالی معاوضہ کی پیشکش کی جائے۔

اِسی اثناء میں عبدالغفار نام کا ایک نوجوان سرینگر سے لیہہ آیا تھا۔ وہ لیہہ میں ایک سکول کھولنا چاہتا تھا۔ اُس نے بسکو سکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر فرانکی اور پادری ایس. ایچ. ریباک چاہتے تھے کہ عبدالغفار شے میں مشن کے زیرِ تجویز مجوزہ سکول میں بطور اُستاد کام کرے لیکن عبدالغفار لیہہ میں سکول کھولنے میں اڑا تھا۔ چنانچہ وہ قصبے کے مسلمانوں کے گھر گھر گیا اور اپنے بچوں کو سکول بھیجنے کے لئے ترغیب دی۔ جلد ہی سکول میں بچوں کی تعداد ۱۶ تک پہنچی اور اِس میں اضافہ ہونے لگا۔ اِس دوران عبدالغفار عیسائی بننا چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر فرانکی نہیں چاہتے تھے کہ وہ عیسائی بن کر مسلمانوں میں غلط فہمیوں کا موجب بنے۔ عبدالغفار نے بائبل کی تدریس بھی اپنے نصاب میں رکھی تھی۔ صرف ایک مسلمان والد نے اِس کی مخالفت کی۔ عبدالغفار نے اُس کی غلط فہمی دُور کی۔ ۱۹۰۱ء میں کرگل میں سرکاری سکول کھولنے کے ایک سال بعد وہ اس سکول میں اُستاد مقرر ہوا۔

سکردو میں کرگل سے ایک سال پہلے ۱۸۹۹ء میں ایک پرائمری سکول کھولا گیا۔

۱۸۹۲ء کے آس پاس فادر ریباک شے گئے اور گاؤں کے بزرگوں کے سامنے گاؤں میں ایک سکول قائم کرنے کی تجویز رکھی لیکن بزرگوں نے اِس کی مخالفت کی۔ اُن کا یہ انوکھا خیال تھا کہ حکومت کی شہ پر سکول کھولا جا رہا ہے تا کہ بچوں کو فوجی

تربیت کے لئے تیار کیا جائے۔

گھنٹوں کی بحث و تکرار کے بعد فادر ریباک گاؤں والوں کی غلط فہمی دُور کرنے میں کامیاب ہوئے اور سکول کے لئے ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ نو بچوں نے سکول میں داخلہ لیا۔ دُوسری دفعہ ریباک جب شے گئے تو اپنے ساتھ ایک فٹ بال بھی لے گئے۔ اِس سے سکول نہ آنے والے دُوسرے بچوں میں بھی سکول جانے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ کھیل کے اختتام پر مزید نو بچوں نے داخلہ لیا۔

جموں وکشمیر اور لداخ گزیٹر کے مطابق ۱۹۰۰ء میں کرگل، سکردو اور لیہہ میں طلبا کی تعداد حسب ذیل تھی:

مقامات	طلباء کی تعداد	فیصد طلباء
کرگل	۴۸	۱۵۸ اعشاریہ ۵
سکردو	۲۰	۱۲۴ اعشاریہ ۴
لیہہ	۱۴	۷ اعشاریہ ۱

اِس کے برعکس ۱۹۰۱ء میں لیہہ، کیلانگ اور پو کے مشن سکولوں میں طلباء کی کل تعداد ۲۷۵ تھی۔

اُنہی دِنوں لیہہ کے سرکاری سکول پر تبصرہ کرتے ہوئے فرانکی نے لکھا ہے: "سکول کی حالت اچھی نہیں ہے۔ رول کے مطابق ۲۰ طلباء ہیں لیکن دس سے زیادہ حاضر نہیں ہوتے ہیں۔ ہمیں سکول دیکھنے کی اجازت نہیں ہے تاہم ہمیں سکول سے متعلق علم ہے کیونکہ اُستاد ہم سے مدد لینے آتے ہیں۔ ایک اُستاد بالکل ناخواندہ ہے۔ دُوسرا احمق اور مغرور ہے۔ سرکار جانتی ہے اور اُنہیں باقاعدگی سے تنخواہ نہیں دیتی ہے۔"

مسلم مکتبوں سے متعلق فرانکی رقم طراز ہیں کہ مسلم مکتبوں میں صرف قرآن پڑھایا جاتا ہے (مکتب دو یا اس سے زیادہ تھے) فرانکی کے مطابق ایک مکتب بہت ساری گلیوں کے پیچھے تھا۔ یہ جگہ ماضی کے ستاغو پھی لوق کا پہلا مکان ہوسکتا ہے

جہاں آخون خاندان بستا ہے اور ہمارے بچپن میں یہاں ایک سکول ہوا کرتا تھا۔ آخون خاندان کا ایک بزرگ دینیات وغیرہ پڑھاتا تھا۔

فرانکی کے پاس چھ مسلمان لڑکے انگریزی سیکھنے آئے۔ فرانکی نے ایک نظم سے تدریس شروع کی۔ لڑکوں نے آنا چھوڑ دیا۔ جب ترغیب دی تو ایک لڑکا آیا۔ فرانکی لکھتے ہیں:

''جدید یورپی طریقۂ تعلیم اُن کو راس نہیں آتا ہے........ مسلم طلبا اُردو اور فارسی سے مانوس ہیں۔''

ایک مرتبہ فرانکی کے پاس چھ جوان لڑکے آئے۔ اُن کی اوسط عمر بیس سال تھی۔ یہ لڑکے مشن سکول کے طالب علم رہے تھے۔ اُن میں ایک ریاضی، دُوسرا کلاسیکل لداخی، تیسرا اُردو، چوتھا فارسی، پانچواں انگریزی اور چھٹا خطوط نویسی سیکھنا چاہتے تھے۔ فرانکی کے لئے فرداً فرداً اُن کی خواہش پوری کرنا ممکن نہیں تھا۔ بقولِ اُن کے ''اِن (لڑکوں) کو ہماری مشکلات کا احساس تھا۔''

فرانکی بول چال کی لداخی کو فروغ دینا چاہتے تھے اور اِسی کی پڑھائی اور لکھائی کو سکول میں رواج دینے کے حق میں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک دفعہ طالب علم اِس میں عبور حاصل کرے تو کلاسیکل لداخی سکھائی جائے۔

فرانکی لکھتے ہیں: ''مشن سکول میں کلاسیکل لداخی سکھائی جاتی تھی جبکہ عام طلباء بول چال کی زبان پسند کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بائبل کا ترجمہ بھی بول چال کی زبان میں کیا جائے۔ (بائبل کا ترجمہ کلاسیکل زبان میں ہوا تھا) بچوں کی اکثریت ریاضی پڑھنا بھی پسند کرتی تھی۔''

بقولِ فرانکی مشن کے ڈاکٹر شا نے پہلے پہل بول چال کی لداخی میں لکھنے کی کوشش کی۔ مشن کے پادریوں کی بیویاں بھی درس وتدریس میں شریک ہوتی تھیں۔ ایسا لگتا ہے کہ چند لڑکیاں بھی سکول میں پڑھنے کے لئے آتی تھیں، جو عموماً عیسائی تھیں۔

فرانکی رقم طراز ہیں: ''مشن سکول میں ہندوستانی ایک اہم ترین ذریعۂ تعلیم ہے اور پادریوں کو اِسے سیکھنے کی ضرورت ہے۔''

اگسٹ ہرمن فرانکی ایک اچھے معلم ہی نہیں بلکہ ہمہ جہت صفات کے مالک تھے۔ وہ قلم کار ہی نہیں تھے' موسیقار اور مصوّر بھی تھے۔ وہ وائلن اور cello چیلو بجاتے تھے۔ اُنہوں نے موسیقی کی دُھنیں بنائیں، خاکے بنائے، اُن میں چند اُن کی کتاب میں دیئے گئے ہیں۔ پودے اور جانور جمع کئے۔ تاہم اُن کا سب سے بڑا کارنامہ لداخ پر تحقیقی کام اور تصنیفات ہیں۔ اُنہوں نے لداخ پر دو اہم کتابوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر ڈیڑھ سو مضامین لکھے ہیں۔

۱۸۹۹ء میں مشن نے خلسے میں ایک سکول کھولا۔ فرانکی جولائی ۱۸۹۹ء میں اپنی اہلیہ اور بچے کے ساتھ لیہہ سے خلسے روانہ ہوئے۔ اس سے ایک سال پہلے فادر ریباک نے خلسے میں مشن کا ایک مرکز قائم کیا تھا۔ فرانکی نے گھر گھر جا کر لوگوں کو تعلیم کی خوبیاں بیان کیں اور بچوں کو سکول بھیجنے کی ترغیب دی۔ لیہہ اور شے کی طرح شروع میں یہاں بھی لوگوں نے بچوں کو سکول بھیجنے سے گریز کیا تاہم فرانکی کی کوشش سے سکول میں طلباء کی تعداد ۳۰ تک پہنچی۔ سکول کا سب سے کم عمر طالب علم چھ سال کا تھا اور سب سے عمر رسیدہ ساٹھ سال کا تھا۔ جو گاؤں کا نمبردار تھا۔ وہ لکھنا پڑھنا سیکھنا چاہتا تھا۔ لکھنے میں وہ سُست ثابت ہوا تاہم ریاضی میں اُس نے مہارت دکھائی۔ سکول میں ایشے رگزین نام کا ایک اُستاد بھی مقرر کیا گیا تھا۔

سردیوں میں بچوں کی حاضری زیادہ رہتی تھی۔ گرمیوں میں ماں باپ بچوں کو بھیڑ بکریاں چرانے بھیجتے تھے۔ فرانکی نے اُس طالب علم کے لئے انعام رکھا تھا جو ایک ماہ سے زیادہ عرصہ سکول میں مسلسل حاضر رہے۔

فرانکی کی اہلیہ ڈورا نے مقامی عورتوں کے لئے بُنائی کا ایک سکول بھی کھولا تھا، جو دوپہر کے بعد کھلتا تھا۔

ایسا لگتا ہے سکول کھلنے کے کچھ عرصہ بعد لامایورو گنپہ کی طرف سے سکول کے قیام کی مخالفت کی گئی۔ فرانکی کے مطابق گنپہ کے اِنتظامیہ کو اندیشہ تھا کہ اس سے گاؤں والوں میں گنپہ کا اثر ورسوخ کم ہو جائے گا۔ اس سے پہلے یا اِسی دوران سکول کو گرجا کے احاطہ سے ایشے رگزین کے مکان میں منتقل کیا گیا۔

۱۹۰۰ء میں ڈاکٹر فرانکی نے رپورٹ دی کہ لاموں کی مہم کی وجہ سے سکول عارضی طور پر بند کیا جاتا ہے۔

خلسے میں فرانکی کی مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ اُنہوں نے درسی کتابیں چھپائیں۔ عام فہم بول چال لداخی میں بائبل کی کہانیوں کا ایک مجموعہ نکالا۔ وہ لداخی میں ایک اخبار کی ادارت بھی کرتے تھے۔ اُنہوں نے لداخ میں بارہ سال گزارے۔

۱۹۰۳ء میں نو عیسائی چھومبیل اور ستپگیس نے بودھ درد گاؤں کا لمبا دورہ کیا۔ دورہ کے اِختتام پر اُنہوں نے فرانکی کو رپورٹ دی کہ درد لوگ داہ میں ایک سکول چاہتے ہیں لیکن لوگوں کا ایک گروپ اس کے خلاف تھا۔ جو لوگ سکول کے حق میں تھے، انہوں نے سکول کی تعمیر کے لئے زمین کا انتظام کیا لیکن مخالف گروپ میں سماج کے زیادہ اہم اور بارسوخ لوگ تھے۔ اس لئے سکول تعمیر نہیں ہو سکا۔ جس شخص نے سکول کے لئے زمین دی تھی۔ اس کے کھیتوں کو پانی بند کیا، جس سے فصل سوکھ گئی۔

بعد میں مخالف گروپ کو اپنے کئے پر پشیمانی ہوئی اور ۱۹۰۴ء میں سکول کی عمارت کی تعمیر کی اجازت دے دی اور اس کے ساتھ ایک رہائشی مکان بھی تعمیر کیا گیا۔ جو لوگ شروع سے سکول کے حق میں تھے اُنہوں نے یہ مانگ کی تھی کہ چھومبیل گاؤں میں بطور اُستاد کام کریں۔ چھومبیل اُستاد مقرر ہوا۔ وہ خلسے آتا جاتا تھا۔ اِسی دوران فرانکی، ریباک اور پیٹر نے گاؤں کا دورہ کیا۔ بعد میں سکول جلدی بند ہوا لگتا ہے۔ غالباً بچوں کے والدین نے تعاون نہیں کیا ہوگا۔

۱۹۰۳-۱۹۰۴ء میں دو نئے سکول کھولے گئے۔ اُن دنوں وزارتِ لداخ

لیہہ، کرگل اور سکردو تین تحصیلوں پر مشتمل تھی۔ ۱۹۰۸ء میں لیہہ کے سرکاری پرائمری سکول کو طلباء کی تعداد میں اضافہ کے پیش نظر مڈل کا درجہ دیا گیا اور ماہانہ ۳۰ روپے کی مشاہرے پر ایک اور اُستاد کی تقرری کی سفارش کی گئی۔ شروع میں مڈل سکول میں صرف دو اُستاد تھے۔

اس موقعے پر ریاست کے انسپکٹر آف سکولز نے کہا کہ مڈل سکول لیہہ کے باشندوں کے لئے BOON (نعمت) ثابت ہوگا۔

۱۹۲۰ء کی دہائی میں لیہہ کے مسلم مکتب سے متعلق کچھ معلومات خواجہ عبدالوحید کی کتاب سے حاصل ہوتی ہیں۔ اُنہوں نے اپنی یہ کتاب ISLAM IN TIBET AND TIBETAN CARAVANS پہلے فرانسیسی میں لکھی تھی۔ اس کے مطابق لیہہ کے ہر مسلمان بچے کی طرح اُنہوں نے کمسنی میں مکتب میں داخلہ لیا اور قرآن ناظرہ سیکھا۔ اس مکتب کو ایک بزرگ مے مے لسّہ چلاتے تھے۔ مے مے لداخی میں دادا یا بزرگ کو کہتے ہیں۔ لڑکے لڑکیاں دونوں ان کے پاس آتے تھے۔ اس کے بعد اُن کو مے مے غلام محمد کے پاس عربی اور اُردو پڑھنے کے لئے بھیجا گیا۔ وہ لیہہ جامع مسجد کے مؤذن تھے اور آخوند کہلاتے تھے۔ عبدالوحید لکھتے ہیں کہ اُنہوں نے مے مے غلام محمد سے یہ دوز بانیں اچھی سیکھ لیں۔ پھر اُنہوں نے لیہہ مڈل سکول میں داخلہ لیا۔ خواجہ نے سکول کے پنڈت اُستادوں کی تعریف کی ہے۔ اِس کے بعد اُنہوں نے سرینگر میں بسکو سکول سے میٹرک پاس کیا۔

۱۹۲۰ء کے آس پاس مشن نے لیہہ میں لڑکیوں کا ایک سکول بھی کھولا۔

۱۹۲۴ء میں اِس میں ۲۴ لڑکیوں کے ناموں کا اندراج تھا۔

۱۹۶۰ء میں مشن سکول بند ہوا۔

۱۹۲۶-۱۹۲۷ء میں سرکار نے لداخ کے دیہی علاقوں میں مزید سکول کھولنے کی منظوری دی لیکن مقامی طور پر اس کے لئے مڈل پاس اُمیدوار نہیں ملے اور

وادیٔ کشمیر اور جموں سے اُستاد نہیں بھیجے گئے۔ جس کے نتیجے میں مزید سکول نہیں کھولے جا سکے۔

۱۹۳۰ء میں کرگل کے پرائمری سکول کو مڈل کا درجہ دیا گیا۔ سکردو کے پرائمری سکول کو پہلے ہی مڈل کا درجہ دیا گیا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں لیہہ کے شیعہ مسلمانوں نے امامیہ سکول کے نام سے لیہہ میں ایک پرائمری سکول کھولا۔ پہلے ہی سال طلباء کی کل تعداد ۳۷ تھی۔ جن میں ۲۱ لڑکیاں تھیں۔ شروع میں سکول میں دو اُستاد اور دست کاریاں سکھانے کے لئے ایک اُستاد کی تقرری کی گئی۔ بعد میں اِس میں اضافہ کیا گیا۔

مہاراجہ نے غریب اور باصلاحیت طلباء کے حق میں پہلی دفعہ وظیفے کے لئے رقم مخصوص کی۔

۱۹۳۱ء میں کشمیر کے حکمران مہاراجہ ہری سنگھ نے گلینسی کمیشن قائم کیا۔ اس کا مقصد ریاست کی تینوں اِکائیوں کے مسائل کا جائزہ لینا اور ان کے حل کے لئے سفارشات کرنا تھا۔ پی .جی .گلانسی برطانوی ہند سرکار کا ایک سینئر افسر تھا۔ وہ کمیشن کا صدر مقرر ہوا۔ اس سے پہلے مہاراجہ پر برطانوی ہند سرکار کی طرف سے ریاست کے لوگوں کی شکایات کے ازالہ اور مسائل حل کرنے کے لئے دباؤ ڈالا گیا تھا۔ بھوپال کے نواب، جو مہاراجہ ہری سنگھ کے دوست تھے، اور علاّمہ اِقبال نے بھی اِس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

ریاست کے لوگوں کی مالی اور سماجی حالت بڑی ابتر تھی اور شخصی حکومت کے خلاف تحریک شروع ہوئی تھی۔

لداخ کے بودھوں کی طرف سے کشمیر راج بودھی مہا سبھا نے گلانسی کمیشن کو ۲۰ / دسمبر ۱۹۳۱ء کو ایک یادداشت پیش کی جس میں تعلیم کی ضمن میں مندرجہ ذیل مانگیں کی گئی تھیں۔

۱۔ اُردو کے بجائے لداخی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا۔

۲۔ بودھ پاٹھ شالوں کا قیام
۳۔ لداخی میں کتابوں کی چھپائی
۴۔ بودھ طلباء کو کتابیں مفت فراہم کرنا
۵۔ لیہہ میں ایک ہوسٹل کا قیام
۶۔ سنسکرت، ڈرائنگ اور زرعی مضامین کی تعلیم وتدریس
۷۔ بودھوں کی تعلیمی نگرانی کے لئے ایک افسر کی تقرری

کشمیر راج بودھی مہا سبھا کو ۱۹۳۱ء میں تین کشمیری پنڈت شمبو ناتھ در، شری دھر کول ڈُولُو اور شری دھر بٹ نے قائم کیا تھا۔ اُن تینوں نے بدھ مت اختیار کئے تھے۔ اُنہوں نے ہمس گنپہ کے کُوشُوق ستق سنگ راسپا کو اِس ضمن میں اپنے اعتماد میں لیا تھا۔ شمبو ناتھ در اِس کا صدر تھا۔ ینگ مین بدھسٹ ایسوسی ایشن اِس کے پانچ سال بعد اگست ۱۹۳۸ء میں قائم ہوئی۔ لداخ بدھسٹ ایسوسی ایشن کا قیام اِس کا پیش خیمہ تھا۔

اُن دِنوں لداخ میں مروّجہ تعلیم میں شرح خواندگی بہت کم تھی۔ بودھی کی شرح خواندگی میں بودھ جہاں آگے تھے، وہاں مروّجہ تعلیم میں بودھ زیادہ پسماندہ تھے۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق لداخ کی ۴۰ ہزار بودھوں کی آبادی میں صرف ۸۳ بودھ اُردو پڑھ اور لکھ سکتے تھے۔ صرف تین انگریزی لکھ سکتے تھے۔ دُوسرے الفاظ میں ایک ہزار میں صرف دو نے پرائمری سکول کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور صرف تین نے پچھلے تیس سال کے دوران مڈل کا امتحان پاس کیا تھا۔

اُن دِنوں کسی کو انگریزی میں تار آتا تو پڑھنے والا نہیں ملتا تھا۔ اِس کا مطلب پوچھنے کے لئے یوسیب گیرگن یا موراوین مشن کے کسی پادری کے پاس جانا پڑتا تھا۔ تعلیمی پسماندگی کی بڑی وجہ غریبی تھی۔

اسی زمانے کے آس پاس سرکاری ملازمتوں میں بودھوں کی نمائندگی کے

تناسب کا گوشوارہ دیا گیا ہے۔

بودھ ملازموں کی مجموعی تنخواہ	۳۵۰ روپے
گزیٹیڈ افسر	ایک بھی نہیں
۳۰ سے ۵۰ روپے تنخواہ لینے والے ملازموں کی تعداد	۳
۲۰ سے ۳۰ روپے تنخواہ لینے والے ملازموں کی تعداد	۷
۲۰ روپے سے کم روپے تنخواہ لینے والے ملازموں کی تعداد	۱۶
کل میزان	۲۶

گلانسی کمیشن نے اپریل ۱۹۳۲ء میں اپنی رپورٹ مہاراجہ کو پیش کی۔ اس میں لداخ اور گلگت کے مڈل سکولوں کو ہائی سکول بنانے کی سفارش کی گئی تھی لیکن اس پر عمل نہیں ہوا اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ بیرون ریاست کی یونیورسٹی (لاہور یونیورسٹی) لیہہ اور گلگت میں اِمتحانات کے انتظامات نہیں کر پائے گی۔ اُس زمانے میں میٹرک کا امتحان لاہور یونیورسٹی کی نگرانی میں ہوتا تھا۔

لداخ اور گلگت میں صنعتی سکول کھولنے کی تجویز کی گئی تھی لیکن اس پر عمل نہیں ہوا۔ ریاستی حکومت نے یہ بہانہ کر کے اِسے ٹال دیا کہ مالی حالت اجازت دے تو اس تجویز پر غور کیا جائے گا۔

لداخی زبان سے متعلق رپورٹ میں یہ کہا گیا تھا کہ پرائمری سکولوں میں بودھی (لداخی) پڑھائی جاتی ہے اور مڈل جماعتوں میں بودھی کو اختیاری مضمون قرار دیا گیا ہے۔

گلانسی کمیشن کی سفارش کی روشنی میں صنم زربو کو انجینئرنگ کی ٹریننگ کے لئے مانچسٹر، انگلینڈ بھیجا گیا۔ جبکہ وادیٔ کشمیر سے تین اور جموں صوبہ سے تین اُمیدواروں کا بھی اِسی مقصد کے لئے اِنتخاب کیا گیا اور اُنہیں انگلینڈ بھیجا گیا۔

اسی اثنا میں سکولوں کی تعداد بڑھائی گئی۔

اُنہی دِنوں لیہہ کے کئی ذی حیثیت خاندانوں نے آگے تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے بیٹوں کو سرینگر بھیجا۔ اُن میں خواجہ عطا اللہ، ایلی ایزر جولدن، دانیال دانا، خواجہ عبدالوحید شامل تھے۔ خواجہ عطا اللہ نے علی گڑھ یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم. اے کیا۔ یہ لداخ کے پہلے مسلمان تھے جنہوں نے اعلا تعلیم حاصل کی۔ شروع میں یہ سرینگر کے انگریز ریذیڈنٹ کے دفتر میں جونیئر افسر تقرر ہوئے۔ ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے جہاں وزارتِ خارجہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے بعد لیبیا اور نیپال میں حکومتِ پاکستان کے سفیر بھی رہے۔ عبدالوحید نے بھی علی گڑھ یونیورسٹی سے بی. اے کیا۔

لداخ کا پہلا گریجویٹ ایک عیسائی جے دیچن تھا۔ وہ آزادی کے بعد لیہہ میں ڈپٹی کمشنر بھی رہے۔ ایلی ایزر جولدن نے گریجویشن کے بعد لاہور یونیورسٹی سے تعلیم میں بی. ٹی کی۔ دانیال دانا فوج میں کپتان ریٹائر ہوا۔ اُن کے بعد محمد اِقبال دراسی اور وزیر مہدی بلتستان کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ دونوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم. اے، ایل. ایل. بی کی تھی۔

کرگل کی جمیلہ خانم پہلی خاتون تھی جنہوں نے ۱۹۱۷ء میں کرگل میں بطور اُستانی کام کیا۔ لیہہ میں اریس ڈولزین پہلی اُستانی تھی۔ جبکہ امینہ بیگم مسلمان خواتین میں اور ایشے چھومو بودھوں میں پہلی اُستانی تھی۔ دونوں نے پچاس کی دہائی میں ملازمت شروع کی۔ ڈاکٹر ادت زیر اور ڈاکٹر چھرنگ لانڈول اوّلین خاتون ڈاکٹر تھیں۔

جولائی ۱۹۳۳ء میں چند لداخیوں نے لداخ بدھسٹ ایجوکیشن سوسائٹی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ راجہ جگمت ڈاڈول اِس کے صدر، کلون لبزانگ چھوانگ نائب صدر، چھیتن پنچگ سکریٹری، منشی صنم چھوانگ اسسٹنٹ سکریٹری، ماسٹر موروپ گیالچن اسسٹنٹ سکریٹری اور سکلزانگ شاہ خزانچی مقرر ہوئے۔

اُنہی دِنوں ہندی کے ادیب راہول سنکرو اتسائن دُوسری دفعہ لداخ کی

سیاحت پر آیا تھا۔ اُنہوں نے ۱۵ر جولائی ۱۹۳۳ء کو لیہہ سے اپنے بھائی آنند کو لکھا:

''آج ایک چھوٹی سی تنظیم ''لداخ بودھ شکشا سمتی'' قائم ہوئی ہے۔''

لیہہ میں اپنے قیام کے دوران اُنہوں نے لداخ کے بودھ لیڈروں کی درخواست پر تین نصابی کتابیں مرتب کیں جو ایک گرایمر، صرف ونحو اور تین ریڈرز پر مشتمل تھیں۔

لداخ میں اِس سفر کے دوران راہول سنکرواتسائن نے بدھ دھرم اختیار کیا۔ اُنہوں نے لداخی بودھوں کی طرف سے مہاراجہ کے لئے ایک درخواست قلم بند کی۔ اُس میں اُردو کو پانچویں جماعت تک اختیاری زبان بنانا اور اس کی جگہ لداخی کو ذریعہ تعلیم قرار دینا، بودھ طالب علموں کے لئے خصوصی وظیفہ مقرر کرنا، علاقے میں ایک بودھ اسسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز کی تقرری اور لیہہ مڈل سکول میں سنسکرت کے ایک اُستاد کی تعینات کی مانگیں شامل تھیں۔ آخری مطالبہ لداخی بودھوں سے کہیں زیادہ راہول سنکرواتسائن کی اپنی خواہش تھی۔

لیکن لداخ بڈھسٹ ایجوکیشنل سوسائٹی ایک فعال تنظیم ثابت نہیں ہوئی۔ خاص کر راہول سنکرواتسائن اِس کے ممبروں سے مایوس تھے۔ اُن کا تاثر تھا کہ لداخی بودھ لیڈر کاہل اور سُست ہیں۔ اُن دِنوں ہائی سکول اور کالجوں میں پڑھنے والے بودھوں کے لئے چھ وظیفے مخصوص تھے۔ لیکن وظیفے کی یہ رقم منسوخ ہو جاتی تھی کیونکہ بہت کم بودھ طلباء آگے تعلیم حاصل کرنے کے لئے کشمیر جاتے تھے۔

سوسائٹی لوگوں میں تعلیمی جاگرتی اور سماجی بیداری لانے میں کامیاب نہیں رہی تھی۔ اِس کی ایک مثال یونان کے پرنس پیٹر کی سروے رپورٹ میں ملتی ہے۔ سوسائٹی کے قیام کے پانچ سال بعد پرنس پیٹر نے ۱۹۳۸ء میں لیہہ میں چھ خاندانوں کا تعلیمی، سماجی اور معاشی سروے کیا تھا۔ یہ چھ خاندان تھوق تھوق، مائے، ژنگبو، گوبا، اولدن اور غت پو پا تھے۔

سروے کے مطابق ۱۹۳۸ء میں سبھی خاندانوں کا وسیلہء معاش صرف کھیتی باڑی تھا۔ایک بھی ملازم نہیں تھا۔۹۰ فیصد کنبوں میں پولی ینڈری مروّج تھی۔ پرنس پیٹر کے الفاظ میں تب لیہہ ایک بڑا گاؤں جیسا تھا اور آبادی ۲۳۷۷ نفوس تھی۔

۴۲ سال بعد ۱۹۸۱ء میں ایک انگریز پروفیسر جان کروک اور ایک تبتّی چھرنگ شکیا نے دوبارہ اِن چھ خاندانوں کا سروے کیا۔تب ۳۶ مردوں میں ۱۸ کھیتی باڑی کرتے تھے اور باقی ۱۸ دُوسرے پیشوں سے منسلک تھے۔ اِن میں انجینئر، کوآپریٹو منیجر، اُستاد، پولیس، کلرک اور فوجی شامل تھے۔ ۲۰ طلباء زیر تعلیم تھے۔ ان میں ایک یونیورسٹی اور دُوسرا کالج میں پڑھتا تھا۔ پولی ینڈری نئی نسل میں ختم ہوگئی تھی۔ گھریلو زندگی میں خوشگوار تبدیلی آئی تھی اور سبھی معاشی طور پہلے سے بہت بہتر تھے۔ لیہہ کی آبادی میں بڑا اضافہ ہوا تھا اور دس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔

آج اُنہی چھ کنبوں کا سروے کیا جائے تو صورتِ حال پہلے سے مختلف ہوگی۔ میرے خیال میں ہر گھر میں ٹیلی فون ہوگا اور کم سے کم تین چار گھرانوں کے پاس گاڑیاں ہوں گی۔

۱۹۳۹ء میں شری دھر کول ڈُولو اسسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز کی حیثیت سے لداخ آئے اور درمیان میں تھوڑا سا وقفہ چھوڑ کر وہ ۱۹۴۸ء تک لداخ میں اِسی عہدے پر فائز رہے۔ وہ ماہرِ تعلیم، قلم کار اور زبان دان تھے اور ایک با اصول اِنسان تھے۔ اُنہوں نے اپنی کارکردگی اور محنت سے اپنے دورانِ ملازمت لداخ میں تعلیم کا معیار کافی بلند کیا۔

شری ڈُولو کرگل، لیہہ اور سکردو تحصیلوں کے تمام سکولوں کا سال میں کم سے کم ایک دفعہ پیدل یا گھوڑے پر معائنہ کرتے تھے۔ ان تینوں تحصیلوں کا مجموعی رقبہ ایک لاکھ مربع کلومیٹر سے کچھ زیادہ تھا۔اُن کا طریقِ معائنہ بڑا پختہ اور نتیجہ خیز تھا۔ وہ ہر کلاس کا بلاناغہ معائنہ کرتے۔ بچوں سے سوالات پوچھتے، گفتگو سنتے، کاپیاں چیک کرتے، اِملا

دیتے، کھیل کود کی طرف توجہ دیتے تھے حتیٰ کہ ایک ایک بچّے اور ایک ایک مضمون کا خیال رکھتے تھے۔ ایسے میں کئی دفعہ ایک پرائمری سکول کا معائنہ کرتے ہوئے شام ہو جاتی تھی۔ اُستادوں اور بچوں کو زبانی ہدایات دینے کے علاوہ وہ کسی لاگ لپٹ کے بغیر سکول کے لاگ بُک میں حسبِ ضرورت اُردو یا انگریزی میں اپنی رپورٹ لکھتے اور غلطیوں اور خامیوں کی نشان دہی کرتے تھے۔ اساتذہ اُن کی رپورٹ غور اور سنجیدگی سے پڑھنے پر مجبور ہو جاتے تھے کیونکہ دُوسرے معائنے کے دوران بچوں کی پڑھائی میں کتنا سدھار آیا ہے اور اُن کی ہدایات پر کہاں تک عمل کیا ہے، اسی کی روشنی میں وہ آگے اقدام لیتے تھے۔ ایک اچھے اور محنتی اُستاد کی وہ قدر اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

سفر اور معائنہ کے دوران وہ کسی اُستاد سے چائے کی ایک پیالی تک نہیں پیتے تھے۔

لداخ کے پُرانے اُستاد شری دھر کول ڈُولُو کے خلوص، جذبہ اور صلاحیت کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔

شری دھر ڈُولُو تعلیمی افسروں اور استادوں کے لئے ایک ROLE MODEL نمونہ ہیں۔ اُسی زمانے میں لداخ نے ایلی ایز رجولدن کے نام سے ایک مثالی اُستاد پیدا کیا ہے۔ اُن سے متعلق اِس کتاب میں ایک مضمون دیا گیا ہے۔

آزادی کے بعد تعلیم: آزادی سے پہلے لیہہ، کرگل، اور سکردو تحصیلوں میں ۴۶ پرائمری اور ۳ مڈل سکول تھے۔

آزادی کے بعد لداخ میں تاریخ ساز اِنقلاب آیا ہے۔ سکولوں کا جال بچھا ہے اور خواندگی کی شرح بہت بڑھی ہے۔

۱۹۴۹ء میں ریاستی سرکار نے ریاست کے مستقل باشندوں کے لئے آئین کی روشنی میں یونیورسٹی کی سطح تک مفت تعلیم دینے کا اعلان کیا۔

۱۹۵۰ء میں ۱۴ سال کی عمر تک کے بچوں کے لئے تعلیم لازمی قرار دی اور

لیہہ کے نویں درجے کے سکول کو ہائی سکول کا درجہ دیا۔

لداخی طلبا کے لئے حکومت نے قابلیت، غریبی اور سرحدی وظائف دینے کی سکیموں کا اعلان کیا۔ سرحدی وظائف کا اطلاق چنگ تھنگ اور نوبراہ کے طلبا پر ہوتا ہے۔

۱۹۶۱ء میں لڑکوں کی شرح خواندگی ۱۵ اعشاریہ ۴ فیصد اور لڑکیوں کی ایک اعشاریہ صفر فیصد تھی اور مجموعی شرح خواندگی ۱۸ اعشاریہ ۳ فیصد تھی۔

۱۹۸۰ء میں ۲۲/ اعشاریہ ۹ فیصد تک پہنچی۔ پھر ۳۲ فیصد کو چھونے لگی۔

۲۰۰۰-۲۰۰۱ میں تعلیمی فیصد شرح:

لیہہ ضلع:

کل فیصد شرح خواندگی	۶۲ فیصد
لڑکیوں کی شرح فیصد خواندگی	۵۰ فیصد

کرگل ضلع:

کل فیصد شرح خواندگی	۵۸ فیصد
لڑکیوں کی شرح فیصد خواندگی	۴۱ فیصد

۱۹۸۰ء میں موراوین مشن سکول اور ۱۹۹۲ء میں امامیہ سکول دوبارہ کھلے۔

۲۰۰۱-۲۰۰۲ء میں لداخ میں سکولوں کی تعداد

	ضلع لیہہ	ضلع کرگل
ہائر سکینڈری سکول	۴	۶
ہائی سکول	۲۵	۳۱
لوور ہائی سکول	-	۹
مڈل سکول	۵۳	۴۰
پرائمری سکول	۱۸۹	۹۷۲
سی ایس	-	۷

ایس بی ایس		۱۲
کل میزان	۲۷۱	۳۸۴
طلباء کی تعداد:	۱۸۰۰۰	۲۴۰۰۰

اِن کے علاوہ متعدد پرائیویٹ سکول بھی موجود ہیں، جن کے اِمتحانی نتائج بہتر ہوتے ہیں:

خِطّے کا رقبہ: (حالیہ سرکاری ریکارڈ کے مطابق)

ضلع لیہہ کا رقبہ	۵۷۰۰۰ مربع کلومیٹر
ضلع کرگل کا رقبہ	۱۸۰۰۰ مربع کلومیٹر

آبادی:

ضلع لیہہ کی آبادی	۱۱۷۶۳۷ نفوس
ضلع کرگل کی آبادی	۱۱۵۲۲۷ نفوس
گُل آبادی	۲۳۲۸۶۴ نفوس

۱۹۸۸ء میں لیہہ میں ایک غیر سرکاری تنظیم Students; Educational and Cultural Movement of Ladakh (SECMOL) قائم ہوئی۔ جس نے لداخ میں تعلیم کو فروغ دینے کے لئے نمایاں کام کیا ہے۔ تنظیم نے Operation New Hope کے نام سے تعلیم و تدریس میں سدھار لانے اور معیار بلند کرنے کے لئے ایک مہم چلا رکھی ہے۔ لداخ کی تہذیب، ثقافت اور تاریخ کی روشنی میں درسی کتابیں مرتّب کی ہیں۔ اُستادوں کے لئے تربیتی کورس کا اِہتمام کیا ہے اور تعلیم کو فروغ دینے کے لئے گاؤں والوں کو منظّم کیا ہے۔ صنم وانگ چگ تنظیم کی رُوحِ رواں ہیں۔

آج لداخ تعلیمی لحاظ سے ایک اہم دوراہے پر ہے۔ ایک طرف سکولوں کا جال بچھا ہے اور خواندگی کی شرح روز افزوں بڑھ رہی ہے۔ دُوسری طرف تعلیمی معیار

کا مسئلہ ایک بڑا سوالیہ نشان بنا ہے۔ یہ اُستادوں، طلباء اور والدین کا مشترکہ مسئلہ ہے۔

میری دانست میں تعلیمی معیار بلند کرنے کے لئے سکولوں میں دُور رس اور نتیجہ خیز معائنہ ہونا چاہئے، جس کی مثال اور جس کا معیار شری دھر ڈولو نے رکھا تھا۔ یہ معیار تمام سکولوں کے لئے متوازن ہونا چاہئے۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک اچھے پرائمری سکول سے طلباء جب ایسے مڈل یا ہائی سکول میں داخلہ لیتے ہیں، جہاں معیار پست ہو تو سابق اُستادوں اور طلباء دونوں کی محنت اکارت ہو جاتی ہے یا پست معیار کے پرائمری سکول سے اچھے مڈل یا ہائی سکول میں داخلہ لیتے ہیں تو وہ طلباء اُستادوں کے لئے مسئلہ بن جاتے ہیں۔

پرائیویٹ سکولوں کی طرح سرکاری سکولوں میں بھی نرسری نظام مروّج کرنے کی ضرورت ہے تاکہ جماعت اوّل تک پہنچتے پہنچتے طالب علم زبان و بیان کی بنیادی باتیں سیکھ لے۔ مشکل درسی کتابوں کے پیشِ نظر ہر پرائمری سکول میں کم سے کم ایک گریجویٹ اُستاد تعینات کیا جائے۔ درس و تدریس صرف اِمتحانی نتائج Result Oriented کے نقطۂ نظر سے نہیں ہونی چاہئے بلکہ طلباء میں علم و صلاحیت بڑھانے کے لئے ہونی چاہئے۔ ایک لائق اور ذمہ دار ہیڈ ماسٹر سکول میں دُور رس تبدیلیاں لا سکتا ہے۔

لیہہ بازار ۱۹۱۷ء میں

لوک گیت

دُنیا کی ہر زبان اور خطّے کے اپنے لوک ادب اور لوک گیت ہیں۔ لداخی زبان اس سے مُستثنیٰ نہیں ہے۔ لداخی ادب گونا گوں لوک گیتوں سے مالا مال ہے جنھیں دُنیا کے بہترین لوک گیتوں کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

یہ گیت یہاں کے سماجی، سیاسی، تاریخی، مذہبی اور تمدّنی عوامل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ اُن جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں جو تمام اِنسانوں میں قدرِ مشترک ہیں۔

لداخ کے نثری ادب کے مقابلے میں لوک گیتوں کا سرمایہ بڑا زرخیز ہے۔ ماضی میں راجہ، وزیر اور پیشہ ور گویّے تک اچھے شاعر اور گیت کار ہوتے تھے۔ ہر گاؤں میں اچھے گلوکار رہتے تھے۔

لداخی تاریخ اور تمدّن کے ایک ماہر ڈاکٹر اے. ایچ فرانکی لکھتے ہیں:

"لداخ کے لوگ شاعری کی فطری صلاحیت رکھتے ہیں لیکن شاعری اور قومی ادب کو نشو و نما پانے کی مناسب طور پر اجازت نہیں دی گئی۔ تاہم ان گیتوں کا اعلا معیار اِس بات کا غماز ہے کہ اگر لداخی ادب اور شاعری کو آزادانہ طور پر پھلنے پھولنے کا موقع ملتا تو ان لوگوں کی ادبی صلاحیت اِنتہائے کمال کو پہنچ جاتی۔"

فرانکی نے یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ کس نے اور کیوں لداخی ادب اور شاعری کو نشو و نما پانے کی مناسب طور اجازت نہیں دی۔

لوک گیت شروع میں تحریر میں نہیں لائے گئے ہیں اور زبانی نسل در نسل

منتقل ہوئے ہیں۔ اکثر گیتوں کے خالق گمنام ہیں۔ ان گیتوں میں سوز و گداز ہے، لوچ اور گھلاوٹ ہے۔ درد و کرب اور طنز و مزاح ہے۔ اِن گیتوں سے سامعین گیت کاروں کے عصری شعور اور حسّیت کا تاثر پاتے ہیں۔

ایک لداخی ادیب ٹشی ربگیس نے لداخی لوک گیتوں کو کئی جلدوں میں مرتّب کیا ہے۔ اُنہوں نے لوک گیتوں کی گیارہ قسمیں بیان کی ہیں تاہم گیتوں کی قسمیں اُن سے کہیں زیادہ ہیں۔ ذیل میں ان کی اہم قسمیں دی جاتی ہیں:

۱۔ ٹال لُو یعنی مجلسی گیت: یہ گیت سماجی مجلسوں میں گائے جاتے ہیں۔

۲۔ چھوس لو یعنی مذہبی گیت: یہ گیت بڑے لاماؤں کے حضور میں گائے جاتے ہیں۔

۳۔ چھوق لو یعنی شاہی گیت: یہ بادشاہوں اور رانیوں کی تعریف میں لکھے گئے گیت ہیں۔

۴۔ چھنگ لو یعنی مے گساروں کا گیت: مئے نوشی کی مجلسوں سے متعلق گیت ہیں۔ اِن گیتوں میں شراب کی تعریف کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ شراب کیسے کشید کی جاتی ہے۔

۵۔ پق لُو یعنی عروسی گیت: شادی بیاہ پر گائے جاتے ہیں۔ ان گیتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ صرف باراتیوں کے لئے گائے جانے والے گیتوں کی تعداد ۳۶۰ ہے جو ٹھولو کہلاتے ہیں۔ دُلہن، دُلہن کی سہیلیاں اور عزیزوں کے گائے جانے والے گیت الگ الگ ہیں۔

۶۔ ژ یگ لُو یعنی طنزیہ گیت: یہ گیت مجلسوں اور تقریبوں میں سوال و جواب کی صورت میں گائے جاتے ہیں۔ مقابلہ عموماً ایک مرد اور ایک عورت یا دو پارٹیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ طنزیہ گیتوں میں سماجی نابرابری پر چوٹ ہے۔ ان میں محبوبہ کی بے اعتنائی یا عاشق کی بے وفائی کا گلہ ہوتا ہے۔

۷۔ رنگ لُو یعنی خرافات قسم کے گیت: ان گیتوں میں عامیانہ پن اور شوخی پائی جاتی ہے۔

۸۔ جونگ لُو یعنی عوامی گیت: جو مختلف مجلسوں میں گائے جاتے ہیں۔

۹۔ جبرو گیت: یہ گیت لداخ کے ایک خانہ بدوش قبیلہ سے وابستہ ہیں۔ ان گیتوں میں بادشاہوں، لاماؤں اور گنپوں کی تعریفیں اور پیار و محبت کے تذکرے ہوتے ہیں۔ جبرو گیت رقص کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۰۔ شون لُو یعنی شون رقص سے وابستہ گیت: یہ شاہی دورِ حکومت سے متعلق گیت ہیں جو سالِ نو کے تہوار پر رقص کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔

اِن کے علاوہ موسموں، تہواروں، شکار اور تیراندازی کے روایتی میلوں سے متعلق الگ الگ لوک گیت ہیں۔ نیز لوریاں، رزمیہ، محنت کشوں کے جوشیلے گیت، نیک شگون کے لئے گائے جانے والے اور عشق و محبت کے گیت ہیں جو اِنسانی دل کی مختلف کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ گیت میلوں اور تیوہاروں پر گائے جاتے ہیں۔

کھیتی باڑی کے مختلف مرحلوں پر گائے جانے والے گیت بڑے مقبول ہیں۔ مرد، عورتیں، چھوٹے اور بڑے کام کرتے ہوئے کورس میں یہ گیت گاتے ہیں۔ اِن سے محنت اور مشقت آسان ہوتی ہے۔

ہل جتائی کے وقت ''زو'' (مخلوط نسل کے مقامی بیل) کی تعریف میں گیت گایا جاتا ہے۔ جس کا ایک بند یہ ہے:

''زو'' دیوتاؤں کی سرزمین سے دُنیا میں آئے ہیں تاکہ دھرتی کا سینہ چیر کر اِس کے جوف میں بیج ڈالیں۔''

اِسی طرح زو کے چمکتے ہوئے سینگوں کی مدح سرائی کی جاتی ہے۔ گیت میں کھیتی کی زمین کو مکھن میں گندھے ہوئے ستّو کی طرح ملائم بتایا گیا ہے۔

سینچائی کے وقت گیتوں میں سورج کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ خوب چمکے اور برف کو پگھلا دے جس کے بغیر فصل مرجھا جائے گی اور انسان اور جانور بھوکے مر جائیں گے۔

اچھی فصل ہو تو اسے ہندوستان کے شاداب میدانوں کی زرخیزی سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔

فصل کٹائی پر سنہرے خوشوں کو چمکتے ہوئے سونے سے مثال دی جاتی ہے۔ جسے فولاد کی بنی ہوئی جھرنے کی طرح شفاف درانتی تیز دھار آبشار کی طرح کاٹتی ہے۔

اِس کے بعد جب اناج اور بھوسہ الگ کرنے اور اُسے اُسانے کا عمل آتا ہے تو گیت میں ہوا کو تیز چلنے کی دعوت دی جاتی ہے تا کہ بھوسہ اُڑ جائے اور اناج کے دانوں سے الگ ہو جائے۔

فصل کی کٹائی پر دیوی دیوتاؤں کو بطورِ نذرانہ گندم کے خوشے چڑھائے جاتے ہیں۔ لداخ کے ایک گاؤں شے میں فصل کٹائی پر ایک تیوہار منایا جاتا ہے جس میں دیوی کی تعریف میں یہ گیت گایا جاتا ہے:

"سُنہری ٹوپی پہن کر ہم ماں (دیوی) دورجے چھنموں کو سلام کرنے آئے ہیں۔

اے ماں، ہم شے کے باسی شون ناچ پیش کر رہے ہیں۔"

ذیل میں ہم کئی اقسام کے گیتوں سے ایک یا ایک سے زیادہ بندوں کا اُردو ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

لداخ اپنے جنگلی جانوروں کے لئے زمانۂ قدیم سے مشہور ہے۔ چنانچہ شکار پر متعدد گیت ہیں۔ اِن میں کئی کافی پرانے ہیں۔ چند گیتوں کے کچھ بند ملاحظہ ہوں:

''میرے اجداد کی شکار گاہ میں کیل پائے جاتے ہیں
سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں یہ کیل اکٹھے رہتے ہیں
اُن کے سینگ قدیم گراں قدر زیور ہیں
اُن کے بالوں کی رنگت سنہری ہے
ہمارے اجداد بڑے اچھے شکاری تھے
وہ گلگت سے یہاں آئے تھے
اے میرے طاقتور شکاری کے بیٹے
کُتّے کے جس بچّے نے ابھی کوئی شکار نہ سیکھا ہو
اُس سے مارخوروں کا شکار کھیلنا کہاں کا اِنصاف ہے....''

آخری گیت کے بند سیّد محمد عباس کاظمی کی کتاب ''بلتی لوک گیت'' سے ماخوذ ہیں۔ لداخی اور بلتی زبانوں میں گہری مماثلت ہے اور دونوں خطّوں کے لوگوں کا کلچر بھی کم و بیش ایک جیسا ہی ہے۔

جہاں شکار کی تعریف میں گیت ہیں۔ وہاں شکار پر ایک دردناک گیت یہاں پیش ہے۔ جب ایک مادہ ibex کیل شکاری کی گولی سے زخمی ہو جاتی ہے۔ اُس کے بچے سے ماں کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی لیکن ماں اپنے بچے سے چھپاتی ہے۔

''بچہ کہتا ہے، میری ماں، تم روئی ہوئی لگتی ہو
ماں: میرا پیارا بیٹا، تمہاری ماں نے کچھ پانی پیا ہے
بچہ: ماں، میں تمہارے بدن پر کچھ سرخ سرخ سا دیکھ رہا ہوں
ماں: میرا پیارا بیٹا، میں سرخ دلدل میں لوٹا ہوں
بچہ: ماں، درّے پر مجھے ایک آدمی نظر آ رہا ہے
ماں: پیارا بیٹا، درّے پر ایک چرواہا ہے

بچہ: ماں، میں اُس کے کندھے پر ایک بندوق دیکھ رہا ہوں

ماں: پیارا بیٹا، یہ تو محض چرواہے کا ڈنڈا ہے

میرے عزیز، ایک سو بڑے کیلوں کو آگے چلنے دو

ایک سو بڑے کیلوں کو تمہارے پیچھے چلنے دو

میرا پیارا مضبوط اور سیانا بیٹا، سب سے آگے نہ چلو

میرا چہیتا بیٹا، سب کے آخر میں چلو......"

عروسی گیت کے نمونے ملاحظہ ہوں:

"ایک شبھ دن کو دیکھ کر ہم اپنے چھوٹے بیٹے کی شادی کرائیں گے

ایک اچھے ستارے کو دیکھ کر ہم موروپ ستزین کی شادی کرائیں گے

اس مبارک روز آسمان پر تارے چمکتے ہیں

اس مبارک روز آفتاب دھرتی پر کرنیں بکھیرتا ہے....."

دُلہن کو دُعا:

میری خوبصورت لڑکی جب تم پیدا ہوئیں

سرگ میں نقاروں کو تھاپ دی گئی

میری خوبصورت لڑکی جب تم پیدا ہوئی

زیرِ زمین شنکھ سجایا گیا

خوبصورت لڑکی تمہاری کوکھ سے پلے جیسے ایک بیٹے کا

جنم ہو....."

پلے لداخ کی ایک مشہور داستان کے ہیرو کا نام ہے۔

باراتی دُلہن کے گھر پہنچتے ہیں۔ اور روایتی طور ریشمی رومال کی سوغات پیش کرتے ہیں۔ رات نغمہ و سرود میں گزرتی ہے۔ دُوسری صبح باراتی یوں گیت گاتے ہیں:

''صبح کا تارا نکلا ہے، جلدی کرو
دُلہن اجنبی دیس جا رہی ہے، اسے گہنے پہناؤ
اِس کا بناؤ سنگار کرو.....''

ایسے میں دُلہن بابل کا آنگنا چھوڑ دیتی ہے۔ تب باراتی یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں:

''ہم نئی نویلی دُلہن کو لے کر (سسرال) جا رہے ہیں
دُلہن آنکھوں کو لے کر (سسرال) جا رہے ہیں......''

طنزیہ گیت کے چند بند ملاحظہ کیجیے:

''اگر چہ اُونٹ کی گردن لمبی ہے
لیکن یہ دریا پار گھاس تک نہیں پہنچ سکتی
خرگوش کی ٹانگیں چھوٹی ہیں
تاہم کوہستانی درّے کو آسانی سے پار کر سکتی ہیں
لذیذ کھانے میں جو لذّت ہے
وہ تمباکو کے دِلکش پُر لطف دھوئیں میں نہیں.....''

مذہبی گیت:

''بھورے رنگ کے پیڑوں کے درمیان
سونے کے ایک گہنے کی طرح ایک گنپہ ہے
بھورے رنگ کے پیڑوں کے درمیان
سونے کے ایک گہنے کی طرح ہمس گنپہ ہے.....''

حزنیہ گیت:

سکردو (بلتستان) کے حکمران علی شیر خان نے ۱۶۰۰ء میں لداخ پر حملہ کیا۔ لداخ کے راجہ جمیا نگ نمگیل کو شکست ہوئی اور گرفتار ہوا۔ علی شیر خان نے راجہ کی ایک

بیٹی سے شادی کی اور سکر دو پہنچایا۔ کچھ عرصہ بعد علی شیر خان نے ملکہ کو طلاق دے دی اور اُسے لداخ بھیج دیا۔ ملکہ کو بڑا دُکھ ہوا اور اُس نے شکایت کے طور پر ایک گیت کہا۔ اُس تاریخی گیت کے دو بول دیکھئے:

''آپ تو ملکہ کو سینکڑوں اِنسانوں اور گھوڑوں کی معیت میں لائے تھے
اور (اب واپس) بھیجتے وقت ایک آدمی اور ایک گھوڑا بھی اُس کے ساتھ نہیں
آپ جب ملکہ کو (سکردو) لائے تھے تو ہر قدم پر اُس کے پیروں کے نیچے فیروزے کی سلیں بچھائیں تھیں
اور اب (لداخ واپس) بھیجتے وقت اُسے ننگے پاؤں بھیج رہے ہیں....''
(مترجم: سید محمد عباس کاظمی)

لداخ میں سُورو کرتسے نام کے علاقے میں اٹھارویں صدی میں کھری محمد سلطان چونام کا راجہ حکومت کرتا تھا۔ راجا نے اپنی شادی پر یہ منادی کرائی کہ اس سلطنت کا ہر چھوٹا بڑا اُس تقریب میں شرکت کرے۔ کرتسے کے ایک گاؤں میں ایک یتیم بچی اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ سوتیلی ماں نے اس بچی کے شوق کو نظر انداز کرتے ہوئے اُسے گھر اور مال مویشی کی دیکھ بال کے لئے چھوڑ دیا۔ اِس دُکھ میں یتیم بچی نے ایک گیت گایا۔ جس کے دو بند یہ ہیں:

''راجہ کھری سلطان کی شادی میں (شرکت کے لئے) پہاڑ کے سرسبز درّوں میں رہنے والے رام چکور بھی اپنے بچے لئے آبادیوں میں اُتر رہے ہیں
مجھ بن ماں کی یتیم کو باپ کی چراگاہ میں بھیڑیں چرانے کے لئے جانا پڑ رہا ہے
راجا کھری سلطان کی شادی میں (شرکت کے لئے) پہاڑ کی چوٹی پر

رہنے والے ہرن بھی اپنے بچے لئے آبادیوں میں اُتر رہے ہیں
مجھ بن ماں کی یتیم کو باپ کی چراگاہ میں بکریوں کو چرانے کے لئے لے
جانا پڑ رہا ہے

(مترجم: کاظمی)

میکے یا وطن کی یاد سے متعلق حزینہ گیت:

سُورو کرتسے کے راجا کھری سلطان چو کی بہن کی شادی لداخ کے ایک علاقہ زنسکار کے راجا چھوانگ نمگیل سے ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کئی سال تک اپنے میکے نہیں جاسکی تو اُسے گھر کی یاد ستانے لگی۔ یہ گیت اُسی کی دین ہے:

''اے میری سہیلی میں پیدا تو سورو کرتسے میں ہوئی تھی
لیکن پدم کا محل میرے مقدر میں لکھا تھا
اُونچا بہت ہی اُونچا زنسکار کا محل ہے
اِس اُونچائی کو میں کیا کروں (کہ جہاں سے) نہ کچھ نظر آئے
اور نہ (جہاں سے) کہیں پہنچ سکے
شاہراہ سے گزرنے والے خوش نصیب (اے سوار)
تم میرے اِکلوتے بھائی کے محل کے سامنے سے گزرنا
سرسراتی ہوا خوش قسمت ہے (اے سرسراتی ہوا)
تم جا کر میرے اِکلوتے بھائی کے محل کی کھڑکی سے ٹکرانا
آسمان پر اُڑنے والا نیلا کبوتر خوش قسمت ہے (اے نیلے کبوتر)
تُم جا کر میرے اِکلوتے بھائی کے محل کے جھروکے پر اُتر جانا.....''

(مترجم: کاظمی)

ایسا ہی ایک اور لوک گیت لداخ اور بلتستان کے دیرینہ تعلقات اور ثقافتی ہم آہنگی کی عکاسی کرتا ہے۔ چپلوٗ' بلتستان کے ایک راجہ' فتح علی خان کے چچا دولت علی

خان کی شادی لداخ کے شاہی خاندان کی ایک شہزادی سے ہوئی۔ شہزادی کو اپنے گاؤں ہُندر کی یاد ستانے لگی۔ یہ گیت اُن سے منسوب ہے:

''میں پیدا تو ہُندر میں ہوئی تھی لیکن پہنچی چیلُو میں

اِس شہر چیلُو میں مجھے کوئی عزیز یا بھائی نظر نہیں آیا

....

اِس شہر چیلُو میں مجھے کوئی بہن یا سہیلی نظر نہیں آئی......''

(مترجم: کاظمی)

لداخ کے مون قبیلے کے ایک سازندے کا اپنی سارنگی سے متعلق ایک پرانے شاہکار گیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''یہ نہ سوچئے کہ میری سارنگی کا کوئی سرپرست نہیں

یہ عظیم (مہربان) باپ سے محروم ہے

یہ ٹشی وانگیل (مون سازندہ) نے کہا

پنسل سیڈر کا رُوحانی جنگل (جہاں یہ پیدا ہوا)

اس کا عظیم باپ نہیں تو بھلا کون ہے؟

یہ نہ سوچئے کہ میری سارنگی ماں سے محروم ہے

یہ ٹشی وانگیل بولا

اس پر منڈھی ہوئی بکری کی کھال کی تاریں

اس کی ماں نہیں تو بھلا کون ہے؟

یہ نہ سوچئے کہ میری سارنگی کا کوئی دوست نہیں

یہ ٹشی وانگیل بولا

اس کے منہ سے اُبلتا ہوا شیریں نغمہ اس کا دوست نہیں تو بھلا کون ہے؟

یہ نہ سوچئے کہ میری سارنگی کا کوئی بھائی نہیں

یہ ٹشی وانگیل بولا

یہ میری دس اُنگلیاں اس کے بھائی نہیں تو بھلا یہ کون ہیں؟.......''

کشمیر اور لداخ کے درمیان صدیوں سے تمدّنی اور تجارتی تعلقات رہے ہیں۔ اِسی ضمن میں ایک گیت پیش کیا جاتا ہے:

''کشمیر کے شہر کے مرکز میں ایک میلہ لگتا ہے

اے برہمن! اس میلہ سے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

کشمیر کے شہر میں دُودھ جیسا سپید چاول ہے

اے برہمن! اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے......''

ایک پرانے لداخی لوک گیت میں اِس زندگی میں زیادہ سے زیادہ خوشیاں لٹانے اور لطف اندوز ہونے کی بات کہی گئی ہے۔ فرانکی کا خیال ہے کہ یہ گیت بدھ فلسفۂ تعلیم کے خلاف ہے اور خطّے میں بدھ مت کی آمد سے پہلے کہا گیا ہے۔ گیت کے چند بند دیکھئے:

''ہائے موسمِ گرما کے تین ماہ کے بغیر پھول نہیں ہوتے

اِس ایک زِندگی میں جتنی خوشیاں لٹا سکے، لُوٹو

اِس ایک زندگی میں جتنا لطف لے سکو، لے لو!''

لداخ میں کڑاکے کی سردی پڑتی ہے، اِس لئے دُھوپ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ کئی لوک گیتوں میں سہانی دُھوپ کی تعریفیں کی گئی ہیں۔ لیہہ ماضی میں وسطِ ایشیا کا تجارتی مرکز تھا اور بہت سارے لداخیوں کے گزارے کا انحصار تجارت پر تھا۔ ذیل کا گیت اِنہی حقائق پر مبنی ہے:

''مشرق سے سورج طلوع ہوا، مشرق سے نکلنے والے اے مہربان گرم سورج!

تیری گرم کرنیں میری مادرِ وطن کو گرمی عطا کریں

چاند کی دِلکش چاندنی مرکزی چھشوت[1] کو روشنی عطا کرے
اس مبارک دن پر میں (ایک لڑکا) سفر پر نکلا
جیوتشی کی ہدایت پر میں علی گھر سے سفر پر نکلا
اے خدا! میں دُعا گو ہوں
مجھے اپنے مقصد میں کامیابی عطا کر.........''

لداخی لوک ادب میں رُومانی گیتوں کا بھی بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ چند رُومانی گیت پیش ہیں:

ایک عاشق اپنی محبوبہ سے کہتا ہے:

''اگر میں خیر ملانو کا اِنتظار کرتا ہوں تو نماز قضا ہو جاتی ہے
اگر نماز کا وقت گزر بھی جائے تو میں قضا پڑھ لوں گا
خیر ملانو، تمہاری قسم، تمہارے نہ آنے سے چوپال اور گلیوں
میں جوانوں کی سیٹیاں خاموش ہو جاتی ہیں
اگر میں خیز ملانو کا انتظار کرتا ہوں تو میرے ماں باپ ناراض ہو جاتے ہیں
اگر میرے ماں باپ ناراض ہوں تو میں اُن سے معافی مانگ لوں گا
خیر ملانو! تمہاری قسم! تمہارے نہ آنے سے کھیتوں کی ہریالی ختم ہو
جاتی ہے....''

(مترجم: کاظمی)

پیار و محبت سے متعلق ایک غنائیہ گیت:

''مرغزار میں، بالائی مرغزار میں ایک پھول کھل رہا ہے
میرے دوست میرے ہمدم، ایک پھول کھل رہا ہے
اس پھول کو اُٹھا لو، اس حسین پھول کو چُن لو

---

[1] لیہہ کے پاس ایک گاؤں کا نام

اگر تم اپنے ہاتھ سے اُسے اُٹھالو گے، یہ مرجھا جائے گا
اسے اپنی رُوح سے سمیٹو اور اپنے دل پر ٹانک دو....''

اِسی قبیل کے ایک اور رُومانی گیت کے چند بند دیکھئے:

''ایک پُر رونق ریشم جیسے باغ میں
ایک خوش نصیب کنول کا پھول کھلا
اصل میں یہ خوش نصیب کنول کا پھول نہیں
یہ حسین وجمیل سلام خاتون ہے....''

ایک لڑکی اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:

''اے مُلبیک کے وزیر! اگر میں یہ سنوں کہ آپ آرہے ہیں
تو یہ لڑکی
(یعنی) میں پگلی تیز رو گھوڑے پر خوبصورت زین سجائے
آپ کی پیشوائی کے لئے آؤں گی......''

ایک بلتی نوجوان اسکردو کی ایک حسینہ گُل حلیمہ پر فریفتہ تھا۔ اُس نے اپنی چاہت کا ذِکر یوں کیا ہے:

''اگر بچپن کے کسی ساتھی کو میرا ذرا بھر خیال ہے
تو شہر جا کر گل حلیمہ خاتون کی خبر لائے
اے گُل حلیمہ خاتون! اگر تم سے میرا بیاہ ہو جاتا ہے
میں عہد کرتا ہوں میں سات مسجدوں میں دیئے جلاؤں گا''
(مترجم: کاظمی)

ایک اور گیت میں ایک لڑکی اپنے محبوب سے یوں گویا ہوتی ہے:

''شرنگ گنہ! اگر تم اُداس ہو جاؤ تو میں تمہارے لئے ایک
ایسا ڈھول

لے آؤں، جو جونیپر کی مبارک لکڑی سے بنایا گیا ہے
اگر تم نے جونیپر کی لکڑی سے بنائے ہوئے ڈھول کو بجایا تو
اِن خوبصورت ہاتھوں پر یہ پگلی قربان ہو جائے گی
میں تم پر قربان جاؤں.....''

(مترجم: کاظمی)

ایک جدید رُومانی گیت کے چند اشعار' جو لڑکا اور لڑکی ڈراموں میں رقص کے ساتھ گاتے ہیں:

لڑکا: میں نے ساری دُنیا کی خاک چھانی ہے، لیکن تم جیسی حسین کہیں نہیں دیکھی
لڑکی: نوجوان! خُدارا، مجھے خوبصورت نہ کہو، مجھے گُنز یز کے پھول سے
تشبیہہ نہ دو، اُس کی رعنائی تو دیکھنے والے کے دِل میں ہوتی ہے (لب پہ نہیں)
خدارا مجھے جانے دو
لڑکا: کاش میں نے تمہیں دیکھا نہ ہوتا، تو یہ حسرت اور کوفت مجھے نہ ہوتی لیکن اب تمہیں میں دیکھ چکا ہوں۔
اِس لئے تمہارے بغیر میری زندگی اجیرن ہو گی....''

سوال و جواب میں رُومانی گیت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

عاشق: کیا تم نے میری محبوبہ کو نہیں دیکھا؟
میری محبوبہ چھرنگ سکیت کو نہیں دیکھا؟
اجنبی: میں تمہاری محبوبہ کو نہیں جانتا
عاشق: چھرنگ سکیت کو نہیں جانتے؟

جس کی زُلفیں دراز ہیں

وہ ابھی اِسی رہ گزر سے گزری ہے

عاشق: کیا تم نے میری محبوبہ نہیں دیکھی؟

میری محبوبہ چھرنگ سکیت نہیں دیکھی؟

دُوسرا اجنبی: میں تمہاری محبوبہ کو نہیں جانتا

عاشق: چھرنگ سکیت کو نہیں جانتے؟

جس کی پیشانی چاند جیسی ہے

وہ ابھی اسی رہ گزر سے گزری ہے....''

عاشق اِسی طرح گیت میں محبوبہ کی ستواں ناک، ہلالی ابروؤں، سرو قد اور موتی جیسے دانتوں کی نشان دہی سے کئی اجنبیوں کو اپنی محبوبہ کی شناخت کراتا ہے۔

ایک غمگین اور مجبور بوڑھی عورت نے آج سے سینکڑوں سال پہلے اپنی اکلوتی بیٹی کے غم میں ایک گیت کہا ہے، جسے ایک معاہدے کے تحت لداخ کے راجہ کے حکم سے چند اور لڑکیوں کے ہمراہ کشمیر کے ایک نواب (حاکم) کو بھیجا جاتا ہے۔ گیت کے چند بند ملاحظہ ہوں:

اگر میں اپنی مینا کو جدا کرتی ہوں تو مینا کے غم میں گھلی جا رہی ہوں

بے چاری مینا کا کیا ہوگا؟

اگر مینا کو حوالہ نہ کروں تو نواب کا غیض وغضب کون مول لے؟

ایک لڑکی کی محبت ریشہ دوانیوں کا شکار ہوتی ہے۔ وہ ایک گیت گاتی ہے جو بڑا مقبول ہوتا ہے۔ گیت کے چند بند ملاحظہ فرمایئے:

''اینسا ٹقپا[1] میں ہرنی آرام سے زِندگی گزار رہی تھی

---

[1] لداخ کی نوبرہ وادی میں ایک پُر فضا مقام کا نام ہے، جو ایک پہاڑی پر واقع ہے۔

لیکن چٹان اور گیدڑ کی سازش سے ہرنی وہاں رہ نہ سکی
پانی اور ریت کے ساز باز سے ماہی وہاں ٹک نہ سکی....''

متعدد مُلکی و غیر ملکی قلم کاروں نے لداخی گیتوں اور نظموں کا انگریزی اور اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اُن میں چند اہم نام فرانکی، ہنلون، روینہ اگروال اور کاچو سکندر خان ہیں۔

نثری ادب میں جیسے ناول، افسانہ نگاری میں لداخ میں کوئی کام نہیں ہو رہا ہے لیکن لداخی شعراء اور گیت کار نظمیں اور گیت خوب لکھ رہے ہیں۔

تیر اندازی کے تہوار کی ایک جھلک
(مضمون ''لوک اور دھارمک ناچ'' ملاحظہ کیجئے)

لوک اور دھارمک ناچ

ناچ کا جاننا لداخ میں سماجی آداب اور لوازمات میں شمار کیا جاتا ہے اور اسے اپنانا باعثِ احترام تصوّر کیا جاتا ہے۔ بودھوں میں گنپوں کے تیوہاروں کا دھارمک ناچ ''چھمز'' دیکھنا اِس دُنیا میں حصولِ سکون اور مرنے کے بعد باعثِ ثواب مانا جاتا ہے۔ اکثر لداخی خاص طور پر بودھ مرد اور عورتیں کم سنی میں لوک ناچ سیکھتے ہیں۔ خوشی کی ہر مجلس اور سماجی تقریب میں ناچ کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر تیوہاروں میں ناچ ایک ناگزیر حصہ ہے۔ لداخ میں بسنے والے تمام فرقوں کے لوگوں پر اس کا اثر پڑا ہے۔

لداخ کے چند قدیم اور جدید لوک گیتوں میں ناچ کی اہمیت اور اس کے رموز و اسرار اُجاگر کئے گئے ہیں۔ ایک قدیم گیت کے چند بندوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''لڑکی کا بدن اِتنا حسین تھا گویا طلائی سانچے میں ڈھالا ہے
اُس کی زلفیں فیروزہ کی جھالریں جیسی تھیں
اے دخترِ آدم! دائیں طرف موڑو
اے سکلزانگ آنگموں! بائیں طرف موڑو
اب پیچھے کی طرف اپنے پیر بڑھاؤ
اس خوبصورت پہاڑی کی جانب
.....................''

سماج میں ایک اچھے رقّاص کی قدر و منزلت ہے۔ ماضی کے ایک گیت کا

ترجمہ پیشِ خدمت ہے:

''زیریں گاؤں کی لڑکیاں رقص میں طاق ہیں
لڑکیو! اِن کو ناچنے کے لئے اُٹھاؤ
اپنی شخصیت کا حسن دوبالا کرنے کے لئے ایک شال لو
اپنے چہرے پر تین مرتبہ ''شوقلو''[ا] لگاؤ
شال اوڑھ کر رقص کے لئے آؤ.....''

لداخیوں کو اپنی انفرادیت کا بہت زیادہ خیال تھا۔ گاؤں کا ہر آدمی یہ سوچتا تھا کہ اُس کے گاؤں سے بڑھ کر دُنیا میں اور کوئی خوبصورت جگہ نہیں ہے۔ اِس کے باسیوں کی صفات میں ایک صفت ناچنا جاننا تھا۔ شے گاؤں سے متعلق اس قبیل کا ایک گیت ملاحظہ ہو:

پچھلے زمانے میں
ہاں پچھلے زمانے میں شے میں
ہر ایک کم خواب کی پوشاک زیب تن کرتا تھا
جس پر اژدھا کی شبیہیں بنی ہوتی تھیں
اور موروں کی طرح رقص کرتا تھا
پچھلے زمانے میں
ہاں پچھلے زمانے میں شے میں
ہر ایک ریشم کی شال اوڑھتا تھا
اور بھیڑوں کی خالص اُون کا بنا کمر بند باندھتا تھا
اور موروں کی طرح رقص کرتا تھا

لداخ میں تین قسموں کے ناچ ہیں۔ لوک ناچ، دھارمک ناچ اور متفرق ناچ۔

[ا] ایک پھل دار رسیلی جڑی بوٹی جو چہرے پر ملاحت لانے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

لوک ناچ:

لداخ کے لوک گیتوں کی طرح لوک ناچ کے ذیل میں متعدد اقسام کے ناچ آتے ہیں۔ اِن میں کئی ناچ تاریخی نوعیت کے حامل ہیں۔ مقبولِ عام لوک ناچ کو دردی ناچ بھی کہا جاتا ہے۔ غالباً یہ قدیم درد قوم کی دین ہے جو لداخ میں آباد ہوئی تھی۔ لیکن یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یہ ناچ لداخ خطّے تک محدود ہے۔ لداخ کے ہمسایہ ملکوں اور علاقوں میں اِس ناچ کا چلن نہیں ہے۔

لوک ناچ کے زُمرے میں آنے والے حسبِ ذیل ناچ ہیں:

زنانہ لوک ناچ: جس میں صرف عورتیں حصّہ لیتی ہیں۔

مردانہ لوک ناچ: جو مردوں تک محدود ہے۔

مخلوط ناچ: مرد اور عورتیں دونوں اکٹھے ناچتے ہیں۔

تین قدموں کا لوک ناچ: یہ لیہہ اور گرد نواح کے دیہات میں زیادہ مقبول ہے اور اِس میں مرد اور عورتیں دونوں حصہ لیتے ہیں۔

شونڈول ناچ: یہ ناچ لداخ کے شاہی دور کی یادگار ہے۔ اور اس میں صرف عورتیں حصہ لیتی ہیں۔ اس ناچ میں رقاصائیں سنگیت کے زیر و بم پر دائیں بائیں جھومتی ہوئی اپنے پیروں کو آگے پیچھے لاتی ہیں اور مہمانوں کو کورنش بجالاتی ہیں۔

شون ناچ: ماضی میں سالِ نو پر لداخ کے راجہ کے اعزاز میں نو مخصوص گھرانوں کے مرد اور عورتیں دونوں یہ ناچ پیش کرتے تھے۔ عموماً خواتین اس میں حصہ لیتی تھیں۔ اس گروپ کو ٹاقشوس کہا جاتا تھا۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ ناچ ہماچل پردیش سے لداخ آیا۔

شون ناچ اب ماضی کے شاہی دربار سے جنتا کے آنگن میں آیا ہے اور تمدّنی پروگراموں میں دکھایا جاتا ہے۔

کوشین ناچ: یہ ناچ سالِ نو اور لیہہ کے سالانہ تیوہار دسمو چھے پر لیہہ بازار

میں پیش کیا جاتا تھا۔ اس سے پہلے گھوڑ دوڑ ہوتی تھی اور گھوڑ دوڑ کا قائد ناچ کی رہنمائی کرتا تھا۔ اس میں کل آٹھ آدمی حصہ لیتے تھے۔

کھاتوق چھنمو ناچ: لیہہ کے محل کی چھت پر راجہ کے سامنے یہ ناچ پیش کیا جاتا تھا۔ اِس میں اعلا خاندان کے افراد حصہ لیتے تھے۔ موسیقار اُس وقت تک اپنے دمامہ کو تھاپ نہیں دیتے تھے جب تک ناچ کی رہنمائی ایک اعلا خاندان کا فرد نہ کرے۔

لہشون ناچ: یہ فصل کٹائی کا ناچ ہے۔ لیہہ کے پاس شے میں فصل کٹائی کے سالانہ تیوہار پر یہ ناچ پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں بیج بوائی سے لے کر فصل کٹائی تک کا عمل ایکشن کے ذریعے دکھایا جاتا ہے۔ اس موقعے پر دو آدمی شیر کے بھیس میں رقص کرتے ہیں۔ کچھ لوگ لکڑی کے گھوڑے پر سوار ہو کر رقص کرتے ہیں۔

نیوپا ناچ: یہ ناچ شادی کی تقریب میں باراتی پیش کرتے ہیں۔ باراتی مخصوص لباس، سنہری تکونی ٹوپی اور پاپوش پہنتے ہیں۔

جبرو: لداخ کے چنگپا قبیلے کا مخصوص لوک ناچ ہے۔ اس میں مرد اور عورتیں آمنے سامنے ہاتھ میں ہاتھ لئے انہیں لہراتے اور جھومتے ہوئے رباب، الغوزہ اور طبلہ کی تال پر گیت گاتے ہوئے ناچتے ہیں۔ شادی بیاہ، تیوہاروں، سماجی تقریبات اور کسی بڑے مہمان کی آمد پر جبرو پیش کیا جاتا ہے۔

میتوق ستنمو یا پھول میلہ لداخ کے کئی علاقوں میں منایا جاتا ہے۔ ماضی میں کرگل کے علاقہ شکر چیکتن کا پھول میلہ بہت مشہور تھا۔ اس میلے میں رُومان اور پیار کا دلکش عنصر ہے۔ پو پھٹنے سے پہلے گاؤں کے نوجوان پہاڑوں پر پھول چننے جاتے۔ واپسی پر گاؤں کے لوگ خاص طور پر دوشیزائیں اُن کا سواگت کرتی تھیں اور گاؤں کے گنپہ میں گلدستہ کے نذرانے چڑھائے جاتے تھے۔ اِس کے بعد جوان لڑکے لڑکیاں گنپہ کے سامنے رقص کرتے تھے۔ پھول میلہ کے ایک مقبول عام گانے میں اس ناچ کی تعریف کی گئی ہے۔ علاقے میں اِسلام کی آمد کے بعد پھول میلہ ختم

نہیں ہوا ہے لیکن اِس کا انداز اور فلسفہ بدل گیا ہے۔

کرگل میں واکھا مولبیک، نوبراہ میں دیسکیت اور داہانو میں گرکون میں آج بھی پھول میلا منایا جاتا ہے۔ گرکون میں نوجوان لڑکے لڑکیاں پہاڑی پر جنگلی پھول چننے جاتے ہیں اور رنگ برنگِ خودرو پھول چھڑیوں پر ٹانکے اور اپنی ٹوپیوں پر سجائے سازندوں کے ساز و آہنگ میں گیت گاتے اور ناچتے ہوئے گاؤں لوٹتے ہیں۔

ٹاشیسپا ناچ: تقریبات کے اِختتام پر تہنیت اور نیک شگون کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

ماڈرن یا جدید ناچ: جس پر ہندی فلموں کا اثر ہے۔ مختلف مواقع پر دکھایا جاتا ہے اور لوگوں میں مقبول ہے۔

مخصوص لداخی لوک ناچ ایک ایک آدمی کی لمبی قطار میں دائرے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اِس میں آدمیوں کی تعداد کی کوئی قید نہیں ہے۔ ناچ کے تین مرحلے ہوتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں مہمانِ خصوصی اور حاضرین کو سلام کیا جاتا ہے اور ناچ کی رفتار سُست ہوتی ہے۔ دُوسرے مرحلے میں دوبارہ آداب بجالایا جاتا ہے اور ناچ میں تیزی آتی ہے۔ تیسرے مرحلے میں ناچ نقطہء عروج پر پہنچتا ہے۔ رقاص ایک لمبا رُومال یا شال کو کندھے سے لگائے اور اِس کے دونوں سروں کو ہاتھوں میں تھامے رقص کرتا ہے۔ عورتیں شال نہیں لیتی ہیں۔ اُن کے ہاتھوں کی حرکتیں اور اُنگلی کی جنبشیں پھول توڑنے کے سمان ہوتی ہیں۔ رقاصہ ایک ہاتھ کو پھول کا روپ بناتی ہوئی اسے فضا میں تھوڑا سا بلند کر کے یوں جنبش دیتی ہے گویا یہ پھول بدھ کے چرنوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔ رقص کے دوران اور اختتام پر مہمانِ خصوصی اور حاضرین کو سلام کیا جاتا ہے۔ بودھوں کی توجیہات کے مطابق مرد عورتیں رقص کی شروعات میں بدھ، بدھی ستو اور دھرم پالا کو کورنش بجالاتے ہیں۔

لوک ناچ کے اپنے ضابطے اور قواعد ہیں۔ مردانہ ناچ کی شروعات دائیں

پیر سے اور زنانہ ناچ کی بائیں پیر کے پہلے قدم سے ہوتی ہے۔ اسی طرح عورتوں اور مردوں کے لئے موسیقی کے ساز اور لَے الگ الگ ہیں۔ عورتوں کے ساز پر مردانہ ناچ نہیں ہوسکتا۔ البتہ عورتیں مردوں کے ساز پر رقص کرتی ہیں۔

مرد اور عورت دونوں کے لئے ایک اچھے ناچ کی کسوٹی یہ ہے کہ اسے سیدھے بدن بلا کسی حرکت کے پیش کیا جائے اور حرکتیں صرف ٹانگوں اور بازوؤں تک محدود ہوں۔ مردانہ ناچ میں تیز روی اور زنانہ ناچ میں متانت اور نرم روی کو سراہا جاتا ہے۔

لداخی ناچ میں بھانگڑہ کے قبیل کے ناچوں کی طرح تیزی اور تندی نہیں ہے۔ غالباً اِس کی وجہ لداخیوں کا مزاج ہے۔ شاید لداخ کی بلندی کا تقاضا بھی ہو۔ تاہم لداخی ناچ بھی نکتہ چینی سے مبرا نہیں ہے۔ کچھ لوگ ناچ کی سُست روی کو اپنی نکتہ چینی کا ہدف بناتے ہیں۔ ایک انگریز کاوَلے لمبرٹ اپنی کتاب TRIP TO KASHMIR AND LADAKH (مطبوعہ ۱۸۷۷ء) میں رقم طراز ہے: ''اسے ناچ ہی کیوں کہا جائے۔ میرا تو ایسا خیال نہیں ہے۔ اسے ماتمی WALK ROUND کہا جائے تو مناسب رہے گا۔ مجھے یاد ہے، ہماری پارٹی کا ایک آدمی بڑی بے مروّتی سے بولا تھا کہ جتنی جلدی یہ رقاص مر جائیں، اتنا ہی بہتر ہے۔''

لمبرٹ نے لیہہ بازار میں پولو میچ کے بعد کوشین ناچ دیکھا تھا۔ عام لوک ناچ پر یہ بات صادق نہیں آتی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو لداخی لوک ناچ میں کشش اور دِلکشی ہے۔ جب ناچ نقطۂ عروج پر ہوتا ہے تو نہ صرف ناچنے والوں پر سرمستی کی کیفیت طاری ہوتی ہے بلکہ تماشائی بھی وجد میں آتے ہیں۔ اور موسیقی کی تان پر وہ دل ہی دل میں ناچنے اور گانے لگتے ہیں۔

لوک ناچ کے لئے موسیقی کے آلات میں دمامے، سرنائیاں یا شہنائیاں استعمال ہوتی ہیں۔ جبکہ جبرو، رباب، الغوزہ اور طبلے کی تال پر پیش کیا جاتا ہے۔ ناچ

گانوں میں ہارمونیم، دف، بنسری گٹار وغیرہ بھی استعمال ہوتے ہیں۔

مذہبی ناچ:

لداخ، تبت، سکم، بھوٹان اور منگولیا کے گنپوں کے دھارمک ناچ Mask Dance ساری دُنیا میں مشہور ہے۔ اسے ''چھم'' یا ''چھمز'' کہا جاتا ہے۔ ہر سال ہزاروں غیر ملکی چھمز دیکھنے لداخ آتے ہیں۔ خطّے کے لگ بھگ بیس گنپوں میں سالانہ تیوہاروں کے موقعوں پر دھارمک رقص کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ کئی مغربی مشاہدین اور مصنفین نے اِسے DEVIL DANCE یا شیطانی ناچ کہا ہے۔ یہ اس ناچ کی غلط تاویل ہے۔ جسے بودھوں نے ہمیشہ برا مانا ہے۔ بودھ عقیدے کے مطابق چھمز تفریحی یا عامیانہ راگ رنگ نہیں بلکہ ایک رُوحانی عمل ہے جو نیکی اور بدی کی کشمکش اور بدی پر نیکی اور سچائی کی جیت کو اُجاگر کرتا ہے۔ تبّتی اور لداخی بدھ مت کے صحیفوں کے مطابق بدھ نے اپنی زندگی میں دھارمک رقص کی تعلیم دی تھی۔ تانترک فلسفے میں اس کا تذکرہ ہے اور بدھ سے منسوب کیا گیا ہے۔ بعد میں ایک رشی چھوسکیال داوازنگپو نے دیومالائی دیش شمبھالا کو چھمز ناچ سے متعارف کرایا اور وہاں سے کالا چکرا کا فلسفہ لایا۔ تبّتی روایات اور دھارمک کتب کے مطابق تبت میں کالا چکرا اور چھمز ساتھ ساتھ آئے تھے۔

آٹھویں صدی میں تبت کے ایک قدیم ترین گنپہ سمیا میں یہ ناچ مروّج تھا۔ اُن دِنوں تبت کا حکمران ٹھی سونگ دیستن تھا جو رونگ ژن گیالپو کے بعد تبت کا دُوسرا مشہور حکمران مانا جاتا ہے۔

چھمز کے کئی مقاصد ہیں۔ اِس کے فلسفے کو ذیل کے چار شبدوں میں بتایا گیا ہے۔

''جی گیاس ونگ ٹق''

جی برائے امن، گیاس برائے مکمل، ونگ قہر اور ٹق قوت کے معانی میں

اِستعمال ہوتا ہے۔ یہ ناچ ان چاروں عوامل کا مظہر ہے۔ دھرم کے معاملے میں یہ امن وشانتی کی علامت ہے اور اس کے ساتھ قہر، قوت اور جبروت کا آئینہ دار بھی ہے۔ امن کے نقاب کا رنگ سفید ہوتا ہے جب کہ سیاہ رنگ کا نقاب قہاری کی غمازی کرتا ہے۔

چھمز یا دھارمک ناچ کے بڑے مقاصد حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ ہر جاندار کی فلاح اور بھلائی

۲۔ دُنیا اور اِس خطے میں امن اور شانتی کے لئے ناچ کے وسیلے سے مداوا کی تلاش

۳۔ آفاتِ سماوی اور بیماریوں سے آبادی کو محفوظ رکھنا اور پیداوار میں اضافہ

۴۔ متعلقہ گنپہ کے مخصوص دیوتا کو محظوظ رکھنا

۵۔ دیوی دیوتاؤں کے لئے تفریح کا سامان فراہم کرنا اور نذرانہ عقیدت پیش کرنا

۶۔ بودھ فلسفے کے مطابق مرنے کے بعد دُوسری دُنیا میں اِس قسم کے چہرے والی مخلوقات سے اِنسان کا سامنا ہوگا۔ TIBETAN BOOK OF DEAD میں ''بردو'' کا دِلنشین اور تفصیل سے نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اِس کے پسِ پشت یہ مقصد ہے کہ اِس دُنیا میں اِن مخلوقات کے رنگ رُوپ دیکھ کر دُوسری دُنیا میں انسان ان سے مانوس ہو جائیں گے۔

۷۔ تیوہاروں پر دھارمک ناچ کے ذریعے مختلف دیوی دیوتاؤں کی نمائش ہوتی ہے تا کہ عقیدت مند لوگ اُن کے درشن کریں۔

۸۔ کالا چکرا کی مذہبی رسم سے پہلے دھارمک ناچ ہوتا ہے۔ اس کا مقصد اس جگہ کو پوتر بنانا ہے۔

اطالوی عالم گیسپے ٹوچی کو تبت اور لداخ کے بودھ مذہب، کلچر اور تاریخ پر عبور ہے۔ ناچ کے فلسفے پر وہ یوں روشنی ڈالتا ہے:

''ناچ کو عام طور پر ایک وسیلہ سمجھا جاتا ہے جس کے تحت مابعد الطبیعاتی طاقتیں اِنسانوں کی اس دُنیا میں آتی ہیں۔ اس کی مثال ''لہا چھم'' ہے۔ یہ مقدس ناچ

ہمیشہ ماضی کے اہم واقعات کی ترجمانی کرتا ہے اور خاص طور پر تبتی بدھ مت میں یہ دھرم اور بدی کی قوتوں کے درمیان کشمکش کے عام موضوع سے متعلق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تبت کے بادشاہ لنگ ترما کا بدھ دھرم کے پیروکاروں کے خلاف ظلم وستم اور ایذا رسانی اور سپسلگی دورجے کے ہاتھوں اُس کے قتل کو ناچ میں پیش کیا جاتا ہے۔ رقاص بڑے اور خوفناک قسم کے نقاب پہنے مختلف واقعات کو ناچ کے قواعد وضوابط کے دائرہ کار میں بڑے جوش اور طاقت سے پیش کرتے ہیں۔ رقص دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ رقاص کے جسم پر کسی نا قابلِ تسخیر قوت کا غلبہ ہے جو موسیقی کے زیر و بم پر اُسے اُچھالتی، گھماتی اور لہراتی ہے۔ نقارے کی تیز آواز کا جواب ڈھول کی گرج میں ہوتا ہے اور وقفے کی لمبی مہر سکوت کو گیالینگ (انسان کی ران کی ہڈی سے بنایا ہوا ایک آلہء موسیقی) اور الغوزہ کی حزینہ آواز توڑتی ہے۔

آٹے کے ایک پُتلے کو بدی، دشمن اور شیطان کا مجسم رُوپ دیا جاتا ہے۔ جسے نقاب پوش دیوتا چھرا گھونپتا ہے اور اس کا معاون، جس نے چہرے پر بارہ سنگا کی شکل کا نقاب پہنا ہوتا ہے، اُس کی انتڑیاں نکالتا ہے۔''

مارکو پالیس اپنی تصنیف PEAKS AND LAMAS میں نقاب ناچ سے متعلق لکھتا ہے:

''یہ پُر اسرار ناچ دو اہم قسموں کے ہیں۔ ایک نیم تاریخی ہے اور دُوسرا خالص علاقائی اور مابعد الطبیعاتی ہے۔ پہلی قسم کے ایک ناچ میں یہ دِکھایا جاتا ہے کہ بدھ مت کے علمبردار پدما سمبھاوا مراقبہ اور گیان سے حاصل کردہ اعلیٰ قوتوں کی بدولت قدیم بون مذہب کے سیاہ ٹوپ والے جادوگروں پر غالب آتے ہیں۔ دُوسری قسم میں یہ ڈرامہ باطنی موضوع کا حامل ہے۔ بدی جو آٹے کے پتلے کی صورت میں ڈھالی جاتی ہے، انانیت کی مظہر اور جہالت کی پیداوار ہے۔ جو لالچ، گناہ اور خیالِ موہوم کو جنم دیتی ہے۔ رقاص خارجی طور پر شانت یا خشم ناک دیوتاؤں کا روپ

دھار لیتے ہیں جب کہ داخلی طور یہ دیوتا انسانی رُوح میں حلول ہوکر اپنے کرشمے دکھاتے ہیں۔"

لداخ کا مشہور ہمس میلہ پدما سمبھوا کے جنم دن پر منایا جاتا ہے اور اس موقعے پر پدما سمبھوا نقاب پہن کر دیوی دیوتاؤں کے جلو میں جلوہ گر ہوتے ہیں اور رقص کرتے ہیں۔

صحیفوں میں رقص کی ہر حرکت کا مفہوم دیا گیا ہے۔ پیروں کی ہر حرکت اور ہاتھوں کی ہر جنبش میں کوئی مطلب چھپا ہے۔ ہر رقص معینہ اعداد وشمار کا تابع ہوتا ہے۔

ناچ کے یہ قواعد وضوابطہ ایک کتاب "چھم ایک" میں دیئے گئے ہیں۔

لاموں کو رقص کی سخت تربیت دی جاتی ہے تاکہ ناچ میں کسی قسم کی غلطی نہ ہو۔ بودھ عقیدے کے مطابق رقص میں معمولی سی غلطی سے رُوحانی عمل پر برا اثر پڑتا ہے۔

رقص سکھانے اور اِس کی نگرانی کے لئے "چھمز سپون" یا MASTER OF THE BALLET ہوتا ہے۔

اکثر ناتجربہ کار نو عمر لامے قدموں کی حرکتوں کا دھیان تو دیتے ہیں لیکن ایسے میں ہاتھوں کی حرکات وسکنات میں غلطی کرتے ہیں۔

چھمز کے لباس اور نقاب بھی اِنہیں ضابطوں کے تحت آتے ہیں اور صحیفوں میں اِن سے متعلق قواعد بتائے گئے ہیں۔

ہر گنپے کا اپنا آرکسٹرا ہوتا ہے۔ اس میں جھانجھ، ترہی، سرنائی، شہنائی، نقارہ، ڈھول، سنکھ، ناقوس، ڈمرو وغیرہ شامل ہیں۔ Trumpet یا نقارہ کی لمبائی آٹھ فٹ ہوتی ہے۔ موسیقی کے اِن آلات کی ملی جلی گونج میں رقص کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ان نغموں میں حزن وملال ہے۔ جوش اور ہیبت ہے۔ کبھی یہ طویل، کبھی مختصر، کبھی دھیمے، کبھی سمع خراش اور کبھی خوش آئند ہوتے ہیں۔ تماش بینوں پر عجیب کیفیت طاری ہوتی

ہے۔ گنپے کا محل وقوع، ارضیاتی خدوخال Landscape اور پہاڑوں کا پس منظر اس کیفیت کو دوچند بڑھا دیتا ہے۔ جس کا کئی غیر ملکی سیاحوں نے اپنی کتابوں میں تذکرہ کیا ہے۔

مخلوط ناچ:

لداخ کے تمدّن اور ثقافت پر اس کے ہمسایہ ملکوں اور خطّوں کا گہرا اثر پڑا ہے۔ تیراندازی کے تیوہاروں اور دُوسری تقریبات میں ہمسایہ ملکوں اور خطّوں کے ناچ گانے اِنہی ملکوں اور خطّوں کے سنگیت اور لباس میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں تبّتی، ہماچلی اور بلتی ناچ شامل ہیں۔ پہلے گلگتی، یارقندی، کشمیری اور انگریزی ناچ بھی پیش کئے جاتے تھے۔ اسی طرح DRAGON DANCE اژدھا ناچ، امبان (چینی حاکم) ناچ، مشعل ناچ اور لمبا آدمی کا ناچ بھی کئی تقریبات میں دکھائے جاتے تھے۔ یہ ناچ تبت، چین ترکستان اور چین کی دین ہیں۔ آج کل یاک ناچ، شیر ناچ اور تلوار ناچ اکثر پیش کئے جاتے ہیں۔ یاک اور شِیر ناچ بھی چین سے آئے ہیں۔

اژدھا اور امبان ناچ پہلے پہل لداخ کے مہم جُو مسافر قلم رسول اور اس کے ساتھیوں نے اپنے مہم جودوست گلوان رسول کی شادی کی تقریب میں دِکھائے تھے۔ جو اُنہوں نے کاشغر میں دیکھے تھے۔ بعد میں لیہہ میں تقریباً آدھی صدی تک یہ تیراندازی کے تیوہار اور دُوسرے موقعوں پر دکھائے جانے لگے۔

لداخ میں تیوہاروں کی فہرست لمبی ہے۔ ان میں سماجی، نیم مذہبی، مذہبی اور موسمی تیوہار شامل ہیں۔ موسمی تیوہاروں میں ساکا یابوائی، ستروپ لا یعنی فصل کٹائی اور پھول میلہ آتے ہیں۔ درد قبیلہ اپنے سرکردہ بزرگوں کی یاد میں تیوہار مناتے ہیں۔ لگ بھگ ہر تیوہار میں رقص وسرود ہوتا ہے۔

پولو اور تیراندازی:

پولو اور تیز اندازی اگرچہ کھیل کود کے زُمرے میں آتے ہیں لیکن یہ دونوں

کھیل تیوہاروں کے اہم حصّے ہیں۔ تیراندازی بذاتِ خود لداخ کا ایک قدیم اور مقبول عام تیوہار ہے۔

پولو بھی صدیوں سے ایک مقبول کھیل کے طور پر لداخ میں کھیلا جاتا ہے اور حکمرانوں نے اِس کی سرپرستی کی ہے۔ پولو کھیلتا ہوا ایک راجہ کی ایک آنکھ چلی گئی تھی۔ لداخ کے متعدد گاؤں میں پولو گراؤنڈ تھے۔ آج بھی کئی گاؤں میں پولو گراؤنڈ ہیں اور پولو کھیلے جاتے ہیں۔

کچھ مورخوں نے لکھا ہے کہ پولو سے لداخیوں کو گیالپو سینگے نمگیل کے عہد میں بلتیوں نے متعارف کیا تاہم عام خیال یہ ہے کہ یہ اس سے پہلے دردوں نے لایا۔

لداخ کے ایک ناظمِ اعلیٰ فریڈرک ڈریو نے اُنیسویں صدی میں پولو کے تئیں لداخیوں کی غیر معمولی دِلچسپی کا ذکر اِن الفاظ میں کیا ہے:

''لداخی پولو کے بڑے شوقین ہیں۔ اُونچے مرتبہ کے لوگ بڑے چاؤ سے پولو کھیلتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پولو کھیلنا زِندگی کا ایک مقصد ہے اور اِسی لئے ان کو دُنیا میں بھیجا گیا ہے۔ لیکن یہ اُونچے طبقے تک محدود نہیں۔ غریب سے غریب آدمی بھی اس دوڑ میں برابر کے شریک ہیں۔ جس کسی کو ایک ٹٹو ملتا ہے، وہ پولو کے مقابلے میں کود پڑتا ہے۔ بچے کمسنی میں ہاکی کھیلنے میں جُٹے ہیں تاکہ آئندہ زندگی میں اپنے آپ کو پولو کے اچھے کھلاڑی بنائیں۔''

پولو شروع ہونے سے پہلے روایتی طور دمامہ کو تین مرتبہ تھاپ دی جاتی ہے۔ گول کرنے پر دمامے اور سرنائیاں مخصوص نغمہ بجاتی ہیں۔ کسی کسی مقام پر موسیقار کھیل دیکھ کر سنگیت کی زبان میں کھلاڑیوں کی تضحیک یا تعریف کرتے ہیں۔

لداخ میں پولو کی سٹائل قدرے مختلف ہے۔ یہی سٹائل گلگت اور بلتستان میں بھی مروّج ہے۔ گول کرنے پر فاتح کھلاڑی گیند کو ہاتھ میں لے کر مخالف ٹیم کے گول پوسٹ کی طرف گھوڑے کو ایڑ لگا کر بگ ٹٹ دوڑاتا ہوا سٹک کی بھرپور ضرب

سے گیند کو گول کی طرف پھینکتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ خطّے میں پولو قدیمی اور اصلی رُوپ میں ہے۔

آج کل لیہہ میں پولو کے کئی ٹورنامنٹ لگتے ہیں۔ ایک ٹیم میں سات یا آٹھ سے زیادہ کھلاڑی نہیں ہوتے ہیں۔ ماضی میں ایک ٹیم میں بیس سے تیس تک کھلاڑی ہوتے تھے۔

تیراندازی:

لداخ کے تقریباً ہر دیہات میں تیراندازی کا تیوہار دُھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ ایک بڑے دیہات میں محلّہ محلّہ میں تیز اندازی کی تقریب ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں عام طور پر ایک کھیت میں شامیانہ نصب کیا جاتا ہے۔ اطراف میں قناتیں لگائی جاتی ہیں اور لوگوں کی نشست کے لئے قالین بچھائے جاتے ہیں۔ جن کے سامنے رنگین منقش چوکیاں سجائی جاتی ہیں۔ جن پر کھانے پینے کے لئے پیالیاں پلیٹیں رکھی جاتی ہیں۔ مرد اور عورتیں دونوں تقریب میں حصہ لیتے ہیں۔ تاہم عورتیں تیر اندازی میں حصہ نہیں لیتیں۔ شامیانہ میں اُن کی نشستیں الگ بنی ہوتی ہیں۔ اس موقعے پر نیا لباس زیب تن کیا جاتا ہے۔

تیراندازی کا تیوہار تیر پھینکنے تک محدود نہیں ہے بلکہ تیوہار کے دوران ناچ گانے، راگ رنگ، مزاحیہ کھیل وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ ان تفریحی پروگراموں میں عورتیں بھی حصہ لیتی ہیں۔ تیوہار عموماً تین یا چار دن چلتا ہے اس سے گاؤں کی خوابیدہ زندگی میں نئی جان آتی ہے۔

تیراندازوں کو دو ٹیموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جن کا ایک ایک لیڈر رہتا ہے۔ دونوں ٹیموں کے تیرانداز ایک ایک جوڑی میں نشانے پر تیر مارتے ہیں۔ اس دوران دماموں اور شہنائیوں کی نغمہ سرائی ہوتی ہے۔ جو تیرانداز Bull Eye کو تیر مارتا ہے، اُس کا مدّ مقابل اس کے گلے میں اعزازی ریشمی رومال حمائل کرتا ہے۔

دماموں اور شہنائیوں سے خوش آئند تہنیتی نغمے بلند ہوتے ہیں۔ اسی خوشی میں لوک ناچ کا ایک راؤنڈ ہوتا ہے جس کی قیادت نشانہ باز تیرانداز کرتا ہے۔

کرگل ضلع میں بھی تیراندازی کے تیوہار جوش وخروش سے منائے جاتے ہیں۔ ماضی میں لیہہ کی آرغون تیراندازی کی تقریب بڑی مشہور تھی۔ اُس موقعے پر تیس تیس دمامے نغمہ زن ہوتے تھے۔ اُسے دیکھنے کے لئے آس پاس کے دیہات سے بھی لوگ بھاری تعداد میں آتے تھے۔
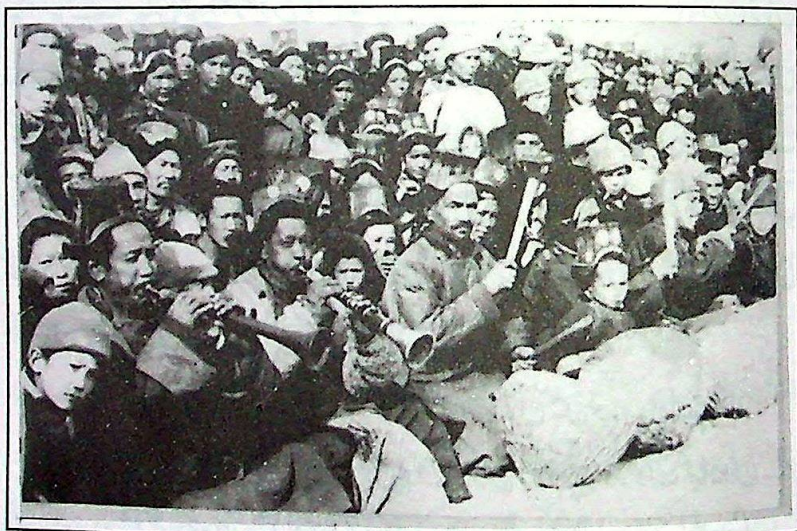
ایک تقریب میں لداخی پیشہ ور موسیقار

لداخی زبان

(ایک تعارف)

لداخی زبان کو دو زُمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

بول چال کی لداخی زبان اور کلاسیکل تبّتی، جسے کلاسیکل لداخی بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہاں میرا موضوع بول چال کی زبان ہے۔ یہ لداخیوں کی مادری زبان ہے جو گھر کی چاردیواری، بس سٹینڈ، دُکانوں، گلی کوچوں اور ہر جگہ بولی جاتی ہے۔ اس کا اپنا لوک ادب ہے جو زبانی ORALLY لوگوں تک آیا ہے۔ اِس میں نظموں، لوک گیتوں اور لوک کہانیوں کے علاوہ کئی مشہور داستانیں ہیں۔ ان میں گیالم کیسر کی مقبولِ عام داستان شامل ہے جو طویل اور دلچسپ ہے۔ ماضی میں سردیوں کی لمبی راتوں میں داستان گو الاؤ کے گرد بیٹھے سامعین کو قسطوں میں یہ داستان سنایا کرتا تھا۔

گیالم کیسر کا انگریزی اور جرمنی دونوں زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔

کلچرل اکادمی لیہہ نے لداخی لوک گیتوں کے چھ اور لوک کہانیوں کے تین مجموعے شائع کئے ہیں۔ لداخی لوک گیتوں میں خاص کشش ہے اور متعدد گیتوں کا انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے۔ لداخی میں عمدہ نظمیں اور گیت لکھے جاتے ہیں۔ گاہے گاہے مشاعرے منعقد ہوتے ہیں، جن میں مرد اور خواتین شعراء اپنا کلام سناتے ہیں۔

تاہم نثری ادب خاص کر فکشن میں برائے نام کام ہوا ہے۔ اِس ضمن میں صرف چھوانگ تولدن کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اُنہوں نے دو ناول اور کہانیوں کا ایک

مجموعہ شائع کیا ہے اور لداخ کے آنے والے ادیبوں کے لئے ایک مثال قائم کی ہے۔

بول چال لداخی ایک زرخیز زبان ہے۔ اِس میں حلاوت، مٹھاس، لوچ اور گھلاوٹ ہے۔ الفاظ کا اچھا ذخیرہ ہے۔ ڈاکٹر سینو گپتا کوشل نے بول چال لداخی سے متعلق اِن الفاظ میں مجھ سے اپنے تاثرات کا اِظہار کیا:

''یہ اپنی جگہ ایک مکمل زبان ہے۔ اِس میں تخلیق کی اُپج اور صلاحیت ہے۔ ہر قسم کا ادب اِس میں تخلیق ہوسکتا ہے اور کسی دُوسری زبان کے سہارے کی اِسے ضرورت نہیں ہے۔''

ڈاکٹر سینو گپتا کوشل نے سنٹرل اِنسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگوئجیز میسور کے زیرِ اہتمام ۱۹۷۰ء کی دہائی میں قبیلوں اور سرحدی علاقوں کی زبانیں سیکھنے کے پروگرام کے تحت لداخی عام بول چال کی زبان پر ریسرچ کی اور اس موضوع پر کئی کتابیں لکھیں، جن میں بول چال لداخی کی لغت اور گرائمر شامل ہیں۔ اس سے پہلے رمزے، فرانکی اور کئی یورپیوں نے بول چال لداخی کا مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے۔

سینو گپتا کوشل کی طرح ڈاکٹر روینہ اگروال اور ہیلسن نانورنج نے بھی لداخی زبان سے متعلق مثبت تاثرات کا اِظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک عمدہ زبان ہے اور اِس میں تحریر و تخلیق کا اچھا کام ہوسکتا ہے۔ دونوں نے لداخی زبان پڑھی اور سیکھی ہے۔ ڈاکٹر روینہ امریکہ میں ایک کالج میں پڑھاتی ہیں اور ہیلا نانورنج نے لیہہ میں دو اہم غیر سرکاری تنظیمیں قائم کی ہیں جو ماحولیات اور خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرتی ہیں۔

لداخی زبان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں لگ بھگ ہر چیز اور اَن گنت مجرد الفاظ کے لئے HONORIFIC یعنی تعظیمی الفاظ موجود ہیں جیسے ناک، کان، آنکھیں، بال، زبان، چائے، روٹی، کپڑے، مکان وغیرہ کے لئے عام الفاظ کے ساتھ متبادل تعظیمی اور تہذیبی الفاظ بھی وضع کئے گئے ہیں۔ جن کے لئے متبادل

الفاظ نہیں ہیں، اُن کے ساتھ تعظیمی الفاظ بڑھائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں اس ضمن میں لداخی اور فرانسیسی زبان میں یکسانیت ہے۔ ایک ناگوار بات کو خوشگوار انداز میں کہنے کے لئے بامحاورہ جملے بنے ہیں۔ جن زبان دانوں نے یہ کام کیا ہے، وہ بڑے خوش مذاق ہوں گے اور اچھا خاصا جمالیاتی ذوق رکھتے ہوں گے۔

لیہہ ریڈیو سٹیشن اور دُور درشن سے اِسی زبان میں بات چیت، مباحثے، ڈرامے اور دُوسرے پروگرام نشر اور ٹیلی کاسٹ ہوتے ہیں۔ اِس زبان میں تھوڑا بہت دُوسری زبانوں سے ترجمے کا کام بھی ہوا ہے۔

لداخ میں دردی اور بلتی نسل کے لوگ آباد ہیں جن کی اپنی بولیاں ہیں۔ تاہم سبھی لداخی سمجھتے اور بولتے ہیں۔ بلتی اور لداخی زبان میں گہری مماثلت ہے۔

لداخی زبان میں تخلیقات کا سوتا پھوٹ رہا ہے۔ لداخ کی تاریخ پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مضامین، ڈرامے اور نظمیں لکھی جارہی ہیں۔ لداخی ادب، ثقافت، زبان اور تاریخ پر گاہے گاہے سیمینار، مجالس و مناظرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ تاہم تنقید، سائنس اور فلسفہ پر کوئی تخلیقی کام نہیں ہو رہا ہے۔ ایک بات جو کھٹکتی ہے، وہ یہ ہے کہ لداخی میں ناول نہیں لکھے جاتے اور نہ نئے طرز کا کوئی افسانہ تخلیق ہوتا ہے' جس کا ذِکر اُوپر آیا ہے۔

لداخ میں جدید ادبی تحریکوں اور تجربوں کا کوئی جھونکا نہیں پہنچا ہے۔ البتہ شعوری اور غیر شعوری طور لداخی شاعر اور ادیب جو لکھ رہے ہیں، ان میں مختلف ادبی تحریکوں کا پرتو نظر آتا ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ ابھی لداخی زبان اور ادب کو لمبا سفر طے کرنا ہے اور ادب کی تمام اصناف میں متوازن طور پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

کلچرل اکادمی لیہہ نے ۱۹۷۶ء سے لداخی میں اپنی سالانہ مطبوعات منظرِ عام پر لائی ہیں۔ ۱۹۷۹ء سے اب تک ادارہ کے جریدہ شیس رب، (لداخی شیرازہ) کے متعدد شمارے شائع کئے ہیں جن میں بہت سارے خصوصی شمارے اور نمبرات

شامل ہیں۔

لداخی ادیبوں کو جموں و کشمیر کلچرل اکادمی سے اپنی تصنیفات کے لئے انعامات بھی ملتے رہے ہیں۔

لیکن لداخی مطبوعات بہت کم فروخت ہوتی ہیں۔ لداخی پڑھنے والے اکثر وہی لوگ ہیں جن کو لداخی کے بغیر دُوسری کوئی زبان نہیں آتی۔ البتہ تاریخی اور معلوماتی تصنیفات پڑھی جاتی ہیں اور مقبول گیت اور نظمیں پسند کی جاتی ہیں۔

لداخی مطبوعات کیوں نہیں پڑھی جاتیں؟ لداخی ادیبوں کو اِس کی وجوہات معلوم کرنی چاہئیں اوران کا مداوا ڈھونڈنا چاہیئے۔

اِس وقت لداخی میں لکھنے والے بہت ہیں۔ ان میں ٹشی رگبیس، جمیانگ گیالچن، گیلوتگ پلدن، گے چھوانگ رگزین، چھوانگ تولدن، صنم پنچگ، چھمیت نمگیل، چھرنگ نربو، ڈاکٹر لبزانگ چھوانگ، ڈاکٹر نوانگ چھرنگ، اُرگین ڈاڈول، گیرگن صنم، چھتین پنچگ، گیلونگ پھندے، ایشے چھومو، گیشے ایشے تنڈوپ، ٹشی پنچگ اور چھوانگ دورجے نئے اور پرانے چند اہم نام ہیں۔ ان میں سے چند اب اِس دنیا میں نہیں ہیں۔

اُنیسویں صدی میں ریزونگ گنپہ کے بانی لاما چھولٹیم نیماں نے اپنی سوانح حیات اِسی زبان میں لکھی۔ موراوین مشن نے ۱۹۰۴ء میں لیہہ سے اِسی زبان میں ایک اخبار کا اجرا کیا' جو تقریباً نصف صدی تک چلا۔

لداخی زبان کے ماخذ سے متعلق قدرے اِختلاف ہے۔ ڈاکٹر سینو گتا کوشل لکھتی ہیں کہ بول چال لداخی کا ماخذ تبّتی زبان ہے اور یہ چینی خاندان کی زبانوں کے چین تبت گروپ سے تعلق رکھتی ہے۔ تاہم کئی یورپی محققوں کا خیال ہے کہ بول چال لداخی تبّتی سے بالکل جداگانہ ہے اور یہ اِس خطّے میں تبتیوں کی آمد سے بہت پہلے مروّج تھی۔

کلاسیکی تبّتی اور بول چال لداخی کا ایک ہی رسم الخط ہے جسے ساتویں صدی میں ایک تبّتی عالم تھونمی سمبھوٹا نے ہندوستان جا کر سنسکرت رسم الخط سے لیا تھا۔ اُنہوں نے تبّتی ماحول اور زبان کے مزاج اور ضروریات کے مطابق اِس میں ترمیم اور حروف ایجاد کئے تھے۔

اکثر لداخی ادیبوں کی تحریری اور بول چال کی زبان میں فرق پایا جاتا ہے۔ اِس کا اثر سکولوں کی درسی کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سنیو گتا کے الفاظ میں یہ نہ خالص لداخی ہے اور نہ کلاسیکل تبّتی بلکہ A kind of Tibetan influenced ladakhi یعنی تبّتی سے اثر پذیر لداخی زبان ہے۔

جب زیادہ تبتیت آ جائے تو یہ زبان کلاسیکل تبّتی اور لداخی کا معجون مرکب بن جاتی ہے جس طرح فارسی الفاظ کی بھرمار سے اُردو زبان فارسیت یا سنسکرت الفاظ کے زیادہ استعمال سے ہندی Sanskratised ہو جاتی ہے۔

اسی طرح لداخی تحریر میں بول چال لداخی کی مٹھاس، لوچ، گھلاوٹ اور دلکشی ختم ہو جاتی ہے۔

تبت اور لداخ کے درمیان زمانہء قدیم سے تعلقات رہے ہیں اور صدیوں پہلے لداخیوں نے کلاسیکل تبّتی ادبی، علمی اور مذہبی زبان کی حیثیت سے قبول کی تھی اور آج بھی کم و بیش اِس پر قائم ہیں۔ اِس زبان کا مذہبی، ادبی اور علمی سرمایہ تبت اور لداخ کے علاوہ سکم اور بھوٹان کی مشترکہ میراث ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان چاروں خطّوں کی مادری اور بول چال کی زبان الگ اور ایک دُوسرے سے مختلف ہیں۔

کلاسیکل تبّتی کا اثر ادیبوں، سکالروں اور مذہبی حلقوں تک محدود رہا ہے اور یہ عوام میں مقبولیت حاصل نہیں کر سکی ہے۔ اِس کے باوجود اِس زبان کو لداخ کی تمدنی، تہذیبی، علمی اور ثقافتی زندگی میں گہری افادیت حاصل ہے۔ خاص طور پر لداخ کے بودھوں کا مذہبی اور علمی خزینہ اسی میں محفوظ ہے۔

ماضی میں سنسکرت کی سینکڑوں ہزاروں کتابوں کا کلاسیکل تبّتی میں ترجمہ ہوا ہے۔ ان میں مذہبی صحیفے شامل ہیں جو تبت، لداخ، منگولیا، بھوٹان اور سکم کے علاوہ چند ہمالیائی خطوں کے بودھوں کا مشترکہ ورثہ ہیں۔ ان صحیفوں میں کنگیور (وینیا) کی ۱۰۸ جلدیں اور ستنگیور (سُترا) کی ۲۲۵ جلدیں ہیں جو تمام بڑے گنپوں میں محفوظ ہیں۔ اِس کے علاوہ فلسفہ، طب، جیوتش، علمِ نجوم وغیرہ پر کتابیں ہیں۔ جن میں اکثر کتابیں سنسکرت سے مترجمہ ہیں۔ ان علوم میں وقتاً فوقتاً تبّتی علماء نے اضافہ کیا ہے اور کتابیں تصنیف کی ہیں۔ تاہم بہت ہی کم لوگ ان کے مفہوم سمجھتے ہیں۔ جس طرح اکثر مسلمان مفہوم سمجھے بغیر قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں، اسی طرح بودھوں کی بھاری اکثریت ان دھارمک کتابوں کا مطلب سمجھے بغیر وِرد کرتی ہے۔

لداخی حکیم جو اپچی کہلاتے ہیں، طب سے وابستہ اِنہیں کتابوں سے براہِ راست استفادہ کرتے ہیں۔ لداخی جیوتشیوں کے لئے جیوتش پر لکھی یہی کتابیں علم و عمل کے ماخذ ہیں۔

پچھلے ایک ہزار سال کی لداخی تاریخ بتاتی ہے کہ اکثر لداخی اور لداخ آئے ہوئے غیر لداخی عالموں نے کلاسیکل تبّتی یا لداخی میں تخلیقی کام کئے اور سنسکرت کی کتابوں کا کلاسیکل تبّتی میں ترجمے کا کام کیا۔ ان میں دسویں صدی کے عالم لوژا وا رینچن زنگپو، بارھویں صدی کے لوژا وا پھقسپا شیرپ اور سولہویں صدی کے عالم نوانگ گیا ژو ستق سنگ راسپا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ موخرالذکر کی تصنیفات میں خودنوشت سوانح حیات، سفرنامہ اور گیتوں کا مجموعہ شامل ہیں۔

لداخ آنے والے یورپی سکالروں کے لئے طبعی کلاسیکل لداخی میں کشش رہی ہے۔ ہنگری کے ایک محقق سوماڈی کروسے نے زنسکار کے کرشا اور پھوکتل گنپوں میں یہی زبان سیکھی اور پہلی مرتبہ تبّتی اور لداخی میں ایک لغت مرتب کی۔ تبّتی گرامر اور بدھ مت کے فلسفہ سے دُنیا کو روشناس کیا۔ وہ ۱۸۲۰ء

میں لداخ آیا تھا۔

جے ۔این ۔یشکے نے (J.N. JACHKE) نے بھی یہی زبان سیکھی۔ ان کی تبّتی انگریزی لغت ایک قابل قدر کام ہے۔

پچھلی صدی کے اوائل میں موراوین مشن کے پادری ڈاکٹر کارل مارکس، ڈاکٹر فرانکی اور دُوسروں نے یہی زبان سیکھی اور انجیل مقدس کا اِسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اور لداخ پر انگریزی میں اہم کتابیں لکھیں۔ اطالوی عالم ٹوچی اور مورخ لوسینو پٹیک نے یہی زبان سیکھی اور اہم تاریخی اور علمی کتابیں لکھیں۔

آج کل سنٹرل اِنسٹی ٹیوٹ آف بدھسٹ سٹیڈیز لیہہ اور کئی پرائیویٹ سکولوں میں کلاسیکل تبّتی سکھائی جاتی ہے۔ لداخی بودھ سکالر، مذہبی اور سیاسی رہنما یہ مطالبہ کرتے آئے ہیں کہ آٹھویں شیڈول میں کلاسیکل تبّتی یا کلاسیکل لداخی کو ملک کی ایک علاقائی زبان قرار دی جائے اور کشمیر یونیورسٹی میں اِس کے درس و تدریس کے لئے ایک شعبہ کھولا جائے۔ (ملک اور بیرونِ ملک کی متعدد یونیورسٹیوں میں کلاسیکل تبّتی پڑھانے کا اِنتظام ہے)

کئی دفعہ کئی لداخی سکالر اور ادیب سمیناروں میں کلاسیکل لداخی میں اپنا مقالہ پڑھتے ہیں۔ سامعین میں چند ہی لوگ یہ زبان سمجھ سکتے ہیں۔ ان میں وہ لداخی ادیب بھی شامل ہیں جن کو لداخی زبان میں ملکہ حاصل ہے لیکن وہ کلاسیکل لداخی سے بالکل نابلد ہیں۔

سکالروں کو تشویش ہے کہ اگر وہ کلاسیکل تبّتی کو نظر انداز کریں گے تو نئی نسل مذہبی علوم سے بے بہرہ ہو گی اور ماضی کے علم و ادب سے بیگانہ رہے گی۔ یہ بات اپنی جگہ دُرست ہے اور اندیشہ بھی حق بجانب ہے لیکن لداخی بول چال کی مادری زبان کو پسِ پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ اکثر لداخی بلا تمیز مذہب اس زبان اور ادب کا فروغ چاہتے ہیں۔ اسی طرح کلاسیکل لداخی کا فروغ بھی ضروری ہے۔ اِس لئے بیچ کا

راستہ اختیار کرنا چاہیئے جس سے دونوں زبانوں کے علم وادب کی نشو ونما اور ارتقا ہو۔

لداخی زبان کی ترکیب، ساخت، صوتیات اور مزاج ایسا ہے کہ وہ تبّتی الفاظ نسبتاً آسانی سے قبول کر لیتی ہے لیکن صدیوں کے میل جول کی وجہ سے بہت سارے کشمیری، ترکی، چینی، انگریزی، دردی، فارسی وغیرہ کے الفاظ اصلی یا بگڑی ہوئی صورتوں میں اِس میں رچ بس گئے ہیں اور یہ لداخی زبان کے ناقابلِ تقسیم جُز بن گئے ہیں۔ جیسے کشمیری چنڈا (جیب) ژھیٹو (کشمیر ژھیٹ بمعنی گندگی غلاظت) ٹھول (انڈا) ٹر (ہنسی مذاق)، گام (گاؤں) ٹابر (کنبہ) ہنڈنگ (گونگا، کشمیری ہنڈم) بھتو (کشمیری بھتہ) وغیرہ۔

ترکی شاپوس (شاہ پوش، رضائی) سرق تُورمن (گاجر) باکیر خان (باقر خوانی) سمسو (سموسہ) موق موق (مومو) وغیرہ۔

چین نے لداخی بول چال زبان کو کئی اہم الفاظ دیئے ہیں جیسے ژونگ، (پیاز) کایول (تام چین کی پیالی) چوتپے (لداخی پست میز)، چھونگپے (جھروکا، Balcony) لداخی میں اِن الفاظ کے لئے متبادل الفاظ نہیں ہیں۔

سنسکرت کے الفاظ جیسے پوتی (سنسکرت پوتھی)، سینگے (بمعنی شیر سنسکرت سنگھ)، بیدا (پیشہ ور موسیقار)، پدما (پدما پھول) کوکو (بچے کا فضلہ)، چی چی (بچے کا پیشاب)، جُو (سلام جس پر لداخی لے چڑھایا گیا ہے)

لداخی میں کم سے کم دو منگول الفاظ ہیں جیسے اچی (حکیم) اور آرغون (آمیزش۔ مخلوط)

انگریزی الفاظ کی فہرست بڑی لمبی ہے۔ چند الفاظ جیسے سیمنٹ، سگریٹ، بس، جیپ، کار، پیٹرول، پالش، ٹب، بوٹ، کوٹ، سٹو، پلیٹ، بسکٹ، جری کین، ریڈیو، ٹیلی فون، ٹی وی وغیرہ۔

سنٹرل ایشیا کے ازبک الفاظ جیسے کلچہ، طبق ماز، ہریسہ، روغن جوش،

کباب وغیرہ۔

فارسی الفاظ دمن (دمامہ)، سُرنا (سُرنائی)، پابو (فارسی پاپوش)، چلم، (نائے) دُورمیک (دُوربین وغیرہ)۔

چی لداخی زبان کا ایک اہم لفظ ہے۔ فارسی ''چہ'' جس معنی میں استعمال ہوتا ہے لداخی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

جرمنی کے بیر، یونانی ڈرامہ، پنجابی ہٹی، پرتگال کے تولیہ اور گودام، رُوسی سماوار، ولندیزی سقلت (سقرلت) اور پمپ فرانسیسی کونسل اور فیشن، لاطینی البم لداخی زبان میں عام مستعمل ہیں۔ فرانکی کے مطابق لداخی پے نے انگریزی (Penny)، توبق بندوق اور خرجی خرچ سے ماخوذ ہیں۔

مجھے کسی نے بتایا کہ چُھوبہ عربی کے جُبہ اور یُم عربی کے اُم سے ماخوذ ہیں۔

اُردو نے لداخی کو متعدد الفاظ دیئے ہیں۔ اِن کا ذکر ''لداخ میں اُردو'' باب کے تحت آئندہ صفحات میں آئے گا۔

الفاظ کا لین دین دُنیا کی ہر زبان میں ہے۔ تبّتی اور لداخی نے دُوسری زبانوں کو گنپہ، چھنگ، اپسو، سانپو، یاک، لاما، گنپہ جیسے الفاظ دیئے ہیں۔

ماہرِ لسانیات کے مطابق جو الفاظ کسی زبان میں کسی بھی صورت میں مقبول ہو چکے ہوں، اُنہیں دُرست مانا جاتا ہے مثلاً موسِم کا صحیح تلفّظ موسِم ہے لیکن کثرتِ اِستعمال سے موسَم بنا ہے اور یہی صحیح مانا جاتا ہے۔

الفاظ اپنا چولا بدلتے رہتے ہیں جیسے انگریزی Verandah اُردو میں برآمدہ اِستعمال ہوتا ہے جبکہ لداخی میں برانڈا کہا جاتا ہے۔ انگریزی Tobaccoo اُردو میں تمباکو اور لداخی میں تمق بنا ہے۔ اُردو کے ایک لفظ ''توا'' کے لئے لیہہ اور سنٹرل لداخ میں ''تاوٗ'' استعمال ہوتا ہے۔ علاقہ لائن کے اکثر گاؤں میں ''تو'' بنا ہے۔ آگے جا کر دومکھر اور سیکو بوچن میں ''تول'' کہا جاتا ہے۔

لداخی میں کچھ الفاظ ایسے ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ یہ اُردو سے ماخوذ ہیں جیسے لازیز، لُوزیز۔ لذیذ سے ماخوذ لگتا ہے۔ ڈین چوقس ڈائن کے معنی میں اِستعمال ہوتا ہے۔

لداخیوں نے اُردو اور لداخی الفاظ کے مرکب سے دلچسپ الفاظ اور اِصطلاحیں وضع کی ہیں۔ جیسے گیوما خان (دل کا برا، کینہ رکھنے والا)، مالا خان (جھگڑالو)، شوقچن (شوقین)، گام پا (گاؤں والا)، سنگ تھل (تھالی کے لئے اعزازی لفظ ہے) وغیرہ وغیرہ۔

صرف چائے سے کئی مرکبات بنائے ہیں جیسے چاریل، چاکیر، چاتنگ، چاژھن، چاشوق، چارول، سولجا وغیرہ۔

پولو جو بلتی لفظ ہے۔ گول چیز یا گیند کو کہتے ہیں۔ اس سے ستا پولوق، کنگ پولوق، رس پولوق بنے ہیں۔

کئی الفاظ مکرر استعمال ہوتے ہیں جیسے پولا شولا (پلاؤ وغیرہ)، فلاں پھستاں، (یعنی فلاں فلاں آدمی) وغیرہ۔

ماہرینِ لسانیات کہتے ہیں کہ زبان صدیوں کے طویل سفر کے بعد معرضِ وجود میں آتی ہے اور اس میں نئے الفاظ شامل ہوتے جاتے ہیں۔ حال میں لداخی میں ایک لفظ ناچوق کا اضافہ ہوا ہے جس کا لفظی مطلب کان ہے اور مخبر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اِس لفظ نے قبولِ عام کی سند حاصل کی ہے۔ خوشامدی اور کاسہ لیس کے لئے ''دتُھر مانکس'' یا چمچہ بھی استعمال ہوتا ہے لیکن یہ زیادہ مقبول نہیں ہے۔

کئی دفعہ زبان کے الفاظ مرتے ہیں یا ایسے غائب ہوتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ، بلکہ خود زبان بھی مرجاتی ہے۔ جیسے سنسکرت جیسی زرخیز زبان کے ساتھ ہوا۔ لداخی میں تین چار دھائیاں پہلے بے بُوش، منظوُ بلی، تھادولی، چاروق، چاپن، داؤس، ہیربون جیسے الفاظ عام استعمال ہوتے تھے۔ اب یہ الفاظ مرگئے

ہیں۔ ان میں چند الفاظ ترکی اور کشمیری کی دین ہیں۔

لداخی راجاؤں نے اپنی فتوحات وغیرہ کے دوران لداخی زبان کو لداخ سے باہر مروّج کیا۔ آج کل لداخی زبان لداخ سے باہر نیپال کے علاقے مستانگ (لداخی منتانگ)، مون یول، ڈوڈہ کے پاڈر، ہماچل پردیش کے سپیتی اور لاہول، وادی کشمیر کے نیلا گراٹ، گنگوتری (اتر پردیش) کے ہرسل گاؤں اور بلتستان میں گنوخ میں بولی جاتی ہے۔

زبان کے سلسلے میں ماہرین لکھتے ہیں: ''سماجی، معاشی اور تمدّنی زندگی کا اثر زبان پر پڑتا ہے۔ اگر سماج ترقی یافتہ ہو تو زبان بھی ترقی یافتہ ہوگی۔''

زبانیں آسمان سے نہیں اُترتیں، خلا میں پروان نہیں چڑھتیں بلکہ زندگی کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں اور جیتے جاگتے سماج کے گہوارے میں پروان چڑھتی ہیں۔ وہی زبان نشو ونما پاتی ہے اور زندہ رہ سکتی ہے، جو روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہوتی ہے۔ بول چال لداخی ایسی ہی ایک زبان ہے۔
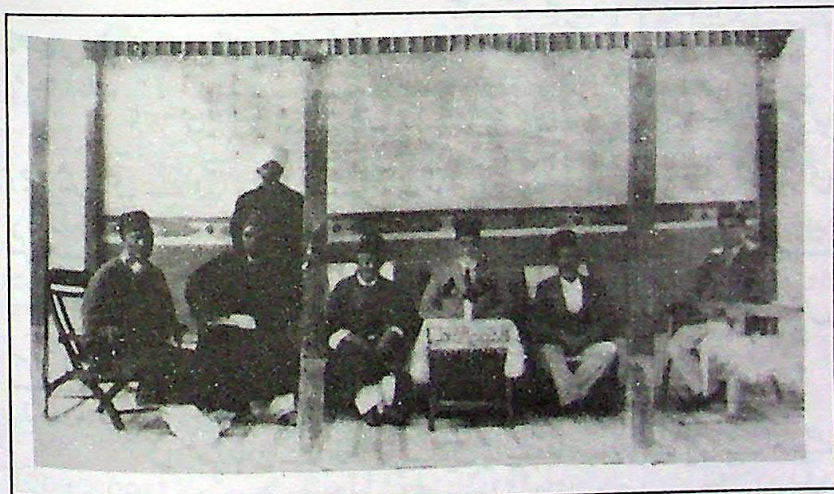
۱۹۴۷ء سے پہلے کا ایک فوٹو، جب مُسلمان رومی (مراکشی) ٹوپی پہنتے تھے۔
منشی غلام محی الدین، بابو تھرچین اور دوسرے رومی ٹوپی میں

لداخ میں اُردو

اُردو لداخ کی تہذیبی اور رابطے کی زبان ہے۔ یہاں مادری زبان کے بعد اُردو پڑھنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اُردو ریاست جموں وکشمیر کی سرکاری زبان بھی ہے۔

ریاست میں اُردو زبان ڈوگرہ حکومت کی دین ہے۔ ڈوگرہ حکمران مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۸۹ء میں اُردو کو ریاست جموں وکشمیر کی سرکاری زبان بنایا۔ اس سے پہلے فارسی سرکاری زبان تھی۔ تاہم درباری اُردو لکھتے اور بولتے تھے۔ اُن کے پیشرو مہاراجہ رنبیر سنگھ نے تار برقی کی ترسیل کے لئے اُردو زبان کو رائج کیا۔ کشمیر سے پہلے ۱۸۳۵ء میں اُردو کو پنجاب میں سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تھا، جس کے ساتھ لداخ کے تعلقات قائم تھے۔

فارسی ریاست کی سرکاری زبان ہونے کے باوجود اِس کا استعمال اعلیٰ طبقہ تک محدود تھا۔ آرکائیوز ریکارڈ کے مطابق عام لوگوں کے لئے دفاتر میں اُردو اور انگریزی استعمال ہوتی تھی اور اُردو کو سرکاری زبان بنانے کے لئے راہ ہموار ہوئی تھی۔

تاہم حالات اور کوائف بتاتے ہیں کہ اُردو کو سرکاری زبان بنانے سے بہت پہلے لداخ میں اُردو باہمی لین دین اور آپسی تبادلۂ خیال کے لئے رابطے کی زبان کی حیثیت سے مقبول تھی۔ تب لداخ ایک خودمختار خطّہ تھا۔ لیہہ وسط الیشیاء کا ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ بہت سارے پنجابی، کشمیری، تبّتی اور ترکی تاجر تجارت کے سلسلے میں لداخ آتے تھے۔ اِس لئے رابطے کے لئے ایک زبان کی ضرورت تھی۔ ترکی

تاجروں کے ساتھ لداخی ترکی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ پنجابیوں اور کشمیریوں کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی سہی، اُردو میں بات چیت کرتے تھے۔ ۱۸۲۰ء اور ۱۸۲۱ء کے دوران ایک انگریز مورکرافٹ لداخ میں تھا۔ وہ رقم طراز ہے: ''کرگل میں ہر گاؤں میں ایک یا دو فارسی اور ہندوستانی جاننے والے تھے۔''

مسلمانوں نے ریاست میں اُردو کو سرکاری زبان بنانے سے دوسو سال پہلے لداخ کو فارسی سے روشناس کیا۔ لداخ مغلیہ حکومت کا باج گذار تھا اور لداخ کے راجے کشمیر کے مغل گورنرز سے فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ اِس ضمن میں ایک لداخی راجہ نے کشمیر سے ایک فارسی دان مسلمان کو مدعو کیا اور لیہہ میں آباد کیا۔

اُنیسویں صدی میں لداخ میں اُردو کی مقبولیت کی تصدیق ایک واقعہ سے ہوتی ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷-۱۸۸۵ء) نے ۱۸۷۴ء میں لیہہ میں سنسکرت کی درس و تدریس کے لئے ایک پاٹھ شالہ کھولی اور اس کے لئے کشمیر سے ایک اُستاد بھیجا۔ لداخ کے تمام نمبرداروں کے نام ہدایت جاری کی گئی کہ وہ اپنے بیٹے یا اپنے رشتے کے ایک قریبی بچے کو پاٹھ شالہ میں سنسکرت سیکھنے کے لئے داخل کریں لیکن لداخیوں نے سنسکرت سیکھنے میں بالکل دلچسپی نہیں دکھائی۔ اکثر بچے سکول سے بھاگ جاتے تھے اور والدین اُن کو روکنے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔

وسط ایشیاء سے تجارتی امور کی نگرانی کیلئے لیہہ میں متعینہ انگریز جوائنٹ کمشنر نے اکتوبر ۱۸۸۲ء میں اپنی ڈائیری میں لکھا ہے: ''لداخی فارسی رسم الخط میں لکھنے اور پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں۔ یہ کشمیر کی سرکاری زبان ہے کیونکہ یہ ہندوستانیوں اور ترکی تاجروں میں آپسی میل جول کے دوران عملی طور زیادہ مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ (اشارہ اُردو کی طرف ہے۔ ترکی تاجر بھی اُردو رسم الخط میں لکھتے تھے) اِس کے برعکس لداخی سنسکرت کے چند صفحات رٹانے میں اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ ان لڑکوں کو بڑی مشکل سے سکول میں حاضر رکھا جاتا ہے۔ مہاراجہ کی طرف سے فراخ دِلانہ

وظائف کی ادائیگی، خوراک وغیرہ کی فراہمی کے باوجود وہ لگاتار سکول سے بھاگتے رہے ہیں۔ مہاراجہ کو پاٹھ شالہ کی ناپسندیدگی کا علم رہا ہے۔ ہر سال طلباء کی تعداد گھٹتی جارہی ہے لیکن اُس نے سکول بند نہیں کیا ہے۔''

آگے وہ لکھتا ہے: ''شاستری سکول جو یہاں چند سال سے قائم ہے، آج عملی طور بے کار پڑا ہے اور اِس میں صرف پانچ طلباء زیر تعلیم ہیں۔''

برٹش جوائنٹ کمشنر کی یہ ڈائیری نیشنل آرکائیوز میں موجود ہے۔

اِس سے پہلے کشمیر میں برطانوی ہند سرکار کے خصوصی ڈیوٹی پر تعینات افسر میجر پی. ڈی. ہنڈرسن نے معاملہ ہذا زیر نمبر ۱۴۴ مورخہ ۲۵؍اکتوبر ۱۸۷۷ء برطانوی ہند حکومت کی نوٹس میں لایا تھا۔ غالباً لیہہ میں تعینات برٹش جوائنٹ کمشنر نے اس طرف ان کو متوجہ کیا ہوگا۔ میجر ہنڈرسن نے لکھا تھا: ''لداخی لڑکوں کی تعلیم کے لئے مہاراجہ کا قائم کردہ یہ شاستری سکول (مقامی لوگوں میں) بالکل نامقبول ہے۔ مہاراجہ صورتِ حال سے آگاہ ہے لیکن اپنے فیصلے پر اڑا ہے۔''

آخر کار مہاراجہ کو لوگوں کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا اور سکول بند کر دیا گیا۔

۱۸۸۵ء میں عیسائی مشنری موراوین مشن نے لیہہ میں ایک سکول کھولا۔ سکول میں اُردو اور انگریزی دونوں زبانیں پڑھائی جانے لگیں۔ اگرچہ تب تک اُردو کو ریاست میں سرکاری زبان نہیں بنایا گیا تھا لیکن اُردو کی مقبولیت کے پیشِ نظر مشن نے اُردو کو نصاب میں رکھا۔

آزادی سے پہلے لداخ میں متعدد انگریز سیاحت اور شکار کے لئے آتے تھے۔ اُن میں سے بہتوں نے اپنے سفرنامے لکھے ہیں۔ کئی سفرناموں میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے اور لداخیوں کے درمیان ذریعہ اظہار کی زبان اُردو تھی۔ یہ انگریز، جن میں بہت سارے فوجی افسر تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی ہند سرکار کے ملازم

رہے تھے۔

۱۹۴۰ء میں والئی ریاست مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے جانشین مہاراجہ ہری سنگھ (۱۹۲۵ء-۱۹۴۷ء) کے دورِ حکومت میں سیّدین کمیٹی کی سفارشات پر ریاست میں اُردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔ تب خواجہ غلام السیّدین ریاست میں محکمہ تعلیم میں ناظمِ اعلیٰ تھے۔ اس سے پہلے ریاست کے تمام سکولوں میں اُردو پڑھائی جاتی تھی۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۸۸ء میں جموں صوبہ میں اُردو کو عدالتی زبان بنایا تھا۔ بیسویں صدی کی دُوسری دہائی میں وادیء کشمیر اور لداخ کی عدالتوں میں اُردو میں کام ہونے لگا۔ تقریباً اُسی زمانے میں محکمہ مال میں بھی اُردو مروّج ہوئی۔

شخصی حکومت کے دور میں ریاست میں اخبارات کی اشاعت اور بیرون ریاست سے اخبارات کی آمد پر پابندی عائد کی گئی تھی۔ لاہور، الہ آباد اور دُوسرے شہروں میں چھپنے والے اُردو اخبارات چوری چھپے ریاست میں منگائے جاتے تھے۔ جنہوں نے ریاست میں تحریکِ آزادی کا بیج بونے اور اِسے بڑھاوا دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

لداخ میں بھی لاہور سے ''صداقت''، ''خلافت''، ''زمیندار''، ''انقلاب''، ''پرتاپ'' اور ''ملاپ'' جیسے اخبارات خفیہ طریقے سے منگائے جاتے تھے۔ یہ پچھلی صدی کی بیس اور تیس کی دہائی کی بات ہے۔ ان اخبارات کو پڑھ کر ایک لداخی منشی عبدالستار نے تحریکِ آزادی میں حِصّہ لیا اور جیل گئے۔ وہ لداخ کے واحد مجاہدِ آزادی ہیں۔ مذکورہ کئی اخبارات میں کئی دفعہ لداخ میں شخصی حکومت کے مظالم کی روئداد بھی چھپتی تھی۔

بعد میں سرینگر سے ''ہمدرد'' اور ''صداقت'' نام کے اخبارات لیہہ آنے لگے۔

ڈوگرہ حکمرانوں نے اُردو کی ترقی و ترویج میں بڑی دلچسپی لی ہے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے اُردو کے فروغ کے لئے سکولوں میں انسپکٹر تعینات کئے اور اُردو ادیبوں کی

اعلیٰ تخلیقات کے لئے انعامات اور اعزازات کا سلسلہ شروع کیا۔

ریاست میں اُردو کی پہلی کتاب ''سفرنامہء بخارا'' ہے، جو جموں میں چھپی اور اس کا مصنّف مہتہ شیر سنگھ ہے۔ وہ بخارا سے لداخ کے راستے واپس کشمیر روانہ ہوا تھا۔ اِس کتاب میں لداخ کا بھی ذکر ہے۔

اِسی طرح ''احوالِ ملک لداخ'' اِس خطّے کے بارے میں ایک پرانا قلمی نسخہ ہے۔ یہ دونوں نسخے سرینگر کی ریسرچ لائیبریری میں ہیں۔

آزادی کے بعد لداخ میں اُردو نے نمایاں ترقی کی۔ اُردو میں کتابیں لکھی گئیں اور اُردو قارئین کی تعداد ہزاروں تک پہنچی۔ یہاں زبان کے نام پر تناؤ اور کھچاؤ نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے آج لداخ میں ادبی، سیاسی اور ثقافتی زندگی پر اُردو کا اثر ہے۔ یہ ریاست اور ملک کے دوسرے حصوں کے لئے رابطے کی زبان کا کام دیتی ہے۔ اندرون ملک سے کوئی بڑی شخصیت آتی ہے تو عام طور پر اُردو میں اس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ اُردو میں سپاسنامہ پڑھا جاتا ہے۔ کھیل کے میدان میں کومینٹری اِسی زبان میں ہوتی ہے اور مختلف اعلانات کرنے کے لئے اسی زبان کا سہارا لیا جاتا ہے۔

لیکن تصویر کا ایک اور رُخ بھی ہے جو حال کی پیداوار ہے۔ اِس زبان کے ساتھ ماضی میں جو گہری وابستگی تھی، اب لیہہ ضلع میں اِس میں کمی آئی ہے۔ البتہ کرگل ضلع میں اِس کی گرفت مضبوط ہے۔

۱۹۵۶ء میں جموں و کشمیر آئین ساز اسمبلی نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا۔ تاہم ایک سرکاری زبان کو فروغ دینے کے لئے جو اقدام لینے چاہیئے تھے وہ سرکار نے اب تک نہیں لئے ہیں۔

۱۹۷۵ء میں جب شیخ محمد عبداللہ دوبارہ ریاست کے وزیر اعلیٰ بنے تو اُنہوں نے اُردو و ہندی کو دسویں جماعت تک لازمی قرار دیا۔ اس کے مطابق جس نے ابتدائی جماعت میں اُردو زبان اختیار کی ہو، چوتھی جماعت سے ثانوی زبان کی حیثیت

سے ہندی پڑھنی ہوگی اور ہندی ابتدائی جماعت سے پڑھنے والے طالب علم کو چوتھی سے اُردو پڑھنی ہوگی۔

اُردو کو اِس لحاظ سے فوقیت دی گئی کہ ایک لازمی مضمون کے علاوہ اِبتدائی درجے سے میٹرک تک ذریعہءِ تعلیم بنایا گیا۔ سرکاری نوکری کے لئے اُردو ہندی دونوں کا جاننا لازمی قرار دیا گیا۔

حکومت نے حکم تو جاری کیا لیکن اِن فیصلوں پر شروع سے ہی نیم دلی سے عمل ہونے لگا۔ پرائیویٹ سکولوں کی اس ضمن میں بے اعتنائی پر کوئی باز پُرس نہیں کی گئی اور پھر ایک مرحلہ آیا کہ سبھوں نے اِس کو خیر باد کہا۔

عام مشاہدے میں آیا ہے کہ جو زبان شروع میں اختیار کی جاتی ہے، اس کی بنیاد اچھی رہتی ہے۔ خاص کر آج کل جب تعلیم کا معیار گر گیا ہے۔ یہ مسئلہ زیادہ سنگین بنا ہے۔ چوتھی جماعت میں پہنچنے کے بعد طلباء دونوں زبانوں میں کمزور ہوتے ہیں۔ میٹرک کے بعد ہر طالب علم کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کیونکر ان دونوں زبانوں کو خیر باد کہے اور دُوسرا مضمون اختیار کرے۔ یہاں ذریعہءِ تعلیم انگریزی ہونے کی وجہ سے سبھی انگریزی کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ خاص کر حالیہ سالوں میں انگریزی نے ملکی اور بین الاقومی سطحوں پر غیر معمولی افادیت حاصل کی ہے۔ اب تو انگریزی ذریعہءِ تعلیم بھی ہے۔

کئی ریاستی سرکاریں سہ لسانی فارمولہ کو نہیں مانتی ہیں۔ یہاں چار زبانیں پڑھانے کی باتیں ہوتی ہیں۔ ریاست کی تینوں اِکائیوں میں مادری زبانوں کو لازمی بنانے کی دیرینہ مانگ ہے۔ ظاہر ہے اِس صورتِ حال میں حکومت کو ریاست کی سرکاری زبان اُردو کی بقا اور نشو و نما کے لئے نئی حکمت عملی وضع کرنی ہوگی۔

لداخ میں اُردو قارئین ہزاروں ہیں لیکن لکھنے والے بہت کم ہیں۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں منشی عبدالستّار نے اُردو میں لداخ کی تاریخ لکھی۔ یہ ریاست میں لکھی جانے والی اُردو کی پہلی تصنیفات میں سے ایک ہے۔

آزادی کے بعد کاچو سکندر خان نے اُردو میں تین کتابیں تصنیف کیں۔ ''قدیم لداخ'' لداخ اور بلتستان کی تاریخ پر ایک مبسوط تصنیف ہے۔ ۳۴۷ صفحات کی اِس ضخیم کتاب میں کاچو صاحب نے بلتستان اور لداخ کی تاریخ، تہذیب اور تمدّن پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اِس تاریخ کی تیاری میں اُنہوں نے جہاں مختلف مورخوں سے اِستفادہ کیا ہے وہاں اپنی تحقیق سے نئی باتیں منظرِ عام پر لائی ہیں۔ خاص طور پر درردوں کی تہذیب پر بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے۔

اُن کی دُوسری کتاب ''زبوز انگپو وایت ٹھوق لہامو'' مشہو لداخی داستان کا اُردو ترجمہ ہے۔ اِس داستان کا اصلی ماخذ سنسکرت ہے اور اسے مقامی ماحول کے مطابق تبّتی اور لداخی جامہ پہنایا گیا ہے۔ کاچو صاحب نے اِس داستان پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

اُن کی تیسری تصنیف ''افکارِ پریشاں'' اُن کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ کتاب کے خوبصورت عنوان کی طرح اُنہوں نے اپنی آپ بیتی، مشاہدات اور تجربات کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ کاچو صاحب کی زبان سلیس، شیریں اور دلنشیں ہے۔

اوّل الذکر دو کتابوں پر کاچو صاحب کو ایوارڈ بھی ملے ہیں۔

اکبر لداخی مرحوم نے لداخی زندگی پر کئی کہانیاں اور مضامین لکھے ہیں۔ بابو عبدالحمید نے لداخی۔ اُردو اور انگریزی لغت مرتّب کی ہے۔ یہ پہلی لغت ہے، جس میں لداخی الفاظ کے اُردو متبادل دیئے گئے ہیں۔ مصنف نے اپنی دُوسری کتاب میں ایک ہزار لداخی کہاوتوں کے متبادل، اُردو کہاوتیں یا اُن کے ترجمے پیش کئے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اِس نوعیت کی منفرد تصنیفات ہیں جن سے اُردو قارئین لداخی زبان اور کہاوتوں سے رُوشناس ہوئے ہیں۔

راقم الحروف نے اب تک اُردو میں دو ناول، دو افسانوی مجموعے، ایک سوانح

حیات اور دو تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ اِن کے علاوہ میری بیسیوں کہانیاں، ادبی تخلیقات اور لداخ سے متعلق متعدد مضامین ریاست اور ملک کے بہت سے رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

کئی لداخی قلم کاروں ٹشی ربگیں، چھوانگ تولدن، ستزین آنگچک، عبدالقیوم وغیرہ نے اُردو میں اِکّا دُکّا مضامین قلم بند کئے ہیں۔ اُردو میں کئی شعراء اور شاعرات طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان میں منیر احمد، رقیہ بانو، چھرنگ آنگموں، پنچگ آنگموں اور خالدہ باری (مرحومہ) شامل ہیں۔

کئی غیر لداخی ادیبوں اور قلم کاروں نے لداخ پر اُردو میں لکھا۔ اُن میں وزیر حشمت اللہ کی کتاب ''تاریخِ لداخ، جموں وکشمیر'' ایک معرکتہ الاراء تصنیف ہے۔ نیز امین پنڈت کی کتاب 'لداخ کی کہانی'' اور ستیش بترا کا سفر نامہ 'جولے لداخ'' قابلِ ذکر ہیں۔

لیہہ اور کرگل کے ریڈیو سٹیشنوں نے اُردو کے فروغ کے لئے اچھا کردار ادا کیا ہے۔ ان سٹیشنوں سے اُردو میں وقتاً فوقتاً پروگرام نشر ہوتے ہیں۔

ریاستی کلچرل اکادمی کی مطبوعات خاص کر ادارہ کے جریدے ''ہمارا ادب'' اور ''شیرازہ'' کے خصوصی شمارے تاریخی طور پر دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں۔ اِن میں ریاست کے تینوں خطوں کے مشاہیر، ثقافت، فنونِ لطیفہ، رہن سہن، رسم و رواج، پکوان، لباس، تاریخ، جغرافیہ، اساطیر اور دیو مالائی کتھاؤں پر تحقیقی مضامین دئے گئے ہیں۔ اِس ضمن میں تینوں اکائیوں کے قلم کاروں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔

مُلک کے دُوسرے حصّوں کی طرح یہاں بھی فلمیں اُردو کے فروغ اور بقاء میں اہم رول ادا کر رہی ہیں اور فلمی مکالمے اور گیت ناخواندہ لوگوں کی بھی زبان پر چڑھے ہیں۔

اُردو نے لداخی اور بلتی زبانوں کو غزل، قوالی، نعت، منقبت، قصیدہ اور مرثیہ

عطا کیا ہے۔

اُردو نے براہِ راست اور بالواسطہ ریاست کی وحدت کو تقویت پہنچائی ہے۔ لداخی بول چال کی زبان کو اُردو نے متعدد الفاظ دئے ہیں۔ جن میں متعدد الفاظ اپنی اصلی صورت میں ہیں اور متعدد الفاظ لداخی سانچے میں ڈھل کر اس میں ضم ہو گئے ہیں۔ کئی مقبولِ عام کہاوتوں میں اُردو کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔

لداخی زبان کی ترکیب، ساخت اور مزاج کچھ ایسا ہے کہ اس میں اُردو، ہندی یا فارسی کے الفاظ نہیں پھبتے۔ اِس لئے لداخی ادیب اور مترجم متبادل اور نئے الفاظ کے لئے تبتی ماخذ سے الفاظ ڈھونڈتے ہیں یا لداخی لفظ یا اُن کے مرکبات سے تلمیحات اور اصطلاحات وضع کرتے ہیں۔ تاہم متعدد اُردو الفاظ لداخی میں ایسے رچ بس گئے ہیں کہ اُن کے بغیر لداخی نامکمل ہوگی۔

اُردو کے متعدد الفاظ لداخی زبان میں اِستعمال ہوتے ہیں جیسے کمبل، کمرہ، چلم، کشتی، بنیان، کنٹوپ، کلچہ، بقچہ، بستہ، الماری، میز، پیوند، دیدی، خواجہ، برقع، گلاب، قالین، شال، توپ، دری، مخمل، رنگ، ٹماٹر، آلو، پھول گوبھی، دیگ، ٹھیک، آرہ، سپاہ، کباب، گوشتابہ، یخنی وغیرہ۔

بہت سارے الفاظ بگڑی ہوئی صورت میں لداخی زبان کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں، جیسے:

فارسی/اُردو	لداخی	اُردو	لداخی	اُردو	لداخی
دف	دپس	نیلام	لیلم	پلاؤ	پولا
جنازہ	جِناز	سموسہ	سمسو	الائچی	لیشی
بالٹی	بالٹین	کھجور	خسور	بندوق	تُوبق
چادر	ژازر	مسخرا	مسکر	کھانڈ	خرا
چڑیا	چوتی	مردار	مُل دار	پاپوش	پابُو

قمیض	کمیز	طشت	طاس	مسجد	مجید
موتی	موتیک	فلیتہ	فتیلہ	تمباکو	تمق
بگھار	بفر	تمغہ	تغمہ	ابّا	آوا
چائے	چاء	پراٹھا	پورونٹا	ڈمرُو	درُو
موم بتی	بتی	توا	تاوٗ	نیند	نیت
قفل	کولیک	ڈائین	ڈین	گُم گُم	گُرگُم
دارچینی	دالچین	وسوسہ	وسواس	سرائے	سرا
				پڑاوٗ	پڑا

لداخیوں نے اُردو الفاظ سے لداخی زبان کے الفاظ کے طرز پر حروف مکبّر اورحروفِ تصفیر بنائے ہیں جیسے دیگ سے دیگچین یا بڑی دیگ، دیگچُونگ یا چھوٹی دیگ۔

کئی دفعہ اُردو اور لداخی ہم معنی الفاظ ایک ساتھ اِستعمال کئے جاتے ہیں جیسے ٹھیل شرم، شرع شرم، ٹھمز قانون، ٹھل بے کار، خداقو نجوق، گاڑی خورلو وغیرہ۔

کئی اُردو الفاظ لداخی میں دُوسرے معانی میں اِستعمال ہوتے ہیں جیسے:

کھیل تپ چیس	ہوشیاری سے نفع کمانا یا فائدہ لینا
خوشی چن	متلون مزاج
جورا ریگ چیس	غلط باتیں بنانا
ٹوٹا پھوقچیس	نقصان ہونا
مِنّت چوڈُوگ	ٹرخا رہا ہے
باقی پھوق چیس	کمی پیش آنا
ادب چیگ دُوگ/ حساب چیگ دُوگ	تھوڑا بہت ہے
بُو میدُوگ	نام ونشان نہیں ہے
غُدود	پاجی، کمینہ آدمی

کئی لداخی کہاوتوں میں اُردو کے الفاظ ہیں، جیسے خاخارا، نینگ آرہ یعنی زبان کا میٹھا لیکن دِل کا بُرا۔ آرہ کو یہاں خراب کے معنی میں لیا ہے۔ یا ایک اور محاورہ لیجئے۔ چُھو کھیونگ کن لاشاباش میت، چھو کرچق کن لاکپ کیون میت یعنی پانی لانے والے کو شاباش نہیں اور گاگر توڑنے والے کو ڈانٹ نہیں۔

کسی ملک یا خطّے کے علمی ذوق کا تعیّن اس ملک یا خطّے کے لوگوں کے ذوقِ مطالعہ، اچھے برے مذاق اور ذہنی سطح کا اندازہ کتابوں کے اِنتخاب سے لگایا جاسکتا ہے۔ مطالعہ کے ضمن میں رسائل اور جرائد کا رول نہایت ہی اہم ہے۔ رسالے جہاں ہر ماہ علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی، فلمی اور کھیل کود سے متعلق تازہ معلومات بہم پہنچاتے ہیں، وہاں قارئین کو ادیبوں اور شاعروں کی نئی تخلیقات بھی فراہم کرتے ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے کہ لداخ میں اُردو بلکہ دُوسری زبانوں کی کتابیں اور رسائل وغیرہ پڑھنے والوں کی تعداد سکڑتی جارہی ہے۔ لیہہ میں دو تین دہائیاں پہلے اُردو کے متعدد رسائل آتے تھے اور بکتے تھے۔ آج یا تو نہیں بکتے یا پھر کم بکتے ہیں۔ جس کے سبب متعلقہ ایجنٹوں نے رسائل منگانا بند کردیا ہے۔ میَں ایک کتاب فروش کو جانتا ہوں، جس نے آزمائشی طور اُردو کے مختلف رسائل منگائے اور یکے بعد دیگرے انہیں بند کردئے تاہم اُنہوں نے اپنا یہ تجربہ جاری رکھا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ گزشتہ دو تین دھائیوں کے مقابلے میں اُردو دانوں کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا ہے اور لوگ مادّی لحاظ سے خوشحال ہو گئے ہیں اور دو چار رسائل خریدنا اُن کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

کم مطالعہ کی ایک وجہ ٹی وی ہوسکتا ہے۔ جس کا اثر مغرب پر نہیں پڑا ہے۔ دُوسری وجہ روپے پیسے کے پیچھے دوڑ دھوپ ہے۔ فضول مصروفیات اور غلط قسم کے مشاغل میں مگن رہنا ہے۔ اِس منفی پہلو کے باوجود اُردو کا گہرا اور دُور رس اثر ہے۔ لوگ اُردو اشعار پر سر دھنتے ہیں۔ اُردو گیتوں کی فرمائشیں کی جاتی ہیں۔ اکثر لداخی ادیبوں نے اُردو پڑھی ہے اور براہ راست یا بالواسطہ اُردو سے اثر لیا ہے۔ میَں نے

ایک لداخی شاعر سے سوال کیا کہ اُس کی رومانی شاعری پر کس کا اثر ہے؟ تو وہ جھٹ سے بولا۔ ''اختر شیرانی۔''

سب سے بڑھ کر یہ کہ اُردو لداخ میں اِس وقت رابطے کی ایک اہم زبان بنی ہے۔ یہاں نہ صرف تینوں اکائیوں کے ملازم اور دُوسرے پیشہ ور لوگ ہیں بلکہ ملک کے مختلف حصوں سے ہزاروں لوگ آتے ہیں جن میں سیاح، فوجی جوان، تاجر، کاریگر اور مزدور شامل ہیں۔ یہی زبان سب کے لئے باہمی بات چیت اور تبادلہ خیال کا ذریعہ ہے۔

میرے نزدیک ریاست میں اُردو کی نشو ونما اور ترقی کے لئے مندرجہ ذیل چند اقدام لینے کی اشد ضرورت ہے:

(ا) ریاست کے تینوں خطّوں میں قائم کلچرل اکادمی سے منسلک ایک شاخ یا شعبہ کھولا جائے جو اُردو کی ترقی اور ترویج کے لئے کام کرے۔

(ب) یہ ادارہ محکمہ تعلیم، مقامی ادیبوں اور ادب نوازوں کے اشتراک سے سمیناروں، ورک شاپوں اور کانفرنسوں کا اہتمام کرے۔

(ج) پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں اُردو پڑھانا لازمی قرار دیا جائے۔

(د) اُردو کتابت اور خوش نویسی کی تربیت کے لئے ریاست کے ہر ضلع سے اُمیدواروں کو موقع دیا جائے۔

زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور نہ اسے جغرافیائی حد بندیوں یا خانوں میں قید کیا جا سکتا ہے۔ اُردو ہماری گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ اُردو کے ممتاز افسانہ نگار رام لعل لکھتے ہیں: ''اُردو زبان کو کسی ایک فرقہ سے جوڑنا نہ صرف تاریخی غلطی ہے بلکہ ایک خطرناک سیاسی حربہ ہے۔ جس سے اُردو زبان کے حامیوں کو خبردار رہنا چاہئے۔''

نامور قانون دان اور قلم کار سر تیج بہادر سپرو نے پنڈت جواہر لعل نہرو کے نام

اپنے ایک خط میں لکھا تھا:

''اُردو مسلمانوں ہی کی زبان نہیں ہے' ہندوؤں نے بھی اِس کے لئے بڑا سرمایہ فراہم کیا ہے۔''

اُردو کا ایک ادیب سوم آنند رقم طراز ہے:

''کئی دھائیوں تک برِ صغیر میں بول چال کی زبان اُردو رہی اور اب بھی اُردو شاعری برِ صغیر میں اِظہارِ خیال کا بہترین ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ اُردو پہلے شمالی ہند کی زبان تھی' اب جنوبی ہند میں اِس کا چرچا ہے۔ کثیر تعداد میں لوگ اُردو زبان پسند کرتے ہیں۔''

مڈل سکول لیہہ' ۱۹۴۷ء سے پہلے

تصویر میں شری دھر ڈولو' سیّد محمد سعید' ایلی ایز رجولدن اور گیشے ایشے تنڈوپ نظر آرہے ہیں۔

مضمون ''لداخ میں تعلیم کی کہانی'' ملاحظہ ہو

لوڑا اور رینچن زنگپو

لداخ کی سرزمین کو مردم خیز تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اِس کی ڈیڑھ ہزار سالہ پرانی تاریخ پر ہم ایک نظر ڈالیں تو ہمیں چند ایسی شخصیتیں نظر آتی ہیں جنہوں نے علم و ادب، فنون لطیفہ، سیاسیات، مہم جوئی یا میدان جنگ میں کارہائے نمایاں سرانجام دئے ہیں۔

لداخ کے لوک گیتوں، گنپوں کی مصوّری، آرٹ کے نمونوں اور چٹانوں پر تراشے گئے شاہ پاروں کو دیکھ کر بے کم وکاست یہ کہا جا سکتا ہے کہ ماضی میں اِس بے آب وگیاہ وسیع سرزمین نے اعلیٰ پایہ کے گیت کار، شاعر، مصوّر، مجسمہ ساز، معمار اور سنگ تراش پیدا کئے ہیں۔ یا یہ فن کار لداخ سے ہو گزرے ہیں۔ تخلیقی شاہپارے تو ہمارے سامنے ہیں لیکن اُن کے خالق گمنام ہیں۔

قدیم زمانے میں لداخ کے ایک دیہات شرگولا میں لونپو ریگپا چن نامی یعنی دانا وزیر ایک اہم شخصیت ہو گزری ہے۔ اُس کی ذہانت کی کہانیاں آج بھی مشہور ہیں۔ تبت کے نامور بادشاہ رونگ ژن گیالپو نے اُس کو وزیر بنایا اور پیکنگ اور دہلی سفارتی مشن پر بھیجا۔ چین کا شہنشاہ، لونپو ریگپا چن کی ذہانت اور حکمت عملی سے بہت متاثر ہوا۔ وزیر نے تبت کے بادشاہ کے لئے چین اور نیپال سے ایک ایک شاہزادی بطور دُلہن لائی۔

رینچن شاہ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ چودھویں صدی کے پہلے رُبع میں یہ لداخی شاہزادہ کشمیر گیا تھا اور ایک اجنبی دیش میں کس مپرسی کے عالم میں اپنی ذہانت اور جُرأت سے تخت وتاج حاصل کیا اور سُلطان صدرالدّین کے نام سے کشمیر

کے پہلے مسلم حکمران کی حیثیت سے فرمان روائی کی۔

سولہویں صدی میں وسطی تبت کے مذہبی عالم ستق سنگ راسپا اوّل لداخ کے نامور راجہ سینگے نمگیل کے رُوحانی مُشیر تھے۔ اُنہوں نے لداخ میں ہمس، ٹشی گانگ، آنلے اور چمیرے گینپے تعمیر کئے۔ کہتے ہیں اُنہوں نے لداخ کو ہندو دھرم کے دیوی دیوتاؤں سے رُوشناس کیا۔ اُس سے پہلے ستق سنگ راسپا نے ہندوستان میں مختلف عالموں سے فیض حاصل کیا تھا۔

نامکاسپا لگی گون سولہویں صدی میں ایک مشہور عالم اور خوش نویس ہو گذرے ہیں۔ جنہوں نے چار سو سے زیادہ کتابوں کی کتابت کی۔ اُن کی خوش نویسی کا چرچا تبت تک تھا۔

ہند اور تبت سے لداخ آئے ہوئے چند سرکردہ بودھ اور مسلم مبلغوں اور عالموں کی تعلیمات کا دُور رس اثر یہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ اُن میں پدما سمبھاوا' ناروپا' میر سیّد علی ہمدانیؒ، سیّد نور بخشؒ اور شمس الدّین ایراکیؒ قابلِ ذکر ہیں۔

زوپا پلے ایک بلند پایہ مصوّر تھا۔ جن کی مصوری میں ایک خاص اِنفرادیت پائی جاتی ہے۔

کوشوق چھولٹیم نیماں کو اپنے ایثار کے لئے لداخ کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

ان شخصیتوں میں ایک اہم ترین شخصیت لوژاوا رینچن زنگپو تھے' جو دسویں اور گیارھویں صدیوں میں لداخ اور مغربی تبت کے آسمان پر ایک ستارے کی طرح چمکی تھی۔ علم نجوم' فلسفہ' طب' مذہب' تانترک اور بدھ دھرم پر سنسکرت کی کتابوں کے علوم سے تبتیوں اور لداخیوں کو روشناس کرنے میں اُنہوں نے سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ''لوژا'' سنسکرت میں آنکھ کو کہتے ہیں۔ اس پر لداخی ''وا'' ایزاد کیا گیا ہے۔ یعنی آنکھ والا یا چشم بینا۔ رینچن زنگپو کو یہ لقب اپنی تبحّرِ علمی' ذکاوت اور بصیرت کے

لئے ملا تھا۔

لوڑاوا رینچن زنگپو کے کارناموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اوّل اُن کی تعمیرات اور دویم اُن کی تصنیفات اور ترجمے کا کام۔ اُنہوں نے اپنی زندگی میں ایک سو آٹھ وہار اور متعدد ستوپا تعمیر کئے۔ یہ وہار لداخ، چہلو، بلتستان، سپیتی اور مغربی تبت میں پورانگ کوگے وغیرہ کے علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں زیادہ تر وہار امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں مٹ گئے ہیں اور اُن مقامات کی نشاندہی بھی نہیں ہوتی جہاں یہ تعمیر کئے گئے تھے۔ بہتوں کے کھنڈرات یا کچھ نشان رہ گئے ہیں اور چند وہار اب بھی لوڑاوا کی آرٹ نوازی، دھرم سے عقیدت اور اُس دور کی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔

لوڑاوا نے اپنی چند تصنیفات کے علاوہ سنسکرت کی متعدد کتابوں کا ترجمہ تبّتی میں کیا ہے۔ ان کتابوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ وہ عظیم مترجم کے نام سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔ لوڑاوا رینچن زنگپو کا جنم اندازاً ۹۵۷ء یا ۹۵۸ء میں مغربی تبت کی ایک چھوٹی سی ریاست گوگے میں ہوا۔ گوگے لداخ کا علاقہ رہا۔ لداخ کو ماضی میں مغربی تبت کہا جاتا رہا ہے۔ دسویں صدی میں تبّتی نسل کے لداخی راجا سکید دے نیما گون نے اپنی سلطنت اپنے تین بیٹوں میں تقسیم کی۔ منجھلے بیٹے الدے ستوق گون کو گوگے اور پورانگ کا علاقہ ملا۔ اس کی اولاد میں راجا ایشے اود بڑے مذہبی تھے۔ تھولینگ ریاست کا پایہ تخت تھا۔ وہ ہندوستان کے بدھ دھرم کے فلسفے اور طریقِ کار سے متاثر تھے اور اسے مروّج کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے اکیس منتخب ذہین طلباء کشمیر بھیجے۔ اُن میں ایک رینچن زنگپو تھے۔ یہ ۹۷۵ء یا ۹۷۶ء کی بات ہے۔ تب رینچن زنگپو ۱۸ سال کے تھے۔ اُن دنوں لداخ سے کشمیر یا ہندوستان کے سفر پر جانا بہت کٹھن تھا۔ راستے اِنتہائی دُشوار گذار تھے اور اکثر مسافر منزل پر پہنچنے سے پہلے لقمہء اجل بن جاتے تھے۔

رینچن زنگپو نے شروع میں کشمیر میں ایک قابل اُستاد پنڈتا گونا میترا سے علم

حاصل کیا اور سات ماہ میں گرایمر اور ترجمہ کے کام میں ماہر ہو گئے۔ اِن کے علاوہ اُنہوں نے اور کئی اُستادوں سے فیض حاصل کیا۔ اُن میں ایک پنڈتا کملا گپتا تھا۔ اُن دِنوں کشمیر بودھوں کا اہم علمی مرکز تھا۔ وہ کشمیر کے علاوہ ہندوستان کے دُوسرے حصوں میں گئے۔

اپنی غیر معمولی ذہانت سے رینچن زنگپو نے سنسکرت میں مہارت حاصل کی اور فلسفہ، مذہب نجوم، طب، یوگا اور مختلف علوم حاصل کئے۔ عالموں، رِشیوں اور منیوں کی صحبت میں دِن گذارے۔ اُنہوں نے نالندہ بھی دیکھا۔

تیرہ سال بعد رینچن زنگپو متعدد کتابیں لئے پورانگ لوٹے۔ اکیس طلباء میں سے صرف دو طلباء گُوگے واپس لوٹے۔ اُن میں دُوسرا طالب علم لقپا شیرپ تھا۔

شیرپ ایک جونیر مترجم بنا۔ باقی اُنیس طلباء کا پتہ نہیں لگتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق سارے مر گئے۔ رینچن زنگپو دس سال ستوت میں رہے۔

۹۹۶ء میں ایشئے اُود کی ہدایت پر رینچن زنگپو دوبارہ کشمیر گئے۔ اُن کا ایک مشن کشمیر سے اہم پنڈتوں کو مدعو کرنا تھا۔ اب کے پندرہ طلباء اُن کے ساتھ تھے۔ چھ سال بعد جب وہ لوٹے تو اُن کے ہمراہ بتیس مصوّر، کاریگر اور معمار تھے۔ کئی مورخوں نے یہ تعداد چھتالیس بتائی ہے۔

لوژاوا رنیچن زنگپو کی زندگی سے متعلق مفصّل مواد نہیں ملتا ہے۔ لداخی سکالر ٹشی ربگیس نے اپنے ایک مضمون میں اِس طرف اشارہ کیا ہے۔ لوژاوا سے وابستہ اب تک جو دستاویزات دستیاب ہوئی ہیں، اُن میں اُن کی زندگی اور کارکردگیوں کے احوال بہت کم دئے گئے ہیں۔ چنانچہ اُن کی زندگی کے مختلف ادوار کی کڑیوں کو ملانا دوبھر ہو جاتا ہے۔

رینچن زنگپو بنگال کے مہاتما اتیشا، بودھ رشی منی اور مہاسدھا مارپا، تیلوپا، ناروپا، آچاریہ دھرم پالا اور تبت کے گوشہ نشین فلسفی شاعر مِلا ریپا کے ہم عصر تھے۔

کہتے ہیں کہ رینچن زنگپو نے جب اپنی تعلیم مکمل کی اور وطن واپس آنے والے تھے تو اُنہوں نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے قومی لباس میں ملبوس ہے۔ ایک بڑھیا اُن کے پاس آکر کہتی ہے:

''رینچن زنگپو! اصل لعل ابھی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے، وہ تو ناروپا کے پاس ہے۔''

ناروپا اُن دِنوں بنگال سے کشمیر آئے تھے اور سرینگر سے ۱۸ کلومیٹر دور گھونمو گاؤں کے پاس پہاڑی گپھا ہرلیش ور میں تپسیا کرتے تھے۔ لداخی اُس گپھا کو ناروپا کا ''ٹُو پُوک'' کہتے ہیں۔

خواب دیکھنے کے بعد رینچن زنگپو، ناروپا کے پاس جاکر زانوئے ادب تہہ کرتے ہیں اور اُن سے یوگا کا گیان حاصل کرتے ہیں۔

لوژاوا تین دفعہ کشمیر گئے اور تین دفعہ لداخ آئے۔ ایک روایت کے مطابق تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ چالیس سال کے تھے گویا اُنہوں نے بائیس سال کشمیر اور دُوسرے مقامات پر گذارے تھے۔ غالباً وہ زوجی لا کے راستے لداخ آئے ہوں گے۔ ایک حساب سے تب سن ۱۰۲۳ء تھا۔ اُن دنوں لھاچھن چھوس گون لداخ کا حکمران ہونا چاہیے۔

رینچن زنگپو کی آمد کے بعد تبت اور لداخ میں بدھ مت کی نشاۃ الثانیہ (Renaissance) کی شروعات ہوئی۔ گُوگے مذہب اور ثقافت کا اہم ترین مرکز بن گیا۔ سبھی مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گُوگے کی راج دھانی تھولنگ جانے لگے۔ لداخ کی تاریخ کے اطالوی محقق ڈاکٹر لوسینو پیٹیک نے لکھا ہے کہ لداخ سے نوآموز لامے مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گُوگے میں رینچن زنگپو کی قائم کردہ خانقاہ میں جاتے تھے۔

ایشے اُود کی ہدایت پر اِسی اثناء میں سن ۹۹۶ء میں لداخ میں نیرما کے مقام پر

ایک مذہبی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ یہ رینچن زنگپو کا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ اُس میں ایک ہزار طلباء تھے جو لداخ کے تمام علاقوں کے علاوہ ہماچل پردیش کے لاہول، سپیتی سے آئے ہوئے تھے۔ رینچن زنگپو یونیورسٹی کے پرنسپل تھے۔

مغربی تبت اور لداخ میں گہرے تعلقات رہے ہیں۔ سکید دے نیما گون پورے خطّے کا حکمران رہا۔ اُس کی اولاد نے دونوں خطّوں میں الگ الگ حکومت کی۔ لداخ کے ایک راجہ اوت پالا (۱۰۸۰ء-۱۱۱۰ء) نے مغربی تبت اور لداخ کو متحد کیا۔ پھر دوبارہ الگ ہوئے۔ راجہ سینگئے نمگیل (۱۶۲۴ء-۱۶۴۲ء) نے نہ صرف مغربی تبت کو لداخ میں شامل کیا بلکہ سلطنت کو مزید توسیع دی۔ لیکن راجہ دے لیگس نمگیل کے عہد میں پھر ایک دفعہ مغربی تبت لداخیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جب راجہ نے تبت اور بھوٹان کے مابین زرد اور سرخ فرقوں کے تنازعے میں بھوٹان کا ساتھ دیا۔ دلائی لاما کی ہدایت پر منگول جرنیل سوقپا غلدن نے لداخ پر حملہ بول دیا اور لداخیوں کو شکست ہوئی۔ ایک معاہدے کے تحت لداخیوں کو مغربی تبت کے گو گے، پورانگ اور رُودوق کے علاقے چھوڑنے پڑے۔ اِس کے بعد پھر یہ کبھی متحد نہیں ہوئے۔

جیسا کہ اُوپر ذکر آیا ہے کہ لوڑاوا رینچن زنگپو نے ۱۰۸ وہار تعمیر کئے تھے۔ وہار کو لداخی زبان میں چھوسکور کہا جاتا ہے۔ لداخ کے گنپوں اور لوڑاوا کے وہار میں یہ فرق ہے کہ اوّل الذکر عموماً پہاڑوں اور اُن کی چوٹیوں پر تعمیر کئے گئے ہیں جبکہ موخر الذکر میدانوں میں بنے ہیں۔

لداخ میں لوڑاوا نے پہلا وہار چیلنگ سُومدو میں تعمیر کیا۔ دُوسرا وہار الچی میں اور تیسرا منگیُو کے مقام پر بنایا۔ زنسکار میں سانی گاؤں کا کانیکا نام کا گنپہ سب سے قدیم مانا جاتا ہے۔ تبّتی مورخین کے مطابق کشمیری راہب پہلے سانی میں بس گئے تھے۔ کانیکا کا نام کنشک سے بنا ہے اور اس کی تعمیر کو کنشک کے زمانے سے جوڑا جاتا ہے۔ تاہم کئی مورخین کا خیال ہے کہ سانی گنپہ بھی رینچن زنگپو نے تعمیر کیا تھا۔

ڈاکٹر کارل مارکس نے لداخ کے بزگو اور چیکتن گاؤں میں رینچن زنگپو کے دو وہاروں کا پتہ لگایا ہے۔ لیہہ میں ماضی قریب تک ایک وہار کی دیوار موجود تھی۔ بزگو میں بھی ایک وہار کا کھنڈر لبِ سڑک نظر آتا تھا۔

کرگل میں چھوسکور نام کا ایک گاؤں ہے۔ یہاں بھی لوژاوا رینچن زنگپو کا ایک وہار تھا۔ لیکن بہت سارے وہاروں کا پتہ نہیں چلتا ہے اور نہ ہی اِن سے متعلق کوئی دستاویز یا ریکارڈ ہے۔ البتہ الچی وہار اور سپیتی کا تابو وہار تقریباً اچھی حالت میں موجود ہیں۔ مغربی تبت میں تھولینگ کا وہار بھی لوژاوا کی یادگار ہے۔

الچی وہار لیہہ سرینگر شاہراہ پر دریائے سندھ کے پار لیہہ سے ۶۲ رکلومیٹر دُور الچی گاؤں میں ہے۔ لداخ کے راجہ چنگ چُب سیمپا نے گیارھویں صدی میں وہار کی تعمیر میں لوژاوا کو تعاون دیا۔ مقامی روایت کے مطابق لوژاوا کے ساتھ کشمیر سے ۳۵ معمار اور کاریگر آئے تھے۔ تاہم یہ لوژاوا کا اکیلا کام نہیں تھا۔ الچی وہار کے ایک کتبے کے مطابق دو پرانے گنپوں کی بنیاد لاماغلدن شیرب اور چھولیٹم اود نے ڈالی تھی۔ بعد میں راجہ ٹشی نمگیل نے سولہویں صدی میں اِن کی مرمت اور توسیع کی تھی۔

الچی چھوسکور مصوّری کا خزینہ ہے۔ یہاں کے ہالوں اور چھورتنوں کی دیواروں پر پانچ لاکھ کے قریب تصویریں ہیں۔ ایک محقق پروفیسر سنیل گرو نے تصاویر وغیرہ کے مطالعے میں یہاں تین ماہ گذارے۔ ایک جاپانی فوٹو گرافر نے تصاویر کو کیمرے کی آنکھ میں سمونے میں کئی مہینے لگائے۔

تصاویر میں گوناگونی اور نیرنگی ہے۔ کہیں بدھ کی حیات کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ کہیں کالا چکرا کے فلسفے کو نقوش میں سمجھایا گیا ہے۔ کہیں شاہی محلات کی منظر کشی ہے۔ کہیں برفیلی جھیل پر کشتی رانی ہورہی ہے۔ کہیں تبّتی رُوساء گھوڑسواری کر رہے ہیں۔ کہیں دیویوں کی شبیہیں ہیں۔ یہاں رینچن زنگپو کی شبیہہ کے علاوہ ناگ ارجن، پدما سمبھاوا، آریہ دیوا، ناروپا، مارپا اور ملاراسپا کی تصویریں ہیں۔ تصاویر کے رنگ و

روغن صدیاں گذرنے کے بعد بھی قائم ہیں۔

الچی چھوسکور کی مصوّری اور لکڑی کا کام کشمیری سٹائل کا ہے۔ کرداروں کے خدوخال اور ناک نقشہ آریائی ہیں۔ لمبی ستواں ناک اور بڑی بڑی بادامی گھمبیر آنکھیں............ اِس کے برعکس لداخ کے دُوسرے گنپوں میں مصوّری پر تبّتی کا گہرا اثر ہے۔

کشمیر کے آرٹ پر چین کے تانگ، بغداد کے عباسی، بنگال اور بہار کے پالا اور سینا حکومتوں کے آرٹ کا اثر ہے۔

دُورافتادہ اور کم آبادی والے مقامات پر وہار تعمیر کرنے کی وجہ لوڑاوا نے یہ بتائی تھی کہ قصبوں اور شہروں میں تو حکمرانوں کی سرپرستی سے بنائے گئے بہت سارے وہار ہوتے ہیں لیکن کم آبادی والے اور ویران علاقوں کی طرف نظر نہیں جاتی۔

وہاروں کے علاوہ لوڑاوا نے بہت سارے ستوپایا چھورتن تعمیر کئے۔ لیہہ سے ۱۲ رکلومیٹر دُور شے کا مشہور چھورتن ''دورجے چھنمو'' لوڑاوا نے بنایا تھا۔ لیہہ میں موجود پیلے رنگ کا ایک چھورتن ''منے سیر مو'' لوڑاوا سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لداخ کے گُونگیام اور تیری دو دیہات کے درمیان ایک سو آٹھ چھورتن ہیں۔ یہ بھی لوڑاوا کی دین ہیں۔ لوڑاوا کے تعمیر کئے گئے ایسے متعدد چھورتن وقت کے ہاتھوں مٹ گئے ہیں۔

عالم، مصنّف اور مترجم رتنچن زنگپو کا مرتبہ زیادہ بلند اور ان علمی میدانوں میں اُن کی خدمات زیادہ اہم ہیں۔ اُنہوں نے مختلف موضوعات پر کئی کتابیں لکھی ہیں اور مختلف علوم جیسے فلسفہ، طب، نجوم وغیرہ پر سنسکرت کی سینکڑوں کتابوں کا ترجمہ تبّتی میں کیا ہے۔ ان کتابوں کی باقاعدہ فہرست بنی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک کوئی ان علوم پر گہری بصیرت نہ رکھے، اُن کا ترجمہ ممکن نہیں۔ سنسکرت کی منظوم کتابوں کا منظوم تبّتی میں اُنہوں نے ترجمہ کیا ہے۔ اُن میں ''بُوم'' مشہور ہے۔ اِس دھارمک کتاب میں

ایک لاکھ اشعار ہیں۔ اِسی طرح ''جم سپل سم چوت'' جیسی دقیق کتاب کا اُنھوں نے سنسکرت سے کامیاب ترجمہ کیا ہے۔ سنسکرت جیسی زرخیز اور علمی زبان کے الفاظ کے لئے تبّتی میں متبادل اور موزوں الفاظ کی ساخت اور ترکیب بندی لوژاوا جیسے ذہین اور فطین انسان کے ہی بس کی بات تھی۔

لوژاوا کی طب کی کتابیں لداخی حکیموں کے نصاب میں ہیں۔ لداخ میں یہ طریقہ علاج آج بھی مروّج ہے۔ بہت سے حکیموں کو سرکار ماہانہ مشاہرہ اور جڑی بوٹیاں وغیرہ خریدنے کے لئے کچھ فنڈ دیتی ہے۔

لداخی جوتشی صدیوں تک نجوم کی اِن کتابوں سے عام لوگوں کو روزمرہ کی زندگی میں رہبری کرتے آئے ہیں اور لوگ سادگی سے اِن پر ایمان لیتے آئے ہیں۔

تبّتی میں مترجمہ دھارمک کتابوں کے شلوکوں کے زمزموں سے لداخ کی بودھ عبادت گاہیں گونجتی رہتی ہیں اور تبّتی داستانوں کا آہنگ گھر گھر سُنائی دیتا ہے۔

گُوگے کے حکمران چنگ چُب اُود کی دعوت پر آتیشا گوگے کی راج دھانی تھولینگ گئے۔ چنگ چُب ایشے اُود کا بیٹا تھا۔ آتیشا نے اپنے ہمراہ ایک تبّتی مترجم بھی لایا لیکن وہ سفر کے دوران راستے میں فوت ہوگیا۔ تھولینگ میں آتیشا کی ملاقات لوژاوا رنچن زنگپو سے ہوئی۔ تب لوژاوا اٹھاسی برس کے تھے۔ آتیشا نے دیکھا کہ لوژاوا کے بال گھرے سفید ہو گئے ہیں۔ اُنھوں نے لوژاوا سے سُترا تنترا وغیرہ سے متعلق مختلف سوالات پوچھے۔ جن کا لوژاوا نے مدلّل اور عالمانہ جواب دیا۔ تب آتیشا بے ساختہ بولے:

''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تبت میں ایک ایسا اِنسان ہے تو میں کبھی یہاں نہیں آتا۔''

ایک روایت یہ ہے کہ آتیشا نے لوژاوا سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ایک شاگرد کی حیثیت سے اُن سے فیضیاب ہونا چاہتے ہیں لیکن لوژاوا نے معذرت کا اِظہار

کرتے ہوئے کہا کہ اِس سے اُن پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوں گی۔

رینچن زنگپو' آتیشا کے بڑے مدّاح تھے۔ ایک روایت کے مطابق وہ آتیشا کے مقلِّد بن گئے۔

لداخ کے اِس مردِ فہمیدہ نے ستانوے سال کی عمر میں ۱۰۵۵ء میں انتقال کیا۔ اور اُن کی لاش گُوگے کی ایک اور راجدھانی ژھپرنگ میں ایک چھورتن میں محفوظ کی گئی۔

آتیشا اِن سے تین سال پہلے ۱۰۵۲ء میں فوت ہوئے تھے۔ میلاریپا' رینچن زنگپو کے اِنتقال کے ۱۵ سال بعد چل بسے۔ تیلوپا ۱۰۶۹ء اور ناروپا نے ۱۱۰۰ء میں وفات پائی۔

پُرانے لداخ کا ایک فوٹو

کُرسی پر بیٹھا ہوا غالباً لداخ کا راجہ ہے

میر سیّد علی ہمدانی رح

اور لداخ

حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح چودھویں صدی کے آخری رُبع میں لداخ آئے تھے۔ کئی تاریخی کتب میں اِس کا ذِکر ہے تاہم لداخ میں اُن کی آمد کا تذکرہ زبانی روایات تک محدود ہے۔ لداخ سے وہ تبلیغ کیلئے چینی ترکستان گئے تھے۔

''لداخ گیالربس''، یعنی لداخ کی شاہی تاریخ لداخ کے ماضی کا سب سے اہم اور قدیم ماخذ مانا جاتا ہے۔ یہ گذشتہ ایک ہزار سال کے دور کا احاطہ کرتی ہے تاہم اِس میں بہت سارے اہم واقعات نہیں دئے گئے ہیں۔

سلطان زین العابدین، سلطان سکندر، مرزا حیدر دوغلت، آدم خان، حسن خان وغیرہ کے حملوں کا لداخ کی شاہی تاریخی میں کوئی تذکرہ نہیں ہے جن میں سے کئی ایک نے خطّے کو فتح کر کے عارضی طور پر زیرِ نگیں رکھا تھا۔ چند ایک نے لوٹ مار کی تھی اور لوگوں پر ظلم کیا تھا۔ دردوں نے لداخ پر عارضی طور قبضہ کیا تھا اور حکمرانی کی تھی، اس کا بھی تذکرہ نہیں ہے۔ اِسی طرح اُن اولیاء، صلحاء اور علمائے کرام کا ذکر بھی نہیں ہے جو وقتاً فوقتاً لداخ آتے رہے، جن میں میر سیّد علی ہمدانی رح، زین شاہ ولی رح، بابا نصیب الدّین غازی رح، سیّد قطب شاہ رح اور خواجہ شاہ نواز رح جیسے خدا کے نیک بندے شامل ہیں۔

یہ تاریخ سترھویں صدی کے وسط کے آس پاس لداخی راجہ دیلدن نمگیل نے سرکاری تاریخ نویس یا تاریخ نویسوں سے مرتب کرائی تھی۔ دیلدن نمگیل کے جانشین

حکمرانوں نے بھی اپنے دور کے احوال اور کوائف لکھنے کے لئے تاریخ نویس رکھے جو حکومتِ وقت کی سرپرستی میں اُن کی ایما پر لکھتے تھے۔ لداخی راجوں نے سیاسی مصلحت کوشی کے تحت یا قوم پرستی اور انانیت میں آکر کئی اہم واقعات سے چشم پوشی کی ہے اور کئی تاریخی حقائق کو نظر انداز کیا ہے۔

راجہ دے لیگس نمگیل نے تبت اور بھوٹان کے تنازعے میں ٹانگ اڑائی، جس کے سبب تبت کی حکومت نے منگول جرنیل غلدن چھوانگ کی سرکردگی میں لداخ فوج بھیجی اور راجہ کو مغربی تبت سے ہاتھ دھونا پڑا اور تنگ موگنگ معاہدے کے تحت سرحد بندی عمل میں آئی۔ راجہ دے لیگس نمگیل نے اِس واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی تاریخ نویس سے بڑی خوبصورتی سے شاہی تاریخ میں یہ الفاظ تحریر کرائے کہ ملک میں خوشحالی اور اقبال مندی کا نیا سورج طلوع ہوا ہے۔

اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر غیر مقامی تاریخی ماخذوں اور مقامی روایات پر تکیہ کرنا پڑتا ہے جن میں میر سیّد ہمدانیؒ کے ورودِ لداخ کا ذکر ہے۔ روایت اپنے طور تاریخ کا ایک اہم ماخذ مانی جاتی ہے۔

لداخ اور بلتستان میں کسی بھی مسلمان سے سوال کیا جائے کہ اُن کے علاقے میں اسلام کب آیا تو وہ بے کم و کاست یہ جواب دے گا کہ لداخ میں اِسلام کی اشاعت کا سہرا امیر سیّد علی ہمدانیؒ کے سر ہے۔

بلتستان میں شِگر کے مقام پر بنی ہوئی مسجد کی تعمیر شاہِ ہمدانؒ سے منسوب ہے جو علاقے کی پہلی مسجد ہے۔ لداخ میں شے کی مسجد سب سے قدیم مانی جاتی ہے اور اِس کی تعمیر کا سہرا بھی شاہِ ہمدانؒ کو جاتا ہے تاہم اِس ضمن میں مستند تحریری ریکارڈ دستیاب نہیں ہیں۔

وزیر حشمت اللہ ''تاریخ جموں و کشمیر، لداخ و بلتستان'' میں رقم طراز ہیں کہ ایک مقامی عالم مولوی غلام عباس نے اُنہیں بلتستان میں میر سیّد علی ہمدانیؒ کی آمد اور

تبلیغِ دین سے متعلق ایک دستاویز کی موجودگی کا تذکرہ کیا تاہم وہ اُن کی نظر سے نہیں گذری۔

مقامی روایات کے مطابق شاہِ ہمدانؒ نے بلتستان میں خردونگ، شگر، چپلو اور سکردو میں بمقام کھری ڈونگ اور گمبہ اور دُوسرے کئی مقامات پر مسجدیں تعمیر کیں۔ اِسی طرح کشمیر کی تاریخی کتب میں لکھا ہے کہ لداخ میں بھی اُنہوں نے مساجد تعمیر کی تھیں۔ پروفیسر مجیب کے مطابق امیر کبیرؒ نے زنسکار کے صدر مقام پدم میں بھی ایک مسجد تعمیر کی تھی۔

بلتستان کے مورخوں نے لکھا ہے کہ شاہِ ہمدان خطّے میں دو مرتبہ آئے۔ پہلی دفعہ ۷۸۳ ھجری مطابق ۱۳۸۱ء میں کشمیر سے براستہ زوجی لا بلتستان وارد ہوئے اور ڈیڑھ سال قیام کے بعد چینی ترکستان چلے گئے۔ اِس دوران آپ نے شِگر، تھلے، بلغار، چپلو، سلتورو اور سکردو میں دین کی تبلیغ کی۔ چپلو کی جامع مسجد چھچین کی تعمیر اُن کے ہاتھوں سے ہوئی۔ اس کا فنِ تعمیر بلتی، ایرانی اور کشمیر کا امتزاج ہے۔ جامع مسجد چھچین سمیت سکردو کی دو مسجدیں آج بھی موجود ہیں۔ اُن دِنوں یبگو مقیم خان کی حکومت تھی۔

دُوسری مرتبہ شاہ ہمدانؒ ۷۸۵ ھجری بمطابق ۱۳۸۳ء قراقرم کے درّہ مُستغ پار کر کے شگر کے موضع برالدو پہنچے اور علاقے میں کئی مسجدیں تعمیر کیں۔

لداخ میں اُن کا سالِ آمد ۱۳۸۱ء یا ۱۳۸۲ دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے وہ لداخ سے بلتستان گئے ہوں گے یا بلتستان سے یہاں آئے ہوں گے۔

اِس امر کا بہت حد تک ثبوت ملتا ہے کہ بلتستان میں تبلیغِ دین کے لئے سیّد محمد نور بخش آئے تھے اور بلتستان کے لوگ اُن کے ہاتھوں حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے۔ اُن کے مقلّدوں کو نور بخشی کہا جاتا ہے۔ اُن کے بعد میر شمس الدین ایراکی آئے۔ ایراک، ایران میں ایک جگہ کا نام ہے۔ میر شمس الدّین کے ہاتھوں بلتستان کے اکثر

لوگوں نے شیعہ مسلک اختیار کیا۔

کشمیر اور سنٹرل ایشیا سے وقتاً فوقتاً بزرگانِ دین، اولیائے کرام اور علماء لداخ اور بلتستان آتے رہے۔ علاقہ کرگل میں مقامی راجاؤں اور سرداروں نے انہیں دعوت دی اور اپنے علاقوں میں آباد کیا۔ کیوں نے اپنی بیٹیاں اُن کے عقد میں دیں۔ کرگل اور دراس میں کئی آستانے ہیں جو بزرگانِ دین سے وابستہ ہیں۔

وزیر حشمت اللہ نے لکھا ہے کہ بلتستان اور علاقہ کرگل میں بزرگانِ دین اور اولیاء کے متعدد مقبرے ہیں۔ جن سے متعلق لکھا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔

بلتستان میں تقسیمِ ملک سے پہلے خرمنگ میں لوگ محرم پر کشمیری زبان میں مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ اگر چہ وہ کشمیری زبان سے نابلد تھے۔ غالباً اب بھی یہی دستور قائم ہوگا۔ ظاہر ہے ماضی میں یہاں کشمیری مبلغوں کا اثر رہا ہوگا۔

لداخ اور بلتستان میں متعدد مساجد سے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں شاہ ہمدانؒ نے تعمیر کیا تھا۔ شاہ ہمدانؒ ایک عظیم المرتبت خدا رسیدہ انسان تھے۔ اُن کے زہد و تقویٰ، معرفتِ الٰہی اور عشقِ سرمدی کا شہرہ آج بھی خطّے میں ہے۔ غالباً اُن کی اس ہمہ گیر شخصیت کا سحر ہے کہ اکثر مساجد کی تعمیر کا سہرا اُن کے سر باندھا گیا۔ اُنہیں امیر کبیر، شاہ ہمدان، قطب الاقطاب اور شیخ الکامل جیسے القاب سے نوازا گیا ہے جو اُن کے تبحرِ علمی، اوصافِ جمیلہ اور مقبولیت کے عکاس ہیں۔

ایک خدا رسیدہ مسلم بزرگ اور ہمس گپنہ کے بڑے لاما نوانگ گیا ژوستق سنگ راسپا اوّل کی دوستی کا لداخ میں بڑا چرچا ہے۔ یہ سترھویں صدی کی شروعات کی بات ہے جب گیالپو سینگے نمگیل لداخ کا حکمران تھا۔ راجہ نے لیہہ میں مسجد تعمیر کرنے کے لئے زمین مرحمت کی۔ بڑے لاما اور مسلمان بزرگ کے تعاون سے مسجد کی تعمیر عمل میں آئی۔ اوّل الذکر سنسکرت اور تبّتی زبانوں میں بڑے عالم تھے۔ اُنہوں نے اپنے رفیق مسلمان بزرگ کو ایک عصاء پیش کیا جو ایک واعظ عابد کے لئے ایک موزوں تحفہ

لگتا ہے۔ عصاء عموماً وعظ خوانی کے موقع پر اِستعمال ہوتا ہے۔ یہ عصاء لیہہ جامع مسجد میں شاہ ہمدانؒ کی یاد میں تعمیر کی گئی چھوٹی سی حجرہ نما عمارت میں محفوظ کیا گیا تھا۔ چند سال پہلے جب اس یادگار کی تعمیرِ نو عمل میں آئی تو وہ عصاء بھی پایا گیا۔ یہ تاریخی عصاء محفوظ رکھا گیا ہے جو دو رہنماؤں کی یادگار ہے جن میں ایک مسلمان اور دُوسرے بودھ تھے۔

ہمس گنپہ میں قرآن مجید کا ایک نادر قلمی نسخہ ہے، جس سے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اسے مسلم بزرگ نے ستق راسپا اوّل کو پیش کیا تھا۔

لداخ کے مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ مسلم بزرگ میر سیّد علی ہمدانؒ تھے، تاہم یہ غلط ہے۔ ستق سنگ راسپا اوّل اور شاہ ہمدانؒ کے دور میں لگ بھگ تین سو سال کا تفاوت ہے۔ اوّل الذکر سترھویں صدی میں گذرے ہیں جبکہ شاہ ہمدانؒ چودھویں صدی میں لداخ کے راستے ترکستان گئے تھے۔ اِس روایت کے پیچھے بھی شاہ ہمدانؒ کے تیئں لوگوں کی عقیدت کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔

مسجد کی تعمیر سے متعلق ایک غیر فطری روایت بھی مشہور ہے جسے عقیدت مند خدا کے اِس نیک بندے کی کرامت اور رُوحانی طاقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ بزرگ رات کے اندھیرے میں اپنی رُوحانی طاقت کے بل بوتے بڑے بڑے پتھروں کو اُٹھائے بغیر زیرِ تعمیر مسجد کے مقام تک پہنچاتے تھے۔ ایک رات کسی عورت نے بزرگ کے ہمراہ پتھر کو چلتے دیکھا تو وہ حیرت سے چلا اُٹھی اور وہ پتھر اپنی جگہ رُک گیا۔ یہ بڑا پتھر ماضی قریب تک مسجد کے سامنے پڑا تھا۔

میر سیّد علی ہمدانیؒ ۱۳۸۱ء یا ۱۳۸۲ء میں لداخ کے راستے ترکستان گئے تھے اور دو سال کے اندر واپس کشمیر لوٹے تھے۔ اُن دِنوں کشمیر سے ترکستان پہنچنے میں اندازاً ڈھائی سے تین مہینے لگتے تھے۔ اِس لئے آنے جانے کے سفر میں پانچ یا چھ ماہ لگے ہوں گے۔ راستہ اِنتہائی دُشوار گذار اور خطرناک تھا۔ اُنھوں نے اس سے

پہلے تقریباً بیس سال تک مختلف ملکوں اور خطوں کا سفر کیا تھا اور ان میں سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کا غیر معمولی مادّہ تھا۔

لداخ میں اُنہوں نے کتنی مدّت قیام فرمایا اِس سے متعلق کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ پروفیسر مجیب کے بیان کی روشنی میں اگر وہ زنسکار گئے تھے اور مقامی روایت کے مطابق اُنہوں نے لداخ تبت سرحد تک سفر کیا تھا تو اُنہوں نے لداخ میں لمبا عرصہ گذارا ہوگا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ لداخ میں اپنے قیام کے دوران اُنہوں نے تبلیغی کام کیا اور متعدد لوگوں نے اِسلام قبول کیا۔

اُن دِنوں لیہہ سے ۱۲ رکلومیٹر دُور واقع شے گاؤں لداخ کا دارالخلافہ تھا۔ شاہ ہمدانؒ یقیناً شے گئے ہوں گے۔ جیسا کہ اُوپر ذکر آیا ہے اُنہوں نے شے میں مسجد تعمیر کی تھی۔ یہ روایت سینہ بہ سینہ منتقل ہوئی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ دریائے سندھ کے کنارے ایک پُر فضا مقام پر واقع اس مسجد کو ایک آستانے کا درجہ حاصل ہے۔ عقیدت منداس پر علم اور نذرانہ چڑھاتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں۔ کئی دفعہ کئی غیر مسلم عقیدت مند بھی یہاں آکر اپنی مرادوں کی تکمیل کے لئے نذرانہ چڑھاتے ہیں۔

سنٹرل ایشیا کی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے لیہہ کی اپنی اہمیت تھی۔ ترکستان جاتے ہوئے وہ لیہہ میں ضرور رُکے ہوں گے۔ لیہہ جامع مسجد میں، جسے شاہ ہمدان مسجد بھی کہا جاتا ہے، اُن کی یاد میں حجرہ جیسا ایک چھوٹا ساڈھانچہ تعمیر کیا گیا ہے۔ اِس پر غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ اب اِسے ڈھا کر حجرہ برابر لکڑی کا ایک ڈھانچہ نصب کیا گیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے اسمائے مبارک ہیں۔

روایت کے مطابق اِس جگہ حضرت امیر کبیر نے قیام فرمایا تھا اور عبادت کی تھی۔ زمانہ حال تک مسجد کے داخلہ کے پاس دیوار پر ایک کتبہ نصب تھا جس میں منظوم فارسی میں جامع مسجد شاہ ہمدانؒ سے منسوب کی گئی ہے۔ مسجد کے بڑے ہال کو جہاں

امیر کبیر کی یادگار ہے' خانقاہ کہا جاتا ہے جو کسی ولی سے اس کی وابستگی کی علامت ہے۔ یہاں ہر صبح بلا ناغہ اوراد فتحیہ پڑھی جاتی ہے جسے شاہ ہمدانؒ نے تحریر کیا تھا۔

لیہہ جامع مسجد ۶۷-۱۶۶۶ء میں مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر اور لداخی راجہ دیلدن نمگیل کے مابین ایک معاہدہ کے تحت تعمیر کی گئی۔ اُن دِنوں لداخ مغلیہ حکومت کا باج گزار تھا اور مغلیہ حکومت لداخ کی سلامتی کی ضامن تھی۔ تعمیر سے پہلے مسجد کا نقشہ اورنگزیب کو بھیجا گیا اور تعمیر کے دوران کشمیر کے مغلیہ گورنر نے اپنا نمائندہ لداخ بھیجا۔ اُس کا نام غلام محی الدّین تھا۔ مسجد کی تکمیل پر ایک بڑی تقریب ہوئی۔ امام پر اشرفیاں نچھاور کی گئیں۔ جامع مسجد کی وقتاً فوقتاً مرمت اور توسیع ہوتی رہی ہے۔ زمانہ حال میں مسجد کی عمارت پر گنبد اور مینار تعمیر کئے گئے ہیں۔ پہلے یہ لداخی فنِ تعمیر کے مطابق بنائی گئی تھی۔ خانقاہ کے ستونوں اور محرابوں پر لداخی مصّوری کا نمونہ ہے۔

جامع مسجد کے پاس مسلم اوقاف کی عمارت میں ایک کمرے میں شاہ ہمدانؒ کے نام پر ایک چھوٹی سی لائبریری ہے۔

شاہ ہمدانؒ سے متعلق لداخی مسلمانوں میں یہ روایت ہے کہ وہ لداخ اور تبت کی سرحد پر واقع ایک مقام مردے ناغا گئے تھے جہاں خطّے کی ترقی اور سلامتی کے لئے اُنہوں نے دُعا مانگی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اُن کی دُعا کا اثر تھا کہ ۱۹۶۲ء کی ہند چین جنگ میں اِس علاقے کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔

علاقہ چنگ تھنگ کے نیُوما گاؤں کے بودھوں میں ''خاچے لہا'' یا مسلم دیوتا کی ایک پرانی روایت ہے جو ایک نیک اور سچے مسلمان سے منسوب ہے۔ لیہہ کے جانکار مسلمانوں کا کہنا ہے کہ یہ نیک مسلمان میر سیّد علی ہمدانیؒ تھے۔

پروفیسر محمد طیّب صدیقی نے لکھا ہے کہ لداخ میں اقامت کے زمانے میں امیر کبیرؒ نے پشمینہ کا ایک جوڑا معہ موزہ بنوایا اور کشمیر کے فرمان روا سلطان قطب الدّین کو بطورِ تحفہ بھیج دیا۔ اِس سے آپ کا منشا یہ تھا کہ سلطان شالبافی کی صنعت کو فروغ دے۔

اِس ضمن میں میر سیّد مشتاق ہمدانی رقم طراز ہیں:

''جب امیر کبیر لداخ سے کشمیر تشریف لائے تو اُنہوں نے لداخ سے پشمینہ کا خام مواد اپنے ساتھ لایا اور یہاں پہنچ کر پشمینہ کی کتائی بنائی کا کام شروع کروا دیا اور اپنے دستِ مبارک سے پشمینہ کا ایک موزہ تیار کر کے سلطان قطب الدّین شہمیری کو بطور تبرک عطا کیا۔''

نشاؔط انصاری لکھتا ہے: ''اِس واقعہ کے بعد وادیءِ کشمیر میں پشمینہ کی کتائی بنائی کا سلسلہ چل نکلا اور یہ صنعت یہاں مکمل طور رواج پا چکی............وہ (شاہ ہمدان) منجھے ہوئے دستکار بھی تھے۔''

تاریخی ریکارڈ کے مطابق شاہ ہمدانؒ اور زین شاہ ولیؒ کے ہاتھوں لداخ میں بہت سارے لوگوں نے اِسلام قبول کیا تھا لیکن سولہویں صدی میں جب مرزا حیدر دوغلت نے لداخ کو اپنے قبضے میں لایا تو مرزا نے اپنی تصنیف ''تاریخِ رشیدی'' میں لیہہ، شے یا زنسکار میں مسلم آبادی یا کسی مسجد کے وجود کا ذِکر نہیں کیا ہے۔ غالباً امیر کبیرؒ کی واپسی کے بعد نو مسلموں نے دوبارہ اپنا آبائی مذہب اختیار کیا ہو۔ مغربی تبت اور لداخ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جب مسیحی مبلغوں کے ہاتھوں عیسائیت اختیار کرنے کے بعد نو مسیحی روگردان ہو گئے۔ لداخ کے محدود وسائل اور ناسازگار آب وہوا کے باعث باہر سے آئے ہوئے لوگ یہاں زیادہ دیر تک ٹِک نہیں پاتے تھے اور اپنی تحریک جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔

بہر حال حقیقت یہ ہے کہ شاہ ہمدانؒ نے چودھویں صدی میں بلتستان اور لداخ میں معرفت کا جو پودا لگایا تھا اگر وقتی طور وہ مُرجھا بھی گیا ہو، اُن کے بعد لداخ آنے والے خدا کے نیک بندوں، مبلغوں اور خدا ترس بزرگوں نے اپنی ریاضت اور علم وعرفان سے اُسے سینچا اور اُن کی بدولت آج یہ پودا ایک تناور درخت بن چکا ہے۔

فضل اللہ کشمیری

(کشمیری نژاد کے مشہور اور مقبول تبّتی شاعر)

فضل اللہ اٹھارویں صدی کے تبت کے مقبولِ عام شاعر اور دانشور تھے، جن کی کتاب ''خاچے پھالُو'' کے اشعار اور کہاوتیں آج بھی تبت اور لداخ میں مقبول ہیں۔

لائبریری آف تبّتی ورکس اینڈ آرکائیوز، دھرم شالہ کے ڈائریکٹر گیاژو چھرنگ لکھتے ہیں:

''اٹھارویں صدی کا مجموعہ پند و نصائح ''خاچے پھالُو'' تبت میں بڑا مقبول ہے۔ حتیٰ کہ آج کل بھی بڑے ذوق وشوق سے اِس کے اشعار کا حوالہ دیا جاتا ہے۔''

فضل اللہ تبّتی زبان کے علاوہ عربی، فارسی اور اُردو بھی جانتے تھے۔

آپ کے کلام میں مذہب، زندگی، موت، مساوات، سماجی تفریق، قناعت، حاکم، محکوم، اخلاقیات، بچوں کی تعلیم و تربیت، والدین کی خدمت اور مختلف موضوعات پر شاہ پارے ملتے ہیں۔

غالبؔ کو شہرت دیوان غالبؔ سے ملی اور اُن کے اشعار کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اِسی طرح فضل اللہ اپنی واحد تصنیف ''خاچے پھالُو'' کی وجہ سے تبت اور لداخ میں مشہور ہوئے۔ اُن کے برمحل اشعار کا موقع ومحل کے مطابق بے ساختہ حوالہ دیا جاتا ہے۔

فضل اللہ اِنسان دوست عوامی شاعر تھے۔ اُنہوں نے اپنے کلام کی معرفت سے آفاقی پیغام دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''خدمتِ آدمیت مذہب کی بنیادی تعلیم ہے

دُوسروں کو فائدہ دینا مذہب کی رُوح ہے

انانیت کہتی ہے۔ ''میں ہوں.... میں ہوں۔

انانیت کہتی ہے۔ ''مجھے روپیہ اور شہرت چاہیئے۔''

کھانے کو اچھی خوراک اور پہننے کو اچھی پوشاک چاہیئے

میں اچھا اور خوبصورت ہوں۔''

''اگر تم دُوسری دنیا میں امیر بننا چاہتے ہو

ابھی محتاجوں کی حاجت روائی کرو

اگر تم کل کلاں خوبانی کھانا چاہتے ہو

آج خوبانی کا ایک پیڑ لگاؤ۔''

تبّتی کلچرل پرنٹنگ پریس، دھرم شالہ نے ۱۹۸۰ء میں ''خاچے پھالُو'' شائع کیا ہے۔ موجودہ ایڈیشن سے متعلق کہا جاتا ہے کہ اِس میں بہت سارے اشعار نہیں ہیں اور کتاب ضخامت میں چھوٹی ہے۔ راقم الحروف نے بچپن میں لیہہ کی جامع مسجد میں ایک بزرگ غلام محمد داروخان مرحوم کو ''خاچے پھالُو'' سے دینیات سے متعلق اشعارِ ورد کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ مجلّد قلمی نسخہ کافی ضخیم تھا اور آج کل نایاب ہے۔ ''خاچے پھالُو'' کا موجودہ ایڈیشن لوگ شوق سے خریدتے ہیں۔

لداخی اور تبّتی زبانوں میں ''خاچے'' کا مطلب کشمیری ہے اور ''پھالُو'' فضل اللہ کا مخفّف ہے۔ کشمیر کو خاچول کہا جاتا ہے۔ کشمیر میں اسلام کی اشاعت کے بعد مسلمانوں کو خاچے کہا جانے لگا۔ لداخی میں سُنی مسلمانوں کو خاچے اور شیعہ مسلمانوں کو بلتی کہا جاتا ہے۔ اوّل الذکر کشمیر سے اور آخر الذکر بلتستان سے آئے تھے اور لداخ میں آباد ہوئے تھے۔

ڈاکٹر ابوبکر امیر الدین تبّتی اپنی تصنیف ''تبت اور تبّتی مسلمان'' میں رقم طراز ہیں:

''پھالُو سے مراد چند باتیں چند الفاظ ہیں۔یعنی کتاب کا مفہوم ''ایک مسلم یا کشمیر کی طرف سے چند باتیں'' ہے۔تاہم اشعار سے خاچے پھالُو شاعر کا تخلص بھی لگتا ہے۔جیسے وہ کہتے ہیں ''خاچے پھالُو نے یکے بعد دیگرے دھاگے میں پروئے موتی کی طرح اپنے پند و نصائح دئے ہیں......... یا خاچے پھالُو کے دِل کی گہرائی سے نکلی ہوئی نصیحتیں غور سے سنو!''

فضل اللہ نے ''خاچے پھالُو'' تبت کے قصبہ شیگا ژے میں تبّتی بودھوں کے بڑے لاما پنچن لاما پلدن ایشے (۱۷۳۸-۱۷۸۰ء) کے عہد میں لکھا۔

تبت میں دلائی لاما کے بعد پنچن لاما کا مرتبہ بلند ہے۔دونوں مذہبی رہنما گیلوٗ گپا سکول (زرد فرقہ) سے تعلق رکھتے ہیں۔اُن دنوں بھی شیگا ژے میں متعدد مسلمان آباد تھے اور اُن کی ایک مسجد بھی تھی۔

فضل اللہ نے ''خاچے پھالُو'' ہاتھ سے لکھا تھا۔یہ قلمی نسخہ بہت سارے ہاتھوں میں پہنچا اور داد حاصل کی۔بعد میں اِس کی کاپیاں بنائی گئیں۔

اُن دنوں تبت اور لداخ میں چھپائی کے لئے لکڑی کے بلاک اِستعمال ہوتے تھے۔بلاک پر الفاظ تراشے جاتے تھے اور ان پر سیاہی پوت کر اُن کے نقوش کاغذ پر نکالے جاتے تھے۔ایک ضخیم کتاب کے لئے بیسویں اور سینکڑوں بلاک بنائے جاتے تھے۔تبت اور لداخ کے گنپوں میں لکڑی کے ایسے متعدد بلاک موجود ہیں۔بودھوں کے اہم صحیفے کنجوٗر اور تنجوٗر' جو بدھ کی تعلیمات اور ان کی تفسیروں اور تبصروں پر مشتمل ہیں' بلاکوں پر چھپائے گئے ہیں۔

کنجوٗر کی ایک سو آٹھ اور تنجوٗر کی دو سو پچیس جلدیں ہیں۔پہلے پہل بلاک کی چھپائی چین میں ہوئی۔بلاک نہ بنانے کی وجہ سے ''خاچے پھالُو'' کی زیادہ کاپیاں

نہیں بنائی جا سکیں۔ اِسی وجہ سے مصنّف مدّت تک گمنام رہے اور تصنیف متنازعہ بنی۔

لداخی اور تبّتی زبانوں کا کلاسیکل ادب مشترکہ ہے اور دونوں زبانوں کا ایک ہی رسم الخط ہے۔ تاہم لداخی اور تبّتی بول چال کی زبانیں الگ ہیں اور دونوں میں ایک دُوسرے کے وافر الفاظ ہیں۔

ایک تبّتی سکالر ڈاکٹر داوانربُو نے ''خاچے پھالُو'' کا جزوی طور انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں شعبۂ سنٹرل ایشین سٹڈیز میں ایشوسیٹ پروفیسر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''خاچے پھالُو'' تبت کے عام لوگوں کے خیالات اور احساسات کی گونا گونی' جیسے اُن کی بساط اور مجبوریاں' دانائی اور حماقتیں' مصائب اور اُمنگیں' آدرش اور اوہام' سماجی قدروں اور ہتھکنڈوں' غرض اُن کے مکمل طرزِ زندگی اور دُنیا سے متعلق نظریات کو اُجاگر کرتا ہے۔ اس سے پہلے ایک عام تبّتی کے فکر ونظر کی ایسی واضح اور نمایاں نقشہ کشی اور کسی تصنیف میں نہیں ملتی ہے۔''

اِس قسم کی سنجیدہ اور علمی تصنیف کو تبّتی اور لداخی میں لیگشیت کہا جاتا ہے۔ جو انگریزی لفظ TREATISE کا معنی دیتا ہے۔ مترجم رقم طراز ہیں:

''تبّت کے مقبول ترین سسکیا لیگشیت کے بعد شاید ''خاچے پھالُو'' لوگوں میں سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ تبّتی کلاسیکی ادب میں زیادہ اشاروں اور کنایوں سے مبرا ایسا عام فہم تخلیقی شاہکار پہلے کبھی موجود نہیں تھا............ ایک مسلمان کی تخلیق ہوتے ہوئے بھی اِس نے ایک عام تبّتی کے دِل کے تاروں کو چھوا ہے۔''

اپنی ماں کے نام اپنی تصنیف کا اِنتساب کرتے ہوئے داوانربو لکھتے ہیں:

''ماں کی نصیحتیں مجھے ''خاچے پھالُو'' کی یاد دلاتی ہیں۔''

ایک زبان سے دُوسری زبان میں شاعری کا ترجمہ بہت مشکل ہے۔ ہر زبان کا مزاج اور لہجہ ہوتا ہے۔ ترجمہ میں اشعار کی فطری خوبصورتی اور دِلکشی ختم ہو جاتی

ہے۔ یہی مسئلہ ہمیں ''خاچے پھالُو'' کے اشعار کا انگریزی اور اُردو میں ترجمہ کرتے ہوئے پیش آتا ہے۔

فضل اللہ کے خیالات میں گہرائی اور گیرائی، طرزِ ادا میں ندرت اور معانی و الفاظ میں جدّت اور مشاہدے میں دُور رسی ہے۔

اُن کے مجموعہ سے کچھ اشعار پیشِ خدمت ہیں:

''پتھر پر سبزی نہیں اُگتی
غصہ اور کبر سے کوئی فائدہ نہیں۔''

....

''ایک قلم کار زیرِ زمین مدفون ہو
لیکن اُس کی تحریریں زندہ ہوتی ہیں۔''

....

''تخیل سے عاری اِنسان کتے سے بدتر ہے۔''

....

''تحریر کمان کی طرح ٹیڑھی میڑھی ہے
لیکن اِس کا مفہوم تیر کی طرح سیدھا ہوتا ہے۔''

....

''اگر تم ایک پتھر کو پالش کروگے
یہ قیمتی پتھر بنتا ہے
اگر تم ایک دھات کو پالش کروگے
یہ ایک آئینہ بن جاتا ہے
میرے عزیز، زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو جاؤ۔''

....

"ایک لومڑی کے بچے نہیں گرتے
حیف! اِنسان کے بچے ڈھلوان زمین پر لڑھک جاتے ہیں۔"

....

"زہریلے پیڑ پر خوبانی نہیں اُگتی
اگر تم خوبانیاں چاہتے ہو
تو خوبانی کے پیڑ کے پاس جاؤ
اگر تمہیں قیمتی پتھر کی چاہت ہے
جنگل میں جانا بے کار ہے
اگر تم اپنی عزت چاہتے ہو
تو دُوسروں کی زیادہ عزت کرو۔"

....

"جہاں اچھے لوگ جاتے ہیں.......اُن کی نیک نامی بھی ساتھ جاتی ہے۔"

....

"گرمیوں میں دھات کے برتن کا خیال رکھو
سردیوں میں مٹی کے برتن سے احتیاط برتو۔"
(گرمیوں میں دھات زنگ آلود ہو جاتی ہے اور سردیوں میں مٹی کا برتن جلدی ٹوٹ جاتا ہے۔)

"بُرے آدمی سے دوستی حکمران سے دُشمنی کے مترادف ہے۔"

....

"چور کے بیٹے کو تحفظ دینا، سوداگر کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔"

....

"جس طرح لگام سے تیز گھوڑے کو قابو میں رکھا جاتا ہے، اُسی طرح اپنے نفس

کو قابو میں رکھو۔''

....

''عمر رسیدہ لوگوں کی نصیحت سنو' اُن کو بڑے تجربے ہوتے ہیں
یہ گرگِ باراں دیدہ ہیں۔''

....

''پڑھے لکھے انسان' اچھی چیزوں کے متلاشی ہوتے ہیں۔''

....

''اگر تمہیں قیمتی جواہرات مطلوب ہوں' وہ سمندر کی تہ میں ہوتے ہیں۔''

....

''اگر تم اپنے دُشمن کو مغلوب کرنا چاہتے ہو' اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ اس کا
دوست بنو۔''

....

''ایک بادشاہ جاہ و حشمت رکھتا ہوا بھی بھوکا ہوتا ہے
ایک بھکاری اپنے بھرے کشکول پر قانع اور نازاں ہوتا ہے۔''

....

''زندگی بلند ڈھلوانوں اور کھڈوں سے گھری ہے'
پھسلنا اور گرنا آسان ہے
زِندگی کی راہ پر احتیاط سے چلو۔''

....

''اپنے بیٹے کو کمسنی میں تعلیم دو
بید کا پودا جب چھوٹا ہو' سیدھا کیا جا سکتا ہے
جب یہ پیڑ بنے تو یہ ٹوٹ جاتا ہے۔''

تبت میں یہ خیال مشہور تھا کہ ''خاچے پھالُو'' ایک بڑے لاما نے لکھا ہے، جنہوں نے اپنا تخلص خاچے پھالُو رکھا ہے۔ بہتوں کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ چھٹے دلائی لاما کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ روایتی طور تبت میں ایک بڑے لاما، اشراف اور امراء نے ہی تخلیقی کام کیا ہے۔

جس طرح شیکسپیر کی تصنیفات کے حقیقی قلم کار سے متعلق مدّت تک لا معنی بحث چلی۔ ''خاچے پھالُو'' بھی مدّت تک متنازعہ رہا۔ تاہم تبت کے مسلمانوں نے ہمیشہ یہ دعویٰ کیا کہ یہ اُن کے فرقے کے ایک فرد کا کام ہے۔ اب یہ تنازعہ ختم ہوا ہے اور فضل اللہ کو اِس کا اصلی مصنّف ٹھہرایا جاتا ہے۔

فضل اللہ کی اولاد میں رحیمہ خاتون مغربی بنگال کے قصبہ کلیم پُونگ میں رہتی ہے۔ رحیمہ خاتون نے داوانز بو کو تبّتی اور عربی میں ایک نسخہ دکھایا۔ جس پر ''خاچے پھالُو'' دستخط کی صورت میں لکھا ہے۔

ڈاکٹر داوانز بو نے لکھا ہے کہ نفسِ مضمون سے بھی اِس کی تصدیق ہوتی ہے کہ ''خاچے پھالُو'' ایک مسلمان کا تخلیقی کام ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''وسیع النظر ہونے کے باوجود فضل اللہ اپنی تصنیف میں اِسلام کی بنیادی تعلیم وحدانیت کا پیغام دیتے ہیں۔ جیسے وہ لکھتے ہیں:

''میں سرداروں کے سردار کے سامنے سجدہ بوس ہوتا ہوں، جس کو ہماری زبان میں خدا کہتے ہیں۔''

''تشکّر'' کے عنوان سے وہ ایک نظم میں لکھتے ہیں:

''اوّل ہم سب کے اُوپر خدا ہے
اِس کے بعد ماں باپ ہیں۔''

''خاچے پھالُو'' میں ایسے کئی اشعار ہیں، جن میں شاعر کے اسلامی اعتقادات ظاہر ہوتے ہیں۔ مصائب میں وہ اپنے قارئین کو حتمی مدد کے لئے خدا سے رجوع

ہونے کے لئے تاکید کرتے ہیں۔

داوانز بو کہتے ہیں:

''کتاب کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ساتویں دلائی لاما نے اِس میں سے اُن سطور کو حذف کرایا، جن میں براہِ راست اسلامی عقائد اور عمل پر زور دیا گیا تھا۔''

داوانز بو نے فضل اللہ کے اِس عملی کام کو بودھ تبت میں اِسلام کا مختصر Interval (وقفہ) کہا ہے اور مذہب اور سماج سے دلچسپی رکھنے والے ماہرینِ عمرانیات اور سماجیات کے لئے دُوسری قوموں کے علوم اور حقائق کا خزینہ قرار دیا ہے۔

تبّتی بودھوں کے ہندوستان سے عقیدت کو مدّنظر رکھتے ہوئے وہ اپنی کتاب کی اِبتداء میں بدھ کے وطن (آریا بھومی) کا ذِکر کرتے ہیں:

''اگر تم آریائی ملک بھارت جانا چاہتے ہو
اپنے دل کی آنکھوں سے جہالت کا پردہ ہٹاؤ

....

خواہش اور چاہ کے بُرے خیال کو، سمندر کی تہ میں ڈبو دو

....

لالچ اور حسد کو جلا ڈالو، سوچو، گیان دھیان کرو اور صرف خدائے واحد کو یاد کرو۔''

لہاسہ میں مسلمانوں کے مکتب میں ''گلستان بوستان'' اور ''پند نامہ'' پڑھائے جاتے تھے۔ فضل اللہ نے شیخ سعدیؒ کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہوگا۔ ''خاچے پھالُو'' پر سعدی کا اثر ہے۔ لیکن فضل اللہ کا اسلوبِ بیان اور طرزِ تحریر تبّتی ہے اور اُنھوں نے تبّتی علامتیں، تلمیحات، اِصطلاحات اور استعارے استعمال کئے ہیں۔ جس سے تبت کے لوگ بڑے مانوس ہیں۔ اِس لئے ''خاچے پھالُو'' نے تبت کے عام لوگوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

''تم کیسر ہی کیوں نہ ہو

ڈینما کو نہ چھیڑو

مسائل کو شانتی سے حل کرنا بہتر ہے

ہیرو کی طرح بنرد آزمائی سے باز رہو.....''

گیالم کیسر کی طویل رزمیہ داستان تبت اور لداخ کے علاوہ منگولیا' چین اور بلتستان میں مقبول ہے۔ کیسر داستان کا مرکزی کردار اور دیو مالائی شخصیت ہے۔ ڈینما کیسر کا مشہور کمانڈر تھا۔ شاعر نے اِن کرداروں کے ذریعے امن و شانتی کا درس دیا ہے۔

فضل اللہ نے تبت کے ماحول کے پس منظر میں اشعار کی زبانی اپنا فلسفہ پیش کیا ہے۔ تبت میں خانہ بدوش بھی بستے ہیں اور بھیڑ بکریاں اور یاک پالتے ہیں۔ زِندگی کو وہ پانسے کے کھیل سے تشبیہہ دیتے ہیں۔

''زندگی خانہ بدوشوں کے پانسے کے کھیل کی طرح ہے

کوئی نہیں جانتا کہ کب پانسہ اپنا اصلی رُخ دکھائے۔''

....

''بھیڑ کے بچے کو باہر نکالنے سے پہلے

آپ کو چاہئے کہ بھیڑیئے کو پکڑے

اس سے پہلے کہ فتنہ وفساد ہو

فتنہ پردازوں کو ملک بدر کرو

مشروب اور شراب پی کر

اگر چرواہا نشے میں ہو

بھیڑیا یقیناً بھیڑ کو اُٹھا لے جائے گا

ایک بھیڑیا کیوں نہ اچھا ہو
چرواہا اُس پر اعتبار نہیں کرسکتا....''

....

''اگر تم زہریلے سانپ کو زندہ رکھو گے
یہ لوگوں کو ڈس لے گا
اگر تم بھیڑیا کو زندہ رکھو گے
یہ بھیڑوں کی جان لے گا.....''

فضل اللہؔ مہاتما بدھ کی تعلیمات کا حوالہ دیتے ہیں اور تبّتی بودھوں کو اچھے کرم کے لئے تاکید کرتے ہیں۔ لیکن بڑے دُکھ سے کہتے ہیں:

''بہت سارے لوگ کرم کی بات تو کرتے ہیں
لیکن کرم پر عمل کرنے والے سونے کی طرح خال خال ہیں
اِس کا مجھے دِل کی گہرائیوں سے دُکھ ہے
اِسی بناء پر میں غمگین ہوں۔''

مصنّف کے زمانے میں تبت میں چین کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی اور تبتیوں کے لئے دلائی لاما دینی پیشوا کے علاوہ دُنیاوی بادشاہ بھی تھے۔ لیکن حکومت پر ARISTOCRACY اشرافیہ کی بالا دستی تھی جس کو تبت اور لداخ میں سکوُتق کہا جاتا ہے۔ وہ حکمران سے یوں مخاطب ہیں:

''رنگین اور خوشبودار پھول چمن کے زیور ہیں
اِن کی شگفتگی اور تابندگی سے
چمن نہایت ہی خوبصورت لگتا ہے
ایک نیک بادشاہ ملک کا زیور ہے
اگر وہ قانون اور انصاف پر چلے تو

اس کی قلمرو کی شان اور طاقت بڑھے گی
اگر اس کی حکومت اصول اور انصاف پر قائم ہو
تو سبھی خوش اور خوشحال ہوں گے.....''

....

''اگر سمندر ہلتا ہے
تو فطری طور مچھلیاں بھی ہلیں گی
اگر ملک غریب ہو
تو فطری طور بادشاہ بھی غریب ہو گا
اگر پرجا نہ ہو تو منصب دار بھی جی نہیں سکتا
اگر حاکم اور رعایا میں کھچاؤ ہو
تو حاکم ایک بیمار طبیب کی طرح ہے۔''

....

''اگر تم اپنا اِقتدار و اختیار قائم رکھنا چاہتے ہو
اپنے سنہرے تخت پر غیر جانبداری سے بیٹھو
اپنی سلطنت اور رعایا کی
فلاح و بہبود کا ہمیشہ خیال رکھو۔''

غالبؔ کے مصرعہ ''شہرتِ شعرم بعد من خواہد شدن'' کے مِصداق فضل اللہ کو اپنے کلام کی مقبولیت کا احساس تھا۔ وہ کہتے ہیں:

''میرے رُوحانی بیٹو
خاچے پھالُو کے دِل کی گہرائی سے اُمڈتی ہوئی نصیحتیں غور سے سنو
اگر تم میں سوجھ بوجھ ہے
میں نے اپنی نصیحتیں لکھی ہیں

یہ نصیحتیں بہت زیادہ تو نہیں
لیکن جو بھی ہیں، وہ اچھی ہیں ......"

لیکن دُوسری جگہ وہ اِنکساری سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں:

"آج میں نے جو لکھا ہے
یہ دیوانہ خاچے پھالو کی خرافات ہے
..................میں خود تو نہیں جانتا
لیکن میں دُوسروں سے کہتا ہوں کہ وہ کیا کریں؟
مجھے اپنی آنکھوں کا تنکا نظر نہیں آتا
لیکن دُوسروں کی غلطیوں کی نشان دہی کرتا ہوں
میں نے مبالغہ سے کام لیا ہوگا
....
لاما مجھے معاف کریں
(میری دُعا ہے) لوگ میری باتوں پر عمل کریں۔"

کتاب کے آغاز میں فضل اللہ نے اپنی تحریروں کو اِنسانی تمدّن کے سمندر میں ایک قطرہ بتایا ہے۔

تبت میں اِسلام چین، نیپال، کشمیر اور لداخ سے پہنچا۔ ۱۹۵۹ء سے پہلے وہاں کشمیری اور لداخی نسلوں کے تبتیوں کی تعداد تین ہزار تھی۔ ڈاکٹر ابوبکر کے مطابق چینی نسل کے مسلمانوں کی تعداد نو سو تھی۔

تبت کی راجدھانی لہاسہ شیگا تزے اور زی تنگھ کے قصبوں میں اُن کی کئی مسجدیں تھیں۔ ثقافتی انقلاب کے دوران یہ مسجدیں بند ہوئیں۔ اب یہ مسجدیں دوبارہ کھول دی گئی ہیں اور خطّے میں کئی ہزار مسلمان آباد ہیں۔

کشمیر اور لداخ کے مسلمانوں نے اپنی انفرادیت اور تشخص قائم رکھا ہے۔

یہ تبّتی اور لداخی زبانوں کے علاوہ اُردو بھی بولتے ہیں۔ اُن میں اکثر ۱۹۵۹ء اور اِس کے بعد دلائی لاما کے ساتھ فرار ہو کر ہندوستان آئے اور زیادہ تر کشمیر میں بس گئے۔

کشمیری مسلمان سترھویں صدی میں پانچویں دلائی لاما کے عہد میں کشمیر میں قحط سالی کی وجہ سے تبت ہجرت کر گئے تھے۔ دلائی لاما نے اُن کو تبت میں مستقل طور بسنے کی اجازت دی اور مذہبی آزادی کے علاوہ کئی مراعات دیں۔

تبت میں آباد زیادہ تر لداخی مسلمان اُن جنگی قیدیوں کی اولاد ہیں جن کو ۱۸۴۱ء میں تبتیوں اور ڈوگرہ جرنیل زور آور سنگھ کی فوج کی لڑائی میں موخرالذکر کی ہزیمت کے بعد فاتح تبتیوں نے پکڑا تھے۔ وزیر زور آور سنگھ اس لڑائی میں مارا گیا تھا۔ قیدیوں میں بہت سے ڈوگرہ سپاہی اور لداخی بودھ بھی تھے۔ بعد میں کشمیریوں کے ہاتھوں ڈوگرہ سپاہیوں نے اِسلام اختیار کیا۔ ان کو سنگھ پا خاچے یا سنگھ سے تعلق رکھنے والے مُسلم کہا جانے لگا۔ اُن کے اکثر ناموں کے ساتھ سنسکرت لفظ سنگھ یا شیر جڑا تھا۔ اِس نسبت سے اُنہیں سنگھ پا کہا جانے لگا۔ آج کل کئی سنگھ پا پناہ گزین خاندان سرینگر میں آباد ہیں۔

تبت میں ان کے علاوہ کچھ لداخی مسلمان تجارت کے سلسلے میں بس گئے۔ ان میں بعض کا تبّتی سماج میں اہم مقام تھا۔ ایک لداخی حاجی فیض اللہ کشمیری، لداخی اور سینگھ پا مسلمانوں کی پانچ رُکنی کمیٹی کے سربراہ رہے اور باہمی جھگڑوں کا فیصلہ دینے کے لئے اُنہیں ایک مجسٹریٹ کے اختیارات حاصل تھے۔

اِسی طرح ایک اور لداخی مسلمان حاجی غلام محمد تیرھویں دلائی لاما کے قریبی آدمیوں میں تھے۔ ان دونوں بزرگوں کو برطانوی ہند سرکار نے خان بہادر کا خطاب دیا تھا۔ ایک اور لداخی حاجی سراج الدّین مرحوم کو موجودہ دلائی لاما کا قرب حاصل تھا۔ وہ ۱۹۵۹ء کے بعد تبت سے ہندوستان آئے تھے۔

تبت میں کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا اور تمام دلائی لاموں نے اقلیتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔

اپنی علمی صلاحیت کی بدولت تبّتی مسلمانوں میں فضل اللہ کو منفرد مقام حاصل ہے۔

داوانز بو نے ''خاچے پھالو'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اِس میں زِندگی کے ہر پہلو اور اِنسانی رِشتے کی ہر نہج پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ہر صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اِس میں ناصحانہ نسخے ہیں۔

تعلیم کی افادیت پر اُنہوں نے ذیل کے اشعار کہے ہیں:

''وقت ضائع کئے بغیر اپنے بیٹے کو تعلیم دو
تمام علوم کی بنیاد لکھنا اور پڑھنا سیکھنا ہے
یہ علم کا بادشاہ ہے
تعلیم تمہارے بیٹے کو سنہرے تخت پر بٹھا سکتی ہے
کلاسیکل تعلیم پانے سے اُس کی نشست شیر کی کھال ہوگی
ہوسکتا ہے' اس کا مقام گنپے کی دانش گاہ ہو
جو علم کا جویا ہے' اُس کے لئے علم کی کمی نہیں
اِنسان کو علمِ نافع سے آراستہ ہونا چاہئے
مایا آنی جانی ہے
یہ کھو جاتی ہے' چرائی جا سکتی ہے
لیکن سچی تعلیم دائمی دولت ہے...''

وہ صرف بیٹے کی تعلیم پر ہی زور دیتے ہیں۔ بیٹی کا کہیں ذِکر نہیں ہے۔ ''تربیت'' کے عنوان سے ماں کی تعریف کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''اگر کوئی بچے کو بگاڑتا ہے
یہ ماں ہے

ماں کی غلط پرورش اور پرداخت سے بگڑا ہوا لڑکا بہت بُرا
بن جاتا ہے، جو ماں خود بھی نہیں چاہتی
ایسے بہت سے لڑکے قاتل بنے ہیں
ایسے بہت سے لڑکے چور بنے ہیں
آج وہ انڈے چراتے ہیں
جلدی ہی وہ مرغیاں اور گھوڑے چُرائیں گے
اُن کو زیادہ اچھے کھانے اور اچھے کپڑے نہ دو
بلکہ اچھی عادتیں سکھاؤ....''

''تشکّر'' کے عنوان سے فضل اللہ نے ماں باپ کی خدمت اور فرماں برداری پر ایک قدرے طویل نظم لکھی ہے۔ جس کے چند بند پیشِ خدمت ہیں:

''سنو، میرے بچّو!
تم اپنے کو شیر اور چیتے جیسے محسوس کرتے ہو
جو جنگل میں اُچھل کود کرتے ہیں
جب بچے ماں کی کوکھ سے جنتے ہیں
وہ صرف اپنی ماں کے سہارے ہوتے ہیں
حتیٰ کہ جب چُوسنی اُن کے مونہہ میں ڈالی جاتی ہے
وہ اُسے چوس نہیں سکتے
اُن کی ٹانگیں ہیں
لیکن چل نہیں سکتے
کان ہیں، لیکن الفاظ سمجھ نہیں سکتے
آنکھیں ہیں، صرف ماں نظر آتی ہے
وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ اپنے چہرے پر بیٹھی ہوئی مکھیاں کیسے اُڑائیں؟

وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ اپنی آنکھوں پر لگی گرد کیسے صاف کریں؟
جب اُن کو سردی اور بھوک لگتی ہے
وہ رات اپنے ماں باپ کی نیندوں میں خلل انداز ہوتے ہیں
تب وہ ایسے نہیں تھے، جیسے اب ہیں

....

جو کچھ وہ کرتے ہیں
اُن کے ماں باپ کے رہینِ منّت ہیں

....

رات دن اپنے والدین کی نصیحتیں سنو
صبح تا شام اپنے والدین کی خدمت کرو......''
''قناعت'' سے متعلق چند اشعار ملاحظہ کیجئے:
''قناعت ہو تو ایک بھکاری بادشاہ سے بہتر ہے
سماج میں بڑی نابرابری ہے
کچھ لوگ امیر ہیں، کچھ غریب ہیں
تم دیکھو، مساوات کہیں نہیں
قناعت سب سے بڑی دوا ہے.........''
دُنیا اور آخرت پر چند بند ملاحظہ فرمائیے:
''وہ احمق ہے جو سونے کا تبادلہ کانسے سے کرے
وہ نادان ہے جو نقل اور اصل فیروزے میں تمیز نہ کر سکے
اگر تم اِس دُنیا اور آخرت کی زندگی کا فرق نہ جانو
تو اِس (دُنیاوی) زندگی کو برباد کر رہے ہو.......''
اعتدال پر فضل اللہ کے خیالات سے مملو چند بند دیکھئے:

''اگر کام کی حد نہ ہو
اِس کا انجام تباہی ہوتا ہے
اگر کاروبار حد سے زیادہ ہو
انجام نقصان پر ہوتا ہے
اگر زبان گویائی میں تجاوز کرے
انجام چوٹڑ کی پٹائی پر ہوتا ہے
اگر شجاعت دُور اندیشی سے عاری ہے
آخرکار بہادر بھی کِف افسوس ملتا ہے.......''

شاعر نے ''اِنسانی فطرت'' پر ایک خوبصورت نظم کہی ہے:

''دُنیا ایک آئینہ کی طرح ہے
جس میں ہم ایک دُوسرے کو دیکھتے ہیں
اِنسانی وجود ایک گونج کی طرح ہے
ہم ایک دُوسرے سے ابلاغ و ترسیل کرتے ہیں
جہاں ہم دیکھیں، آئینے پر اِس کا عکس پڑتا ہے
جو تم کہتے ہو
پہاڑوں سے ٹکرا کر صدائے بازگشت آتی ہے
ایک اچھے عمل کا پھل اچھا ہوتا ہے
ایک بُرے عمل کا پھل بُرا ہوتا ہے........''

فارسی کے اکثر شعراء کی طرح فضل اللہ نے رازداری، خاموشی اور غصّے کو قابو میں رکھنے کی ہدایات دی ہیں:

''اپنا منہ بند رکھو
اگر اہم راز افشاء ہوتا ہے

یہ اِنسان کی جان تک لے سکتا ہے
تب ساری پشیمانیاں بے کار ہیں
اگر تم اپنی زبان نہیں سنبھالو گے
تمہارا سر خمیازہ بھگتے گا........"

غصّہ:

"اگر تم غصے پر غالب آجاؤ....... یہ ذی علم کی علامت ہے
جو غصے سے مغلوب ہوتا ہے......وہ ناداں ہے"

کھانے پینے سے متعلق فضل اللہ نے کتاب میں دی گئی کئی نظموں میں اپنا تصّور پیش کیا ہے۔ جو اُس دور کی معاشرتی زندگی کا غماز ہے:

"اچھا کھانا نہ کھاؤ
اور نہ اچھے کپڑے پہنو
کیا پتہ کل تم کھانے اور کپڑے کے لئے محتاج ہو جاؤ گے
خبر دار! کھانے کے لئے زندہ نہ رہو
اِنسانی آنکھیں اور پیٹ کبھی سیر نہیں ہوتے......."

موت سے متعلق وہ لکھتے ہیں:

"رُوحانیت اور مادیت ایک دُوسرے سے الگ ہیں
جس طرح جسم اور من (رُوح) الگ الگ ہیں
دِل (گناہوں) سے تائب موت چاہتا ہے
جسم اچھی خوراک اور راحت چاہتا ہے
جسمانی راحت تو چند روزہ ہوتی ہے
لیکن ذہنی سکون لُٹ جائے، تو اِس کا اثر بعد میں بھی ہوتا ہے

....

موت شاہ و گدا میں کوئی تفریق نہیں کرتی

دونوں کو موت کا مزا چکھنا ہے.........''

مختصر یہ کہ اپنے کلام کی روشنی میں فضل اللہ تبت کے سعدیؒ تھے۔
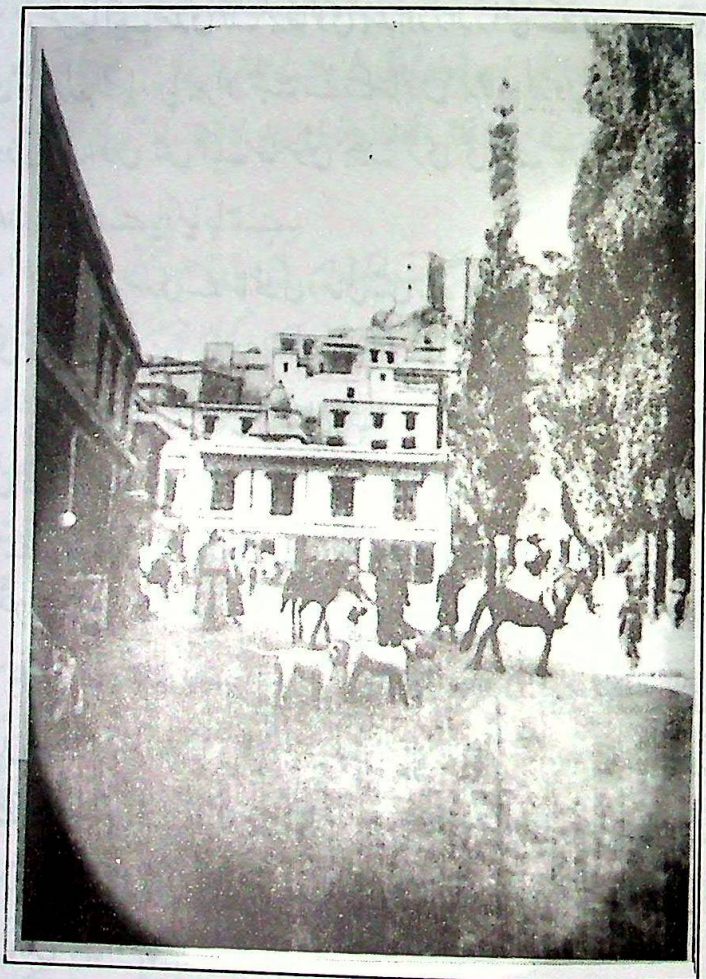
لیہہ جامع مسجد کی پرانی تصویر۔ فوٹو: ۱۹۱۷ء
(مضمون ''لداخ کے مُسلمان'' ملاحظہ ہو)

رسُول گلوان

تقریباً ایک صدی تک برطانوی ہند اور زارِ رُوس کے درمیان افغانستان‘ ایران‘ سنٹرل ایشیاء، پامیر اور تبت کے ریگستانوں‘ برفانی درّوں‘ ننگے پہاڑوں اور لق ودق میدانوں میں ایک خاموش جنگ لڑی گئی جسے تاریخ میں GREAT GAME کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے ساٹھ کی دھائی میں یہ خاموش جنگ چترال‘ ہنزہ‘ لداخ اور چینی ترکستان منتقل ہوئی۔

برطانوی ہند کو زارِ رُوس کی توسیع پسندی اور پیش قدمی پر گہری تشویش ہوئی اور سنٹرل ایشیا اور تبت جاسوس‘ محقق اور خفیہ اور علانیہ طور سائنسی‘ تجارتی اور سیاسی مشن روانہ کئے۔ لداخ کی راجدھانی لیہہ اِس مقصد کے لئے ایک اہم مرکز تھا اور لیہہ بازار سنٹرل ایشیا اور تبت سے پہنچنے والی خبروں اور افواہوں کا ایک اہم گڑھ تھا۔

اپنے مقاصد کے حصول کے لئے برطانوی ہند کو مقامی قلیوں‘ رہبروں‘ مترجموں اور گھوڑے والوں کی ضرورت تھی۔ لیہہ نے اِس مشن کی کامیابی اور تکمیل کے لئے جفاکش‘ من چلے اور باہمت کوہ پیما‘ رہبر‘ مترجم‘ قلی اور کارواں لیڈر دئے۔ یہ لوگ عمومی طور لداخ کے آرغون قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن مہم جو آرغون قلیوں اور رہبروں میں ایک اہم نام رسول گلوان ہے۔

رسول گلوان کو شہرت اُن کی کتاب SERVANT OF THE SAHIBS سے ملی ہے۔ اپنے ساتھیوں کی طرح سفر اور باہمی میل جول کے سبب وہ ترکی‘ تبتی‘

ہندوستانی اور کشمیری زبانیں بولنا جانتا تھا۔ بعد میں اُس نے کام چلاؤ انگریزی لکھنا اور بولنا بھی سیکھی۔

رسول کا پورا نام غلام رسول گلوان تھا لیکن وہ لداخ اور لداخ سے باہر رسول گلوان کے نام سے مشہور ہے۔ کئی باتوں میں رسول کو اپنے ہم عصر ساتھیوں پر اِنفرادیت حاصل ہے۔ اپنی محنت اور دیانت داری کی وجہ سے وہ لیہہ میں اقسقال بن گیا۔ اقسقال وسط ایشیا سے لداخ آنے والے تاجروں کا افسر ہوتا تھا اور برٹش جوائنٹ کمشنر کے تحت کام کرتا تھا۔ اقسقال ترکی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ''سفید ریش والا'' یا بزرگ ہے۔

رسول گلوان نے اپنی کتاب ایک امریکی سیاح اور محقق رابرٹ براٹ کی تحریک پر لکھی تھی۔ رسول نے بطورِ کارواں لیڈر راس کے ہمراہ سنٹرل ایشیا اور چین کے سفر کئے اور وہ رسول سے بڑا متاثر تھا۔ رابرٹ براٹ کی ہدایت پر رسول گلوان نے اپنی خودنوشت سوانح کے مسوّدے صاحب کو مختلف پتوں پر بھیجے۔ پہلی کوشش کو رابرٹ براٹ نے دُرست کیا۔ پورے چودہ سال مسوّدے صاحب کو دُنیا کے مختلف ملکوں میں ملتے رہے۔ کئی مرتبہ ناقابلِ فہم ابواب دوبارہ لکھنے کے لئے واپس کئے۔ آخرکار رسول نے لکھنے کا ایک طرز پالیا اور اِسی کو اپنایا۔ رابرٹ نے بہت ساری جزئیات اور تفصیلات کو، جن میں موسم اور سفر کی مشکلات کا ذِکر تھا، حذف کر دیا۔ آخرکار کمیبرج میں رسول کی تصویر کے ساتھ کتاب شائع کی۔ زبان اور گرائمر کی غلطیوں کی تصحیح کی ضرورت سمجھی نہیں گئی۔

رابرٹ براٹ غریب صاحب کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ اُس میں دُوسرے انگریز افسروں کی طرح دبدبہ نہیں تھا جو ہندوستانیوں کو اپنا غلام سمجھتے تھے۔ رابرٹ براٹ سادہ لباس پہنتا تھا اور لداخی قلیوں اور گھوڑے والوں کے ساتھ گُھل مِل جاتا تھا۔

رسول گلوان متعدد یورپی محققوں اور مہم جو سیاحوں کے ہمراہ تبت، سنٹرل ایشیا، پامیر، اکسائی چین وغیرہ گھوما تھا لیکن اُس کی خودنوشت سوانح عمری میں رسول کی سیاحت اور صحرا نوردی کی طویل زندگی کا ایک اجمالی خاکہ ملتا ہے۔ ان میں سے بعض انفرادی محققوں اور سیاحوں کے سفرنامے اور رپورٹ رسول گلوان کی کتاب کے مقابلے میں زیادہ ضخیم اور جامع ہیں۔ حالانکہ رسول نے انفرادی طور ان سب کے مقابلے میں بہت زیادہ سفر کیا تھا۔ تاہم اپنی جگہ اس کتاب کی افادیت مسلّمہ ہے۔ یہ رسول گلوان کی شخصیت کے مخفی اور دلچسپ گوشوں کو بے نقاب کرتی ہے اور اس دور کی کئی اہم باتیں منظرِ عام پر آتی ہیں۔

رسول گلوان کا دادا خیرا گلوان تھا جو دِلچسپ روایتوں کا جنم داتا ہے اور جس کے کارنامے الف لیلوی داستان کے کسی اہم کردار کی یاد دلاتے ہیں۔ وہ جہاں ایک بدنام رہزن اور ڈکیتی مار تھا، وہاں غریبوں کا مددگار اور رحم دل انسان تھا۔ آج بھی وادیٔ کشمیر میں اس کے کارناموں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ خیرا گلوان نے سکھ گورنر کرنل میاں سنگھ (۱۸۴۱ء-۱۸۳۴ء) اور اس سے پہلے کے گورنر کی حکومت کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔

خیرا کو گلوان قبیلے میں خاص مقام حاصل تھا۔ مورّخ محمد الدّین فوقؔ نے گلوان کو گلّہ بان بتایا ہے۔ سر والٹر لارنس اپنی کتاب IMPERIAL GAZETTER OF INDIA میں اُن کے بارے میں رقم طراز ہے:

"گلوان چک خاندان کی اولاد ہیں۔ اُن کی طبیعت میں ایک قاہرانہ بے چینی پائی جاتی ہے۔ پہلے وہ گھوڑے پال کر گذارہ کرتے تھے۔ بعد میں اُنہوں نے گھوڑے چُرانے کا پیشہ اختیار کیا کیونکہ اُن کے لئے یہ کام زیادہ آسان تھا۔ سکھوں کے دورِ حکومت میں اُنہوں نے بڑی دہشت پھیلا رکھی تھی۔ بہت ساری روایتوں کے ہیرو خیرا گلوان کو سکھ گورنر میاں سنگھ نے تختہ دار پر لٹکایا۔ گلاب سنگھ نے گلوان کے خلاف

اپنی مہم جاری رکھی اور اُن کو بُونجی جلاوطن کیا۔''

رسول کا باپ محمد گلوان بھاگ کر بلتستان آیا۔ اُن کے بھائی کا نام غفور گلوان تھا۔ غالباً اُسی زمانے میں محمد گلوان کو کشمیر سے جلاوطن کیا گیا تھا یا وہ خود سکھوں کی دستبرد سے بچنے کے لئے بھاگ گیا تھا۔ رسول گلوان کی ماں بلتستان سے لیہہ آئی تھی جہاں اُن کی شادی اپنے قبیلے کے ایک آدمی سے ہوئی۔ اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُن دِنوں لیہہ میں گلوان پہنچا تھا۔

رسول کی پیدائش لیہہ میں ہوئی۔ بتایا گیا ہے کہ کتاب کی تصنیف کے وقت رسول گلوان کی عمر ۴۵ سال کی تھی۔ اِس حساب سے وہ لگ بھگ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوا تھا۔ اگر اس سن کو مصدقہ قرار دیا جائے تو رسول گلوان بارہ سال کی عمر میں بطور قلی ینگ ہاسبنڈ کے ہمراہ سنٹرل ایشیا کی مشہور مہم پر روانہ ہوا تھا۔ اِس سے پہلے ایک ڈاکٹر TRALL کے ساتھ کشمیر کا سفر کیا تھا۔ رسول نے خود بھی لکھا ہے کہ اُس نے کمسنی میں سفر کیا تھا۔

اُس زمانے میں تبت اور سنٹرل ایشیا کے بے آب و گیاہ علاقوں اور لق ودق خطوں کی مسافت اِنتہائی صبر آزما اور جان جوکھوں کا کام تھا۔ گھوڑے اور اِنسان سردی اور برفانی طوفان سے مر جاتے تھے۔ راستے میں رہزنوں کا خطرہ تھا۔ کئی دفعہ دِل گردہ والے مہم جو بھی ہمت ہار جاتے تھے۔ چنانچہ صحرائے گوبی میں سفر کرتے ہوئے ینگ ہاسبنڈ نے لکھا ہے:

''ایک رات میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں کتنا احمق ہوں کہ جو یہ سفر کر رہا ہوں اور میں نے قسم کھائی کہ آئندہ میں رُوئے زمین کے ایسے ویران علاقوں میں پھر کبھی سفر نہیں کروں گا۔''

ایک قُلی کا کام زیادہ مشکل تھا۔ اُسے کپڑے دھونا، کھانا پکانا، ایندھن جمع کرنا، جانوروں پر سامان لادنا حتی کہ کبھی سامان بھی اُٹھانا پڑتا تھا۔ وہ عموماً پا پیادہ سفر کرتا تھا۔

کئی یورپی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر اُن کو سزائیں دیتے تھے۔ چنانچہ ینگ ہاسبنڈ نے قدرے حیرت کے ساتھ لکھا ہے کہ "ہمالیائی لوگ کسی Stray مسافر کے لئے کیوں اِتنے مصائب اُٹھاتے ہیں اور اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہیں؟ ان کو اس کے لئے بہت کم محنتانہ ملتا ہے جبکہ انہیں روزانہ آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ حادثات کی صورت میں اُن کی زندگی کا کوئی بیمہ نہیں ہے۔ پھر بھی یہ لمبے اور مشکل دن میں کام کرتے ہیں۔ یہ دانستہ اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہیں اور سب سے تعجب خیز بات یہ ہے کہ وہ اپنے مالکوں کے بہت شکر گذار ہوتے ہیں۔"

پھر وہ لکھتا ہے: "اس کتاب سے ہمیں اس مشکل سوال کا جواب ملتا ہے۔" ینگ ہاسبنڈ کو صبر آزما سفر کے دوران جن تجربات سے گذرنا پڑا، قلیوں کو بھی ایسے ہی تجربات سے گذرنا پڑتا تھا۔ ایک روز رسول روتا ہے اور سوچتا ہے کہ کیوں لیہہ میں قلی بن کر نہیں رہا؟

تاہم قلی اور گھوڑے والے عموماً ہنسی خوشی سے رہتے ہیں۔ اِس ضمن میں ینگ ہاسبنڈ رقم طراز ہے: "اس راز کا جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کو مہم جوئی سے اُتنا ہی لگاؤ ہے جتنا اُن کو ملازمت میں لینے والے لوگوں کو لگاؤ ہے۔"

رسول گلوان کے سفر کی تاریخوں اور دُوسری جزئیات کی تمام کڑیوں کو ملانا بہت مشکل ہے کیونکہ جن سیاحوں کے ساتھ رسول نے سفر کیا تھا' اُن میں سے اکثروں کے سفر کے ریکارڈ دستیاب نہیں ہیں۔

رسول نے ۱۸۹۰ء میں ینگ ہاسبنڈ کے ساتھ سفر کیا۔ ۱۸۹۲ء میں لارڈ ڈینمور کے ہمراہ دُنیا کے بلند ترین مقام پامیر گیا۔ ۱۸۹۵ء میں جارج آر لیٹل ڈیل کے ساتھ دُشوار گذار علاقوں سے ہوتا ہوا وہ تبت کی راجدھانی لہاسہ کے نزدیک پہنچا۔ اُسی سال ارتھر نیوے کے ہمراہ قراقرم اور بلتستان کے بالتورو اور سیاچن کے گلیشروں کے سفر پر روانہ ہوا۔ اِس دوران ساسیر کی ۲۵ ہزار بلند چوٹی سر کی گئی تھی۔ ۱۹۰۱ء میں وہ

فلپس اور چرچ کے ساتھ شکار کی ایک مہم پر سنٹرل ایشیاء گیا۔ مہم سے واپس آکر فلپس اور چرچ نے لیہہ میں رسول کی ایک تقریب میں دستار بندی کی۔

اِس کے بعد یکے بعد دیگرے وہ کئی مہمات میں شامل ہوا۔ ان میں مارٹائن، ہاورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر رونالڈ ڈکسن، رابرٹ براٹ وغیرہ شامل ہیں۔ ۱۴-۱۹۱۳ء میں اطالوی محقق ڈاکٹر ڈی فلیپو فلیپی کی مہمِ قراقرم میں وہ میرِ کارواں تھا۔ کئی مہمات میں اُس کو اپنی ذہانت، دیانت اور تجربہ کاری کی وجہ سے کارواں لیڈر بنایا گیا تھا جن کی تفصیلات نہیں ملتی ہیں۔

رسول گلوان سے متعلق ینگ ہاسبنڈ کے تاثرات ملاحظہ ہوں:

''رسول گلوان ایک محنتی، جفاکش اور تنومند اِنسان ہے۔ اُس پر بڑے بڑے کوہ پیماؤں کو ناز ہوسکتا ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہ ایک دانشمند اور نہایت ہی وفا شعار انسان ہے۔ میں نے اُس جیسا شکر گذار آدمی اپنی زندگی میں شاید ہی کوئی اور دیکھا ہے۔''

لارڈ ڈینمور کی مہم پامیر اہم سیاسی نوعیت کی تھی۔ اُن دِنوں لداخ کی سرحد رُوس، چین، افغانستان اور برطانوی ہند کی سیاسی سرگرمیوں اور ریشہ دوانیوں کی آماج گاہ بنی ہوئی تھی۔ لداخ کی طرف رُوسی فوج کی پیش قدمی کا چرچا تھا۔ چنانچہ برطانوی ہند کو بڑی تشویش ہوئی اور ینگ ہاسبنڈ اور ڈینمور کو رُوسی فوج کی نقل وحرکت کا جائزہ لینے کے لئے یکے بعد دیگرے پامیر روانہ کیا۔

پامیر میں ایک روز رسول گلوان کا سامنا اچانک چند رُوسی فوجیوں سے ہوا۔ اُنھوں نے رسول سے باز پرس کی۔ رسول نے اپنی حاضر جوابی سے رُوسیوں کو قائل کیا اور اُنھوں نے اُسے سگریٹ پیش کیا۔ رسول نے اُس مقام پر افغان فوج کی چند لاشیں دیکھیں۔ یہ فوجی رُوسیوں کے ساتھ مڈبھیڑ میں مارے گئے تھے۔ واپس آکر رسول نے ڈینمور کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ڈینمور بہت خوش ہوا اور رسول کو

اِنعام دیا۔

اس سفر کے دوران چین اور ہند کی سرحد پر واقع ایک وادی کا نام رسول گلوان کے نام پر ''گلوان وادی'' رکھا گیا۔ یہ وہی گلوان نالہ ہے جس کا اخبارات اور ریڈیو میں ۱۹۶۲ء کی ہند اور چین کی جنگ کے دوران بہت چرچا ہوا۔ گلوان وادی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک دفعہ پامیر جاتے ہوئے خراب موسم اور دُھند کی وجہ سے ڈینمور کا قافلہ راستے سے بھٹک گیا اور ایک دُشوار گذار علاقے میں پہنچا۔ قافلے کے ہر فرد کی آنکھوں کے سامنے موت ناچنے لگی۔ رسول گلوان جیسے نوعمر مہم جو کے لئے یہ اِمتحان کی گھڑی تھی جس میں وہ پورا اُترا۔ وہ راستے کی تلاش میں نکلا اور ایک نئی وادی میں وارد ہوا جہاں سے ایک راستے کا سراغ ملا۔ چنانچہ وہ سارے قافلے کو وہاں لے آیا۔ ڈینمور اس دریافت پر بہت خوش ہوا اور اُس نے اس وادی کا نام ''گلوان وادی'' رکھا جسے آج کل گلوان نالہ بھی کہا جاتا ہے۔

ڈینمور نے رسول کو اپنی کتاب میں OLD FRANCATELLI کا خطاب دیا ہے۔ اِس خطاب کا مطلب معلوم نہیں ہوسکا۔

ڈینمور نے اپنی کتاب THE PAMIR میں قافلے کے لداخیوں کی بڑی تعریف کی ہے۔

لارڈ ڈینمور کی مہم کے لگ بھگ ڈھائی سال بعد ۱۸۹۵ء میں جارج. آر لیٹل ڈیل کے ہمراہ وہ تبت کی مہم پر روانہ ہوتا ہے۔ اور پہلی دفعہ ایک مہم میں کارواں لیڈر اِنتخاب کیا جاتا ہے۔ تب رسول کی شادی ہوئے صرف جمعہ جمعہ آٹھ روز ہوئے تھے۔ لیہہ کے وزیر (منتظم) نے رسول کو بلایا اور مہم میں شامل ہونے کی پیشکش کی۔ رسول کو لٹیل ڈیل سے ملنے فوری طور پر کاشغر روانہ ہونا تھا۔ وزیر کو اِس ضمن میں برٹش جوائنٹ کمشنر کا خط آیا تھا۔ رسول اِتنی جلدی اپنی نوبیاہی چہیتی بیوی کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن غریبی کی وجہ سے وہ جانے کے لئے مجبور تھا۔ ڈیل کے مکالمے حقائق کو پیش

کرتے ہیں:

''ماں: ابھی تمہاری شادی ہوئے دس روز بھی نہیں ہوئے ہیں۔تم کیسے جا سکتے ہو! تم کیا چاہتے ہو؟''

''رسول: میں بہت پریشان ہوں ماں۔آپ کو اور مریم کو چھوڑ کر جانا بھاری لگتا ہے۔ مجھے ایک بہت اچھی بیوی نصیب ہوئی ہے.........لیکن بیکاری بھی ایک بوجھ ہے۔شادی پر کافی خرچ آیا.........گھر میں اجنبی لڑکی ہے۔ہمیں سردیوں میں گزر بسر کے لئے پیسہ چاہئے.........''

پھر وہ مریم سے ملتا ہے۔مریم کہتی ہے۔''میں آپ کو اِتنی جلدی جانے نہیں دوں گی۔''

''رسول: یہ بات تو ٹھیک ہے مریم۔میرے لئے بھی جدائی تکلیف دہ ہے۔لیکن ....تم جانتی ہو۔ہم بہت غریب ہیں.........ایک دو دفعہ ایسا سفر کرلوں تو کچھ رقم جمع کرلوں گا اور کوئی کاروبار کروں گا۔''

''مریم: میں نے سنا یہ سفر بہت بُرا ہوتا ہے اور انسان کی جان کو خطرہ رہتا ہے۔اگر آپ.........''

''رسول: موت تو کہیں بھی آسکتی ہے مریم۔یہاں بیٹھ کر بھی آسکتی ہے۔''

''رسول: (روانگی کی صبح ماں سے) ماں، میں مریم کو بہت چاہتا ہوں۔اس کی جدائی کا مجھے بہت غم ہے ماں۔میں تم سے اِلتجا کرتا ہوں کہ اس پر مہربان ہی رہنا.........''

''ماں: تم بالکل فکر نہیں کرو رسول.....میں شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔''

''رسول: (الگ سے اپنی بیوی کو) مریم، ماں ذرا گرم مزاج کی ہے.....خدارا ماں کو نبھا لینا۔''

''مریم: میں ماں کا غصہ برداشت کروں گی........آپ سفر میں اپنی صحت

کا خیال رکھنا۔''

''رسول: اپنا چال چلن ٹھیک رکھنا۔ میں ہمیشہ تمہارا وفادار رہوں گا۔''

''مریم: میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گی۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔''

''رسول: (مریم کو روتے دیکھ کر) تم پھر رو رہی ہو.........اگر ہمارے پاس کچھ روپیہ پیسہ ہوتا تو میں نہیں جاتا۔''

''مریم: (اپنے آنسو پونچھتی ہوئی) سفر میں اپنی صحت کا خیال رکھنا۔''

''رسول: (مریم کو پانچ روپیہ کا ایک نوٹ دیتا ہوا) یہ اپنے پاس رکھ لینا۔ ماں کو اِس کا علم نہیں ہے۔ کچھ کام آسکتا ہے۔ میں تمہارے لئے کیا تحفہ لاؤں......؟''

''مریم: آپ صحیح وسلامت واپس آجائیں تو یہ میرے لئے بڑا تحفہ ہے۔''

رسول گلوان نے اپنی کتاب میں جارج لیٹل ڈل کے ہمراہ تبت کے سفر کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اُن دنوں یورپیوں کو تبت میں داخلہ کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ لیٹل ڈل کے قافلے نے اصلی راستہ چھوڑ کر شمال کی جانب سے سفر کیا اور اکّا دُکا تبتیوں کی مزاحمتوں کا سامنا کرتا ہوا وہ تبت کی راجدھانی لہاسہ کے قریب پہنچا۔ اِس دوران کئی جگہوں پر تبتیوں سے جھڑپ ہوتے ہوتے رہ گئی۔

جب لہاسہ ۴۳ میل دُور رہا تو تبتیوں نے قافلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ قلم رسول اور رسول گلوان گھوڑے پر سوار قافلے سے آگے آگے جا رہے تھے کہ تقریباً ایک ہزار گھوڑ سوار مسلح تبتیوں نے اُن دونوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر قافلے کو کیمپ تک واپس پہنچایا۔ یہاں سے قافلے کو واپس لداخ کی طرف لوٹنا پڑا۔ اس دفعہ اُنہوں نے عام راستہ اختیار کیا لیکن بار برداری کے لئے جانور اور اشیائے خوردنی فراہم کرنے میں گاؤں والوں اور خانہ بدوش چنگپاؤں نے اُن کے ساتھ ٹھیک تعاون نہیں کیا تب قلم رسول نے ایک چینی لاما کا رُوپ دھارا

اور رسول گلوان نے تبّتی لاما کا بھیس بدلا اور جگہ جگہ اُنہوں نے تبتیوں سے کہا کہ وہ دلائی لامہ کے نمائندے ہیں اور قافلے کی حفاظت کے لئے لداخ تک جا رہے ہیں۔

قلم رسول بڑا چرب زبان اور چالاک تھا۔ وہ لٹیل ڈل کی بیوی کو دِکھا کر، جو اُس سفر میں اپنے شوہر کے ساتھ تھی، نمبرداروں سے کہتا۔ ''ہمارے ساتھ انگریز سرکار کی مہارانی وکٹوریہ کی چھوٹی بہن ہیں۔ لہاسہ میں یہ دلائی لاما کی خصوصی مہمان تھیں۔ ہم دونوں کو چین کی حکومت نے صاحب اور بڑی میم کی حفاظت کے لئے ان کے ساتھ بھیجا ہے۔ اِنگلینڈ اور تبت میں دوستی ہوئی ہے اور تحفے تحائف کا تبادلہ ہوا ہے۔

سیدھے سادے تبّتی اُن کے جھانسے میں آجاتے اور یاک اور راشن مفت فراہم کر دیتے۔

قلم رسول جعلی تعویز اور نقلی ٹکیاں تقسیم کرتا ہوا کہتا۔ ''یہ تعویز اور پوتر ٹکیاں ہمیں دلائی لامانے دی ہیں۔ آپ بھی کچھ تبرک اپنے لئے رکھیں۔''

تبّتی ''لہاسو! لہاسو! تھُوجے چھے!'' (جی ہاں، جی ہاں شکریہ) کہتے ہوئے اور اپنی زبان نکالے اور ہاتھ جوڑ کر نقلی تعویز اور ٹکیاں حاصل کرتے۔

اِس طرح رسول اور اُن کے ساتھی سیدھے سادے تبتیوں کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے میں کامیاب ہوئے۔

یاک کے تبّتی مالکان گلوان اور قلم رسول سے اِتنے مرعوب ہوئے کہ سفر کے اِختتام پر رسول، قلم اور رزاق آخون کو ریشمی رُومال پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ بڑے آدمی ہیں اور ایک بڑی چراگاہ دِکھاتے ہوئے اِستدعا کی کہ اسے اُن کے نام اِنتقال کریں۔

تینوں ایک دُوسرے کا منہ تاکنے لگے اور قلم رسول نے ترکی زبان میں رسول سے کہا کہ کچھ لکھ کر دے دیں۔ رزاق آخون بھی ترکی میں بولا کہ کچھ بھی لکھ دے، چل جائے گا۔

رسول گلوان نے ایک کاغذ پر ٹوٹی پھوٹی بودھی میں چراگاہ کے اِنتقال کا حکم نامہ لکھ کر کرایہ کشوں کے حوالے کیا اور کرایہ کشوں نے رسم کے مطابق زبان نکالے شکریہ بجالاتے ہوئے حکم نامہ حاصل کیا۔

مغربی تبت کے صدر مقام رُودوق سے کچھ آگے لیٹل ڈل اور اس کے آدمیوں کو چند اہل کاروں اور مسلّح سپاہیوں نے روک دیا اور ایک آدمی نے اپنے آپ کو ہیڈ مین بتاتے ہوئے شکایت کی کہ اُنھوں نے دیواجُونگ (حاکمِ اعلیٰ) کے حکم کے بغیر تبتیوں سے یاک، گھوڑے اور کھانے پینے کی چیزیں حاصل کی ہیں اور تبتیوں کی سادگی سے ناجائز فائدہ اُٹھایا ہے۔

قلم رسول بولا "اگر یہ ڈرامہ نہیں کرتے تو آج ہم یہاں نہیں پہنچتے اور راستے میں کہیں بھوکے مرجاتے۔"

اُنہیں رُودوق میں داخل ہونے نہیں دیا۔ البتہ آگے جانے کی اجازت دی اور اُن کی درخواست پر اُنہیں چند لداخی تاجروں سے ملنے دیا، جو رُودوق آئے تھے۔

ایک سال تین ماہ اور تیرہ روز بعد یہ لیہہ پہنچے، جو رسول کی ماں اور مریم نے ایک ایک دن گِن کر گذارے تھے۔ ایک رات گھر پر گذارنے کے بعد دُوسری صبح رسول کو لٹیل ڈل اور مسز ڈل کے ساتھ سرینگر جانا پڑا۔ موسم سرما تھا اور راستہ کسی بھی لمحہ بند ہوسکتا تھا۔ مریم نے احتجاج کیا۔ رسول بھی اپنی چھتی بیوی سے اِتنی جلدی جدا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"بھاری دل کے ساتھ میں دُوسری صبح کشمیر روانہ ہوا۔"

۱۸۹۶ء میں رسول گلوان ایک انگریز آرتھر نیوے کے ہمراہ قراقرم، سیاچن اور بالتُورو گلیشیر جاتا ہے۔ سفر اور مہم جوئی کا شوق مریم سے کئے گئے وعدے پر قائم نہیں رہنے دیتا۔ ان کے بعد وہ چائے کپڑے کی ایک دُکان چلاتا ہے۔ ڈیڑھ سال بعد پھر وہ سفر شروع کرتا ہے۔ یہ رابرٹ براٹ ہوتا ہے، امریکی سیاح، جس کی ایماء پر رسول

نے اپنی کتاب لکھی۔ غریب صاحب رسول گلوان اور دُوسرے لداخی ملازمین کے لئے سابق یورپیوں سے زیادہ فراخ دل ثابت ہوتا ہے۔

رسول گلوان پیدائشی مہم جو تھا۔ سیاحت کا شوق اُس کی گھٹی میں تھا۔ مہم جوئی کا عشق اور سفر کا جنوں اُسے صحرا صحرا گلشن گلشن لے جاتا تھا۔ وہ رقم طراز ہے:

''چینی ترکستان میں میرے ایک رشتہ دار نے مجھے دولت کی پیشکش کرتے ہوئے کہا کہ سفر کے مصائب کیوں جھیلتے ہو۔ یہ مال و دولت لو جو تمہاری ضروریات کے لئے کافی ہیں۔ لیکن میں نے مال و دولت ٹھکراتے ہوئے جواب دیا مجھے حقیقی سکون بادہ پیمائی اور سیاحت میں ملتا ہے۔''

رسول گلوان اور اُس کے ساتھیوں کو نئے نئے مقامات دیکھنے، اجنبی لوگوں سے ملنے اور اُن کے رہن سہن، رسم و رواج وغیرہ جاننے کا بڑا شوق تھا۔ اپنے مشاہدات اور تجربات کو وہ لیہہ آکر دوستوں کو بڑے چاؤ سے سناتے تھے۔

بچپن میں لیہہ میں مَیں نے کئی آدمی دیکھے ہیں جو قلم رسول، گلوان رسول، صابر ملک اور محمد عیسٰی وغیرہ کے سفر کی آپ بیتی اور احوال سناتے تھے جو اُنہوں نے ان مہم جوؤں سے سنے ہوتے تھے۔ اُن دِنوں لوگوں کو بڑی فراغت حاصل تھی۔ سفر کے احوال سنانے کے لئے مہم جوؤں کو دعوتیں دیتے اور دوستوں کی محفلیں جماتے تھے۔

رسول گلوان میں کسی چیز کو دیکھنے اور جاننے کا بڑا تجسُس تھا۔ پامیر کے سفر کے دوران اُس نے ایک مرتبہ اپنے کئی ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود محض اس لئے ایک جنگل کو آگ لگا دی کہ وہ لپکتے شعلوں کا منظر دیکھنا چاہتا تھا۔ جب لارڈ ڈینمور نے خفگی سے پوچھا کہ اُس نے یہ حرکت کیوں کی تو رسول صاف صاف بولا۔

''میں تماشا دیکھنا چاہتا تھا۔''

رسول گلوان خدا پرست، سادہ لوح اور نیک انسان تھا۔ کتاب کے پیش لفظ میں ینگ ہاسبنڈ لکھتا ہے: ''رسول کی کتاب کی سب سے قابلِ ذکر بات خدا پر اُس کا

مکمل اعتقاد ہے۔ یہ اُس کے سارے مصائب' آزمائشوں اور مایوسیوں میں مددگار تھا۔ اور خدا کے تئیں اُس کی یہ عقیدت تھی کہ جس نے اس کو بلاشبہ ایک بھلا مانس اِنسان بنا دیا۔'' بعد میں ینگ ہاسبنڈ بھی مذہبی ہو گیا تھا۔

لیکن رسول زاہد خشک نہیں تھا۔ وہ اچھا گوّیا تھا اور بڑے چاؤ سے بنجو بجاتا تھا۔ سفر حضر دونوں میں وہ اور اس کے ساتھی اپنے ناچ گانوں سے لوگوں کا دل بہلاتے تھے۔ لیہہ کے بعد چینی ترکستان کے شہر کاشغر اور یارقند اُن کے تفریحی مشاغل کے مراکز تھے۔

رسول نے کتاب میں اپنا ایک گیت دیا ہے۔ اِس کا اُردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

''سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے

یہ خدا کی عنایت ہے

چاروں طرف یہ روشنی بکھیرتا ہے

یہ بڑا طاقت ور ہے

غریب لڑکا رسول پر یہ ہمیشہ مہربان ہے

رسول کے پاس کام اور روپیہ نہیں

خدا اپنی رضا سے چھوٹا موٹا کام دیتا ہے.....''

رسول گلوان کی خودنوشت سوانح عمری میں جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا' وہ رسول کی سادگی' سچائی اور صاف گوئی ہے۔ وہ اس زمانے کے ایک مثالی لداخی کی طرح لگی لپٹی کے بغیر بات صاف صاف کہتا ہے اور اپنی کمزوریوں کا ذکر کرنے سے گریز نہیں کرتا ہے۔ کمسنی میں اپنی غریبی کا نقشہ وہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے:

'میں بکری کی کھال پہنتا تھا اور چند بچوں کے ساتھ گوبر اور ایک جھاڑی بُرٹزے (Artemisia) چننے جایا کرتا تھا۔ اُن میں ایک قلم رسول تھا۔ اپنے پھٹے ہوئے پاپوش سلانے کے لئے ہم سُوا اور دھاگا ساتھ رکھتے تھے۔ جب پیاس لگتی تو پتھر پر

برف پگھلا کر اُسے کھال پر ڈال کر پی لیتے اور اپنی پیاس بجھا لیتے تھے۔"

رسول کو پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"مجھے تعلیم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اُن دِنوں لیہہ میں کوئی سکول نہیں تھا۔"

جب مشن سکول کھلا تو وہ عارضی طور پر وہاں پڑھنے گیا۔ وہ سرکاری سکول میں بھی پڑھنے گیا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے: "بعد میں مہاراجہ نے لیہہ میں ایک مدرسہ کھولا۔ میں اپنا شوق پورا کرنے کے لئے مدرسہ گیا۔"

رسول نے کتنے درجے تک پڑھا' اِس کا ذِکر نہیں کیا ہے۔ باقاعدگی سے وہ تعلیم حاصل نہیں کر سکا تھا۔ ماں نے کمسنی میں اُس کو ایک درزی کے پاس کام سیکھنے کے لئے رکھا۔ درزی سخت گیر تھا۔ رسول تنگ آ کر بھاگ گیا۔

پھر ایک کوٹھیالہ کے پاس ترازو بردار کا کام کرنے لگا اور تھوڑا بہت کمانے لگا۔

کتاب میں جا بجا دلچسپ واقعات کا تذکرہ ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے:

"بچپن میں جب کسی بات پر ماں مجھ سے خفا ہو جاتی تو وہ میرے بدن کی زور سے چٹکی لیتی تھی۔ وہ کبھی سر یا بدن پر ہاتھ نہیں اُٹھاتی تھی کیونکہ ماں کا خیال تھا کہ چٹکی لینے سے بچے کو کوئی جسمانی ضرر نہیں پہنچتا۔"

ماں نے ایک بکری پال رکھی تھی۔ ایک روز ماہِ رمضان میں رسول کی لاپروائی سے بکری نے افطار کے لئے پکائی ہوئی روٹیاں کھا لیں۔ ماں نے باہر جانے سے پہلے رسول کو تاکید کی تھی کہ کہیں بکری روٹیاں نہ کھا لیں۔ غصے میں آ کر ماں نے رسول کو گھر سے نکال دیا۔ وہ رات رسول نے کسی دُوسرے کے گھر میں گذاری۔

رسول گلوان میں کہانی گوئی کا اچھا فن ہے۔ ینگ ہاسبنڈ نے اُس کو جنم جنم کا (پیدائشی) کہانی گو قرار دیا ہے جو اپنے اندازِ بیان سے معمولی واقعات کو ادب پارے بنا دیتا ہے۔

رسول کو ترکی زبان میں یدِ طولی حاصل تھا۔ اپنی محنت سے انگریزی میں

شُد بُد حاصل کی تھی۔ شکور علی نے ینگ ہاسبنڈ کو جب وہ سرینگر میں ریذیڈنٹ تھا' ایک خط میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے: ''مجھے خط لکھنے کے لئے کوئی منشی نہیں ملا۔ اِس لئے اپنے پرانے دوست رسول سے یہ خط لکھوایا ہے۔ اِس لئے اس کی انگریزی تحریر پر ناراض نہ ہونا اور مجھے معاف کرنا.........غریب رسول کا بہت بہت سلام!''

مسز رابرٹ براٹ' رسول گلوان سے بڑی متاثر تھی۔ وہ رقم طراز ہے:

''رسول بڑے خوش اخلاق ہیں..........ایک شریف ترین اِنسان بھی اس کا ثانی نہیں ہوسکتا۔ وہ بڑے بھلے مانس ہیں اور اس کے ساتھیوں سے بہتر ہیں۔''

رسول کی شخصیت سے متعلق اُس کے تاثرات کچھ یوں ہیں:

''رسول کا رنگ بہت سیاہ ہے اور بڑا وجیہہ ہے۔ اُس کی حرکات وسا کنات پُر وقار اور اُس کی مسکراہٹ نہایت ہی دلکش ہے۔ اُس کی آواز بڑی شیریں ہے۔ میں نے ایسی میٹھی آواز آج تک نہیں سُنی ہے۔ اُس کو دیکھ کر ہر عورت پہلی نظر میں فریفتہ ہو سکتی ہے لیکن اُس کا کردار بہت بلند ہے۔ عورتیں اُس کو ایک ولی سمجھ کر ڈرتی ہیں۔''

مذکورہ الفاظ ۱۸۹۵ء کے رسول کی شبیہہ اور شخصیت کو پیش کرتے ہیں۔ اس کے ستائیس اٹھائیس سال بعد ۱۹۲۳ء کے رسول گلوان کی ایک اور تصویر ہمارے سامنے ہے' جب وہ لیہہ کا اقسقال تھا۔

''اُس کے سر پر ململ کی سفید پگڑی اور بدن پر ڈھیلا ڈھالا چُغا ہے۔ اُس کے کتابی چہرے پر داڑھی ہے اور اُن آنکھوں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اِس انسان نے زندگی میں بڑے نشیب وفراز دیکھے ہیں۔''

لداخ کا یہ مہم جو اِنسان ۱۳ر مارچ ۱۹۲۵ء کے روز خدا کو پیارے ہوئے۔ وفات کے وقت اُن کی عمر ۴۷ سال تھی۔ حکومتِ وقت نے اُن کے دو کمسن بیٹوں کی کفالت کے لئے لیہہ میں زمین دی۔ اُن کے یہ دو بیٹے محمد غلام رسول اور حبیب اللہ بھی اب اِس دُنیا میں نہیں ہیں۔ اُن کے بیٹے بیٹیاں اور پوتے پوتیاں لیہہ میں آباد ہیں۔

گیشے ایشے تنڈوپ

گیشے ایشے تنڈوپ جدید لداخ کے ایک سرکردہ مذہبی عالم تھے۔ بدھ دھرم خاص طور پر تبّتی بدھ مت سے متعلق وہ گہری بصیرت اور بڑی علمیت رکھتے تھے۔ تبّتی بدھ مت (TIBETAN BUDDHISM) کی اصطلاح مغربی اسکالروں اور مُستشرقیات نے وضع کی ہے۔ مشہور ماہرِ تبتیات TIBETOLOGIST پروفیسر گیسیو پوٹوچی نے لکھا ہے:

''تبّتی بدھ دھرم کا علمی سرمایہ اِتنا بڑا ہے کہ ایک آدمی کو انہیں پڑھنے کے لئے اتنی لمبی عمر چاہیے جو دو طبعی زِندگیوں کا احاطہ کرے۔''

یہ کتابیں زیادہ تر سنسکرت سے ماخوذ یا ترجمہ کی ہوئی ہیں۔ اِن میں مذہب' فلسفہ' منطق' جیوتش اور طب کے علوم شامل ہیں جو بُدھ ازمنہ قدیم' دورِ وسطیٰ کے ہندی بودھ عالموں اور تبّتی رشیوں منیوں کی دین ہیں۔ ان میں مہاتما بدھ سے براہِ راست منسوب مذہبی صحیفوں کی ۱۰۸ ضخیم جلدیں اور ان کی ۲۲۵ ضخیم تفاسیر بھی شامل ہیں' جو ہر بڑے گپنہ میں موجود ہیں۔

گیشے اِیشے تنڈوپ نے تبت میں مذہبیات میں ڈاکٹریٹ کیا تھا۔ گیشے ڈاکٹریٹ کا تبّتی متبادل لفظ ہے۔ اِس لئے وہ گیشے کہلاتے ہیں۔

گیشے ایشے تنڈوپ سے متعلق لداخی ادیب ٹشی ربگیس نے لکھا ہے:

''وہ بودھ دھرم کے کسی بھی مضمون یا موضوع پر آسان اور عام فہم زبان میں اِظہار خیال کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اُن کے اُپدیش سننے کے لئے عام لوگوں

کے علاوہ نئی نسل کے پڑھے لکھے جوان بھی آتے تھے۔ اُنہوں نے اجتماعات میں بدھی آچاریہ، شانتی دیوا اور ناگ ارجن کے فلسفے کو سلیس اور بول چال کی زبان میں پیش کیا ہے۔ تانترک کے موضوع پر تعلیم و تدریس دینے سے اُنہوں نے ہمیشہ گریز کیا۔''

ٹشی ربگیس نے گیشے ایسے تنڈوپ کو علم کا خزینہ قرار دیا ہے۔ بقولِ اُن کے لداخی یا تبّتی صرف ونحو اور کوی درشن میں ہم عالموں میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ گیشے تنڈوپ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے لداخی میں پہلی سے دسویں جماعت تک کی درسی کتابوں کی تصنیف و تالیف کی۔ اِس کام میں لداخی مدرّس ٹشی پنچگ نے اُن کی اعانت کی۔

گیشے ایشے تنڈوپ اچھے قلم کار تھے۔ اُنہوں نے کئی تبّتی داستانوں اور جھٹا کا کی حکایات کو لداخی میں ڈرامائی رُوپ دیا۔ ان کے لئے منظوم مکالمے لکھے۔ شروع میں سن ساٹھ کی دہائی میں لیہہ اور مختلف دیہات میں یہ ڈرامے سٹیج کئے گئے۔ ان ڈراموں کے اخلاقی پہلو اور نفسِ مضمون کو سماج سُدھار اور دھرم کے پرچار کے لئے بروئے کار لایا گیا۔

بدھ کی تعلیمات اور حیات پر اُنہوں نے ڈرامے لکھے۔ یہ ڈرامے لوگوں میں بڑے مقبول ہوئے۔ ڈراموں سے حاصل آمدن گنپوں اور یادگاروں کے تحفّظ اور مرمت کے لئے خرچ کی گئی۔ اُن کی پہل سے لمڈون ڈرامیٹک کلب قائم ہوا۔ کلب کی کوششوں سے لمڈون پبلک سکول اور لمڈون ویلفیئر سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ان اداروں نے تعلیمی اور سماجی میدان میں نمایاں کام کیا ہے۔

گیشے ایشے تنڈوپ کی علمیت اور خدمات کے لئے ریاستی کلچرل اکیڈمی نے اُن کو خلعت سے نوازا۔ شیخ محمد عبداللہ نے ٹیگور ہال سرینگر میں اُن کو یہ اعزاز بخشا۔ اُن کے لداخی ڈرامہ ''ستارزی زون می شیس'' پر اُنہیں کلچرل اکیڈمی کی طرف سے انعام ملا۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے کئی اچھے ڈرامے لکھے ہیں جن میں ''لہا مواتیوق''

اور ''ٹیسمیت کوئدن'' شامل ہیں۔ان ڈراموں کی کہانی سنسکرت سے ماخوذ ہے اوران کا تبّتی میں ترجمہ ہوا ہے۔اُنہوں نے لداخ کی ایک مختصر تاریخ بھی تصنیف کی ہے۔

ایشے تنڈوپ نے گیت اور نظمیں لکھی ہیں۔مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی تعریف میں بھی اُنہوں نے ایک نظم لکھی ہے۔

گیشے ایشے تنڈوپ ایک قابل مترجم بھی تھے۔جب دلائی لاما نے لیہہ میں کلاسیکل تبّتی میں بودھ فلسفہ ''کالا چکر'' پر ایک طویل اُپدیش دیا تو گیشے صاحب کو بطور مترجم منتخب کیا گیا۔دلائی لاما نے اُن کو لوڑاوایا ''عالم چشمِ بینا'' کے نام سے خطاب کیا۔

گیشے ایشے تنڈوپ نے زندگی کا بڑا حصہ ایک معلّم کی حیثیت سے گذارا۔وہ لداخ کے گیلُو گپا فرقہ کے مشہور گنپہ سپیتک سے وابستہ تھے جہاں اُنہوں نے مختلف اہم عہدوں پر کام کیا۔۱۹۵۷ء میں وہ لداخ بڈھسٹ ایسوسی ایشن کے صدر منتخب کئے گئے۔آخری عمر میں وہ بیلی کوٹی' کرناٹک میں تبّتی پناہ گزینوں کے گنپہ ٹشی لُھونبُو کے خنپو یا ہیڈ لاما بنائے گئے۔اُن کے شاگردوں میں ہمس اور ریزونگ گنپوں کے گُوشوق بھی شامل تھے۔

تبت کے متعدد عالموں سے اُن کی راہ ورسم تھی۔موخرالذکر اُن کے علم وفضل کے معترف تھے۔اُن کے واقف کاروں کا کہنا ہے کہ تبّتی بدھ مت کے تمام فرقوں کے تیئں اُن کے دل میں احترام تھا۔اگرچہ وہ خود گیلُو گپا یا زرد فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔زرد فرقہ کو اصلاح شدہ فرقہ (REFORMED SECT) بھی کہا جاتا ہے۔

گیشے ایشے تنڈوپ ایک بڑے لاما اور یوگین ڈوڈ جام رینگبو چھے کے بڑے مداح تھے جو ایک قدیم فرقہ ننگما پا سے تعلق رکھتے تھے۔

گیشے ایشے تنڈوپ ۱۸۹۷ء میں ستوق گاؤں میں اوماچیگ نام کے خاندان میں پیدا ہوئے۔اُنہوں نے اپنی سوانح حیات لکھی ہے۔اِس خودنوشت سوانح حیات

کا مسودہ ہالینڈ کے شہر لیڈن کے نیشنل میوزم آف اتھنولوجی میں پڑا ہے۔ ایک منظوم سوانح حیات بھی لکھی ہے جو اُن کے بھتیجے جگمت دُورجے کے پاس ہے۔

گیشے ایشے تنڈوپ نے آٹھ سال کی عمر میں اپنے خاندان سے کہا کہ وہ ایک بھکشو بننا چاہتے ہیں۔ نوعمر ایشے کی خواہش کا پاس رکھتے ہوئے اُن کے والدین نے اُنہیں اِس کی اجازت دے دی۔ اِبتداء میں ایشے تنڈوپ نے ستوق گنپہ میں بودھی پڑھنا لکھنا سیکھا۔ پھر وہ سپتیک گنپہ کے سنگھ میں شامل ہوئے جہاں گنپہ کے ہیڈ لاما کوشوق بکولا نے اُن کو آشیرواد دیا۔

اُن دنوں ایک لاما کا مرتبہ حاصل کرنے کے لئے تبت جانا لازمی تھا۔ ایشے تنڈوپ ۱۹۱۱ء میں لوپچق مشن کے ارکان کے ہمراہ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے تبت روانہ ہوئے۔ تب وہ چودہ سال کے تھے۔ لوپچق ہر تیسرے سال حکومت کی طرف سے خیرسگالی مشن پر لہاسہ تبت جاتا تھا۔ اُس سال مشن کی قیادت لیہہ کا ایک مسلمان خواجہ عبدالرشید کررہا تھا۔

ایشے تنڈوپ نے ٹشی لُھو بنُو گنپہ میں داخلہ لیا، جس کے سربراہ پنچن لاما تھے۔ گیشُ ول کا اِبتدائی درجہ حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اگلے کئی سالوں کے دوران فلسفہ کی مختلف شاخوں کا مطالعہ کیا۔ منطق میں اعلیٰ صلاحیت رکھنے اور اچھی کارگذاری کے لئے پنچن لاما نے اُن کو خلعت پیش کی۔ یہ سرخ اور زرد کمخواب کا ایک واسکٹ تھا، جس پر اژدھا کی شبیہہ کی کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ روایتی اعزازی ریشمی رومال کے علاوہ اُن کی ذاتی حفاظت کے لئے منتر جاپا ہوا ریشمی نسخہ (Charmed Silk Knot) عطا کیا۔

اگلے چھ سالوں میں اُنہوں نے پانچ سنجیدہ مضامین کا مطالعہ کیا۔ یہ مضامین پرمنا ودیتکا (منطق)، وِنیا (بھکشو کے اخلاقی اصول)، پراجنا پرامِتا (ماورائی دانائی)، مدھمیکا (درمیانی راستہ) اور بودھ فلسفہ (ابھید ہار ما کوشا) تھے اور ان علوم میں مہارت

حاصل کی۔

۱۹۲۵ء میں ٹشی لھونبو گنپہ نے ان کو کاچین کی سند دی، جو ڈاکٹریٹ کے درجہ کے برابر ہے۔ جلسہ تقسیم اسناد میں ۲۸۰۰ لامے موجود تھے، جن میں ۲۰۰ کے آس پاس بڑے عالم تھے۔ اِس گنپہ کے کاچین کی ڈگری تین مشہور گنپے سیرا، غلدن اور ڈیپونگ کے گیشے کی ڈگری کے برابر مانی جاتی ہے۔

اٹھائیس سال کی عمر میں اُن کو پنچن لاما کی نجی ملکیت کا نگراں بنایا گیا جہاں اُن کو پنچن لاما کی جمع کردہ کتابوں سے اِستفادہ کرنے کا موقع ملا۔ پنچن لاما نے گیشے کو چاندی کا ایک تمغہ بھی عطا کیا۔

گیشے ایشے تنڈوپ نے ٹشی لھُونبو میں ۲۴ سال گذارے۔ اِس دوران بیس سے زائد رینگبو چھے اور گیشے سے استفادہ کیا، جن میں کھُونُو لاماستزین گیالچن جیسے عالم شامل تھے جنھوں نے چودھویں دلائی لاما کو چند پنہاں علوم سکھائے۔

۱۹۳۱ء میں ۳۴ سال کی عمر میں وہ گیانگچے میں پلکھور تعلیمی مرکز میں بودھ فلسفہ کے اُستاد مقرر ہوئے۔

بعد میں اُنہوں نے پچاس گیشے کے ساتھ عِلم ہجا (Orthography) سے وابستہ کلاسوں میں حاضری دی اور صرف ونحو میں یدطولیٰ حاصل کیا۔ اِسی اثناء میں اُنہوں نے مانے گنپہ کے ایک لاما سے عِلم جیوتش سیکھا۔

۱۹۳۴ء میں وہ لداخ لوٹے۔ تب وہ ۳۷ سال کے تھے۔ لیہہ میں اُن کا رابطہ موراوین مشن کے پادری پیٹر صاحب سے رہا، جو علم وادب کے بڑے شیدا تھے۔ پیٹر نے گیسیو پے ٹوچی سے اُن کا متعارف کیا، جو مختصر دورے پر لداخ آیا تھا۔ ٹوچی گیشے سے متاثر ہوا اور اٹلی آنے کی دعوت دی۔

ٹوچی کے مشورے پر اِٹلی جانے کے سلسلے میں ویزا حاصل کرنے کے لئے وہ کلکتہ گئے۔ ویزا کا کیا بنا، کچھ پتہ نہیں چلتا ہے، البتہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے

سکریٹری Van Manen کی سفارش پر وہ سوسائٹی میں ریسرچ سکالر تقرر ہوئے۔ مانین، گیشے کی علمیت سے بے حد متاثر تھا۔

اسی اثناء میں لیہہ کے دوسر کردہ اشخاص کلون لبزانگ چھوانگ اور تونیت شاہ نے اُن سے اِستدعا کی کہ کلکتہ سے زیادہ لداخ میں اُن کی بڑی ضرورت ہے، اِس لئے وہ لداخ آئیں۔ تب کلکتہ میں رہتے ہوئے اُن کو ایک سال ہو چکا تھا۔

گیشے ایشے تنڈوپ لیہہ لوٹے۔ لیہہ پہنچنے پر ایک گُپھا میں چند ماہ مراقبہ کیا۔ پھر لیہہ کے سرکاری مڈل سکول میں وہ بودھی (لداخی) زبان کے اُستاد مقرر ہوئے۔ گیشے صاحب کی علمی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے سکول کا بودھی اُستاد موروپ گیالچن، گیشے ایشے تنڈوپ کے حق میں رضا کارانہ طور دستبردار ہو گیا۔ اِس طرح بودھی پڑھنے والے طلباء کو ایک عالم اُستاد ملا۔ اُن کی شاگردی میں بودھی میں کئی ہونہار طلباء اُبھرے۔

تین سال بعد انہوں نے معلم کا پیشہ عارضی طور چھوڑ دیا اور لداخ کے دیہات میں تبلیغی کام میں لگ گئے۔ اِس دوران اُنہوں نے بدھی ستواویلوکیتشورا پر اپنی کتاب تصنیف کی۔ اُنہی دِنوں نوبراہ میں ایک سفر کے دوران اُن کے والد کا انتقال ہوا۔ والدہ تبت میں اُن کی تعلیم کے دوران چل بسی تھیں۔ اسی اثناء میں اُنہیں ٹشی لھُونبوُ میں بطور اُستاد کام کرنے کے پیشکش آئی جسے اُنہوں نے قبول نہیں کیا۔

چار سال بعد ۱۹۴۵ء میں دوبارہ اُنہوں نے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا اور ۱۹۴۶ء کی سردیوں سے پہلے وہ ایک مشن پر سکم کی راجدھانی گنگٹوک روانہ ہوئے جہاں اُنہوں نے رانی اور وزیرِ داخلہ سے ملاقات کی۔ واپسی پر کالیمپونگ میں گیشے ایشے تنڈوپ نے ایک لداخی عیسائی بابو تھرچین سے دوبارہ ملاقات کی جو تبّتی میں ایک اخبار ''میلونگ'' چلاتا تھا۔ گیشے نے اُن کے ساتھ اس سے پہلے ایک ماہ کام کیا تھا۔ اب کی دفعہ وہ پانچ ماہ رہے اور ''میلونگ'' کے لئے مضامین، نظمیں وغیرہ لکھتے رہے۔

ہندوستان کے بٹوارے پر بہت سے مقامات پر فرقہ دارانہ فسادات بھڑک اُٹھے

تھے۔ لاہور سے سیالکوٹ ریل گاڑی میں سفر کرتے ہوئے گیشے ایشے تنڈوپ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑتے اور مرتے دیکھے اور ریل کی کھڑکی سے مرنے والوں کی لاشیں دیکھیں۔

سیالکوٹ میں وہ ایک پگڈنڈی سے گذر رہے تھے کہ کسی نے اُن کے سر پر اینٹ دے ماری اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آئے تو اُنہوں نے اپنے کو فوجی افسروں سے گھرا پایا۔ وہ خون سے لہولہان تھے۔ اُن کو ایک گاڑی میں ہسپتال پہنچایا جہاں ایک ہفتہ اُن کا علاج ہوا اور ازاں بعد جموں بھیج دیا۔

وہ سپتیک گنپہ سے وابستہ تھے اور اجتماعی پوجا میں ''بوم زاد'' اُستاد یا نگراں کے فرائض سرنجام دیتے تھے۔ اپنے آبائی گاؤں ستوق میں ''لوبون'' گوروکا منصب سنبھالا تھا۔

بعد میں گیشے ایشے تنڈوپ سپتیک گنپہ میں ہیڈ لاما کوشوق بکولا کی قیادت میں گنپہ کے بڑے لاما بنے۔

اُنہوں نے ۱۹۵۴ء میں وارانسی کی یاترا کی۔ اس سے پہلے متبرک جھیل پدما میں دو روز گذارے۔ کالمپونگ گئے اور اپنے دوست بابوتھرچین کے اخبار کے لئے حسبِ معمول تاریخی مضامین قلمبند کئے اور نظمیں لکھیں۔ ایک تبّتی ڈکشنری تالیف کی۔ تین ماہ بعد وہ لیہہ لوٹے۔

۱۹۵۶ء میں اُنہوں نے کوشُوق بکولا کے ہمراہ ایک مذہبی مشن پر تبت کا سفر کیا۔ پنچن لاما اور پرانے رفقائے کار سے ملاقات کی۔ لہاسہ گئے اور تین بڑے گنپے سیرا، ڈیپُونگ اور غلدن کی یاترا کی۔ پوتالا میں دلائی لاما سے اُپدیش سننے اور پنچن لاما کے اتالیق سے محافظ دیوتا چمسر ین سے متعلق تعلیم حاصل کی۔

غرض گیشے ایشے تنڈوپ نے ساری زِندگی سیکھنے اور سکھانے میں گذاری۔ ۱۹۵۷ء میں لداخ میں اُن کو لداخ بڈھسٹ ایسوسی ایشن کے صدر کا عہدہ پیش کیا۔ بطور صدر اُنہوں نے کئی تعمیری اور دھارمِک کام کئے۔

۶۵ سال کی عمر میں اُنہیں بطور اُستاد ریٹائر ہونا تھا تاہم اُن کے تبحّر علمی اور تجربات کے پیش نظر اُن کی ملازمت میں دوبارہ توسیع کی گئی اور وہ لگ بھگ ستر سال کی عمر تک اِس عہدے پر فائز رہے۔ اُن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے اُن کو قریب سے دیکھا ہے۔

گیشے ایشے تنڈوپ لداخی ''شیرازہ'' کے لئے مختلف موضوعات جیسے فلسفہ، مذہب، تاریخ اور زبان پر مضامین لکھتے تھے۔ اُنہوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ وہ ہندی اور اُردو میں بھی شُد بُد رکھتے تھے۔

زِندگی کے آخری پانچ سال گیشے ایشے تنڈوپ نے جنوبی ہندوستان میں کشی نگر کے نئے گنپے کے لاموں کی درخواست پر گنپہ کے بطورِ پہلے خانپو یا ہیڈ لاما گذارے۔ یہ گنپہ تبت کے ٹشی لھُونبو گنپہ سے وابستہ ہے۔

گیشے ایشے تنڈوپ ۱۹۸۰ء میں ۸۳ سال کی عمر میں کشی نگر، کرناٹک میں بیلی کوٹی کے مقام پر چل بسے۔ اُن کے بھتیجے اور عقیدت مند جگمت دورجے نے مجھے بتایا کہ فوت ہونے سے پہلے وہ ۴۸ گھنٹے تک مراقبہ میں رہے۔

اُن کے صد سالہ جنم دن پر کلچرل اکادمی لیہہ کے اہتمام سے اُن کی زندگی اور کارکردگی پر ایک مجلسِ مناظرہ ہوئی، جس میں سات سکالروں نے اُن پر مقالے پیش کیے جنہیں ''شیرازہ'' لداخی کے ایک خصوصی شمارہ میں تالیف کیا گیا ہے۔

گیشے صاحب بہ حیثیت اِنسان بڑے ہی بھلے مانس، ملنسار، روادار اور حلیم تھے۔ وہ بڑے کم گو اور بلا ضرورت یا بلا فرمائش کسی موضوع پر لب کشائی نہیں کرتے تھے۔

وہ لداخ کی متنازعہ سیاسیات سے ہمیشہ کنارہ کش رہے تھے۔ ٹشی رگیس نے اُن سے متعلق ایک مضمون میں لکھا ہے کہ اُنہوں نے سفر اور حضر دونوں میں اپنا راہبانہ لباس ترک نہیں کیا اور وہ اپنے لباس کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھتے تھے۔

وہ بڑے کفایت شعار تھے۔ اُن کی کفایت شعاری کنجوسی کی حد تک مشہور تھی

لیکن یہ کنجوسی اُنہوں نے اپنی آسائش کے لئے نہیں بلکہ دُوسروں کی بہبود کے لئے اختیار کی۔ جو رقم وہ پس انداز کر سکے، اُنہوں نے وہ گنپوں یا کسی فلاحی تنظیم کو نذر کی۔

میں اپنے مضمون کا اختتام پیٹر ریچارڈس کی طرف سے گیشے ایشے تنڈوپ کے تئیں کہے گئے ذیل کے الفاظ پر ختم کرتا ہوں جنہوں نے گیشے صاحب کی زِندگی اور کام پر مضامین قلم بند کئے ہیں۔

"گیشے تنڈوپ کی ذات ایک عالم بھکشو کی ایک ممتاز مثال سمجھی جانی چاہئے جس نے ایک تہذیب کی بقا کے لئے حتیٰ الوُسع کام کیا جو اپنی تاریخ کے ایک سنگین بحران میں اُلجھ گئی تھی۔"

گیشے ایشے تنڈوپ

مُنشی عبدالستّار

(لداخ کے واحد مجاہدِ آزادی)

لداخ میں اگر کسی نے تحریکِ آزادی میں اعلانیہ حصّہ لیا تو ایک ہی فرد کا نام لیا جاسکتا ہے، یہ ہیں منشی عبدالستّار۔ ناٹا قد، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، منگول شکل وشباہت کے عبدالستّار لیہہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

اِس صدی کے اوائل میں جب لداخ جیسے پسماندہ اور دُور افتادہ علاقے کے لوگوں کے لئے آزادی کا تصوّر ایک رنگین خواب اور اِس کا مفہوم ایک موہوم تخیّل تھا، منشی عبدالستّار ۱۹۲۹ء میں تحریکِ آزادی میں کود پڑے۔ وہ لاہور اور ریاست جموں وکشمیر سے نکلنے والے اخبارات ''انقلاب''، ''زمیندار''، ''صداقت''، ''ہمدرد'' وغیرہ کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے اور گہرا سیاسی شعور اور سماجی بصیرت رکھتے تھے۔ ریاست کی تحریکِ آزادی کے بزرگ رہنما شیخ محمد عبداللہ، چودھری غلام عباس، مولانا محمد سعید مسعودی اور دُوسرے لیڈروں سے بخوبی متعارف تھے۔ اُن کے ساتھ ان کی خط وکتابت تھی۔ کشمیر کے چند تاریخ نویسوں نے مُسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے اجلاس میں لداخی وفد کی شمولیت کا تذکرہ کیا ہے۔ منشی عبدالستّار نے اِن اجلاسوں میں لداخی مندوب کی حیثیت سے لداخ کی نمائندگی کی تھی۔

اُنھوں نے لداخیوں پر مقامی اور غیر مقامی سرکاری ملازمین کے ظلم وستم کے خلاف ڈوگرہ حکومت سے اِحتجاج کیا اور جیل گئے۔

۱۹۷۳ء میں منشی عبدالستّار کو اُن کی قربانیوں کے لئے یومِ جمہوریہ کی تقریب

پر لیہہ میں تامر پتر اعطا کیا گیا۔ اِس صدی کے آغاز میں لداخی حد سے زیادہ دبے ہوئے تھے۔ ایک معمولی چپراسی کو دیکھ کر سارے دیہاتی لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ اِس کے اسباب ۱۸۳۴ء میں وزیر زورآور سنگھ کے حملے سے پیدا شدہ سیاسی اُتھل پُتھل، لڑائیوں اور بغاوتوں میں ملتے ہیں۔ ۱۸۳۴ء سے ۱۸۴۱ء کے درمیان لداخیوں کو بے پناہ جانی اور مالی نقصانات اُٹھانا پڑے۔ الیگزنڈر کننگھم نے اپنی کتاب ''لداخ'' میں لکھا ہے کہ اِن لڑائیوں اور بغاوتوں میں پندرہ ہزار لداخی مارے گئے۔ چودہ ہزار چیچک کے موذی مرض کے شکار ہوئے۔ نو ہزار بودھ اور ایک ہزار لداخی مسلمان گھربار چھوڑ کر تبت، بلتستان وغیرہ بھاگ گئے۔ ظاہر ہے ڈیڑھ لاکھ آبادی کے علاقے کے لئے یہ زبردست جانی نقصان تھا۔ کہتے ہیں تمام ہشیار، حساس اور باہمت افراد لڑائیوں اور بغاوتوں میں کام آئے اور جو بچ گئے اُن کو مرعوب کرنے کے لئے مختلف تادیبی ہتھکنڈے استعمال کئے گئے۔ باغیوں کے سرغنوں کو سخت ایذائیں دے کر تڑپا تڑپا کر لوگوں کے بھرے مجمع کے سامنے مارا گیا۔ لوگوں کی عبرت کے لئے ایک باغی لیڈر کا ہاتھ کاٹ کر ایک گاؤں خلسے میں دریائے سندھ کے پُل کے ناکے پر آویزاں رکھا گیا۔ ایک مرتبہ ایک بلّی یہ ہاتھ اُٹھا کر بھاگ گئی۔ خلسے کے لوگ بڑے ہراساں ہوئے۔ اِتفاق سے گاؤں میں ایک آدمی فوت ہوا تھا۔ گاؤں والوں نے اُس کا ہاتھ کاٹ کر اُس جگہ لٹکا دیا۔

تقریباً ایک صدی تک لداخی پھر اپنا سر نہیں اُٹھا سکے۔ منشی عبدالستار پہلا فرد تھا جس نے پچھلی صدی کے دُوسرے دہے میں ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔

غالباً ۱۹۷۴ء کی بات ہے۔ میں اپنے ایک دوست عبدالقیوم کے ہمراہ اُن کی قیام گاہ پر اُن سے انٹرویو لینے گیا۔ اکتوبر کا مہینہ اور عید کا دن تھا۔ اُجلی اُجلی دُھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن فضا میں خنکی تھی۔ تیرہ ہزار فٹ بلندی پر واقع ہورزے محلّہ سے ۱۹ ہزار فٹ بلند خردونگ پیر کا سنہری دُھوپ میں جگمگاتا ہوا نقرئی گلیشیر بالکل قریب نظر

آرہا تھا۔ یہ وہی تاریخی پیر ہے جہاں سے صدیوں تک وسط ایشیا کے تجارتی کارواں لداخ اور کشمیر آتے جاتے رہے ہیں۔ ایک عجیب پرسکون سناٹا طاری تھا۔ لیکن منشی عبدالستّار اپنے ماحول سے بے نیاز بسترِ علالت پر دراز تھے۔

آپ کو تحریکِ آزادی سے کیسے دلچسپی پیدا ہوئی؟ یہ ہمارا پہلا سوال تھا۔ منشی عبدالستّار کچھ لمحات کے لئے ماضی میں مستغرق ہوئے اور پھر دھیرے دھیرے بولے۔ ''اِس کے کئی محرکات تھے۔ اُن دنوں لداخ میں سرکاری ملازم لوگوں پر بہت ظلم ڈھاتے تھے۔ رشوت ستانی کا بازار گرم تھا۔ لداخیوں کے لئے ملازمت کا دروازہ بند تھا۔ غیر مقامی ملازم اپنے ساتھ لداخ نوکر تک لاتے تھے اور اُن کو روزگار فراہم کرتے تھے۔ لیکن لداخی چپراسی کے کام پر بھی نہیں لگتے تھے۔ اُن دِنوں میں اخبار ''صداقت'' وغیرہ کا مطالعہ کرتا تھا۔ اخبارات کے مطالعے سے میرے دِل میں یہ احساس جاگا کہ مجھے بھی لداخیوں کے لئے کچھ کام کرنا چاہیئے......''

اپنا سلسلہء کلام جاری رکھتے ہوئے اُنہوں نے کہا۔ ''.........میں تبت بقال خواجہ احمد اللہ شہداد سے متاثر ہوا۔ موصوف بغرضِ تجارت لیہہ آتے تھے اور کشمیر کی تحریکِ آزادی میں دلچسپی رکھتے تھے۔''

اپنی سیاسی سرگرمیوں کا ذِکر کرتے ہوئے منشی عبدالستّار نے کہا ''.....لاہور سے نکلنے والے اخبارات ''انقلاب'' اور ''زمیندار'' میں لداخیوں پر ہونے والے مظالم کی خبریں چھپتی تھیں۔ کئی لداخی بودھ اِن خبروں کو لیہہ میں مشتہر کرتے اور مظلوم اور محکوم لداخیوں کو ایک ذہنی سکون اور رُوحانی آسودگی ملتی۔ تحریکِ آزادی میں لیہہ کے امام سیّد محمد سعید اور چودھری غلام محمد بھی پس پردہ شریک کار تھے۔ سرینگر جانے والے لداخیوں کے ذریعے ہم لداخیوں کے مصائب اور مسائل کی روئداد سرینگر مجاہد منزل بھیجتے۔ جہاں سے یہ لاہور بھیجے جاتے۔ ''زمیندار'' اور ''انقلاب'' کے پرچے خفیہ طور لیہہ میں ایک کشمیری ڈاکٹر حبیب اللہ کو آتے تھے۔ بعد میں اِسی بنا پر ڈاکٹر حبیب اللہ

لیہہ سے تبدیل کیئے گئے۔''

منشی عبدالستّار نے کہا'' ....ہم لداخیوں کے مطالبات وقتاً فوقتاً لیہہ سے بذریعہ تار ڈوگرہ سرکار کے سامنے رکھتے اور ایک قائد کی حیثیت سے شیخ محمد عبداللہ کی حمایت کرتے تھے۔تار وغیرہ کے اخراجات مجھے برداشت کرنا پڑتے تھے.....''

پچھتر سالہ مجاہدِ آزادی کی آنکھوں میں اچانک ایک چمک آئی۔''......اُن دِنوں میں جوان تھا۔کام کرنے کی اُمنگ تھی۔ بلند حوصلہ تھا' ولولہ تھا۔ میں نے ظالم کے خلاف ببانگِ دہل احتجاج کیا اور اِس کی پاداش میں مجھے سرِ بازار ہتھکڑی پہنائی گئی۔ یہ جنوری ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے۔ اُن دِنوں لداخ کا وزیر پنڈت نرنجن ناتھ تھا۔ مجھے لیہہ سے اسکردو جیل خانہ بھیجا گیا.........''

اپنی گرفتاری پر لداخیوں کے ردِّعمل کا ذِکر کرتے ہوئے منشی عبدالستّار نے کہا۔ ''متعدد بودھوں نے مجھ سے برملا ہمدردی کا اِظہار کیا۔وہ میرے لئے قربانیاں دینے کے لئے تیار تھے۔لیہہ کے نمگیل تھوسپا اور چھیتن ٹونکسپون میرے ساتھ اسکردو جانے کے متمنی تھے۔''

ہمارے اِستفسار پر لداخی بودھوں کی غیر معمولی حمایت اور اُن کی گہری ہمدردی کی وضاحت کرتے ہوئے منشی عبدالستار نے کہا۔''شخصی حکومت میں لداخ میں کسان ہی ظلم وستم کا تختہ مشق بنتے تھے۔ عام لداخی بودھ کھیتی باڑی کرتے تھے۔لداخ میں ریس اور بیگار کا قبیح نظام رائج تھا اور کسانوں سے بڑی سختی سے یہ کام لیا جاتا تھا۔''

سٹیٹ آرکائیوز کی ایک فائل میں منشی عبدالستار کی سرگرمیوں کا کچھ تذکرہ ہے۔لیہہ کے منتظمِ اعلیٰ (وزیرِ وزارت) نے ۲۶رفروری ۱۹۳۲ء کو ڈوگرہ مہاراجہ ہری سنگھ کے وزیراعظم کے نام ایک تار بھیجا۔ جس میں منشی عبدالستار پر بودھوں کو اشتعال دینے اور پھوٹ ڈالنے اور انہیں شیخ محمد عبداللہ کو اپنا نمائندہ قرار دینے کی سازش کرنے کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ لیہہ میں خفیہ میٹنگیں کی جاتی ہیں جن

میں کئی سرکاری ملازم حصّہ لیتے ہیں۔ وزیر نے صورتِ حال سے فوری طور نپٹنے کے لئے لیہہ، کرگل اور سکردو میں خصوصی طور ٹیلی فون رابطہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ حتیٰ کہ وائرلیس سٹیشن قائم کرنے کا ایک منصوبہ بھی بنایا گیا تھا جو فنڈ کی کمی کی وجہ سے ناقابلِ عمل سمجھا گیا۔

وزیرِاعظم نے یہ اطلاعات مہاراجہ کی نوٹس میں لائیں۔ اِس طرح فرانیٹر لداخ میں ٹیلی فون لانے کے محرک منشی عبدالستّار تھے۔

''آپ کو جیل میں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں پہنچائی گئی؟'' میں نے منشی عبدالستّار سے پوچھا۔ وہ اُونچا سنتے تھے اور ہمیں کبھی کبھی اپنا سوال دوہرانا پڑتا تھا۔

منشی عبدالستّار ماضی کی پہنائیوں میں کھو گئے اور اپنے حافظہ کو کریدتے ہوئے اُنہوں نے کہا۔

''شروع شروع میں وہ مجھے جسمانی اذیت دینے کے درپے تھے لیکن اسکردو کے بلتی میرے آڑے آئے۔ وہاں لوگوں میں سیاسی بیداری زیادہ تھی۔ اُنہوں نے ''زندہ باد'' کے نعروں سے میرا خیر مقدم کیا۔ کرگل میں لوگوں کا ردّعمل زیادہ شدید تھا۔ اگر میں نے روکا نہ ہوتا تو وہاں لوگ تشدّد پر اُتر آتے۔''

اپنی قید و بند کا ذِکر کرتے ہوئے منشی عبدالستّار نے کہا۔ ''........ میرے خطوط سنسر ہوتے تھے۔ لیکن اسکردو میں میرے ہمدردوں اور تحریکِ آزادی کے شیدائیوں نے چوری چھپے خط و کتابت کا اہتمام کیا۔ اُن دِنوں خواجہ احمد اللہ شہداد کی معرفت شیخ صاحب اور پارٹی کے دُوسرے کارکنوں کے حوصلہ افزا بیانات ملتے رہے۔''

وہ جولائی ۱۹۳۲ء میں رہا ہوئے۔

تحریکِ آزادی کے بوڑھے سپاہی کے ذہن میں کئی تلخ یادیں محفوظ تھیں۔

''تحریک میں حصّہ میں لینے کی وجہ سے میری خانگی زِندگی تلخ بن گئی تھی۔ گھر میں روزانہ جھگڑا ہوتا تھا۔ میں ملازمت کر نہیں سکتا تھا۔ میرے ماموں کہتے تھے کہ یہ

آدمی سب کو تباہ کرے گا۔ چنانچہ مجھے گھر سے نکال دیا.........''

اُن کے لہجے میں کرب تھا اور چشمے کے دبیز شیشوں کی آڑ میں سے اُن کی آنکھوں کی اُداس پرچھائیں دیکھی جاسکتی تھیں۔

''..........گھر میں تحریکِ آزادی سے متعلق جتنے کاغذات تھے۔ وہ سب نذر آتش کئے گئے۔ اُن میں شیخ صاحب اور مولانا مسعودی کے خطوط بھی تھے۔ ''کشمیر چھوڑو'' تحریک سے کچھ مدّت قبل جب میں سرینگر گیا تو مولانا نے مجھے سرینگر میں مستقل طور بسنے کے لئے کہا۔ لیکن گھریلو حالات کی وجہ سے میں یہ دعوت قبول نہ کرسکا..........''

ملک کی آزادی کے بعد منشی عبدالستّار تئیس چوبیس سال تک لیہہ میں نیشنل کانفرنس تنظیم سے وابستہ رہے۔ وہ لیہہ سے ایم۔ایل سی کے لئے بھی نامزد ہوئے لیکن یہ عہدہ سنبھال نہ سکے۔

منشی عبدالستّار کا مطالعہ وسیع ہے۔ اُنہوں نے اُردو میں ناول سے لے کر مختلف موضوعات پر اَن گنت کتب کا مطالعہ کیا ہے۔ لیہہ میں ایک اچھے اُردو دان' خوش نویس اور عرائض نویس کی حیثیت سے اُنہوں نے اُردو میں لداخ کی تاریخ لکھی لیکن یہاں بھی حقیقت بیانی سے نقصان پہنچا اور حکومت نے اِس کتاب کو ممنوع قرار دیا۔

وہ لداخ کی اُن گنے چُنے مسلمانوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ذوق وشوق سے بودھی سیکھی اور انگریزی میں شُد بُد حاصل کی۔

منشی عبدالستّار کی زندگی بالکل سپاٹ' بے کیف اور بے رنگ بھی تو نہیں۔ اُن کے دماغ میں عشق کا سودا سوار تھا اور اُن کی جوانی رنگین اور لذّت آشنا تھی۔

ہماری ملاقات کے وقت منشی عبدالستّار ایک چراغِ سحری کی طرح لگتے تھے۔ تاہم اِس کے بعد وہ کئی سال حیات رہے اور ۶/جون ۱۹۷۹ء کو خدا کو پیارے ہوئے۔ چراغ ازل سے جلتے اور بجھتے آرہے ہیں لیکن کوئی چراغ جب گُل ہوجاتا ہے تو دِل میں گہری ٹیس اُٹھتی ہے۔

ایلی ایزرجولدن

جب اُردو کے نامور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کا اِنتقال ہوا تو کرشن چندر نے آل اِنڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ایک تعزیتی بات چیت میں کہا تھا۔

''منٹو کی موت پر آج جھنڈا سرنگوں نہیں ہوگا۔ کوئی ماتم یا سوگ نہیں ہوگا' کیونکہ وہ کوئی منسٹر نہیں.............. منٹو ایک غریب ادیب ہے' تانگہ بانوں' نائیوں' دھوبیوں کا.........''

۲۱/جولائی ۲۰۰۱ء کو جب ایلی ایزرجولدن ۸۶ سال کی لمبی عمر میں خدا کو پیارے ہوئے تو مجھے کرشن چندر کے الفاظ یاد آئے۔ وہ کوئی معروف شخصیت نہیں تھا' جس کا ذِکر ریڈیو اور ٹی وی پر ہوتا رہتا ہے۔ وہ تاریخ کا کوئی فاتح جرنیل نہیں تھا' جس کا ذکر کتابوں میں ہوتا ہے۔ وہ کوئی بڑا سیاستدان بھی نہیں تھا جس نے ساری زندگی جلیل القدر منصبوں پر گزاری ہوتی ہے۔ وہ ایک اُستاد تھے۔ ہم سب کے اُستاد تھے' جس نے ایک پوری نسل کو متاثر کیا تھا۔

اُن کی وفات پر لیہہ ہائی سکول کے اولڈ بوائز یا ایلی ایزرجولدن کے شاگرد ایک تعزیتی میٹنگ کے لئے جمع ہوئے اور ایک قرارداد پاس کی۔ سابق مرکزی وزیر اور ممبر پارلیمنٹ پی نمگیل نے کہا کہ قرارداد میں لیہہ کے نئے ڈِگری کالج کو سورگیہ کے نام پر رکھنے کے لئے تجویز پیش کی جائے۔ چنانچہ ریاستی سرکار کو اِس ضمن میں ایک یادداشت پیش کی گئی اور تین سال بعد اس درخواست پر شنوائی ہوئی اور ایلی ایزرجولدن کے شاگردوں کی ایک دیرینہ تمنا پوری ہوئی ہے۔

لیہہ کے مسیحی قبرستان میں تدفین کے دُوسرے یا تیسرے روز ایک ماتمی اجلاس ہوا جس میں قصبے کے سرکردہ لوگوں نے شرکت کی۔ ایک مقرّر نے کہا۔"ہم میں اختلافات ہوسکتے ہیں' سیاسی اختلافات' نظریاتی اختلافات لیکن جب ایلی ایز رجولدن کی ذات آتی ہے تو ہم سب کی ایک آواز ہوتی ہے۔"

معروف انگریزی ادیب خوشونت سنگھ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ وہ کن شخصیتوں سے متاثر ہیں تو اُنہوں نے دو ناموں کے علاوہ اپنے بچپن کے اُردو کے اُستاد شفیع الدین نیّر کا نام لیا' جن کی دیانت داری اور راست بازی سے وہ بڑے متاثر تھے۔

ایلی ایز رجولدن بھی ہمارے لئے ایک ایسی ہی شخصیت تھے۔ ۱۹۴۰ء میں جب وہ گریجویشن کے بعد لاہور یونیورسٹی سے بی. ایڈ کر کے لیہہ لوٹے تو اُن کی والدہ سمیت عزیزوں اور دوستوں کی خواہش تھی کہ وہ تحصیل دار بنے۔ اُن کی سیدھی سادی والدہ نے اپنے افسر بھائی اور اُس کے اختیارات اور شان وشوکت دیکھی تھی۔

شخصی حکومت کا زمانہ تھا۔ لیہہ میں ایک تحصیل دار کا بڑا رعب اور دبدبہ ہوتا تھا۔ جب وہ بازار سے گذرتا تو آگے آگے ایک چپراسی قمچی جھلاتا اور راستہ نکالتا ہوا گذرتا تھا۔ (کبھی کبھی راستے میں آنے والے ایک دو آدمیوں کو قمچی سے ایک آدھ مارتا بھی تھا۔) لوگ دورویہ کھڑے ہوکر تحصیل دار کو کورنش بجالاتے تھے۔ کسی کی کیا مجال کہ تحصیلدار کی راہ میں کھڑا ہو جائے۔ لوگ تو تحصیلدار سے بڑے مرعوب تھے۔ اُن دِنوں وزیر (ناظم اعلیٰ) اور تحصیلدار کی پانچویں اُنگلیاں گھی میں ہوتی تھیں۔ دیوانی' فوجداری' اِنتظامی اور مالی اختیارات اُن کے ہاتھ میں تھے۔

لیکن ایلی ایز رجولدن نے اپنے سبھی خیر خواہوں کو مایوس کیا اور لیہہ کے مڈل سکول میں بطورِ سیکنڈ ماسٹر جوائن کیا۔ اُنہوں نے اس سکول میں اُستاد بن کر لداخ کی خدمت کرنے کا تہیہ کیا تھا۔ وہ اِسی سکول کی پیداوار تھے۔

ایلی ایز رجولدن کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ لداخ کو اچھے اور بے لوث اُستادوں کی ضرورت ہے۔ ایک اچھا اُستاد ہی ذمہ دار اور فرض شناس شہری پیدا کر سکتا ہے اور اسی میں لداخ کی ترقی کا راز چھپا ہے۔

ایلی ایز رجولدن جب حیات تھے تو اُن کے پرانے شاگردوں اور لائنز کلب لیہہ کے اراکین نے اُن کے اعزاز میں منعقدہ ایک عشائیہ میں اُنہیں ایک MEMENTO (ایک قابلِ یادگار نشانی) پیش کی، جس پر لکھا تھا:

''جناب ایلی ایز رجولدن کی خدمت میں گہری محبت اور احترام کے ساتھ سابق طلبا اور لائنز کلب انٹرنیشنل کے ممبران کی طرف سے، جن میں زیادہ تر کو جناب کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ MEMENTO آپ کی ساری زندگی بطورِ اُستاد لداخ کے لوگوں کے تئیں خدمات، بے مثال دیانت داری، خلوص، جذبہ اور بے لوث کام کے لئے پیش خدمت ہے۔''

اُن کے شاگردوں میں، ڈاکٹر، انجینئر، فوجی افسر، آئی. اے. ایس، آئی. پی. ایس افسران، تاجر، رضا کار، وزیر، سیاسی لیڈر، غرض سماج کے ہر طبقہ کے لوگ موجود تھے۔

ایلی ایز رجولدن نے لگ بھگ ۲۵ سال لیہہ ہائی سکول، ۵ سال کرگل ہائی سکول اور ٹیچرز ٹریننگ سکول لیہہ میں بطور ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل کام کیا۔ ریاست جموں و کشمیر کی سرکار نے ایک لائق ترین معلّم کی حیثیت سے اُن کو سند عطا کی۔

بطورِ اُستاد وہ ہمارے ساتھ والی بال اور فٹ بال کھیلتے تھے، دریا اور تالاب میں تیرا کی کرتے تھے اور ناچتے تھے۔ (لداخی لوک ناچ کے وہ اچھے رقاص تھے۔) وہ بچوں میں بچّہ بن جاتے تھے۔

وہ سرینگر کے ٹنڈل بسکو سکول میں دو سال طالب علم رہے تھے۔ کھیل کود، کشتی رانی، کوہ پیمائی، کمپنگ، ٹریکینگ وغیرہ اُنہوں نے بسکو سکول میں سیکھے تھے۔

اپنی سرگرمیوں میں وہ اپنی تینوں بیٹیوں کو بھی شریک کرتے تھے۔ جب وہ

دورانِ تعلیم تعطیلات پر لیہہ آتیں تو اُن کو کیمپنگ کے لئے مختلف گاؤں لے جاتے تاکہ دیہی ماحول کی زندگی سے آشنا ہوں۔ لیہہ آڈیٹوریم میں منعقد کئے جانے والے تمدّنی پروگراموں، یومِ آزادی اور یومِ جمہوریہ کی تقریبات دکھانے کے لئے لے جاتے تھے تاکہ لداخ کی ثقافت اور اِس کے رنگارنگ ناچ گانوں سے لطف اندوز ہوں۔ کبھی وہ اِنہیں اپنے رشتہ داروں کے پاس لے جاتے تھے۔ جو گاؤں میں رہتے تھے۔

اُنہیں کوئی کتاب پسند آجاتی تو طلباء کو اپنی پسند میں شریک کرتے تھے۔ سکول میں لڑکوں کو ایک جگہ جمع کرتے اور کتاب کی تلخیص یا دِلچسپ اِقتباسات سناتے تھے۔ سر کینن ڈائل کے ناولوں کے مشہور کردار شرلوک ہومز کے نام اور کارنامے پہلے پہل میں نے ایلی ایز رجولدن سے سُنے تھے۔

اُن کی صاحبزادی پروفیسر تدزین آنگموں نے مجھے بتایا کہ ایک رات دیر گئے اُن کے والد ریڈیو لے کر اُنہیں نیند سے جگانے آئے۔ جب نیل آرم سٹرونگ اپنے ساتھی خلاباز کے ساتھ ایک خلائی شٹل میں چاند پر اُترنے والا تھا۔ ریڈیو اِس کا آنکھوں دیکھا حال بتا رہا تھا۔ دونوں پو پھٹنے تک اس تاریخی واقعہ کو سنتے رہے۔

میں اُن دِنوں مرکزی محکمہ فیلڈ پبلسٹی میں ملازم تھا۔ کچھ عرصہ بعد دہلی سے ہمیں اِس فلم کا چھوٹا سا شاٹ آیا جس میں دونوں خلابازوں کو چاند پر اُترنے اور چلنے کا منظر پیش کیا گیا تھا۔ ہم لیہہ بازار میں دستاویزی فلمیں دِکھاتے تھے۔ اِس شاٹ کو دِکھانے سے پہلے ہم نے اِس کی تشہیر کی۔ اُس شام اندھیرے میں، مَیں نے لوگوں کی بھیڑ میں ایلی ایز رجولدن کو دیکھا جو یہ فلم دیکھنے آئے تھے۔

وہ ہر طالب علم کے رُجحان کا مطالعہ کرتے تھے۔ جس طالب علم میں کوئی صلاحیت ہو، اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ کوئی پڑھائی میں اچھا تھا۔ کوئی ڈیبیٹ میں ماہر تھا۔ کوئی کھیل کود میں جوہر دکھاتا تھا اور کوئی سٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تھا۔

جولدن کی نظر سے یہ صفات چھپی نہیں رہتی تھیں۔ وہ ہر ایک کو موقع دیتے تھے کہ وہ اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرے تاکہ دُوسرے طلباء کو اِس سے تحریک ملے۔

شہر میں کوئی فن کار یا اہل کار ہوتا یا آتا تو وہ طلباء سے اس کا تعارف کراتے تھے تاکہ اس کے فن سے طلباء فیض یاب ہوں۔

یقیناً وہ ایک ماہرِ تعلیم تھے۔

سرمائی تعطیلات میں وہ میٹرک میں زیرِ تعلیم طلبا کو اپنے گھر پر نہ صرف مفت پڑھاتے تھے بلکہ انہیں کھلاتے پلاتے تھے اور گرمی کے لئے بُخاری کا انتظام کرتے تھے۔

اُن کو تاریخ اور جغرافیہ سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور بڑے پُر لطف انداز میں تاریخی واقعات بیان کرتے تھے جسے سبھی طلباء بڑی دِلچسپی سے سنتے تھے اور یاد بھی رہتے تھے۔ تدزین نے مجھے بتایا کہ تاریخ اور جغرافیہ اُنہوں نے اپنے والد سے سیکھے تھے اور اِن مضامین سے متعلق اُن کی بتائی ہوئی باتیں آج بھی اُن کے ذہن میں تازہ ہیں۔

ایک دفعہ وہ ہمیں لیہہ کے ژیموگنپہ میں اُس تاریخی دیواری تصویر کو دِکھانے کے لئے لے گئے جس میں گیالپوٹشی نمگیل کے دربار کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ جب راجہ اور پرجا دونوں پگڑی باندھتے تھے اور داڑھی رکھتے تھے۔ گنپہ کے ہال میں اندھیرا تھا۔ جولدن نے سولہویں صدی کی اُس تاریخی مصوّری کو دیکھنے کے لئے پٹرومیکس کا اِنتظام کیا تھا۔

مجھے یاد آرہا ہے، ایک دفعہ اُنہوں نے لیہہ محل کی چھت پر سے اُس گیت کو سنایا اور ایک گویّے کو گانے دیا، جو ایک وزیر کی بیٹی نے اپنی رعایا کے ایک عام نوجوان کی محبت میں گایا تھا، جو اُس کے دیدار کے لئے محل کے نیچے رہتا تھا۔ تب ہماری آنکھوں کے سامنے وہ سماں پیدا ہوا تھا جب برسوں پہلے یہ گیت گایا گیا تھا۔

اُن کی بیٹیاں جن دنوں لداخ سے باہر زیرِ تعلیم تھیں تو وہ اُن کو لمبے خطوط لکھا کرتے تھے۔ کوئی کوئی خط دس صفحات سے بھی تجاوز کرتا تھا۔ اُن کے خطوط میں گھریلو

باتیں اور لداخ سے متعلق دلچسپ خبریں ہوتی تھیں۔ اُن کی تینوں بیٹیاں ایلزا آنگموں، مارتھا اوت زلیس اور پروفسر تدزین آنگموں ملازمت کرتی ہیں۔

ایلی ایز رجولدن کی دُور بین نگاہ تاڑ لیتی تھی کہ کون سا طالب علم آگے جا کر ایک اچھا معلّم ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ اُن کو ہدایت دیتے تھے کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد اُستاد بنیں لیکن ہم جیسے اکثر لڑکوں کے لئے معلّمی کے پیشے میں کشش نہیں تھی۔ کہنے کو تو سب کہتے تھے کہ اُستاد قوم کا معمار ہے۔ اُستاد کا پیشہ مقدس ہے لیکن سماج میں اُستاد کی قدر نہیں تھی۔ روزگار کے دُوسرے اچھے وسائل تھے لیکن ایلی ایز رجولدن اِن باتوں سے بالاتر اپنے فرائض میں مگن رہتے تھے۔ اُنہیں نہ ستائش کی تمنا تھی اور نہ صلہ کی پروا۔

ایلی ایز رجولدن کو ترقی دے کر ضلع کا تعلیمی افسر بنایا گیا لیکن اُنہوں نے یہ ترقی اِس لئے قبول نہیں کی کہ اُن کی دانست میں اُن کی صحت اُن کے فرائض کی راہ میں مانع ہوگی اور وہ اپنے کام سے اِنصاف نہیں کرسکیں گے۔ بہت سارے سکول ایسے گاؤں میں تھے جن کا اُن دِنوں سڑکوں سے رابطہ قائم نہیں ہوا تھا اور کہیں پیدل سفر کرنے کی ضرورت تھی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ محکمہ تعلیم میں سیاسی مداخلت ہوتی تھی۔

ہمارے معاشرہ میں جب ترقی کا سوال پیدا ہوتا ہے تو بھائی بھائی کا دُشمن ہوجاتا ہے۔ نت نئی سازشیں ہوتی ہیں۔ جعلی سرٹیفکیٹ لائے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ ایسے منصب پر کام کرنے کے لئے آمادہ بلکہ بے تاب نظر آتے ہیں جن کے لئے وہ بالکل اہل نہیں ہوتے۔

ایلی ایز رجولدن مختلف خمیر کا بنا ہوا تھا۔ اس معاملے میں بھی اُن کا ایثار ان کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ اُنہوں نے اپنے اصولوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اُن کو اُن استادوں سے بھڑتے دیکھا جو اپنی کلاس میں نہیں ہوتے تھے یا اِمتحان میں کسی لڑکے کو سوالوں کا جواب بتاتے تھے۔

تعلیم اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اُنہوں نے اپنی ساری زندگی لداخ میں تعلیم

کے فروغ کے لئے وقف کی۔ ۱۹۵۴ء میں اُنہوں نے اپنی ڈائیری میں لداخ میں تعلیم سے متعلق اپنے نظریات اور تاثرات قلمبند کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہمارا نظامِ تعلیم کتابی اور نظریاتی تعلیم پر بہت زور دیتا ہے اور علمی پہلو کو تقریباً نظرانداز کیا جاتا ہے۔ نئے سکول کھولنے کے ساتھ' اُن سکولوں کی ضروریات کا پورا خیال رکھا جانا چاہئے' جو پہلے سے موجود ہیں۔''

اُنہوں نے اِس بات پر دُکھ کا اِظہار کیا ہے کہ برسوں سے قائم متعدد سکولوں نے ایک بھی طالب علم آگے پڑھنے کے لئے لیہہ ہائی سکول میں نہیں بھیجا۔ (اُن دِنوں صرف لیہہ میں ہائی سکول تھا۔) اِس کا سبب یہ ہے کہ یہ سکول ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہے ہیں۔ یا تو متعلقہ اُستاد نا قابل ہیں یا وہ اپنے فرائض سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔

ایلی ایز رجولدن نے اچھے اُستاد کے اِنتخاب کو بڑی اہمیت دی ہے اور ایک سکول کی بربادی کی وجہ ایک غیر ذمہ دار اُستاد کو ٹھہرایا ہے۔ اُنہوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ نئی پود کو ایک نالائق' لاپرواہ اور کم پڑھا لکھا اُستاد کو حوالہ کرنے سے بہتر ہے کہ گاؤں میں سکول کھولنے کے عمل کو سالوں اِلتوا میں ڈالا جائے۔ جب ایسے لااُبالی اشخاص ایک دفعہ تعلیمی میدان میں آجاتے ہیں تو کم سے کم اِس سے ۲۵ سال تک گلو خلاصی پانا مشکل ہے۔ اُن کے نزدیک بُرے اِنسان کو تعلیم کے مقدس پیشے میں لانا جرم سے کم نہیں تھا۔

اُنہوں نے ڈائری میں لکھا ہے کہ گاؤں والوں کی لاپروائی اور کوتاہی سے ایک اُستاد ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہے اور اس قبیل کے بے ضمیر اساتذہ دِنوں سکول سے غائب رہتے ہیں۔ اِنہی اسباب سے امتحانات کے نتائج خراب ہوتے ہیں۔ اُن کے سدّ باب کے لئے اُنہوں نے Accountability (محاسبہ) کی ضرورت پر زور دیا ہے اور یہ تجویز دی ہے کہ بالائی پرائمری جماعت میں معینہ تعداد کے طلباء پاس نہ ہوں تو

اس مضمون کو پڑھانے والے اُستاد کی سالانہ ترقی روک دی جائے اور سکول سے غیر حاضر رہنے والے اساتذہ کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔

اِس کے ساتھ گاؤں کے لوگوں میں شعور اور بیداری پیدا کی جائے تا کہ وہ اُستاد کو باقاعدگی اور پابندی سے سکولوں میں حاضر ہونے کے لئے اپنا کردار ادا کریں۔

اِس ضمن میں اُنہوں نے پنچایت کے رول کو بھی اُبھارا ہے۔

ایلی ایز رجولدن ایک رواداد انسان تھے اور کہتے تھے کہ ہماری تہذیبی رنگارنگی اور کثرت میں وحدت والی اس سوسائٹی میں ایک دُوسرے کے نظریات، عقائد اور اس کے پس منظر کو سمجھنے اور رواداری کی بڑی ضرورت ہے۔

وہ سادہ انسان تھے۔ لداخی ثقافت سے اُن کو گہرا لگاؤ تھا۔ میں نے زندگی میں اُن کو ہمیشہ لداخی لباس میں دیکھا۔

ایلی ایز رجولدن ایک خلوت پسند اِنسان تھے۔ اُن کو ہمیشہ اپنے کام سے کام تھا۔ سیاست اور ہنگاموں سے ہمیشہ دور رہتے تھے۔ اُن کا ایک محبوب مشغلہ کتابوں کا مطالعہ تھا۔ اُنہوں نے Harvest Festival of Buddhist Dards of Ladakh and other Essays کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے جو کئی مضامین پر مشتمل ہے۔ جو اُن کے مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہیں۔ ان میں قلم رسول کی چین اور تبت میں مہم جوئی کی روئداد بھی ہے جسے سننے کے لئے اُنہوں نے اور شائقین دوستوں نے قلم رسول کو دو مرتبہ کھانے پر مدعو کیا تھا۔

ایلی ایز رجولدن اور اُن کے والد ہر پندرھواڑے کو یا ہر مہینہ داستان گوئی کی محفلیں جماتے تھے اور داستان گو کو مدعو کرتے تھے۔ خاص طور پر اُنہیں گیالم کیسر کی طویل داستان بڑی پسند تھی۔

کتاب میں لداخ کے ساتھ وسط ایشیاء کی تجارت پر ایک معلوماتی مضمون ہے جو جولدن صاحب کے ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہے۔ اُن کے والد جو ناتھن تھر چین تجارتی

امور کے افسر رہے تھے۔ یہ عہدہ اقسقال کہلاتا تھا۔ اقسقال ترکی لفظ ہے اور اس کا مطلب سفید ریش والا یا بزرگ ہے۔

جولدن نے بچپن میں، اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد لداخ میں ۱۹۴۸ء تک سنٹرل ایشیاء کے کارواں اور تجارتی سرگرمیاں دیکھی تھیں۔

لداخ پر لکھی گئی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے Paul.B.Heaze نے تجارت پر مذکورہ مضمون کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ کتاب لداخ کی تجارت پر ایک اہم تصنیف ہے۔

ایلی ایزر جولدن کا جنم ۲۵ / اگست ۱۹۱۶ء کو لیہہ میں ہوا۔ اُن کا پردادا لیہہ کے پاس ستوق گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اُن کے بیٹے سموئل جولدن نے لیہہ میں ڈاک بابو کا کام کیا تھا۔ اِسی نسبت سے اُن کا خاندان لداخ میں 'بابو جولدن' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اُن کی اہلیہ گُونگا آنگموں اُن کے انتقال کے چند ماہ بعد فوت ہوئیں۔

ایک فرض شناس تعلیمی افسر، غیر متنازعہ، با اصول اور بھلے مانس انسان کے ناطے ایلی ایزر جولدن کا لداخی سماج میں سبھی لوگ بلا تمیز مذہب وملّت احترام کرتے تھے۔ لداخ کے اُستادوں کے لئے یقیناً وہ ایک رول ماڈل (نمونہ) ہیں۔
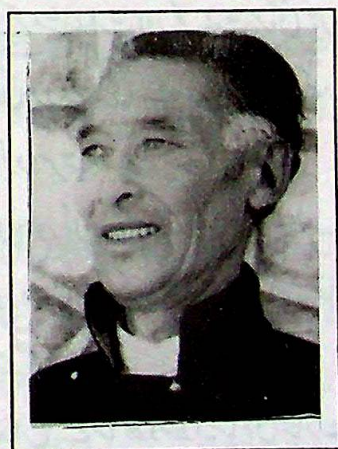
ایلی ایزر جولدن

کاچو سکندر خان

ہندوستان آزاد ہونے میں شاید سال پونا سال باقی تھا۔ لیہہ کے لوئر ہائی سکول میں کرگل سے ایک وجیہہ نوجوان اُستاد آیا۔ ہم چوتھی یا پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ٹھیک طرح سے یاد نہیں آرہا ہے۔ نئے اُستاد نے ہمیں اُردو پڑھائی۔ اُردو ہم نے دُوسرے اُستادوں سے پڑھی تھی لیکن اس اُستاد کے پڑھانے کا انداز بالکل منفرد اور جداگانہ تھا۔ کتاب 'حمد' سے شروع ہوتی تھی۔ اُنھوں نے حمد پڑھائی اور بڑے وجدانہ انداز میں پڑھائی۔ کسی کسی مصرعے کو وہ ترنّم یا نیم ترنّم میں پڑھتے تھے۔ اُن کی آواز دِلکش اور لب ولہجہ دِل نشیں تھا۔ پڑھتے اور مفہوم سمجھاتے ہوئے وہ والہانہ طور اپنے بازو کو لہراتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ہر شعر اُن کی رگ رگ میں سما گیا ہے اور وہ ہمیں بھی ایک سیلِ رواں میں بہالے جارہے ہیں۔

یہ اُستاد کاچو سکندر خان تھے۔ تب ہم نہیں جانتے تھے کہ اُن کے اندر ایک شاعر چھپا ہوا ہے۔ بعد میں اُنہوں نے خود بھی حمد اور نعتیں لکھی ہیں۔ تب ہم کسی اُستاد کے بغیر اشعار کے معانی سمجھنے کے قابل ہوئے تھے۔ اُن کی لکھی ایک حمد کے چند اشعار۔

مالک تیری حمد و ثنا کا کس کو ہے یارا
ساری خلقت پر ہے داتا تیری رحمت کا سایا
ہر سانس تیری رحمت سے ہے ہر نفس تیرا اپنا
تیری قدرت سے قائم ہے سب عالم' یہ ارض وسما

کاچو صاحب نے اپنا تخلص سکندر رکھا تھا۔

اُنہی دِنوں لیہہ میں شجر کاری کو فروغ دینے کے لئے ''انصافِ درختاں'' کا دِن منایا گیا۔ ایلی ایز رجولدن ہیڈ ماسٹر تھے۔ اُن کی ہدایت پر لڑکوں کی ایک ٹولی نے جلسہ گاہ میں ایک نظم پڑھی۔ جسے بہت پسند کی گئی۔ ہمیں مدّت کے بعد معلوم ہوا کہ یہ نظم کاچو سکندر خان نے لکھی تھی۔ کاچو صاحب نے اپنی یادداشت کے سہارے اِس نظم کے چند اشعار قلم بند کئے ہیں۔

تمنا ہے ہری کی ہم، بجائیں چین کی بنسی
پھلے پھولے چمن ہر سوٗ گوشے گوشے میں خیاباں ہوں
جہاں خارِ مغیلاں وہاں گلزار و بُستاں ہوں
سکندر کی دُعا ہے وہ وطن کے حق میں نیساں ہوں

تب اکبر لداخی نے کاچو صاحب سے کہا تھا۔ ''کاچو صاحب! آپ جب مجبور ہو کر ایسی اچھی نظم لکھ سکتے ہیں تو متاثر ہو کر اِس سے بھی اچھی نظمیں لکھ سکتے ہیں۔''

سرمائی تعطیلات میں کاچو سکندر خان اپنے آبائی گاؤں یوقما کھربو چلے گئے۔ ملک کے بٹوارے کے بعد حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ کرگل اور لیہہ ایک دُوسرے سے منقطع ہو گئے اور کاچو صاحب چاہتے ہوئے بھی لیہہ نہیں لوٹ سکے۔ اس کے بعد ہم نے اُن کو لمبی مدّت تک نہیں دیکھا اور جب دیکھا تو اُنہوں نے معلّمی کا پیشہ چھوڑ دیا تھا۔

تب سے تقریباً چھ دہائیاں گزری ہیں، نظم پڑھاتے ہوئے اُن کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ اور بازوؤں کی حرکات و ساکنات آج بھی آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔

اِس کے بعد اُن سے کبھی ملاقات ہو جاتی تھی لیکن سلام و آداب اور علیک سلیک سے زیادہ بات آگے نہیں ہوتی تھی۔ وہ نائب تحصیلدار، تحصیلدار اور بعد میں اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ لیہہ اور کرگل ضلعوں کے علاوہ اُنہوں نے وادیٔ کشمیر میں بھی کام کیا۔ چپہ چپہ دیکھا۔ جہاں بھی وہ گئے اُنہوں نے اپنی سادگی

اور دیانت داری سے لوگوں کا دِل موہ لیا اور مول لیا۔

جولائی ۱۹۸۰ء میں لمبی ملازمت کے بعد وہ ریٹائر ہوئے۔ تب وہ میرے جیسے بہت سارے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ جب اُنہوں نے یکے بعد دیگرے تین دلچسپ اور اہم کتابیں لکھیں۔ ملازمت کے دوران بھی اُنہوں نے ایک کتاب لکھی تھی۔ تاہم ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اُن کو اچھی فراغت نصیب ہوئی تھی۔ لیکن یہ کتابیں اُن کی ساری زِندگی کے مطالعہ، مشاہدہ اور تجربات کا ثمرہ تھیں۔ اِسی دوران اُنہوں نے حج بھی کیا۔

کاچو سکندر خان اُس دور کی پیداوار ہیں، جب لوگ بڑے سیدھے سادے، ملنسار اور نیک ہوتے تھے۔ وہ اِن سے متعلق لکھتے ہیں:

''آہ کیا زمانہ تھا، کیا لوگ تھے! سیدھے سادے، بات کے پکّے، لحاظ و مروّت کے پیکر، خلیق اور زندہ دل۔ ایک دُوسرے کے کام آنے والے، ایک دُوسرے کا غم کھانے والے، ایک دُوسرے کے دُکھ سکھ میں شریک ہونے والے، ایک دُوسرے کا ساتھ دینے والے، مصیبت میں صبر کرنے والے۔ خوش خلق، خوش باش، بہادر، جفاکش .... باوجود تنگدستی کے آزاد فضاؤں، فطرت کی بوقلمونیوں اور شام و سحر کی رنگینیوں میں کھو جانے والے، فنونِ لطیفہ اور جمالیاتی ذوق سے لو لگانے والے......''

یہی قدریں کاچو صاحب کو وِرثہ میں ملی تھیں۔

لیکن اُنہوں نے آج کا نیا زمانہ بھی دیکھا ہے جس زمانے میں آج آپ اور میں گذر رہے ہیں، وہ بھی گذر رہے ہیں لیکن وہ ہمارے اِس زمانے سے زیادہ مانوس نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ خود اِس ضمن میں اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

''میرے لئے جدید ترقی پسند ماحول ناگوار نہیں البتہ ذرا غیر سا، ذرا نامانوس سا ضرور لگتا ہے۔ اِس لئے کہ آج سے ستر اسّی سال پہلے کا زمانہ دیکھ اور چکھ چکا ہوں جو موجودہ زمانے کی تیز گامی اور تلوّن مزاجی سے ناآشنا تھا۔ اور کچھ اس لئے بھی کہ

ایک لحاظ سے قدیم وجدید دونوں زمانوں کا لذّت آشنا ہوں۔''

وہ الف لیلوی ماحول کی پیداوار تھے اور اسی میں پروان چڑھے تھے۔ ان کے اپنے الفاظ میں: ''میں نے ایک سادہ دلکش الف لیلوی دور میں آنکھ کھولی تھی اور اپنا بچپن اور لڑکپن اسی میں گذارے تھے۔ جس میں زندگی اتنی دلکش تھی، وہی آسان، وہی رشکِ بہار، وہی دِل آویز زندگی............ اب شہری حدود میں مسلسل وُسعت و آبادی کا پھیلاؤ........ سکون وسکوت کی فطری زندگی کو روز بروز محدود کرتا جا رہا ہے۔''

کاچو سکندر خان نے ایک خوبصورت گاؤں یوقما کھر بو میں اپنا بچپن اور لڑکپن گذارا۔ وہ اس کی خوبصورتی سے حد درجہ متاثر تھے۔ دراصل خوبصورتی اُن کے دل اور اُن کی آنکھوں میں تھی۔ یہ اُن کے اندر کا چھپا ہوا شاعر بول رہا تھا۔ جو فطرت کا نہ صرف حسن شناس ہوتا ہے بلکہ قدر شناس بھی ہوتا ہے۔ جس کو ہر ذرّہ میں آفتاب اور ہر قطرہ میں سمندر نظر آتا ہے۔ بعد میں اُنہوں نے یوقما کھر بو کے عنوان سے ایک لمبی نظم لکھی، جس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

آج پھر جاگا ہے دِل میں میری یادوں کا جہاں
آج پھر حاصل ہے تیری دید اے رشک

اُنہوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات کا نام بھی شاعرانہ سا رکھا ہے۔ ''افکارِ پریشاں......... یادوں کے دوش پر'' نام کی اِس کتاب کے پیش لفظ اور بعد میں وہ رقم طراز ہیں:

''خود اپنے بارے میں کچھ لکھنے کا مجھے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ میں نے یہ نام ونمود کے لئے نہیں لکھی ہے۔ اپنی بساط اور اپنی حیثیت ہمیشہ پیش نظر رہتی تھی لیکن اپنے اہلِ خاندان اور اپنے دُوسرے چاہنے والوں کا پُرخلوص اصرار قابلِ لحاظ تھا۔''

اِسی طرح اپنی شاعری سے متعلق وہ اِنکساری سے لکھتے ہیں:

"میں شاعر نہیں ہوں اور نہ شاعر ہونے کا دعویٰ رکھتا ہوں۔ صرف تھوڑا بہت شوق رکھتا ہوں۔ ذوقِ شاعری فقط اِس حد تک ہے کہ جب کہیں بزمِ سخن چل رہی ہو تو اُس میں شریک ہونے اور اگر بن پڑا تو کچھ نہ کچھ تک بندی کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جو ظاہر ہے، شاعری نہیں ہے۔"

یوقما کھر بو اُن کے تحت الشعور اور لاشعور میں چھپا ہوا ہے۔ گاؤں کے بالائی حصّے، گاچھو لہا ہردق سے متعلق وہ ایک نظم میں لکھتے ہیں

تیرے چشموں میں تھا کوثر کا ترنّم پنہاں
اور جھرنوں میں سازِ فطرت کا مضراب لرزاں
تیرے پھولوں پہ تھا فطرت کا تبسّم نازاں
اور گلستانوں میں ہر سُو شاخ و شجر رقصاں
تیری جنت میں خوش تھا کہ میسّر ہے سب ساماں
اُن میں اے گاچھو تیری یاد خُوشتر از ہر یاد

اِس گاؤں میں کاچو سکندر خان نے بچپن کے بے فکرے دن گذارے۔ شوخیاں اور شرارتیں کیں۔ گھوڑسواری کی مشق کی، تیراکی سیکھی، کھیتوں اور سبزہ زاروں میں گدھوں پر پولو کھیلا، تیر چلائے، گوپھن چلائے، ہڈیوں کا کھیل کھیلا، ناچ رنگ میں شامل ہوا۔ پہاڑوں اور سبزہ زاروں میں ریوڑ چرائے۔ بچھڑوں، بکروں کی دیکھ بال کی۔ چڑیوں اور چھپکلیوں کا شکار کھیلا۔ چکوروں اور رام چکوروں کے گھونسلے ڈھونڈے اور انڈے چرائے۔ پولو میچ دیکھے، چوپال میں مردوں اور عورتوں کے ناچ دیکھے۔ کھیتوں میں مٹر کی پھلیاں اُڑائیں، خوشے بھونے، ہر قسم کے کھیل تماشے دیکھے کشتیاں لڑیں اور رسہ کشی کی۔

اُس زمانے کا یوقما کھر بو آج کل کے یوقما کھر بو سے بہت ساری باتوں میں

مختلف تھا۔ گاؤں میں داستاں گو، گیت کار، سازندے، تیرانداز، معمار، نقاش، سنگ تراش وغیرہ تھے اور راگ رنگ کی محفلیں جمتی تھیں۔

کاچو سکندر خان کے اندر ایک شاعر ہی نہیں چھپا ہے بلکہ ایک تاریخ دان بھی چھپا ہے۔ اُن کے لئے کھنڈر محض ایک کھنڈر نہیں ہے۔ ایک محل، ایک قلعہ صرف ایک عمارت کا نام نہیں ہے بلکہ اُن کے پیچھے ایک تاریخ ہے، ایک تہذیب ہے، جس کا ہر پتھر اور ہر اینٹ ایک داستان سناتی ہے۔ بہت سال پہلے لیہہ کے تاریخی محل کا ایک کونا گر گیا جب اُنہوں نے یہ سنا تو اُن کے دُکھی دِل نے اُن سے ایک لمبی نظم کہلائی، جو اِس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

ایک دور کو لے کر چلا　　　لیہہ سپل چن کھر گر گیا!

پوریگ کے پسری پہاڑ کے آثارِ قدیمہ دیکھ کر اُنہوں نے ایک نظم کہی تھی جو اُن کے ذوقِ تجسّس کو اُجاگر کرتی ہے۔

''کیوں اِس ویرانے میں آکر اپنا وقت گنواتے ہو؟
آخر اِس میں رکھا کیا ہے جس کے تم متلاشی ہو؟
ٹیڑھی میڑھی گلیاں، گرتی دیواروں کے سائے
کالے کالے چولھے
جس کی آگ بجھی ہے صدیوں پہلے
تم کیا جانو دوست یہاں
میں سب کچھ پاتا جاتا ہوں''

''یہ کائنات'' کے عنوان سے اُنہوں نے ایک نظم کہی ہے۔ جس کا پہلا شعر ملاحظہ ہو۔

یہ کائنات کیا ہے؟ ایک راز؟ یا راز کا بیان؟
ایک معمّہ؟ ایک نگاہیں؟ ایک سوالیہ نشاں؟

تجسس اور تحقیق سے ہی ایک مورخ' ایک سائنس دان اور محقق اپنی منزل پاتا ہے۔ اُن کی تصنیف ''قدیم لداخ'' اسی کا ثمرہ ہے۔ اس ۳۳۷ صفحات کی ضخیم کتاب پر جموں و کشمیر کلچرل اکادمی نے ان کو ایوارڈ دیا۔

لداخ کی تاریخ اور ادب اُن کے لئے شروع سے ہی اہم موضوع رہا ہے۔ جتنا زیادہ اُنہوں نے اِس کا مطالعہ کیا' اُتنا ہی زیادہ وسیع پایا۔ یہ اُن کے لئے ایک بے کراں اتھاہ سمندر کی طرح تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''جب میں لداخی تاریخ' لداخی ادب اور لداخی دیو مالاؤں کا مطالعہ وسیع تر پیمانے پر کرنے لگا تو اسے ایک اتھاہ سمندر پایا اور اس کے گونا گوں تابناک پہلوؤں کی دِلفریب بھول بھلیوں اور جواہر پاروں میں کھو گیا۔''

وہ لداخ کے آثارِ قدیمہ اور تاریخی یادگاروں کے دِلی قدردان اور قدرشناس تھے۔ بیرونِ لداخ کی تاریخی یادگاروں سے اُن کی آنکھیں چندھیا نہیں جاتی تھیں۔ اُن کے دِلی جذبات اور تاثرات اُنہی کے الفاظ میں سنئے:

''ہم قدیم روما کے Clossium اور ایتھنز کی تاریخی تفریح گاہوں کا ذِکر تو چٹخارے لے لے کر کرتے ہیں لیکن خود اپنے ماضی کی نشانیوں کو بھول جاتے ہیں۔ خود اپنے تہذیبی ورثوں سے بے توجہی برتتے ہیں۔''

کمسن سکندر کو کہانیاں سننے کا بڑا شوق تھا۔ اِس شوق کو اور لوگوں کے علاوہ اُن کی والدہ پورا کرتی تھیں۔ خاص طور پر گیالم کیسر کی داستان اُنہیں بڑی مرغوب تھی۔ یہ داستان لداخ کے علاوہ چین' تبت' منگولیا اور بلتستان میں مقبول ہے۔ چین نے کیسر ساگا پر دو بین الاقوامی کانفرنسوں کا اہتمام کیا ہے۔

کاچو صاحب نے بچپن میں اپنے گاؤں کے نواح میں ایک چٹان کے اُوپر دیو مالائی شخصیت کیسر کے گھوڑے کے سموں کے نشان دیکھے۔ ایک اور جگہ ایک سفید چٹان پر ایک اور کردار آدم خور بڑھیا کے پٹو کے نشان اور گہری گھپا دیکھی۔ یہ اساطیری

داستان اُن کے دِل و دماغ پر نقش ہوگئی تھی۔ اُنھوں نے کیسر کی داستان کو گرانقدر معلوماتی خزانہ اور دُنیائے ادب کا شاہکار قرار دیا ہے۔ کاچو صاحب نے ہومر کی مشہور تصنیفات اِلیاڈ اور اوڈیسی اور کیسر کی داستان میں گہری یکسانیت پائی۔

داستانوں سے لگاؤ کا نتیجہ تھا کہ اُنھوں نے لداخی مقبول داستان ''نُوربُوزانگپو اور اِت ٹھوق لہامو'' کو اُردو کا جامہ پہنایا۔ اصل میں اِس داستان کا ماخذ سنسکرت ہے۔ سنسکرت سے کلاسیکل تبّتی میں اِس کا ترجمہ ہوا ہے۔ اُتر پردیش اُردو اکادمی نے اِس کتاب پر اُن کو اِنعام دیا۔

اُن کی تیسری کتاب LADAKH IN THE MIRROR OF HER FOLKLORE ہے جس میں اُنھوں نے ایک منقبت سمیت سولہ لداخی اور بلتی گیتوں کا انگریزی ترجمہ دیا ہے' اُنھوں نے متعدد دردی گیتوں کو بھی اُردو میں منتقل کیا ہے۔

ریاست کے گورنر نے ادبی اور علمی خدمات کے لئے کاچو سکندر خان کو نقرئی تمغہ اور سند عطا کی۔

کاچو سکندر خان اچھے ادیب تو ہیں ہی' ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ آج کل کے دور میں ایک اچھا اِنسان ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا ہے۔ اُن میں ایک روایتی لداخی کی ساری خوبیاں ہیں۔ روادار' صلح کل' خوش خلق' راست گو اور دیانت دار۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک اچھی نیت اچھے مذہب سے بڑھ کر ہے۔

''انسانیت.......ایک ماں'' کے عنوان سے اپنے کلام میں اُنھوں نے کہا ہے۔

''سچ ہے کہ تیری اولاد باغی ہوئی ہے تجھ سے
سچ ہے کہ تیری اولاد حلقوں میں بٹ گئی ہے

....

بٹ کر بکھر رہی ہے' آپس میں لڑ رہی ہے
مذہب' قبیلہ' ذاتیں

نسل و زبان کے فتنے

....

ڈر ہے تجھے جلا دیں

تیری حدیں مٹا دیں"

اُنہوں نے تحریر اور تقریر میں کسی کی برائی نہیں کی ہے اور نہ زِندگی میں کسی کی غیبت یا نکتہ چینی کی ہے۔ دراصل وہ اِنسان سے مایوس نہیں ہیں۔ ہر آدمی میں اُن کو زندگی کا مثبت پہلو نظر آتا ہے۔ وہ اپنے پرائے سبھوں سے محبت کرنے والا اِنسان ہے۔ اپنی کتابوں کا جس انداز میں اُنہوں نے اپنے عزیزوں کے نام اِنتساب کیا ہے' یہاں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے۔

روایتی طور پر اِنسان ازل سے زن' زر اور زمین کے اسیر رہے ہیں۔ میں اس میں زِمامِ (حکومت) یا اِقتدار کا اضافہ کرتا ہوں۔ میں نے پڑھا ہے اور زِندگی میں بارہا دیکھا ہے کہ بڑے بڑے آدمی ان چاروں کے ایک یا ایک سے زیادہ جال میں پھنستے ہیں۔

کاچو صاحب کا کیا مشاہدہ ہے؟ ملاحظہ ہو:

"آج ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں لیکن سیرت و کردار کی جو پستی' دِلوں کی جو دُوری اور اخلاقی گراوٹ کے جو اِنسانیت سوز منظر آج نظر آ رہے ہیں' وہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آتے تھے۔"

کاچو سکندر خان نے اپنی اِبتدائی تعلیم کرگل میں حاصل کی۔ کرگل یوقما کھربو سے تب گھوڑے یا پیدل بیس پچیس میل دُور تھا۔ جب وہ گھر سے پڑھنے کے لئے نکلے تو روایتی طور نذر و نیاز تقسیم ہوئی۔ سفری لباس پہنایا گیا۔ ماں نے روتے ہوئے اُنہیں گلے سے لگایا اور ہاتھ میں کچھ سکّے تھمائے۔ ہمسایوں اور رشتہ داروں نے الوداع کہا اور والد نے اُنہیں اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھا کر کرگل لایا۔ اُن کے والد اسفندیار

خان گاؤں کے ذیلدار اور بارسوخ آدمی تھے۔ کاچو سکندر خان کے خون میں پوریگ اور لداخ دونوں کے شاہی خاندان کے خون کی آمیزش ہے۔

نویں جماعت پاس کر کے وہ آگے پڑھنے کے لئے سرینگر گئے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ایس. پی. کالج میں داخلہ لیا۔ کاچو صاحب بڑے ذہین تھے۔ اِمتحانات میں وہ اکثر فرسٹ آتے تھے۔ ایف. اے پاس کرنے کے بعد امر سنگھ ڈِگری کالج میں داخلہ لیا۔ جہاں اُردو کے معروف ادیب خلیفہ عبدالحکیم پرنسپل تھے۔ اُردو کے شاعر نندلال کول طالبؔ فارسی کے پروفیسر تھے۔

مہاراجہ ہری سنگھ کی شخصی حکومت میں جو بھی خامیاں ہوں اپنی جگہ، لیکن مہاراجہ نے کئی کلیدی عہدوں پر دانشوروں کو تعینات کر کے اُن کی اعلیٰ خدمات حاصل کی تھیں۔ تب ماہرِ تعلیم خواجہ غلام السیّدین ناظمِ تعلیمات تھے۔ ماہرِ اقبالیات ڈاکٹر محمد الدین تاثیر ایس. پی. کالج کے پرنسپل تھے۔ اُردو کے نامور شاعر مرزا جعفر علی خان اثرؔ لکھنوی ریاست کے وزیرِ داخلہ تھے۔

اُن دِنوں کالج کے طلباء کو اعزازی طور پر کالجیٹ کہا جاتا تھا اور سماج میں اس کی عزت تھی۔ کاچو صاحب نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ سرکاری راشن حاصل کرنے کے لئے محلّہ افسر کی تصدیق لینی ہوتی تھی۔ کاچو صاحب نے اِس سلسلے میں محلّہ افسر سے رابطہ قائم کیا تو وہ بولا ’آپ کالجیٹ ہیں، افسر کی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘

اُس سال گرمائی تعطیلات میں وہ گھر آئے۔ تعطیلات کے بعد اُن کی شادی ہوئی اور اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے وہ سرینگر واپس نہیں جا سکے۔ والد کا سایہ پہلے ہی سر سے اُٹھ گیا تھا۔ اِس لئے اُن کی سرپرستی نہیں رہی تھی۔ وہ ۴۳ سال کی عمر میں فوت ہوئے تھے۔ گزر بسر کے لئے وسیلۂ معاش کی ضرورت تھی۔ ضلع تعلیمی افسر شری دھر ڈولو، کاچو صاحب کو جانتے تھے۔ اُنہوں نے اُنہیں لیہہ کے لوور ہائی سکول میں اُستاد تعینات کیا۔

کاچو سکندر خان کو لکھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ کرگل سکول میں جہاں وہ زیرِ تعلیم تھے، بچوں کا رسالہ ''رتن'' آتا تھا۔ اُن کے کئی مضامین ''رتن'' میں شائع ہوئے۔ وہ ایس. پی. کالج کے میگزین میں بھی لکھا کرتے تھے۔

بظاہر تادمِ تحریر کاچو سکندر خان چراغِ سحری ہیں۔ موت اٹل ہے۔ کسی بھی لمحہ یہ چراغ بجھ سکتا ہے لیکن وہ ایک ایسا چراغِ سحری ہے جو بجھنے کے بعد بھی اپنا اُجالا دیتا ہے۔ اُن کی زندگی اور کتابیں بہتوں کے لئے چراغِ راہ ہوں گی۔

اسفہند یار خان، کاچو سکندر خان کے فرزند ہیں، جن کو اپنے والد سے علم و ادب ورثہ میں مِلا ہے اور پرورشِ لوح و قلم میں مگن ہیں۔
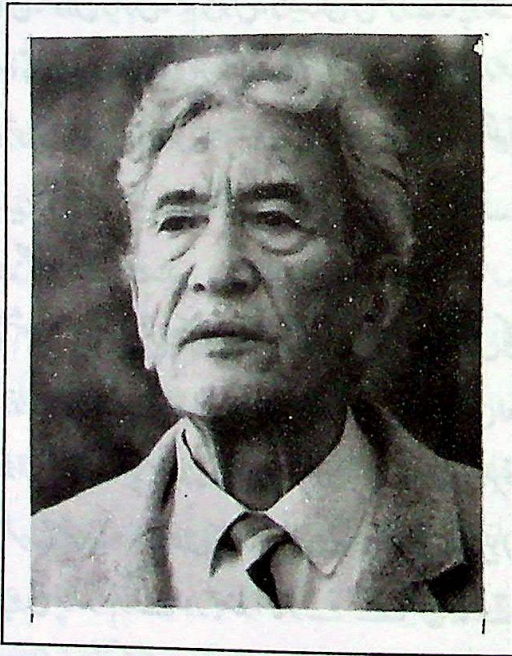
کاچو سکندر خان

ناموَر مہم جُو آرغون

لداخ نے ماضی میں جفاکش، من چلے اور عالی ہمت مہم جو آرغون پیدا کئے ہیں۔ آرغون لداخی مسلمانوں کے ایک قبیلہ کو کہتے ہیں جو کشمیر اور چینی ترکستان سمیت بیرونِ لداخ اور لداخی نسلوں کی اولاد ہیں۔ آرغون کا لفظی معنی بھی مخلوط النسل ہے۔

آج لیہہ کے اکثر مسلمان آرغون ہیں۔ یہ صدیوں سے یہاں آباد ہیں۔ ان آرغون مہم جوؤں میں محمد عیسیٰ، گلوان رسول، قلم رسول، رمضان علی عرف راچونگ، جمعہ مالک، محمد رحیم، بڑا اسلام، چھوٹا اسلام، عبدالکریم، لسو آرغون، صابر مالک، عبدالخالق، حبیب اللہ، عزیز شیخ، خوشحال رمضان اور کئی نام آتے ہیں۔ اُن کے علاوہ شکور علی ایک اہم نام ہے، جو بلتی تھا۔ یہ سرد و گرم چشیدہ اور گرگ باراں دیدہ قسم کے لوگ ہی نہیں تھے بلکہ باغ و بہار طبیعت بھی رکھتے تھے۔

مثل مشہور ہے کہ شرپا کے بغیر کوہ ہمالیہ کی بلندیاں سر نہیں کی جاسکتیں۔ اِسی طرح یورپی مہم جو سیاحوں نے اعتراف کیا ہے کہ آرغون رہبروں اور قلیوں کے بغیر اُس دور میں وسط ایشیا، تبت، پامیر وغیرہ میں سفر اور سروے کرنا دوبھر تھا۔

جس طرح شرپا کوہ پیماؤں کا سامان لے کر اِنتہائی بلندیوں پر چڑھتے ہیں اور کوہ پیماؤں کو چوٹی پر قدم رکھنے اور جھنڈا گاڑنے کے قابل بناتے ہیں، اُسی طرح آرغون جسمانی مصائب سہہ کر مہم پسند یورپیوں کا کام آسان بناتے تھے۔

مغربی محققین کرنل سر فرانسس لیگ ہسبنڈ، ، لارڈ ایریل آف ڈینمور، ڈاکٹر سون ہیڈین، کپتان ایچ۔ ایچ۔ پی۔ ڈیزی، سر فریڈرک ڈریو، میجر گوڈوین آسٹن وغیرہ

نے اپنی تصنیفات میں آرغون کی سراہنا کی ہے۔ اِس طرح اُن کے کارنامے جزوی طور منظرِ عام پر آتے ہیں۔ تاہم کم و بیش سارے مہم جو آرغون گمنامی میں پڑے ہیں۔ لارڈ ڈینمور ایک مرتبہ لداخ کے راستے پامیر جاتا ہے اور اپنی معرکتہ آلارا کتاب ''پامیر'' کی وجہ سے غیر معمولی شہرت پاتا ہے۔ اِسی طرح سویڈن کے نامور مہم جو سیاح ڈاکٹر سون ہیڈین اور برطانیہ کے کرنل سر فرانسس ینگ ہسبنڈ اپنی مہمات سے متعلق کتابوں کی بدولت شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کرتے ہیں۔ اِس کے برعکس چند آرغون اِنفرادی طور پر لارڈ ڈینمور، ینگ ہسبنڈ اور سون ہیڈین جیسے متعدد یورپیوں کے ساتھ وسطِ ایشیاء اور تبت کے لق و دق صحراؤں، بے آب و گیاہ میدانوں اور برف پوش کہساروں میں گھومتے ہیں۔ لیکن یہ گمنام ہیں کیونکہ اُنہوں نے اپنے پیچھے کوئی دستاویز نہیں چھوڑی۔ وہ تو بھلا ہو امریکی سیاح رابرٹ براٹ کا جس نے گلوان رسول کو اپنی سوانح حیات SERVANT OF THE SAHIBS لکھنے کی ترغیب دی اور ہم نے اُس کی اوائل زندگی سے متعلق کچھ اہم باتیں معلوم کیں۔

اِس میں شک نہیں کہ مہم پسند یورپیوں کے ساتھ آرغون کی سیاحت اور اُن کی ملازمت کا بنیادی محرک حصولِ معاش تھا۔ تاہم اپنی جان جوکھم میں ڈال کر ان ویران علاقوں میں سالہا سال مسلسل کٹھن سفر پر رہنے میں آرغون کی مہم جوئی کو دخل تھا۔ چنانچہ ینگ ہاسبنڈ نے گلوان غلام رسول کی کتاب Servant of the Sahibs کے پیش لفظ میں لکھا ہے: ''یہ افراد مہم جوئی کے اُتنے ہی دلدادہ ہیں جتنے اُن کے Employers مالکان ہیں۔''

گلوان رسول نے اپنی اِس کتاب میں لکھا ہے کہ چینی ترکستان میں اُس کے ایک رشتہ دار نے اُس کو مادی وسائل فراہم کرتے ہوئے کہا کہ اس کو مزید سفر کے مصائب جھیلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اُس نے مال و دولت کو ٹھکرایا اور کہا کہ اس کو حقیقی سکون بادہ پیمائی اور سیاحت میں ملتا ہے۔

آرغون کے علاوہ کئی لداخی بودھوں نے بھی یورپی مہم جوؤں کے ساتھ کام کیا ہے۔ اُن کے سفرناموں میں تنڈوپ صنم، رالپیانگ، ایشے چھرنگ وغیرہ کے نام آتے ہیں جو اچھے شکاری اور جفاکش مہم پسند تھے۔ بودھ اکثر قلی اور گھوڑے والے ہوتے تھے۔

اے.ای. وارڈ نے اپنی کتاب TOURIST AND SPORTS MAN'S GUIDE TO KASHMIR AND LADAKH میں آرغون سے متعلق لکھا ہے:

''طویل مسافت کے لئے آرغون بہترین خادم ہیں کیونکہ یہ بڑے جفاکش اور فرمانبردار ہوتے ہیں۔''

سون ہیڈین نے اپنی مشہور کتاب TRANS HIMALAYAS میں لکھا ہے:

''آرغون نسل اپنی جسمانی طاقت اور اچھے تن و توش کی وجہ سے عام لداخیوں سے منفرد ہے۔''

IN TIBET AND CHINESE TURKISTAN میں کپتان ایچ. پی. ڈیزی لکھتا ہے:

''کارواں میں کام کرنے لئے موزوں ترین افراد لداخ کے آرغون ہیں۔ وہ ترکستان کے باشندوں سے بدر جہا بہتر ہیں۔ موخر الذکر بلند مقامات اور ایسے ماحول میں زندگی بسر کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ اِس لئے جلدی تھک جاتے ہیں لیکن آرغون اِنتہائی صبر آزما حالات میں پورے اُترتے ہیں۔''

سر فریڈرک ڈریو کی تصنیف THE JAMMU AND KASHMIR TERRITORIES اپنے موضوع پر ایک معرکتہ الاراء تصنیف مانی جاتی ہے۔ اس میں صفحہ ۲۴۰ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:

''اگر لداخیوں کو مناسب وقت اور موقع فراہم کیا جائے تو وہ سیکھنے کا اچھا مادہ رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے گوڈوین آسٹین کے اِس بیان کو حق بجانب قرار دیا ہے کہ ایک

لحاظ سے لداخی منشی MAPREADING نقشہ فہمی میں ہندوستان کے منشیوں یا لیکھکوں سے سبقت لے گئے ہیں۔"

لارڈ ڈینمور نے رائیل جیوگرافیکل سوسائٹی کے سامنے اپنی مہم کی روئیداد سُناتے ہوئے اِن الفاظ میں لداخیوں کی تعریف کی ہے:

"اِس سے پہلے مجھے کبھی اِس قسم کے جفاکش، عمدہ اور فرمانبردار آدمیوں کی خدمات حاصل نہیں ہوئی تھیں۔"

اپنی کتاب "پامیر" کے دیباچے میں اُن کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ڈینمور لکھتا ہے:

"یہ میرے لئے ناشکراپن ہوگا اگر میں اِس دیباچے کو اُن جفاکش اور ممتاز لداخیوں کو خراجِ تحسین پیش کیے بغیر ختم کردوں جو رمضان (رمضان علی کارواں لیڈر) کے تحت میرے ہم سفر تھے۔ اُنہوں نے اُس مہم میں پاپیادہ ۲۳۰۰ میل لمبا سفر طے کیا۔ اِس دوران ۶۹ دریا اور ۴۱ پہاڑی درّے عبور کیے جن میں بہت سارے دُنیا کے بلند ترین درّے تھے۔"

ڈینمور رقم طراز ہے:

"رمضان نے (پورے قافلے کے ساتھ) رات کے دس بجے طوفانِ برف و باد میں ۱۸۶۸۰ فٹ بلند قراقرم صحیح وسلامت طے کیا۔ تھوڑے وقفے میں خیمے نصب کیے۔ رات کا کھانا تیار کیا۔ دگرگوں حالت میں یہ ایک لداخی باورچی کے بس کی بات ہے۔"

کتاب میں آگے وہ لکھتا ہے:

"اِس میں ذرہ بھر شک نہیں کہ ہمارے ساتھ دُنیا کے بہترین PONEY MEN گھوڑے والے تھے۔ میں نے اُن کے جیسے جفاکش اور محنتی آدمی کبھی نہیں دیکھے۔ اُنہیں اپنے کام کا پورا علم ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ خوش وخرم رہتے ہیں۔ جب کبھی

اُن پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے تو یہ گیت گاتے ہیں۔''

ہیڈین نے تبت میں اپنی مہم کے دوران اِنتہائی کٹھن اور صبر آزما حالات میں لداخیوں کی خوش مزاجی کا ذِکر اِن الفاظ میں کیا ہے:

''چند لداخی جانوروں اور اپنی مشکلات کو ہلکا کرنے کے لئے گیت گا رہے تھے۔ وہ ایسے خوش و خرم اور پُر سکون تھے، گویا فصل کٹائی کے تیوہار پر جا رہے تھے۔''

یورپیوں اور لداخی قلیوں میں عموماً گہری قربت اور اُنسیت تھی۔ مہم تبت کے بعد جب شکور علی، رحیم علی، تنڈوپ صنم اور چھرنگ' سون ہیڈین سے جدا ہوتے ہیں تو یہ لداخی بہت روتے ہیں۔

ہیڈین لکھتا ہے:

''جب یہ لوگ دُربُوگ (تبت سے بطرفِ لداخ ایک گاؤں) روانہ ہوئے تو میں اُن کو اُس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل ہوئے اور خیمے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنے آنسو پونچھ لئے۔''

تبت کی دُوسری مشہور مہم کے اختتام پر ہیڈین چھ لداخیوں کے ساتھ ۱۶ استمبر ۱۹۰۸ء کو شملہ پہنچتا ہے۔ وائسرائے ہند لارڈ منٹو اور لیڈی منٹو' ہیڈین کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ دُوسرے روز ہیڈین ایک سو پچاس معززین کے سامنے اپنے سفر کی روئداد سناتا ہے۔ اُن میں ہند میں برطانوی فوج کے کمانڈر اِنچیف لارڈ کچنسر ،الور اور گوالیار کے مہاراجے اور کئی جرنیل ہوتے ہیں۔

یہاں چھ لداخیوں کو ہیڈین ایک مختصر تقریب میں الوداع کہتا ہے۔ لارڈ منٹو اور لیڈی منٹو اِس میں شرکت کرتے ہیں۔ اِس موقعہ پر لارڈ منٹو ایک مختصر اور مسرور کُن تقریر کرتا ہے۔ جدا ہوتے وقت لداخیوں کو روتے دیکھ کر لارڈ اور لیڈی منٹو بہت متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ بے ساختہ کہتے ہیں:

''یہ کتنے وفا شعار اور عقیدت مند لوگ ہیں۔ الفاظ میں ان کے آنسو بیان

نہیں ہو سکتے۔"

بعد میں سویڈن کے شاہ گستاف نے اِن چھ لداخیوں اور مہم کے دُوسرے تمام افراد کو اعلیٰ خدمات کے لئے سونے اور چاندی کے تمغے عطا کئے۔ ہیڈین نے اُن چھ افراد کے نام نہیں دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ گیارہ افراد تھے۔ کارواں لیڈر ایک لداخی عبدالکریم تھا۔ باقی چند نام قدوس، غلام، لبز انگ فنچگ، صدیق، عبداللہ، غفار وغیرہ تھے۔

وسط ایشیاء تبت اور پامیر سے واقف اور ان خطّوں میں یورپی مہم پسند سیاحوں اور محققوں کے سفر کے احوال وکوائف پڑھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ اُس دور میں اِن دُشوار گذار خطّوں کی مسافت نہایت ہی صبر آزما اور جان جوکھوں کا کام تھا۔ راستے میں رہزنوں کا خطرہ رہتا تھا۔ گھوڑے اور آدمی برف باری کی نذر ہو جاتے تھے۔ رسد پھینکنی پڑتی تھی۔ کارواں اپنی راہ سے بھٹک جاتا تھا۔ کپتان ویلبی ۱۸۹۶ء کپتان ڈیزی ۹۹-۱۸۹۶ء اور کپتان رالینگ ۱۹۰۳ء کی مہمات اِس قبیل کی اہم مثالیں ہیں۔ کبھی مہم کے یورپی لیڈر غیر دوستانہ آدمیوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ اِس ضمن میں فرانس کے DULRE DE RHINS (۱۸۸۴)، برطانیہ کے ANDREW DALGLEISH اور جرمنی کے SCHLAGIN WEIT ۱۸۵۷ء کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

ناموافق موسمی حالات بھی سفر میں تکلیف کا باعث تھے۔ ہیڈین نے تبت میں اپنے سفر کے دوران نقطہ انجماد سے نیچے تقریباً ۴۰ ڈگری سلسیس درجہ حرارت کا ریکارڈ کیا ہے۔

ایسے سفر میں بار برداری اور سواری کے جانوروں کا مر جانا معمول کی بات تھی۔ ڈینمور نے ایک چینی ترکستانی کے حوالے سے بتایا ہے کہ یارقند (چینی ترکستان) سے لیہہ تک سفر کرنے کے دوران بیس فیصد گھوڑے مر جاتے تھے۔

ہیڈین کی تبت کی سات مہموں کے دوران صرف ایک مہم میں سفر کی تکمیل

سے پہلے اُس کے کارواں کے ۵۸ گھوڑوں اور ۳۶ خچروں میں ۲۹ گھوڑے اور ۶ خچر مر گئے۔

ایسے حالات میں جانباز اور باہمت مہم جو بھی مایوس ہو جاتے تھے۔

صحرائے گوبی میں سفر کرتے ہوئے جب ینگ ہاسبنڈ کو سخت آلام اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور رات کی نیند آنکھوں سے اُڑ جاتی ہے تو وہ سخت پچھتاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

''اُس رات میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں کتنا بے وقوف ہوں اور قسم کھائی کہ آئندہ رُوئے زمین کے ایسے ویران علاقوں میں کبھی نہیں گھوموں گا۔ ہم مسافر یا سیت کے ایسے لمحات سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ بار بار اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں، بھلا اِس دشت نوردی کا ماحصل کیا ہے؟''

لیکن ایک مہم جو اِنسان کے لئے یہ مایوسی عارضی ہوتی ہے۔

لداخ کے مہم جو آرغون بڑے دلچسپ اور Colourful باغ و بہار لوگ تھے۔ یہ بڑے زاہد اور اطاعت گزار تھے اور رقص و سرود کے بھی بڑے دلدادہ تھے۔ مشہور مہم جو آرغون گلوان غلام رسول، جو گلوان رسول کے نام سے مشہور ہے، بنجو (ایک ساز) بجانے کا بڑا شیدائی تھا۔ محمد عیسٰی بڑے چاؤ سے گٹار بجاتا تھا۔ جس روز اِنتقال ہوا، اُس کی پچھلی رات وہ اپنے مرغوب گٹار پر گیت گا کر سویا تھا۔

قلم غلام رسول بڑا ظریف اور زندہ دل آدمی تھا۔ لیہہ کی مجلسی زندگی میں وہ اپنی شمشیر بازی، مشعل ناچ اور بھانت بھانت کے رقص سے رونق لاتا تھا۔ اُس نے چین کے مشہور رقص امبان اور کشتی اور اژدہا ناچ (Dragon Dance) سے لداخیوں کو رُوشناس کیا' جو لداخ میں تقریباً رُبع صدی تک میلوں تماشوں میں باقاعدگی سے دِکھائے جاتے تھے۔

یہ لوگ اپنے آپ کو ''جنگ مٹی'' یا ''جنگا مٹی'' کہتے تھے اور جنگا مٹی یورولونگی

خوب لالہ، کا گیت گاتے ہوئے والہانہ انداز میں ناچتے تھے۔ ''جنگ مٹی'' یا '' جنگا مٹی'' کے لفظ کا ماخذ معلوم نہیں ہوسکا۔ کوئی اِس کا مطلب جنگجو بتاتا ہے۔ یہ لوگ سفر اور حضر دونوں میں راگ رنگ کی محفلیں جماتے تھے۔ لداخ میں تیراندازی کے میلے لگتے ہیں۔ ماضی میں خاص کر لیہہ میں ہر سال تیراندازی کی دِلچسپ تقریب ہوتی تھی۔ یہ آرغون تیراندازی کے نام سے مشہور تھا۔ جنگ مٹی خاندان کے یہ مہم پسند افراد اس میلے کے رُوح رواں تھے۔ اپنی زِندہ دِلی اور خوش مذاقی سے یہ اِس میں نئی جان ڈالتے تھے۔

اُن دِنوں تُرکی زبان کو لداخ میں Lingua Franca کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ لوگ ترکی زبان میں ماہر تھے۔

تاریخ میں ایسے متعدد وشہرہ آفاق فن کاروں، ادیبوں اور فلسفیوں کے نام آتے ہیں جنھوں نے اِنتہائی تنگ دستی اور مفلوک الحالی میں اپنی زِندگی گزاری۔ فلسفی کلیانت بہشتی، مشہور فلسفی فارابی مالی اور ولندیزی شیکسپیئر ونڈرل ایک معمولی کلرک تھا۔ لداخ کے اکثر نامور مہم جو آرغون انگریز جوائنٹ کمشنر اور وزارتِ لداخ کے دفاتر میں چپراسی تھے۔ بعد میں کئیوں نے مالی اور سماجی لحاظ سے ترقی کی۔

اُنیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں مہم جو یورپی محققین کی تصنیفات، سفرناموں، یادداشتوں اور دُوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ آرغون نے انفرادی اور اجتماعی طور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

رمضان علی نے ایک انگریز جوائنٹ کمشنر کے ساتھ لیہہ سے سرینگر کا سفر گھوڑے پر چوبیس گھنٹوں میں طے کیا۔ یہ اُس زمانے میں پندرہ دن کا کٹھن سفر تھا۔ ہر پڑاؤ پر اُن کے لئے تیز رو گھوڑے کا اہتمام تھا۔ مسلسل سواری کی اذیت اور جھٹکے سے محفوظ رہنے کے لئے اُنہوں نے سارے بدن پر پٹی باندھی تھی۔

محمد عیسٰی نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ پاپیادہ دس روز میں اپنا سامان خورد و نوش خود

اُٹھا کر لیہہ سے چینی ترکستان گیا تھا۔ اِس طرح ایک آرغون خوشحال رمضان تن تنہا لیہہ سے چینی ترکستان کے سفر پر روانہ ہوا اور راستے میں قافلوں کی چھپائی ہوئی اشیائے خورد ونوش سے وہ اپنی شکم پُری کرتا ہوا اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ تب لیہہ سے چینی ترکستان پہنچنے میں ایک ماہ سے زیادہ عرصہ لگتا تھا۔ راستے میں کئی کئی روز آبادی کا نام و نشان ہی نہیں تھا اور دُنیا کے چند بلند ترین درّوں اور تیز رو گہرے دریاؤں سے پالا پڑتا تھا، جن پر کوئی پُل نہیں تھا۔

اڈولف شے لیگین ویٹ پہلا یورپی محقق سیاح تھا جو ۱۸۵۷ء میں اکسائی چین کے راستے چینی ترکستان پہنچا۔ اُس سفر میں اُس کے ہمراہ ایک لداخی آرغون محمد امین تھا۔ بعد میں اڈولف شے لیگین کاشغر میں مارا گیا۔ اُس کی قیمتی دستاویز ایک نسوار فروش کے ہاتھ لگی تھی جسے مرزا عبدالودود نامی ایک شخص نے سولہ ماہ کی تلاش و جستجو کے بعد ایک روپیہ میں حاصل کیا تھا۔

کاشغر میں برطانوی کونسل کے آفیسر اِنچارج انڈریو ڈلگلیش کے قاتل کو گرفتار کرانے کے صلے میں لیہہ کے ایک مسلمان شمس الدّین کو اِنعام اور سند عطا کی گئی۔ ڈلگلیش پہلے ایک تاجر تھا اور اُس نے تجارت کے سلسلے میں لیہہ اور یارقند کے درمیان چودہ سال سفر کیا تھا۔ اُس نے یارقند میں شادی کی تھی۔ لیہہ سے یارقند جاتا ہوا قراقرم پر ایک افغان داؤد محمد نے ڈلگلیش کو قتل کیا۔ شمس الدّین، داؤد محمد کو جانتا تھا۔ ایک انگریز فوجی افسر بوور کو قاتل کو گرفتار کرنے کے لئے شمس الدّین کے ساتھ بھیجا۔ ایک سال پیچھا کرنے کے بعد مفرور مجرم کو سمرقند میں گرفتار کرنے میں وہ کامیاب ہوئے۔ شمس الدّین کو برٹش جوائنٹ کمشنر ایچ رمزے نے لیہہ میں ایک تقریب میں تین ہزار روپے اور سند دی۔ ڈلگلیش لیہہ کے مسیحی قبرستان میں مدفون ہے۔

حاجی حیدر شاہ اور حاجی نصر شاہ پچھلی صدی میں لداخ کے سرکردہ مسلمان ہو گزرے ہیں۔ اُن کے اجداد میں ایک فرد کو لداخ کے ایک راجہ نے کشمیر کے مغل گورنر

سے فارسی میں خط و کتابت کے لئے لداخ مدعو کیا تھا اور دُوسرا تبلیغ دین کے لئے آئے تھے۔

ڈوگرہ دورِ حکومت میں اپنے اثر و رسوخ اور فہم و فراست کی وجہ سے اس خاندان کو سرکار کی طرف سے دلائی لاما کو لہاسہ، تبت خیر سگالی مشن پر تحائف لے جانے کا شرف حاصل تھا۔ لداخ اور تبت کے مابین ایک پرانے معاہدے کے مطابق لداخ سے ہر تیسرے سال دلائی لاما کو تحائف کے ساتھ ایک خیر سگالی مشن بھیجا جاتا تھا۔ اسے ''لوپچق'' یا سالانہ سفارت کہا جاتا تھا۔ لوپچق کی قیادت کرنے والے شخص کو خصوصی مراعات حاصل تھیں۔ اِس لئے یہ خاندان لداخ میں بڑا متمول تھا۔

سون ہیڈین نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ نصر شاہ کا نام اندرونِ ایشیاء اور تبت میں مشہور تھا۔ اِس خاندان کے ایک بزرگ خواجہ غلام رسول نے ہیڈین کو مغربی تبت کی مہم کے دوران مالی اعانت اور دُوسری سہولتیں فراہم کیں۔

بعد میں سون ہیڈین کی سفارش پر سویڈن کے بادشاہ گستاف نے خواجہ غلام رسول کو سونے کا تمغہ دیا اور برطانوی ہند حکومت نے اُن کو خان بہادر کا خطاب دیا۔

اُس زمانے میں تبت اور وسط ایشیاء کے سروے پر جانے والے کارواں اپنے جلو میں بڑی رنگینیاں اور دلچسپیاں رکھتے تھے۔ کچھ کارواں چند افراد اور تیں چالیس گھوڑوں پر مشتمل ہوتے۔ مشہور فارسائتھ مشن FORSYTH MISSION میں ۱۶۲۱ یاک اور گھوڑے اور ۶۴۷۶ قلی تھے۔ جن میں ۱۲۳۶ ڈولی بردار تھے۔ یہ مشن برطانوی ہند نے ۱۸۷۰ء میں لداخ کے رستے اہم سیاسی اور تجارتی امور پر گفت و شنید کے لئے سر ڈگلس فارسائتھ کی قیادت میں وسط ایشیاء بھیجا تھا۔ بہت سارے لوگوں کے آنے کی وجہ سے اُن دِنوں لیہہ میں چیزوں اور اشیائے خوردنی کی بڑی قلت پڑی تھی اور قحط کا سا سماں پیدا ہوتا تھا۔

کارواں اکثر دِلچسپ افراد پر مشتمل ہوتا تھا۔ سون ہیڈین کے ایک کارواں

کو لیجئے۔

تنڈوپ صنم شکاری تھا۔ ہیڈین نے اُس کو GRAND COURT HUNTMAN کہا ہے۔

لونبزانگ کارواں کا مسخرا تھا۔ اُس کی ذات میں ہر ایک کے لئے دِلچسپی کا سامان تھا۔

حاجی غلام رسول کارواں لیڈر محمد عیسیٰ کا باورچی تھا اور دو مرتبہ حج کر آیا تھا۔

تنڈوپ گیالچن داستان گو تھا۔ دِن کو سفر کرنے کے بعد وہ رات کو بالاقساط طویل داستان گیالم کیسر سُناتا تھا۔

بائیس سالہ عدول جہاں کارواں کا سب سے کم عمر قلی تھا۔ باسٹھ سالہ غفور کارواں میں سب سے عمر رسیدہ آدمی تھا۔ وہ ۳۳ سال قبل فارسائتھ مشن کے ساتھ وسط ایشیاء گیا تھا۔ ہیڈین پہلے اس عمر رسیدہ آدمی کو اپنے ساتھ لینے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ جب بوڑھے آدمی نے اپنے ساتھ کفن اُٹھایا تو ہیڈین اور محمد عیسیٰ ہنس پڑے۔ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ یہی کفن اُسی سفر میں محمد عیسیٰ کے کام آیا جو ۵۳ سال کی عمر میں فوت ہوا اور بوڑھا آدمی صحیح وسلامت اپنے گھر پہنچا۔

لداخ کے مہم پسند ایک آرغون کی مہم جویانہ زندگی کے تمام گوشوں سے پردہ اُٹھانا مشکل ہے۔ اِس کی تین وجوہات دی جاسکتی ہیں۔ اوّل ماسوائے گلوان رسول کسی آرغون نے اپنا سفر نامہ مرتب نہیں کیا ہے۔ گلوان رسول نے اپنی کتاب پینتالیس برس کی عمر میں لکھی۔ اِس کے بعد بھی وہ متعدد یورپیوں کے ہمراہ سفر پر گیا۔ اِس لئے اُس کی خودنوشت سوانح عمری نامکمل ہے۔ دوئم اُس زمانے میں اُن کے کام کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اِس لئے کسی نے اُن کے مہم جویانہ سفر کے احوال وکوائف لکھنے میں دلچسپی نہیں لی۔ لیہہ کے ایک باذوق آدمی منشی غلام محی الدّین مرحوم اور ماہرِ تعلیم ایلی ایزر جولدن نے قلم غلام رسول کی زبانی تبت اور چین کی ایک مہم سے متعلق

اُس کی مختصر آپ بیتی قلم بند کی ہے۔ اِس کتاب میں قدرے تفصیل سے اُس آپ بیتی کا تذکرہ ہے۔ سوئم اِس وقت، جب یہ مضمون لکھا جارہا ہے، اُن میں سے کوئی بھی مہم جو آرغون ہمارے درمیان نہیں ہے۔

وسط ایشیاء، تبت، پامیر، لداخ اور چین میں مہمات اور سروے سے متعلق تصنیفات کے آئینے میں ایک آرغون کی انفرادی زندگی پر ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ میں نے جب ان مہم جوؤں سے متعلق کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو صرف حاجی حبیب اللہ حیات تھے۔ یہ سن ۱۹۷۲ء کی بات ہے۔ وہ اُس وقت اکیاسی برس کے تھے۔ مختلف کتابوں سے ایسے چند افراد سے متعلق تھوڑی سی معلومات ہوئیں۔ جو یہاں قدرے اختصار سے پیش کی جاتی ہیں۔

رسول گلوان سے متعلق ایک الگ مضمون دیا گیا ہے۔ قلم رسول کی زندگی اور کارناموں کا تذکرہ زیرِ نظر کتاب میں ''چین اور تبت میں برطانوی ہند کی ایک غیر معمولی مہم''، مضمون میں ہے۔ رمضان علی اور دیگر کئی سرکردہ آرغون سے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہوئیں۔ اِس لئے یہاں محمد عیسیٰ، شکور علی، حبیب اللہ اور خوشحال رمضان کے تذکرے پر اِکتفا کیا جاتا ہے۔

محمد عیسیٰ: محمد عیسیٰ نے تیس سال تک متعدد مہم جو سیاحوں کے ساتھ وسط ایشیا اور تبت کی خاک چھانی۔ بہت سی مشہور مہموں میں وہ کارواں لیڈر تھا۔ ۱۹۰۴ء کی کرنیل ینگ ہسبنڈ کی سرکردگی میں بھیجی گئی لہاسہ کی مشہور جنگی مہم میں بھی محمد عیسیٰ کارواں لیڈر تھا۔

محمد عیسیٰ کا باپ چینی ترکستان کا تھا اور ماں لداخی بودھ تھی۔

سویڈن کے مشہور مہم جو محقق ڈاکٹر سون ہیڈین نے محمد عیسیٰ کی شخصیت کا نقشہ یوں کھینچا ہے: ''وہ اُونچے قد و قامت کا ایک ذی شان اِنسان تھا۔ ریچھ کی طرح مضبوط اور نہایت بردبار تھا۔ وہ نہایت ہی معتمد، دیانت دار، حاضر جواب،

ظریف اور خوش طبع اِنسان تھا۔ ہر وقت ہنسنے ہنسانے کے لئے تیار رہتا اور مایوس کن حالات میں سب کو خوش و خرم رکھتا تھا۔"

ہیڈین کے ساتھ تبت سے واپس آتے ہوئے یکم جون ۱۹۰۷ء کو وہ تبت میں اسکاڈوزونگ کے مقام پر چل بسا۔ وہ اِس وقت ۵۳ سال کا تھا۔

ہیڈین کو محمد عیسیٰ کی ناگہانی موت کا بہت دُکھ ہوا۔ وہ پانچ افراد کے ہمراہ برہم پُتر کا سنگم دیکھنے گیا تھا۔ جب واپس آیا تو محمد عیسیٰ بسترِ مرگ پر تھا۔ ہیڈین بڑے کرب سے لکھتا ہے:

"میری روانگی کے وقت میرا کارواں لیڈر ایک بلّی (Pole) کی طرح دراز قد اور سیدھا تھا اور ہمارے تھیلوں میں رسد ڈلوا رہا تھا۔"

محمد عیسیٰ کی میت کو اسکاڈوزونگ میں لہاسہ تجارتی شاہراہ کے پاس سپردِ خاک کیا گیا۔ ہیڈین نے قبر پر ایک پتھر کا کتبہ لگوایا، جس پر یہ عبارت نقش کرائی۔

"گیرے، ڈلگلیش، .... ینگ ہسبنڈ، رالنگ، رائڈر اور دیگران کے کارواں لیڈر محمد عیسیٰ، جو یکم جون ۱۹۰۷ء کو ۵۳ برس کی عمر میں سون ہیڈین کی سروس میں چل بسے۔"

اُس موقع پر کارواں سے خطاب کرتے ہوئے ہیڈین نے ترکی زبان میں مرحوم کو جن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ وہ محمد عیسیٰ کی عظمت کی نشان دہی کرتے ہیں:

"اپنے تمام سفر کے دوران میں نے اِس جیسا قابل، تجربہ کار اور وفادار کارواں لیڈر کبھی نہیں دیکھا۔ اُس نے کارواں کا نظم وضبط برقرار رکھا۔ وہ اس کے باپ تھے۔ اُس نے جانوروں کا بہت اچھا خیال رکھا۔ وہ نہایت ہی قابل مترجم تھے اور تبتیوں کے معاملے میں محمد عیسیٰ نے اِنتہائی حکمت عملی کا ثبوت دیا اور خوش مزاجی اور طبعی ظرافت سے سب کو خوش رکھا۔ مشکل صورتِ حال میں اُس نے آسان راہ نکالی۔

اجنبی ملک میں بہترین راستے کی تلاش میں وہ درّوں پر چڑھے۔ چوٹیاں سر کریں۔ وہ ہمیشہ خود گئے اور دُوسروں کو نہیں بھیجا۔ ہم اس کو ہمیشہ احترام سے یاد کریں گے۔ اس نے ایشیا کی کھوج میں اپنی اعلیٰ کارکردگی سے نام پیدا کیا ہے۔ مرحوم نے گذشتہ تین سال میں وفاداری اور دیانت داری سے میری طرح متعدد یورپیوں کی خدمات انجام دیں۔''

ہیڈین نے اپنی کتاب TRANS HIMALAYA میں جا بجا محمد عیسیٰ کا ذِکر کیا ہے۔ بقولِ ہیڈین ایشیاء میں محمد عیسیٰ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔

رالنگ (Rawling) اپنے تاثرات جیوگرافیکل جرنل اپریل ۱۹۰۹ء میں صفحہ ۴۲۲ پر اِن الفاظ میں پیش کرتا ہے:

''اسکاڈوزونگ کا ذِکر کرتے ہوئے مجھے سون ہیڈین کے وفادار خادم کے احترام میں ایک لمحہ رُک جانا چاہیئے جو یہاں فوت ہوئے۔ وہ نہایت ہی معتمد اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں غیر متزلزل اِنسان تھے۔ ایشیا پر اپنے تمام ہم وطنوں سے اس کی معلومات زیادہ تھیں۔ اس کی بدیہی وجوہات ہیں۔ وہ ینگ ہسبنڈ کے ساتھ چین کے مشہور سفر پر روانہ ہوئے۔ وہ کیلے کے ہم سفر تھے۔ وہ ڈلیگلیش کے ہم سفر تھے' جو بعد میں مارے گئے۔ محمد عیسیٰ بے یار و مددگار دیکھتے رہے۔ رُودوق کی مہم میں محمد عیسیٰ کارواں لیڈر کی حیثیت سے میرے شریکِ سفر تھے۔ حالیہ سفر میں وہ سون ہیڈین کے ہم سفر تھے اور تیس سال تک وفادارانہ خدمات کے بعد ایک ویران مقام پر اِنتقال کر گئے۔''

اِسی طرح ینگ ہسبنڈ، اوکونور اور رائڈر نے محمد عیسیٰ کے مرنے پر گہرے دُکھ کا اِظہار کیا ہے۔

محمد عیسیٰ کو کارکردگی کے لئے ینگ ہاسبنڈ کی طرف سے دیا ہوا تمغہ اور سند اُس کے لواحقین کے پاس ہیں۔

شکور علی: شکور علی بھی محمد عیسیٰ ،گلوان رسول اور قلم رسول کا ہم عصر تھا اور اُن کی طرح ایک سر کردہ مہم پسند انسان تھا۔ کئی اہم مہمات میں وہ ان کے ساتھ تھا۔ شکور علی بلتی تھا، آرغون نہیں تھا۔ وہ پہلا لداخی تھا جس نے ۱۸۷۷ء میں مشہور پیر مستق عبور کیا۔ مستق کا لفظی مفہوم یخ کا پہاڑ ہے۔ یہ پیر سچ مچ ہے بھی یخ کا پہاڑ۔

۱۸۹۰ء میں جب کرنل سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کو پامیر کی اہم مہم پر بھیجا گیا، شکور علی ینگ ہسبنڈ کا خانساماں تھا۔

وہ لارڈ ڈینمور کے ساتھ پامیر کی مہم میں شامل ہوا۔ اُن دنوں پامیر، رُوس، چین، افغانستان اور برطانیہ کی سیاسی ریشہ دوانیوں کا مرکز بنا تھا اور ساری طاقتیں ایک دُوسرے کو شک کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ ویلبی کی پُر آشوب مہم میں وہ کارواں کا ایک اہم فرد تھا۔ ویلبی نے بعد میں اُس کو اپنے ساتھ لیا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں وہ ہیڈین کے ساتھ تبت گیا۔ شکور علی کو ہیڈین اِن الفاظ میں یاد کرتا ہے:

''وہ فطری ظریف تھا۔ جب وہ منہ کھولتا تو آدمی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ وہ تجربہ کار اور کم تجربہ رکھنے والے لداخیوں میں میرا سب سے پرانا واقف کار تھا۔

ویلبی کی المناک مہم (۱۸۹۶ء) کے ایک سال بعد وہ متبرک جھیل مانسرور کی کشتی رانی کی مہم میں وہ میرے ساتھ تھا۔ وہ میرا ممد و معاون ہی نہیں تھا بلکہ اپنی ظرافت سے میرے لئے تفریح کا سامان بھی فراہم کرتا تھا۔ شکور علی دیانت دار، صحت منداور طاقت ور انسان تھا۔ وہ اپنا کام کہے بغیر اور کسی سے جھگڑا کئے بغیر سرانجام دیتا تھا اور ہر قسم کا فریضہ انجام دینے کے لئے ہر آن رضا منداور کمر بستہ رہتا تھا۔ جھیل کے وسط میں جب ہمیں طوفان نے آگھیرا، اُس وقت بھی وہ پُر سکون اور خوش مذاق تھا۔ میں نے دوبار اُسے ایک بچے کی طرح روتے دیکھا۔ پہلی دفعہ جب محمد عیسیٰ کی نعش سپردِ خاک کی گئی اور دُوسری بار جب ہم ایک دُوسرے سے جدا ہوئے۔''

ینگ ہسبنڈ نے اپنی ایک مہم سے متعلق لکھا ہے:

''ہم ایک گلیشیر کے پاس پہنچے، جس سے ایک تیز رو نالہ نکل رہا تھا۔ ہمیں یہ نالہ عبور کرنا تھا۔ پانی کمر تک گہرا تھا اور اِس میں یخ کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ میرے پاس بدلنے کے لئے کپڑے نہیں تھے۔ اِس مرحلے پر وفا شعار شکور علی نے' جو میرے ہمراہ اِس سے قبل دو سفر کر چکا تھا' اپنی رضا مندی سے مجھے پیٹھ پر اُٹھایا۔''

''پامیر'' میں ڈینمور نے شکور علی سے وابستہ ایک لطیفہ سنایا ہے۔ پامیر کے سفر کے دوران شکور علی کو کھانسی کی شکایت ہوئی۔ ڈینمور نے چوسنے کے لئے اُسے لوزنجیز Lozenges دئے۔ کارواں کے دُوسرے قلیوں کے کان میں لوزنجیز کی مٹھاس کی بھنک پڑی اور اُن کو بھی یہ کھانے کا شوق ہوا۔ اب کیا تھا۔ کارواں کے سارے قلیوں کو کھانسی کی شکایت ہوئی۔ چنانچہ ڈینمور نے اُن سبھوں میں لوزنجیز بانٹے۔

ینگ ہسبنڈ نے شکور علی کی بڑی سراہنا کی ہے۔ اُس کی سفارش پر مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے شکور علی کو تمغہ اور سند عطا کی، وظیفہ مقرر کیا اور بیگار معاف کرایا۔ اپنی کتاب ''کشمیر'' میں شکور علی کی تصویر نمایاں طور شائع کی ہے۔

حاجی حبیب اللہ: میں نومبر ۱۹۷۳ء میں لیہہ میں حاجی حبیب اللہ سے ملا۔ وہ ''جنگ بامٹی'' خاندان کی آخری یادگار تھے۔ اُنہوں نے مجھے اپنے سفر کی کچھ روئداد سنائی۔ ۱۴-۱۹۱۳ء میں وہ ڈاکٹر فیلیپو فیلیپی کی مہم قراقرم میں شامل تھا۔ اُس وقت کارواں میں اُن کی عمر سب سے چھوٹی تھی۔ ڈاکٹر فلیپو فلیپی نے اپنے سارٹیفکیٹ میں اِس کا ذِکر کیا ہے۔ گلوان رسول اُس مہم میں کارواں لیڈر تھا۔

حاجی حبیب اللہ نے ڈاکٹر ٹنکلر کے ساتھ اکسائی چین، امریکی مہم جو سیاح رابرٹ براٹ کے ساتھ بلتستان میں باشو بلدور اور میجر میسن کے ہمراہ شاد کام نالہ کا سفر کیا۔ اُنہوں نے روز ویلٹ اور تھیوڈر روز ویلٹ کے ساتھ بھی لداخ میں مختصر سفر

کیا۔ جب ۱۹۲۱ء میں وہ امریکہ سے لداخ آئے تھے جہاں سے وہ ایک سائنسی مہم پر چینی ترکستان روانہ ہوئے۔ دونوں امریکی صدر روز ویلٹ کے بیٹے تھے۔

خوشحال رمضان: حال کے آرغون مہم جوؤں میں خوشحال رمضان نسبتاً ایک مثالی مہم پسند آدمی ہو گزرا ہے۔ اُس نے چین، برما، رُوس، تبت وغیرہ کی سیاحت کی۔ زار رُوس کی ایک نواسی اور اُس کے شوہر کی جلاوطنی کے ایام میں وہ کچھ مدت کے لئے اُن کا معتمدِ خاص تھا۔ وہ شہزادی کے دامِ محبت میں گرفتار ہوا تھا لیکن یہ محبت پروان نہیں چڑھی۔ اس سے وہ ذہنی طور ذرا سا غیر متوازن ہو گیا تھا۔ اِس لئے وہ ڈھنگ سے باتیں نہیں کرتا تھا۔ جب کبھی اُس سے سفر کے حالات دریافت کئے جاتے تو وہ اول فول کہتا تھا۔

خوشحال رمضان کے متعلق لیہہ میں یہ تاثر عام تھا کہ بادیہ پیمائی اور مٹر گشتی میں ہی اُس کی رُوح کو سکون ملتا ہے۔ ایک مقام پر کچھ مدت رہنے کے بعد وہ مضطرب اور بے چین ہو جاتا اور اُس کی مہم جوئی اُسے کہیں سے کہیں لے جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ پیدل سفر کرتا تھا۔ لیہہ سرینگر سڑک بننے سے پہلے' جب یہ سفر کٹھن سمجھا جاتا تھا' خوشحال رمضان لیہہ اور سرینگر کے درمیان سال میں کئی مرتبہ اور کبھی سال میں متعدد بار سفر کرتا تھا۔ وہ گھوڑا اور بستر کے لوازمات اور اشیائے خورد و نوش کے تکلّفات سے بے نیاز سفر کرتا تھا۔

وہ جہاں بھی جاتا اپنے لئے گزارے کا سامان پیدا کر لیتا۔ کبھی بچوں کے لئے پاپوش، کھلونے ٹوپیاں وغیرہ بناتا۔ کبھی ایک چھوٹا موٹا ہوٹل چلاتا۔ جب کچھ رقم پس انداز ہوتی تو خدا کا یہ نیک اور عجیب بندہ دوبارہ سفر پر نکلتا اور اپنی پونجی لٹا دیتا تھا۔ اُس کے پاس نسوار کا ایک بڑا ڈبہ تھا۔ کہتے ہیں ہنگامی حالت میں وہ اِس میں چائے بھی بنا لیتا تھا۔

رمضان اپنے پرانے ''جنگ بامٹی'' گروپ کی طرح ناچ گانے کا دلدادہ

اور ہنسی مذاق کا شیدا تھا۔

یہ دلچسپ باغ و بہار آدمی سرینگر میں دسمبر ۱۹۷۰ء میں اپنے رشتہ داروں اور ہم وطنوں سے دُور کسمپرسی کے عالم میں فوت ہوا۔ وہ رعناواری کے قبرستان میں مدفون ہے۔

لداخ کے دُوسرے آرغون مہم جوؤں کی طرح اُس کی زندگی ماضی کے گم شدہ اوراق بن چکی ہے اور اُس کی قبر گمنام ہے۔

بیسویں صدی کے پہلے رُبع میں صحرائے گوبی کے لوب نور اور چینی ترکستان کے مدفون آثارِ قدیمہ اور نوادرات کی کھوج میں کئی آرغون کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اِس کے تذکرہ کے لئے ایک مفصل باب چاہئے۔

محمد عیسیٰ
(کارواں لیڈر)

چین اور تبت

میں برطانوی ہند کی ایک غیر معمولی مہم

۴؍مئی ۱۸۹۶ء کو ایک انگریز فوجی افسر ایم. ایس. ویلبی M.S. Welleby کی سرکردگی میں برطانوی ہند سرکار کی طرف سے ایک تحقیقی مہم لیہہ سے تبت کی راجدھانی لہاسہ کی طرف روانہ ہوئی لیکن لہاسہ سے بہت دُور اندرونِ تبت سے اس سے واپس کی اور مہم کے ارکان دُشوار گذار اور نامعلوم راستے سے چین کے صوبہ کانسو کی طرف روانہ ہوئے۔ اس مسافت کے دوران یہ راستے سے بھٹک گئے اور یکے بعد دیگرے تقریباً سارے باربردار اور سواری کے جانور مر گئے۔ راشن اور سامان پھینکنا پڑا۔ سفر کے دوران کپتان ویلبی اور لداخی گھوڑے والوں، خدمت گاروں وغیرہ میں ناچاقی ہوئی۔ ویلبی نے چار لداخیوں کو ٹیم سے نکال دیا۔ بقولِ ویلبی یہ ٹیم سے الگ ہوئے۔ سفر کی صعوبتوں کے علاوہ سبھوں کو بھوک اور پیاس سے سخت مصائب اُٹھانے پڑے۔ دو افراد تختہ آخون اور سُولُو پُوریگپا مر گئے۔ قلم رسول، جمعہ مالک اور محمد رحیم زندگی اور موت سے لڑتے ہوئے بقولِ قلم رسول تین سال بعد گھر پہنچے۔ اِس سے پہلے اُن کے اہلِ خاندان نے اُن کی زِندگی سے مایوس ہوکر اُن کی آخری رسومات کے طور پر قرآن خوانی اور فاتحہ خوانی کی تھی۔

ایک لداخی عثمان چُونکا وطن واپس نہیں لوٹا اور ایک گمنام بستی میں فوت ہوا۔ ویلبی اور اُس کے ساتھی جنگلی جانوروں کے شکار کرتے، اُن کے گوشت کھاتے اور کبھی فاقہ کشی کرتے ہوئے تین ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے چھ ماہ سے کچھ

زیادہ مدّت بعد چین کی راجدھانی پیکینگ (بیجینگ) پہنچے۔ ویلبی کے ہمراہ اُس سفر میں اُس کا کتا رُوبی بھی تھا۔

سفر کی روئداد دِلچسپ اور حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ اِنتہائی جرأت اور عزم و اِستقلال کی ایک مثالی داستان ہے۔ اِن واقعات کی روشنی میں یہ مہم سنٹرل ایشیا، تبت اور چین جانے والی یورپ کی دُوسری تحقیقی، سیاسی اور تجارتی مہمات سے جداگانہ اور منفرد ہے۔

تبت سے وابستہ ایک محقق اور تاریخ دان گراہم سینڈ برگ' کپتان ویلبی کی اس مہم سے متعلق رقم طراز ہے: "بالآخر یہ (مہم کے ارکان) چوک گئے اور بھٹکتے رہے......تاہم یہ کارآمد تحقیقی کام ایک کارنامہ تھا۔ خاص کراکا تاگ (آرکا تاغ) کے جنوب میں دو لمبے سلسلہ ہائے کوہ کے صحیح راستے سے متعلق زیادہ اہم معلومات سے ہمارے نقشوں میں اِضافہ ہوا ہے۔"

زیرِ نظر مضمون میں ہم اُس اجمال کی تفصیل پیش کریں گے۔

اس سفر کے تین راوی ہیں۔ ایک کپتان ایم. ایس. ویلبی ہے، جس نے اپنی کتاب Through unkonwn Tibet (مطبوعہ ۱۸۹۸ء) میں اِس کا ذِکر کیا ہے۔ ویلبی ملکہ برطانیہ کے گھوڑ سوار رجمنٹ ۱۸ ہُوسارز میں کپتان تھا۔ اُس کے ہمراہ دُوسرا انگریز فوجی افسر لیفٹیننٹ سرنیل ملکولم تھا۔ وہ پانچ سال سے Argyll and Southerland Highlanders میں اپنا فریضہ سرانجام دے رہا تھا۔

دُوسرا راوی ایک افغان شہزادہ میر خان ہے، جو برطانوی ہند فوج میں ملازم تھا اور اُس نے سروے اور نقشہ کشی کی ٹریننگ حاصل کی تھی۔ اُس نے اس سے پہلے ینگ ہاسبنڈ کے ساتھ سفر کیا تھا۔

شہزادہ میر نے اپنا سفر نامہ اُردو میں "شاہِ سفر سیرِ دُنیا" کے نام سے لکھا ہے۔ اور کرنل. سی. اے. بوئلے Boyle نے اس کا انگریزی میں A Right Royal

World Tour کے عنوان سے ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔

ایک یورپی سائمن ڈگبائی Simon Digby نے حال میں شہزاد میر کے سفر نامے کو From Nawshahra To Peking کے نام سے اپنے الفاظ میں تنقیدی انداز میں پیش کیا ہے۔

سائمن ڈِگبائی نے کپتان ویلبی کی کتاب سے بھی جا بجا حوالہ دیا ہے۔

شہزاد میر افغانستان میں نوشہرہ کا رہنے والا تھا۔ اپریل ۱۸۹۶ء میں اس کے رجمنٹ کے کمانڈر کرنل ہیتھ نے اُس کو گھر سے بلایا جہاں وہ دو ماہ کی چھٹی پر تھا۔ کرنل نے اُس کو ہدایت دی کہ اس کو کپتان ویلبی کے ہمراہ چین جانا ہے۔ وہ لیفٹیننٹ ملکولم کے ساتھ لیہہ روانگی کے لئے کشمیر روانہ ہوا۔ جہاں کپتان ویلبی سے ملاقی ہوا۔ قوی ہیکل افغان چھ فٹ سے زیادہ لمبا تھا۔ وہ انگریزوں کے ماحول میں رہا تھا اور اُن کے دبدبے سے مرعوب اور طور طریقوں کا پابند تھا۔ جبکہ کارواں لیڈر تختہ احمد آخون اس کا متضاد تھا۔ اُس نے شہزاد میر کو انگریز افسر کو سلام کرنے پر سرزنش کی۔ تختہ احمد آخون (یارقندی) ترکی تھا۔

تیسرا راوی ایک لداخی قلم غلام رسول ہے، جو قلم رسول یا بابا قلم کے نام سے مشہور ہے۔ قلم رسول مہم کا ایک رُکن تھا۔ وہ تجربہ کار سائیس، خانساماں اور مترجم تھا اور کئی زبانیں جانتا تھا۔

قلم رسول نے اپنے سفر کی روئداد ۱۹۳۳ء میں لیہہ کے ایک شوقین فرد منشی غلام محی الدّین کو سنائی۔ منشی نے اُسے نوٹ کیا اور اپنی تحریری یادداشت راقم الحروف کو دی۔ تب قلم رسول تیریسٹھ سال کا تھا۔

جنوری ۱۹۴۱ء میں لیہہ کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان ایلی ایز رجولدن نے قلم رسول کی زبانی اُس سفر کی آپ بیتی سننے کے لئے ضیافت کا انتظام کیا۔ وہ سرینگر سے تعلیم مکمل کر کے لوٹے تھے۔ ضیافت کی دو نشستیں ہوئیں۔ سردی کا موسم تھا۔ کمرہ گرم کرنے کے لئے بخاری کا انتظام کیا۔ بابا قلم کا بھائی جمعہ مالک بھی ضیافت میں شامل

ہوا۔ وہ اُس سفر میں قلم کے ساتھ تھا۔ قلم رسول بیچ بیچ میں جمعہ سے تصدیق کراتا تھا کہ کیا وہ ٹھیک بول رہا ہے۔

اُس مجلس میں جولدن کے والد اور چند دوستوں نے بھی شرکت کی۔

قلم رسول کا شمار لداخ میں خوبصورت گفتگو کرنے والوں میں ہوتا تھا۔ جولدن لکھتے ہیں: ''بابا قلم کو داستان گوئی کا ملکہ حاصل تھا۔ زبان کی روانی، اندازِ بیان، آواز میں زیر و بم، متناسب حرکات و ساکنات، درمیان میں یہاں وہاں مبالغہ آرائی، جن کے بغیر سننے والوں کو داستان گو بور لگیں گے۔ بابا غلام دُوسروں کو ہنسانے کے گُر جانتے ہیں لیکن خود کبھی نہیں ہنستے۔''

ایلی ایزر جولدن نے قلم رسول پر ایک مضمون معہ فوٹو Adventure of Baba Kalam کے عنوان سے اپنی کتاب Harvest Festival of Buddhist Dards of Ladakh and other Essays میں شامل کیا ہے۔ ایلی ایزر جولدن کو لداخ کی تاریخ پر گہری بصیرت تھی۔ لیہہ کے ڈِگری کالج کو اُن کے نام پر رکھا گیا ہے۔

جولدن کو مہم میں شریک ایک اور لداخی ایشے چھرنگ کو دعوت پر نہ بلائے جانے کا افسوس ہے۔ ایشے چھرنگ اُن دِنوں حیات تھا۔

قلم رسول کی آپ بیتی اِس حقیقت کی ایک زِندہ مثال ہے کہ زندہ رہنے کے لئے اِنسان کتنی جدوجہد کرتا ہے۔

راویوں کے بیان میں کہیں کہیں تھوڑا تفاوت ہے۔ شہزاد میر نے ویلبی کی طرح روزانہ ڈائری میں یادداشت نہیں رکھی تھی اور سفر کے بعد اپنے حافظہ کے سہارے اپنی سرگذشت لکھی تھی۔ ویلبی سائنسی طور پر اپنے سفر کا تقریباً دوتہائی حصہ ریکارڈ کر پایا۔ باقی ایک تہائی مقامات وہ پہچان نہیں سکا۔

ویلبی اور شہزاد میر نے کارواں کے کئی لداخیوں پر بغاوت کا اِلزام لگایا ہے اور اُنہیں بھگوڑا اقرار دیا ہے۔ قلم رسول کو باغیوں کا سرغنہ کہا ہے جبکہ قلم رسول اور

لداخیوں کا کہنا ہے کہ ویلبی نے اُنہیں ایک ایسی جگہ زبردستی پارٹی سے نکال دیا کہ جہاں سے نہ وہ لداخ واپس جا سکتے تھے اور نہ آگے سفر جاری رکھنا محفوظ تھا۔ اُن کی اِستدعا اور اِحتجاج کے باوجود ویلبی اُنہیں پارٹی میں رکھنے پر آمادہ نہیں ہوا۔

کپتان ویلبی کی مہم کی ناکامی کے کئی اسباب ہیں۔ کپتان نے اِس دُشوار گذار خطّے میں اپنی مہم کے لئے ٹھیک طرح سے اِنتظامات نہیں کئے اور جانکار لوگوں سے پیشگی معلومات حاصل نہیں کیں۔ ایک ترکی تختہ احمد آخون کو کارواں لیڈر بنایا۔ جس کو ایسے سفر کا خاص تجربہ نہیں تھا۔ ویلبی کی تختہ آخون سے سرینگر میں ملاقات ہوئی تھی اور اپنے ساتھ لایا تھا۔ ویلبی نے لداخی ملازموں کو اپنے اعتماد میں نہیں لایا اور اُنہیں اپنی منزلِ مقصود سے متعلق اندھیرے میں رکھا۔ وہ بڑا شکی تھا۔ کارواں کے ممبروں سے متعلق اُس کا نظریہ منفی تھا۔ سائمن ڈِگبائی کے مطابق اس ضمن میں اُس کی سوچ معاندانہ تھی۔ جبکہ اسی قبیل کی مہمات میں جانے والے یورپیوں کے ساتھ لداخی ملازموں کے تعلقات عموماً بڑے خوشگوار رہے اور یورپیوں نے اُن کی بڑی تعریفیں کی ہیں لیکن ویلبی الگ خمیر کا بنا ہوا تھا۔ دورانِ سفر ایک دن ویلبی نے ایک لداخی سائیس پر ہاتھ اُٹھایا۔ تمام لداخیوں نے اُس کے ردِ عمل میں ویلبی کی نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنے بستر باندھ دیئے۔ ویلبی لسُو آرغون اور ایشے چھرنگ کو منانے میں کامیاب ہوا۔ شہزاد میر نے شکور علی کو سمجھا بجھا کر جانے سے روک لیا۔ اُن کے بغیر مہم کو جاری رکھنا مشکل تھی۔

لیہہ پہنچنے پر کپتان ویلبی نے بائیس خچریں اور سترہ ٹٹو خریدے۔ شہزاد میر نے خچروں اور گھوڑوں کی تعداد ستر بتائی ہے، جن پر نو ہزار روپے خرچ آئے۔ لیہہ کے ناظمِ اعلیٰ بشن داس کی مدد سے ذیل کے سائیس، خدمت گار اور خانساماں بھرتی کئے۔ لسُو آرغون، ایشے چھرنگ، سُولو پُوریگپا، جمعہ مالک، محمد رحیم، باقر حاجی، عثمان چُونکا اور قلم رسول۔ ایک لداخی شکور علی کو تختہ آخون اپنے ساتھ سرینگر سے لایا تھا۔

لسُو آرغون ایسے سفر کے لئے ہرفن مولا تھا۔ وہ باورچی کے علاوہ ایک اچھا سائیس ، ترکھان، درزی اور نائی تھا۔ ویلبی لکھتا ہے: ''اُس کے بغیر اس کا سفر مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔''

ایشے چھرنگ باورچی اور خدمت گار تھا۔ ویلبی کے لئے اُس نے تبتیوں کے ساتھ بات چیت میں مترجم اور صلاح کار کا کام کیا۔ ویلبی لکھتا ہے: ''اُس کی رنگت کالی ہے۔ حلیہ میں چھبیلا پن ہے۔ سر پر چٹیا رکھی ہے اور کانوں میں بُندے ہیں۔''

سُولُو پُوریکپا علاقہ کرگل کا رہنے والا تھا۔ اُس سے متعلق سفرناموں میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

جمعہ مالک تجربہ کار سائیس تھا۔ اُس سے متعلق یہ لکھا گیا ہے کہ وہ گھوڑا پکڑنے میں ماہر تھا۔

محمد رحیم اچھا سائیس تھا۔ وہ ترکی اور تبّتی دونوں زبانیں جانتا تھا۔

باقر حاجی یارقندی ترکی تھا۔ وہ سفر کے لئے موزوں ثابت نہیں ہوا اور مئی میں ہی اُس کو واپس جانے دیا۔

عثمان چُونکا سیاہ رنگ کا قد آور اور طاقت ور جوان تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک رُوسی کے ہمراہ چینی ترکستان کا سفر کر چکا تھا۔ شروع میں ویلبی عثمان کی ہوشیاری اور رقص سے متاثر لگتا ہے، جب لیہہ میں ویلبی کے اعزاز میں منعقدہ ایک شبانہ تقریب میں عثمان نے شراب کی صراحی سر پر لئے ایک والہانہ ناچ پیش کیا تھا۔ بعد میں عثمان کی یاد میں لیہہ کے چُونکا خاندان نے اپنی ایک اولاد کا نام عثمان رکھا، جو عثمان چُونکا کے نام سے جانا جاتا ہے۔

شکور علی تجربہ کار اور مہم جو مسافر تھا۔ اس مہم سے پہلے وہ کئی مہمات میں حصہ لے چکا تھا۔ ۱۸۷۷ء میں اُس نے ینگ ہاسبنڈ کے ہمراہ مشہور پیر مُستق عبور کیا تھا۔ مُستق کا مطلب یخ کا پہاڑ ہے۔ ۱۸۹۰ء میں وہ ینگ ہاسبنڈ کے ساتھ پامیر گیا۔ سون ہیڈین نے شکور علی کو فطری ظریف کہا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ''جب وہ منہ کھولتا تو

آدمی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتا تھا۔"

شکور علی ۱۹۴۰ء میں فوت ہوا۔ اُس کے ایک سال بعد کرنل ینگ ہاسبنڈ نے بی۔ بی۔ سی کے ایک نشریئے میں شکور علی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا: "وہ ہمیشہ خوش و خرم رہتا تھا۔ جو کچھ کہیئے اُسے پورا کرنے کے لئے ہمیشہ تیار ہوتا تھا۔ اور ایک پہاڑ کی طرح مضبوط تھا۔"

قلم رسول ایک تجربہ کار کارواں کا آدمی تھا۔ وہ نہایت ہی زندہ دل، ظریف اور رنگین مزاج تھا۔ اس کے ایک ہم عصر مہم جو رسول گلوان اپنی کتاب میں لکھتا ہے: "وہ بڑا افضول خرچ تھا اور بڑی دلچسپ گفتگو کرتا تھا۔" اس سے وابستہ کئی لطیفے آج تک مشہور ہیں۔

قلم رسول سے متعلق لیہہ میں یہ مثال مشہور تھی کہ اُس نے ساری زندگی گھوڑے کی پیٹھ پر گزاری۔ اگر ہم اُس کی زندگی کی ساری کڑیاں ملائیں تو اس حقیقت کی توثیق ہوتی ہے۔ تاریخ کے اُستاد ہمیں بتاتا تھا کہ اگر قلم رسول اپنے سفر کی روئداد لکھتا تو مشہور سیاح مارکو پولو کی طرح اُس کا نام بھی لیا جاتا۔

کمسنی میں باپ کا سایہ اُس کے سر سے اُٹھ گیا۔ چنانچہ دس سال کی عمر میں اُسے زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑی۔

جولدن صاحب رقمطراز ہیں: "بابا قلم شاہسوار تھا۔ ایک دفعہ لیہہ کے انگریز جوائنٹ کمشنر نے بابا قلم کے ہاتھ گلگت کے پالٹیکل ایجنٹ کو ایک ضروری خط بھیجا۔ بابا قلم نے ایک چھڑی پر وہ خط اور سرخ کپڑے کا ایک ٹکڑا باندھا اور گھوڑے کو لیہہ سے مسلسل سرپٹ دوڑاتا ہوا وہ خط چوبیس گھنٹے میں گلگت میں مکتوب علیہ تک پہنچایا۔ تب پیدل یا گھوڑے پر لیہہ سے گلگت معمول کے سفر میں کم سے کم پندرہ روز لگتے تھے۔ اُس غیر معمولی سفر کے لئے اِنتظامیہ نے لیہہ تا گلگت ہر پانچ میل یا لگ بھگ اتنے ہی فاصلے پر ایک گھوڑے کا اہتمام کیا تھا اور رات کو گھوڑے والے کے پاس سرراہ الاؤ

جلائے رکھا تھا۔ بابا قلم جواب لے کر فوراً لداخ لوٹا اور لیہہ سے چھ کلومیٹر دور سپتیک میں برٹش جوائنٹ کمشنر کو جوابی خط حوالہ کیا۔ برٹش جوائنٹ کمشنر بہت خوش ہوا۔ جوان سالہ قلم کو تھپکی دی اور چند روپے انعام میں دیئے۔''

جولدن صاحب لکھتے ہیں: ''بابا قلم اپنے لباس کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ گھٹنے تک اُونچا پالش سے چمچماتا ہوا رُوسی جیک بوٹ پہنتا تھا۔ جمعہ کے روز وہ لمبا ساتر کی ریشمی پیٹی دار کوٹ زیب تن کرتا اور سفید صافہ باندھتا تھا۔ ایسے میں وہ ایک امیر ترک لگتا تھا۔''

قلم رسول اور اُس کے چند اہم عصر ساتھیوں نے لداخیوں کو چین کے اژدھا، شیر اور کشتی ناچ سے روشناس کیا۔ جو اکثر لیہہ کے تمدنی پروگراموں اور تیراندازی کے تیوہاروں میں دِکھائے جانے لگے۔ اُنہوں نے یہ ناچ کاشغر میں دیکھے تھے۔

قلم رسول نے ایک چیل پال رکھا تھا۔ آزاد چھوڑا ہوا یہ پالتو چیل اپنی مرضی سے پنجرے میں آتا جاتا تھا۔ بابا قلم سے وہ بڑا مانوس تھا۔ گھر سے باہر کہیں بابا قلم پر اُس کی نظر پڑتی تو وہ بلندی سے غوطہ کھاتا ہوا اُن کے سر پر آبیٹھتا۔

اپنے ہم عصر مسافر ساتھیوں میں قلم رسول نے سب سے لمبی عمر پائی اور اکیاسی سال کی عمر میں چل بسا۔ ۱۹۳۳ء میں جب وہ تریسٹھ سال کے تھے، منشی غلام محی الدّین سے کہا۔ ''میں اب تریسٹھ سال کا ہوں۔ اسے بڑھاپا کہا جاتا ہے لیکن میری صحت اور تندرستی دیکھئے۔ میں ابھی بھی جوان ہُوں۔ میرے بال اور داڑھی قدرے سفید ہوگئی ہے لیکن آج کل کے پینتیس سالہ جوان کے بال اور داڑھی زیادہ سفید ہیں۔ میرا قد ۵ فٹ ۴ اِنچ ہے اور رنگ گندمی ہے۔''

بعد میں وہ گھوڑے کی خرید وفروخت کی دلالی سے اپنی گزر بسر کرتا تھا۔

کپتان ویلبی کی مہم سے صرف ایک سال پہلے ۱۸۹۵ء میں قلم رسول، جارج

آر لیٹیل ڈیل کے ہمراہ تبت کے ایک لمبے سفر پر گیا تھا اور لہاسہ کے نزدیک پہنچا تھا۔ جہاں سے مسلح تبتیوں نے اُن کو زبردست واپس کیا تھا۔ قلم رسول نے واپسی کے سفر میں، جب تبتیوں نے گھوڑے اور رسد کی فراہمی میں تعاون نہیں کیا تو' دلائی لاما کے نمائندے کا بہروپ اِختیار کر کے پارٹی کے لئے رسد اور گھوڑوں کا اِنتظام کیا تھا۔

ایلی ایزر جولدن نے سنٹرل ایشیاء، تبت، چین وغیرہ میں یورپی محققوں کے سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے: ''سائیس یا گھوڑے والے لگام کاٹھی وغیرہ کی مرمت کے لئے کمر بند سے باندھے ہمیشہ ایک بڑا سوا اور چاقو رکھتے تھے۔ خانساماں اپنے ساتھی کے ساتھ نئی منزل کی جانب روز پہلے نکلتا تھا۔ اُن کے ساتھ ایک چھوٹا تنبو ہوتا تھا۔''

صاحب کے ہمراہ بندوق، قطب نما اور بلندی کی پیمائش کا آلہ لئے ایک اردلی ہوتا تھا۔

ایسے سفر میں صاحبوں کے اِستعمال کے لئے فولڈنگ بیڈز، چلمچی، کرسیاں اور میزیں لی جاتی تھیں۔ نوکر جب سو رہے ہوتے، صاحب بادوباراں میں کام آنے والی لالٹین کی روشنی میں ڈائیری لکھتے تھے۔ اِس لئے اُس لالٹین کو ہری کین Hurricane لالٹین کہا جاتا ہے۔

یورپین محققوں نے ایسے سفر کے لئے خاص طور پر لداخ کے آرغون مسلمانوں کو موزوں قرار دیا ہے اور اُن کی کارکردگی کو سراہا ہے۔

ویلبی کے مطابق اُس کی مہم کا مقصد تبت کے مشرقی علاقے سے ہوتا ہوا شمالی خطّے میں جانا اور سروے کرنا تھا۔ جس سے متعلق لوگ بہت کم جانتے تھے۔ پھر چین کے دریائے یانگسی کا منبع معلوم کرنا اور نان شان سلسلہ ہائے کوہ کو عبور کر کے وہاں سے چین کی راج دھانی پیکینگ (بیجنگ) پہنچنا تھا۔ بقولِ ویلبی وہ دُنیا کے اُس نا معلوم پُر اسرار خطّے سے پردہ اُٹھانے کا خواہش مند تھا۔

شہزادمیر اور لداخیوں کے مطابق ویلبی پہلے لداخ کے آخری سرحدی گاؤں چھوشول کے پاس پنگونگ کے جنوب سے تبت کی سرحد میں داخل ہوا۔ جہاں سے بارہ پڑاوٗ طے کرنے کے بعد حکام اور مسلح لوگوں نے اُن کو واپس کیا۔ دُوسری دفعہ شمال کی طرف سے آگے جانے کی کوشش کی۔ یہاں سے بھی اُن کو واپس کیا۔ شاید ویلبی کی منزل دُوسرے یورپیوں کی طرح لہاسہ تھی۔ اُن دِنوں دلائی لامہ کے حکم پر تبت میں یورپیوں کے داخلہ پر سخت پابندی تھی۔

شہزادمیر کے سفر نامہ کے مطابق اس کے بعد ویلبی نے لانق لا کے شمالی مغربی دروں سے چانگ سطح مرتفع کی طرف کوچ کیا۔ اُن کی پہلی منزل نان شان اور چین کا کانسوصوبہ تھا۔ اس راستے سے بہت کم لوگ گزرتے تھے۔ لداخی سائیسوں اور ر. ,وں کو اِس راستے کا علم نہیں تھا۔ ایلی ایزرجولدن کے اندازہ کے مطابق وہ تبت کے مشرق میں کون لون سلسلہ ہائے کوہ کے جنوب میں سفر کر رہے تھے۔ لداخیوں نے ویلبی کو جانا پہچانا راستہ اِختیار کرنے کا مشورہ دیا لیکن ویلبی نے نہیں مانا۔ جون کے مہینے کے دوران مہم کے ارکان سولہ ہزار فٹ بلند اور کبھی کبھی سترہ ہزار فٹ کے بلند مقامات پر بھٹکتے رہے۔ جہاں کوئی بستی یا خانہ بدوشوں کا کوئی کیمپ نہیں تھا۔

ایک روز چرائی کے دوران جانور گم ہوگئے۔ اُنہیں ڈھونڈنے میں پورا ایک دِن لگا۔ ویلبی شکی مزاج تھا ہی، قلم رسول سے بولا کہ لداخی سائیس جانوروں کو لے کر فرار ہوگئے ہیں۔

جب تختہ آخون سے کام نہیں بنا، ویلبی نے قلم رسول کو کارواں کا لیڈر بنایا۔ قلم رسول نے اپنی آپ بیتی میں کہا ہے: "جب رسد کم ہونے لگی اور مال مویشی مرنے لگے تو ویلبی نے تختہ آخون کے بجائے مجھے کارواں لیڈر بنایا۔ میں نے صاحب بہادر کو کہا اب مجھے کارواں لیڈر بنانے سے کیا فائدہ ہے؟ اگر لداخ میں ہم میں سے کسی کو کارواں لیڈر بنایا ہوتا تو بہتر اِنتظام کرسکتا تھا۔" تختہ آخون کو اِس قسم کے سفر کا خاص

تجربہ نہیں تھا۔ سفر کیے تقریباً ایک ماہ بیت گیا۔ سامانِ خورد و نوش ختم ہونے لگا۔ کئی گھوڑے اور خچر مر گئے۔ جو زندہ بچے، وہ مرنے کے قریب تھے۔

اِس ضمن میں شہزاد میر لکھتا ہے: ''شروع میں قلم رسول بطورِ کارواں لیڈر تختہ کے مقابلے میں بہتر ثابت ہوا لیکن جب آگے سفر زیادہ مشکل ہوا اور خوراک کم پڑی تو ان لوگوں میں بے اطمینانی پھیلی اور یہ زود رنج اور کاہل بن گئے۔''

اِسی اثناء میں سُولُو پُوریکپا' بندوق کی اِتفاقیہ گولی چلنے سے سخت مجروح ہوگیا۔ ویلیبی کے مطابق محمد رحیم اور لسُو آرغون کے درمیان ۲۷ رجون کو شاٹ گن چھیننے کی کشمکش میں اِتفاق سے گولی چل گئی اور سُولُو پُوریکپا کا آدھا چہرہ اُڑ گیا۔ تاہم حقیقت اس سے قدرے مختلف تھی جو قلم رسول نے ایلی ایز رجولدن کو بتائی۔ ماضی میں لیہہ میں نیم مذہبی تیوہار دوسموچھے کے موقعے پر گھوڑ دوڑ ہوتی تھی۔ لیہہ کا ایک شخص ایشے پنچگ گنگبا اس موقعے پر اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا ایک توڑے دار بندوق سے گولی چلاتا تھا۔ لداخی راجہ اور رانی لیہہ بازار میں اپنی رہائش گاہ کی کھڑکی سے یہ نظارہ دیکھتے تھے۔ لسُو آرغون نے صاحب کی بندوق اُٹھائی تھی۔ غالباً محمد رحیم نے اُس سے بندوق چھین لی تھی۔ وہ ایشے پنچگ گنگبا کی نقل کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے قلم رسول سے کہا کہ وہ گنگبا کا رول ادا کر رہا ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنے گھوڑے کو تیز دوڑاتے ہوئے بندوق کی نالی کارواں کے دُوسرے آدمیوں کی طرف کر کے بندوق کے گھوڑے کو دبایا، جس سے سُولُو زخمی ہوا۔ محمد رحیم کو یہ خیال تھا کہ بندوق میں گولی نہیں ہے۔ دونوں صاحب کو جب معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے اور محمد رحیم اور لسُو کو سخت سرزنش کی۔ قلم رسول نے صاحب سے کہا کہ یہ صاحب کی غلطی ہے۔ بندوق حوالہ کرنے سے پہلے میگزین میں سے گولیاں نکال دینی چاہئیں تھیں۔

بات آئی گئی ہوگئی لیکن بیچارہ سُولُو زِندگی سے مایوس تھا۔ ویلیبی نے لکھا ہے: ''زندگی سے مایوس سُولُو نے ایک لداخی ساتھی سے کہا کہ اُس کو لداخ میں فلاں آدمی

نے بیس روپے دینے ہیں۔ اُس آدمی سے یہ رقم لے کر اُس کے بھائی کے حوالہ کر دے۔ اُس نے اپنی بیوی کو رقم ہذا دینے کے لئے نہیں کہا جس کے ساتھ سفر پر روانگی سے ایک روز پہلے اُس کی شادی ہوئی تھی۔

سُولُو کو ایک پیٹی سے باندھ کر گھوڑے پر سوار کیا گیا اور ایک سائیس گھوڑے کو چلانے لگا۔

لانق لا پار کرنے کے بعد پارٹی ایک انجان خطّے میں پہنچی۔ تب اُنہیں لیہہ سے نکلے ۲۸ روز ہوئے تھے۔ تبھی سے وہ روز روز پہاڑوں، نالوں اور گھاٹیوں میں اپنا راستہ تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

۲۷ / جون کو اُنہوں نے ۳۹ واں کیمپ لگایا، تب اُن کے پاس ۲۵ دن کا راشن بچا تھا۔ ویلبی نے روزانہ ایک پاؤنڈ راشن کم کرنے کا فیصلہ کیا۔ راشن کم کرنے کی وجہ سے ملازم نالاں تھے۔ ویلبی لکھتا ہے کہ ٹٹو والے بڑ بُڑانے لگے کہ آدھے راشن پر وہ کام نہیں کر سکتے اور آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔

بلندی کی وجہ سے ۴ / جولائی کے آس پاس تختہ آخون بیمار ہوا اور اُس کی حالت روز بروز خراب ہونے لگی۔ ویلبی رقمطراز ہیں: ''اُس کا چہرہ ایک بڑی اور زیادہ پکی ہوئی گوز بیری یا ایک گلاسٹر اسیب کی طرح سوج گیا۔ ۱۱ / جولائی کو ۵۱ ویں کیمپ پر اُس نے اور سُولُو نے آگے سفر کرنے سے اِنکار کیا۔ انہیں بضد دیکھ کر صاحب نے دونوں کو کچھ راشن اور ایک گھوڑے کے ساتھ چھوڑ دیا۔

قلم رسول کے مطابق کئی روز تختہ اور سُولُو ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہے اور شام کو پڑاؤ پر اُن سے آملتے۔ لیکن ایک شام وہ دونوں نہیں پہنچے۔ بعد میں اُن سے متعلق کچھ نہیں سنا۔ ظاہر ہے آگے یا پیچھے دونوں مر گئے تھے۔

قلم رسول نے اپنی آپ بیتی میں بتایا ہے۔ ''ایک روز صاحب نے مجھے کہا جو لوگ واپس جانا چاہتے ہیں۔ اُن کو کہہ دو کہ وہ واپس جا سکتے ہیں۔ میں نے سبھوں

سے پوچھا۔ کوئی بھی جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ سبھوں نے کہا زندہ گھر پہنچنا ناممکن ہے۔ راستہ ملنا دوبھر ہے۔ جس جگہ پیر پڑتا ہے۔ ڈوسرا پیر پڑنے سے پہلے ہوا سے قدم کا نشان مٹ جاتا ہے۔ ایسے میں راستہ کہاں ملے گا؟ اُنہیں تنخواہ نہیں چاہئے لیکن سفر اکٹھے کریں گے۔"

پھر صاحب نے قلم رسول اور تین لداخیوں کو واپس جانے کا حکم دیا۔ لیہہ سے نکلے تب بقولِ قلم رسول ڈیڑھ ماہ ہوئے تھے۔ میرے اندازے اور حساب کے مطابق اُسے زیادہ مدّت ہونی چاہئے۔ ویلبی بولا۔" وہ راستے میں پڑے مردہ جانوروں کے گوشت کھا سکتے ہیں۔ بالآخر کسی بستی میں پہنچ جائیں گے۔"

چاروں نے کہا۔" ہم لداخ واپس جانے کی سوچ بھی نہیں سکتے۔ جئیں گے تو اِکٹھے جئیں گے اور مریں گے تو اکٹھے مریں گے۔ ہم صاحب کے کام پر آئے ہیں۔ اِس لئے ہمیں ایسی ویران جگہ پر چھوڑ دینا مناسب نہیں ہے۔"

ویلبی کو اُن چاروں سے بغاوت کی بو آتی تھی۔ وہ لکھتا ہے:

"ہمیں اِن آدمیوں پر بھروسہ نہیں تھا۔ اور ہم سوچتے تھے کہ اِن کی ساری ضروریات پوری کر کے اِن کو ٹرخانا چاہئے اور ان کو ہمارے خلاف سازش رچانے اور ان پر عمل کرنے کا کوئی موقعہ نہیں دینا چاہئے، جس سے ہمارے اِنتظامات اور اِرادوں پر پانی پھرے۔"

ایک یا دو روز کے بعد صاحب نے اپنا حکم دہرایا کہ وہ پارٹی سے الگ ہو جائیں۔

جولائی کا مہینہ بھی سولہ ہزار اور گاہے گاہے سترہ ہزار فٹ بلند مقامات پر بھٹکنے اور سفر کرنے میں گزرا۔ ان کے پاس صرف ۱۲ بار بردار جانور بچے تھے۔ اب تک اُنہوں نے ایک ہزار میل کا سفر کیا تھا۔

جب اُمید کی آخری کرن بھی بجھ گئی تو قلم رسول نے باورچی ایشے چھرنگ

سے کہا کہ وہ ان کے پیچھے پیچھے سفر جاری رکھیں گے اور اِستدعا کی کہ ان کے لئے کھانے کی کچھ چیزیں چھوڑ دیا کریں۔ آگ نہ بجھائیں اور چائے کی اُبلی پتی ضائع نہ کریں۔

بقولِ قلم رسول: ''صاحب نے آخر کار بندوق کی نوک پر عثمان چونکا، جمعہ مالک، محمد رحیم اور مجھے پارٹی سے نکال دیا اور افغان شہزادہ (قلم نے شہزاد کو شہزادہ کہا ہے) اور باقیوں کو ساتھ لیا۔'' تاہم شہزاد میر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شکور علی کو بھی نکال دیا لیکن دو تین دن بعد جب قلم اور اس کے مفرور ساتھیوں نے پارٹی میں شامل ہونے کی کوشش کی تو شکور علی اکیلے کو لیا گیا۔

شہزاد میر اِس ضمن میں لکھتا ہے: ''۲ر اگست کی صبح ساڑھے تین بجے ان لداخیوں نے خچروں پر سامان نہیں لادا۔ اپنا سامان اُٹھا کر وہ جنوب کی طرف روانہ ہوئے اور نظروں سے غائب ہوئے۔ ان بھگوڑوں کے پاس برتن اور صرف تین دن کے کھانے کے لئے چاول اور چائے تھی۔ جبکہ ویلیی لکھتا ہے کہ بھگوڑوں کے پاس کوئی برتن نہیں تھا۔ ویلیی اور اُس کے آدمیوں کے پاس بھی صرف تین روز کے لئے چاول بچا تھا۔ زندہ رہنے کے لئے وہ اب صرف شکار پر اِنحصار رکھتے تھے۔ ویلیی کے مطابق اس کے ایک یا دو دن بعد آٹھ خچر اور گھوڑے مر گئے اور صرف تین خچر بچے۔

ایک روز پہلے ہی ویلیی کو یہ خدشہ ہوا کہ یہ فرار ہو جائیں گے۔ اُس نے سفر میں تیزی لائی۔ ویلیی کو یہ خوف بھی تھا کہ کہیں یہ لدّو جانوروں پر قبضہ جمانے کی کوشش نہ کریں۔

مختلف عوامل سے یہ شہادت ملتی ہے کہ قلم رسول اور اُس کے تین ساتھیوں نے کارواں سے الگ ہونے کی پہل نہیں کی اور نہ فرار ہوئے جیسا کہ ویلیی اور شہزاد میر نے اُنہیں deserters بھگوڑے قرار دئے ہیں۔ وہ اس لق و دق ویران خطّے میں کارواں سے الگ ہو کر اپنے آپ کو مصائب میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن

ویلبی کو ہر دم بغاوت کا خطرہ نظر آتا تھا۔ یا قرینِ قیاس یہ بھی ہے کہ ویلبی سوچتا تھا کہ کارواں میں زیادہ آدمی ہونے سے کم راشن پر مزید بار پڑے گا کیونکہ بار بردار جانوروں کے مرجانے سے بیشتر راشن اور سامان چھوڑنا پڑا تھا۔

قلم رسول کے مطابق عثمان چُونکا' ویلبی کو مارنے مرنے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ بقولِ قلم بڑا تنومند اور جوشیلا جوان تھا لیکن جمعہ اور قلم نے یہ کہہ کر اُس کو اپنے اس ارادے سے باز رکھا کہ انگریزوں کے ہاتھ بڑے لمبے ہوتے ہیں۔ بعد میں یہ لیہہ میں اُن کے خاندانوں کو نہیں بخشیں گے۔

قلم رسول کی آپ بیتی کے مطابق چند روز ایشے چھرنگ نے اُس کی استدعا پر عمل کیا لیکن ایک روز صاحب کو معلوم ہوا۔ تب سے وہ آگ پر روز پانی ڈال کر بجھایا کرتا تھا۔

شہزاد میر لکھتا ہے: ''یہ اشخاص کئی روز اِدھر اُدھر گھومتے رہے اور اُن کا مزاج دُرست ہوا۔ جب ناکام ہوئے تو ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ جو جانور ہم مارتے، وہ پیچھے پیچھے آکر اُن کے کھانے میں شریک ہو جاتے۔ ویلبی اُن کو پارٹی میں بالکل رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کے حکم پر میں نے اُن سے کہا۔ ''تم جہاں چاہے' جاسکتے ہو۔ اگر ہمارے ساتھ آؤ گے تو گولیاں ماردُوں گا۔''

ایک روز ویلبی نے دُوربین سے اُن کو ایک پہاڑی سے اُترتے دیکھا' جہاں ویلبی اور اُس کی ٹیم نے سابقہ رات کیمپ لگایا تھا۔

آگے اپنے سفرنامہ میں شہزاد میر لکھتا ہے: ''ایک روز جب ہم نے ایک نالہ کے سامنے کیمپ لگایا تو بھگوڑے لداخی سامنے کی ایک پہاڑی کے دامن میں کھڑے تھے۔ پھر وہ نالہ کے کنارے کنارے سے ہماری طرف آئے۔ صاحب نے کہا کہ ان کو اِس راستہ سے نہیں آنے دو۔ اگر نہ مانے تو گولی چلاؤ۔ قلم ننگے سر میرے سامنے کھڑا ہوا اور للکارا، آؤ مجھے مار دو۔''

قلم کا ننگے سر آنا شہزاد کو ہتک آمیز لگا۔ اُس کا ذہن بھی نوآبادیاتی حکومت کے ایک آقا کی طرح سوچتا تھا۔ شہزاد تلوار لے کر قلم رسول کی طرف بڑھا اور پکارا.........''آجاؤ.....اپنی ٹوپی اُتار کر یہاں آجاؤ اور اپنے سر کے ٹکڑے کراؤ۔''

بقولِ شہزاد میر قلم رسول بھاگ کھڑا ہوا۔

ویلبی بولا۔''ہوشیار رہنا، شاید یہ آدمی رات کو ہمیں جان سے مارنے اور لُوٹنے کے لئے لوٹیں گے۔''

پھر بندوق دِکھا کر سبھوں کو بھگا دیا۔

شہزاد لکھتا ہے کہ اِس کے بعد یہ لوگ دوبارہ نظر نہیں آئے۔

قلم رسول کا یہ بیان ہے کہ ایک روز وہ کسی اوٹ میں تھے۔ صاحبوں نے اُن کو دیکھ لیا اور اپنی بندوقوں کی نالی کا نشانہ اُن کی طرف کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ پیچھے پیچھے آئیں گے تو اُن کو گولی ماردیں گے۔

قلم اپنی آپ بیتی میں بتاتا ہے:''ہم ویلبی سے ایک یا دو دن پیچھے چلتے تھے۔ (دودن کا فاصلہ اُس روز سے رکھا جب اُنہیں ویلبی اور شہزاد سے جان کو خطرہ محسوس ہوا۔) دوتین دن ہم نے بھوکے سفر کیے۔ ایک روز ہم نے آٹے کی دوخالی بوریاں دیکھیں۔ اُن میں کچھ آٹا تھا۔ ہم نے یہ آٹا کمر سے باندھا اور تھوڑا تھوڑا چٹکی سے منہ میں پھانکتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا۔ چندروز تک ہمیں شام کو پڑاؤ پر آگ ملی لیکن ایک دِن یہ بھی نہیں ملی۔ روزانہ آگ پر پانی ڈالا ہوا ملتا۔ بعد میں ایشے چھرنگ اور دُوسرے لداخیوں سے معلوم ہوا کہ ویلبی بذاتِ خود آگ بجھا دیتا تھا۔ ہمارے پاس ماچس یا آگ جلانے کا کوئی آلہ نہیں تھا۔ اِس لئے ہم نے یہ ترکیب سوچی کہ ہر ایک آدمی روزانہ یاک کا گوبر، سوت، پگڑی اور کپڑے کا ٹکڑا پھاڑ پھاڑ کر جلاتا ہوا دُوسرے پڑاؤ تک پہنچا دیتا۔ یہاں تک کہ ہمیں اپنی قمیص کُرتے بھی آگ کی نذر کرنے پڑے اور ہمارے بدن پر کپڑے ختم ہونے لگے۔ ہم بہت کمزور ہو گئے تھے۔

راستے میں کہیں کہیں گھاس پات پائی جاتی تھی اور ہم یہی کھاتے تھے۔ کئی مقامات پر گھاس پات بھی نہیں ہوتی تھی۔ پھر چمڑا کھانے کی باری آئی۔''

قلم رسول لیڈر تھا۔ چمڑے کی تمام اشیاء کو سختی سے راشن کیا۔ اُن میں کمر بند، بوٹ، ترکی جوتے، چاروق اور چمڑے کی بنی چیزیں تھیں۔ وہ اُن کے ٹکڑے کرتے اور جلا کر پتھر پر کوٹ کر کھاتے یا آگ پر بھن کر جنگلی گھاس کی جڑوں کے ساتھ چباتے۔

قلم رسول نے منشی غلام محی الدّین کو بتایا کہ گھاس پات کے مقابلے میں چمڑا زیادہ قوّت بخش تھا جس سے وہ اپنا سفر جاری رکھ سکے۔

ایک جگہ اُن کو ایک مردہ جانور کی لاش ملی۔ قلم رسول نے اُس کی ٹانگ کو بھون لیا اور یہی چاٹتے اور بھنبھوڑتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا۔

حالات نے اُن کو ہر چیز کھانے پر مجبور کیا۔ شہزاد میر نے شروع میں لکھا ہے کہ کارواں کے سارے مسلمان صرف حلال گوشت کھاتے تھے۔

قلم رسول نے منشی محی الدّین کو بتایا۔ ''اِنتہائی کمزوری کے عالم میں بھی زندہ رہنے کی خواہش ہمیں نئی طاقت بخشتی تھی اور ہم اپنا سفر جاری رکھتے تھے۔ چاہے روزانہ ایک یا آدھا میل ہی کیوں نہ چلیں۔''

ویلبی کی پارٹی کے پاس بھی کم خوراک بچی تھی۔ جنگلی جانوروں اور پرندوں کا شکار کر کے پارٹی کے افراد نے شکم پری کی۔ کہیں جنگلی جانور بھی نہیں ملے۔ ایک جگہ ایک جنگلی نریاک نے اُن پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ جنگلی یاک بڑا خونخوار ہوتا ہے اور اِنسان کی جان لے سکتا ہے۔

خچریں مرنے کی وجہ سے صاحبوں اور شہزاد میر نے خود خُرجینیں اُٹھائی تھیں۔ پہلے روز ایک میں ایندھن اور دُوسری میں جنگلی پیاز ڈالی۔

شہزاد لکھتا ہے: ''منزل پر پہنچ کر ہم نے پیاز کو کاٹ چھیل کر پکایا اور اسے

کھایا۔ اس حالت میں ہم نے دو ماہ سفر کیا۔ سطح مرتفع عموماً سولہ ہزار فٹ بلند تھی۔

تقریباً دو ماہ بعد ہم ایک جھیل کے پاس پہنچے۔ پانی کا رنگ کالا اور ذائقہ کھاری تھا۔ آگے ایک برفانی پہاڑ تھا۔ ہم اُس کے دامن میں پہنچے۔ کہیں سبزہ نظر نہیں آتا تھا۔ خچروں کے لئے گھاس نہیں تھی۔ یہ صورتِ حال کئی روز رہی۔

آخر کار اُس پہاڑ کی نشیبی ڈھلوان پر چند سرسبز درخت نظر آئے۔ جہاں ہم نے کیمپ لگایا۔"

ویلیمی نے پہاڑوں کی تلہٹی میں ایک شاداب وادی کا ذِکر کیا ہے۔ جہاں ایک جھیل تھی اور نہریں بہتی تھیں۔ شہزاد میر نے اُس کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

اُدھر قلم رسول کی پارٹی کے پاس چمڑے کی پوشش اور سامان ختم ہو گیا تھا۔ ایک روز قلم نے اپنے گلے میں باندھا تعویذ کا دھاگا کاٹ لیا۔ تعویذ کے اندر سے قرآنی آیات لکھا ہوا کاغذ نکالا۔ اور اسے پھاڑ کر تینوں میں بانٹتے ہوئے کہا: "یہ کلام اللہ ہے یہی تمہیں زندہ رکھے گا۔"

قلم رسول نے جولدن صاحب کو ایک سنسنی خیز واقعہ یہ سنایا کہ اُنہوں نے اُس سفر کے دوران ایک جنگلی یاک کو مارا تھا، جو بالائی تبت میں پایا جاتا ہے۔

جولدن نے پوچھا کہ بندوق کے بغیر اُنہوں نے یہ کارنامہ کیسے سرانجام دیا؟ تو قلم بولا۔ "ہم نے جنگلی یاک کا ایک ریوڑ دیکھا اور یہ معلوم کیا کہ یہ یاک کہاں رہتے ہیں۔ خوش قسمتی سے یہ چند بڑے پتھروں boulders کے پاس رہتے تھے۔ میرے پاس ایک خنجر تھا۔ اُسے لئے آہستگی سے پتھروں کی آڑ لیتا ہوا میں ایک یاک تک پہنچا اور ایک بڑے پتھر پر سے کود کر جنگلی یاک کی پیٹھ پر جا سوار ہوا۔ جنگلی یاک گھبرا کر تیز بھاگا۔ یاک کی لمبی ایال کو پکڑ کر اُس کے بدن سے چمٹے رہنا آسان تھا۔ ایسے میں خنجر سے یاک کو مارنا بھی مشکل نہیں تھا۔" بابا قلم اچھا گھوڑ سوار تو تھا ہی ضرورت اور مجبوری اِنسان سے کچھ بھی کرا سکتی ہے۔

ایک بالغ یاک کا وزن ایک ٹن سے زیادہ ہوتا ہے۔ اُس کا گوشت اُن کے لئے نعمت ثابت ہوا۔ آخر کار یہ گوشت بھی ختم ہو گیا۔ یا سفر کی وجہ سے سارا گوشت اُٹھا کر سفر نہ کر سکے ہوں۔ جولدن کے اِس سوال پر کہ وہ کیسے اپنی منزل کا رُخ جانتے تھے؟

قلم رسول نے جواب دیا۔ ''پیکنگ ہماری منزل تھی۔ ہم جانتے تھے کہ یہ مشرق میں واقع ہے۔ اِس سلسلے میں چڑھتا سورج ہمارا رہبر تھا۔''

پھر ایک انہونی سا واقعہ پیش آیا۔ وہ بھوکے اور سخت تھکے ہوئے تھے۔ اس شام ایک جگہ آرام کرنے کی نیت سے بیٹھے۔ خدا کی قدرت، وہاں اُنہیں تلے ہوئے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے ملے۔ تینوں اُن پر ٹوٹ پڑے۔

ویرانے میں یہ کیسے ممکن ہے؟ سبھی حیران ہوئے۔

لیکن بابا قلم مصر تھا کہ یہ سچا واقعہ ہے اور اپنے چھوٹے بھائی جمعہ مالک سے مخاطب ہوا۔ ''کیوں جمعہ یہ حقیقت ہے نا؟''

جمعہ مالک نے اثبات میں سر ہلا کر اِس کی تصدیق کی۔

ممکن ہے کہ ایشے چھرنگ، لسُویا شکور علی نے گوشت کے ٹکڑے اُن کے لئے چھوڑے ہوں کیونکہ یہ اُن کے پیچھے پیچھے سفر کر رہے تھے۔

پھر اُن پر ایک مصیبت آئی۔ عثمان چُونکا سخت بیمار ہو گیا اور چلنا دوبھر ہو گیا۔ وہ ایک چشمہ کے پاس پہنچے۔ عثمان نے اُن سے درخواست کی کہ اُس کو وہاں چھوڑ دیا جائے۔ تینوں نے بادل نخواستہ کھڑے ہو کر ایک قطار میں مرتے ہوئے آدمی کے آخری لمحات میں آرام و سکون کے لئے دُعا مانگی اور آگے روانہ ہوئے۔

تاہم عثمان زِندہ رہا اور ایک گاؤں پہنچا۔ جہاں لیہہ میں اُس کے رشتہ داروں کو موصولہ اطلاعات کے مطابق وہ ایک بودھ کاہن یا جیوتش کے بہروپ میں ضعیف الاعتقاد اور سیدھے سادے گاؤں والوں کو تعویذ گنڈے دینے لگا۔ گاؤں

والوں نے اُس کی خوب خاطر مدارت کی۔ عثمان لداخ نہیں لوٹا۔ غالباً اُسی گاؤں میں مر گیا۔

ایک روز قلم رسول کی پارٹی کو ایک پالتو یاک ملا' جو بہت کمزور اور تھکا ہوا لگتا تھا۔ اُنہوں نے یاک کی ٹانگوں کو باندھا۔ یاک نے اُن کی گرفت سے بچنے کے لئے کوئی تگ و دو نہیں کی۔ یاک کو ذبح کیا۔ سبھی سخت بھوکے تھے۔ جمعہ یاک کے گلے سے بہتے خون کو اپنے دونوں ہاتھوں کا اوک بنا کر پینے لگا۔ سبھوں نے اُس کی تقلید کی۔ بابا قلم نے تھوڑا سا پیا۔ بابا قلم نے جولدن کو بتایا کہ خالی پیٹ ٹھوس خوراک کھانے سے نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اِس لئے سیال خون پینا بہتر تھا۔

محمد رحیم کے حوالہ سے ہالینڈ کی ایک پروٹسٹنٹ مشنری کی ایک خاتون مسز سوسی ریجن ہارٹ Susie Rijnhart نے اِس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ محمد رحیم نے اس کو بتایا کہ بھوک کی وجہ سے اُنہوں نے یاک کا کلیجہ کچا کھا لیا۔ تب ان کے پاس کچھ جنگلی پیاز اور ایک جنگلی پھول کے سوا کھانے کو کچھ نہیں تھا۔

اُدھر کپتان ویلبی کے پاس اب صرف تین خچر بچے تھے اور وہ بھی زخمی تھے۔ شہزاد میر کے پاس چاندی کے تین سو روپے تھے۔ اُنہیں اٹھانا اُس کے لئے دوبھر تھا۔ اُس نے ایک لداخی سے کہا۔ ''اگر تم اِنہیں اُٹھاؤ گے تو سو روپے تمہارے ہوں گے۔'' لداخی نے جواب دیا۔ ''بھوک سے جسم میں کوئی طاقت نہیں بچی ہے۔ اس لئے مجھ سے اُٹھائے نہیں جائیں گے۔''

شہزاد میر نے مزید دو روز چاندی کے روپیوں کو اُٹھائے سفر کیا۔ جب طاقت نہیں رہی تو صاحب سے درخواست کی کہ اُس کے سکّوں کو ایک خچر پر لادے ہوئے صاحب کے صندوق میں ڈالنے کی اجازت دے۔

صاحب بولا۔ ''تم یہ روپے کیسے اُٹھا سکتے ہو شہزاد؟ صرف تین زخمی خچر بچے ہیں۔ جن پر نقشے، نقشہ کشی کے آلات اور کارتوس ہیں۔''

بالآخر صاحب نے روپئے خچر پر لادنے کی اجازت تو دے دی لیکن صاحب شہزاد سے ناراض تھا۔

سائمن ڈِگبائی نے حساب لگایا ہے کہ ایک سکّے کا وزن ایک اعشاریہ چھیاسٹھ گرام کے حساب سے تین سوسکّوں کا وزن تقریباً ساڑھے تین کلو ہوتا ہے۔ ساڑھے تین کلو بھی تب اُن کے لئے بوجھ بنا تھا۔

سائمن ڈِگبائی نے لکھا ہے کہ شہزاد کے پاس اِس سے کہیں زیادہ روپیہ ہونا چاہیئے۔

ویلبی رقم طراز ہے۔ ''ہمارے چار آدمی بھی زودرنج بنے تھے اور آپس میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑتے تھے۔''

۲۹ راگست کو ویلبی نے چار چھوٹی چٹانوں پر تبّتی میں اوم منے پدمے ہوم کے مقدس منتر تراشے دیکھے۔ ویلبی نے ملکولم کو انہیں دیکھنے کے لئے بلایا۔ اُن کی اُمید جاگی کہ نزدیک کوئی بستی ہوگی۔ لیکن اُمید بر نہیں آئی۔ اِس کے دس روز بعد ایک بڑی جھیل کے کنارے اُنہیں ایک پیالی کا ٹکڑا نظر آیا۔

یکم ستمبر کو ویلبی نے ایک چولھا دیکھا۔ اِس کے تین روز بعد ۴ رستمبر کو ایک بڑا چولھا نظر آیا جو چند ماہ قبل اُس مقام سے ایک بڑے قافلے کی روانگی کی نشان دہی کرتا تھا۔

ویلبی نے اس مقام پر چولھوں کی موجودگی کا ذِکر کیا ہے۔ قلم رسول نے بھی لہاسہ -پیکینگ تجارتی راستے پر ایک کیمپنگ کی جگہ کا تذکرہ کیا ہے۔ شاید یہ یہی جگہ ہو۔ جہاں ویلبی نے چولھے دیکھے تھے۔

ویلبی نے یہاں مِرگ antelope کے سینگ اور رسیوں کے چند ٹکڑے بھی دیکھے۔

ایک روز ایشے چھرنگ نے ایک پہاڑی کے نیچے کوئی چار میل کے فاصلے پر

ایک کالا دھبہ دیکھا۔ ایشے چھرنگ نے صاحب کو بتایا۔ صاحب نے دُور بین سے دیکھا۔ اور سفید چیز نظر آئی یہ دراصل سفید رنگ کا ایک اُونی خیمہ تھا۔ چند سو گز آگے جا کر دیکھا تو ایسے اور خیمے اور یاک نظر آئے۔ ایشے چھرنگ کو انہیں دیکھنے کے لئے بھیجا۔ واپس آکر اُس نے بتایا کہ خیمے میں چین کے شہنشاہ کا ایک تاجر ٹھہرا ہے۔ جس نے لہاسہ کے راجا سے ایک ہزار یاک خریدے ہیں۔ جن کو وہ چین لے جا رہا ہے۔

دراصل یہ دلائی لامہ کا چین بھیجا ہوا ایک مشن تھا۔ جو واپس لہاسہ جا رہا تھا۔

پھر کپتان ویلبی، لیفٹیننٹ ملکولم اور شہزاد میر تاجر سے ملنے گئے۔ اُس روز تاریخ ۸ ستمبر تھی۔ تاجر سے ملاقات اُن کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی۔

شہزاد میر رقم طراز ہے: ''اگر ہم تاجر سے نہ ملے ہوتے تو اگلے چھ ماہ ہم شاید کسی بستی کو نہیں دیکھتے کیونکہ مغربی چین وہاں سے شمال کی طرف تھا۔ جبکہ ہم ایک دریا کے کنارے اپنا سفر کر رہے تھے، جو مشرق کو بہتا تھا۔

اُس روز قلم رسول اور اُس کے تین ہم سفر ساتھیوں کو ویلبی کے کارواں کے پیچھے پیچھے چلتے تقریباً اڑتیس روز ہوئے تھے۔ کسی چھت کے بغیر سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر آسمان تلے اُنہوں نے اپنی راتیں گزاری تھیں۔

ویلبی نے تبّتی قافلے سے متعلق لکھا ہے کہ یہ ایک مشن تھا، جو ہر سال تبت سے چین جاتا تھا۔ ویلبی کے قیاس میں یہ ایک خیر سگالی مشن تھا۔ مشن کے ارکان کے ساتھ پندرہ سو یاک تھے جو سات گروپوں میں سفر کر رہے تھے۔ اُن کے اِنتظامات کے لئے دلائی لامانے چین کے ایک تجارتی شہر ٹنکر میں چار ملازم رکھے تھے۔

ویلبی نے تاجر سے ایک گھوڑا خریدا اور اشیائے خوردنی بھی خریدیں۔ جن پر روزانہ سات روپے لاگت آئی تھی۔ شہزاد میر لکھتا ہے: ''صاحب کو یہ رقم زیادہ لگی اور ہم نے مزید چیزیں خریدنا بند کیں۔'' دراصل ویلبی کا فنڈ ختم ہو رہا تھا اور وہ کفایت شعاری سے کام لے رہا تھا۔

ایک ہفتہ بعد ۱۶ ستمبر کو پارٹی نے اپنا سفر دوبارہ شروع کیا اور جلدی ہی سولہ ہزار فٹ کی سطح مرتفع سے نشیبی علاقے میں پہنچی۔ جس کی بلندی آٹھ ہزار فٹ تھی۔ یہاں اُنہوں نے ایک پیڑ دیکھا۔ جس کی شاخیں چھوٹے چھوٹے سیاہ رنگ کے پھلوں سے جھکی تھیں۔ وہ چین کے شمال مغربی صوبہ کانسو کی حدود میں پہنچے تھے۔ اُنہوں ے چند لاموں کو دیکھا۔ اُن کے لئے یہ پہلی اِنسانی آبادی تھی۔ پھر اُن کی راہ میں یکے بعد دیگرے بہت سی بستیاں آتی گئیں۔

یکم اکتوبر کو وہ تجارتی شہر ٹنکر پہنچے۔ اب تک پارٹی نے ایک ہزار نو سو تیراسی (۱۹۸۳) میل کا لمبا سفر طے کیا تھا۔ ٹنکر میں ڈچ مشنری کے ایک ڈاکٹر پیٹرز ریجن ہارٹ اور اُن کی اہلیہ سوسی ریجن ہارٹ مقیم تھے۔ ویلبی اور اُس کے ساتھی اُن کے مہمان رہے۔ ویلبی نے ٹنکر کی آبادی دس ہزار بتائی ہے۔

اِدھر ویلبی کی پارٹی کے قدموں پر چلتے ہوئے قلم رسول اور اُن کے ساتھیوں کا لہاسہ کے تجارتی مشن سے آمنا سامنا ہوا۔ محمد رحیم مشن کے ہمراہ لہاسہ جانا چاہتا تھا اور وہاں سے لداخ جانے کا خواہشمند تھا۔ لیکن قلم رسول پیکینگ جانے کیلئے مصر تھا۔

پھر قلم رسول کی چھوٹی سی پارٹی کی ایک جگہ پہنچی جہاں خانہ بدوشوں کا ایک کیمپ تھا۔ قلم رسول نے اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ وہ تبّتی بودھ یاتریوں کے بھیس میں زمین پر سجدہ بوس ہوتے ہوئے خانہ بدوشوں کی طرف بڑھیں۔ قلم رسول تبتیوں کی نفسیات کو جانتا تھا۔ وہ اِس نسخے کو پہلے ایک دفعہ کامیابی سے آزما چکا تھا۔ جب اس مہم سے ایک سال پہلے جارج لیٹل ڈیل کی پارٹی کو تبتیوں نے واپسی کے سفر میں رسد اور بار بردار جانور فراہم نہیں کئے تھے۔

خانہ بدوش تبتیوں نے اُنہیں عقیدت مند بودھ یاتری سمجھا اور اُن کی خوب آؤ بھگت کی اور مہمانوں کا سا سلوک کیا۔ کچھ مدّت وہ یہاں رُکے اور خانہ بدوشوں کے لئے کام بھی کیا۔ روانگی پر اُنہیں رسد فراہم کی۔

ویلبی کا فنڈ ختم ہو گیا تھا۔ ٹنکر میں اُس نے مشن کے ڈاکٹر پیٹرز کی معرفت ایک چینی افسر سے دو سو ڈالر حاصل کیئے۔

ٹنکر سے ویلبی ایک اور شہر سیننگ پہنچا۔ سیننگ ٹنکر سے تقریباً ۳۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں ایک اور یورپی ڈاکٹر برٹن اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ سکونت پذیر تھا۔ اس شہر کی زیادہ تر بستیاں اُجڑی اُجڑی تھیں اور مکانات منہدم تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں چینیوں اور تبتیوں کے درمیان جھڑپیں ہوئی تھیں اور فریقین کا زبردست خون خرابہ ہوا تھا۔ ویلبی اور شہزاد نے سنا کہ اس خانہ جنگی میں ساٹھ ہزار چینی اور پچاس ہزار تبّتی مارے گئے تھے۔

دراصل سیننگ تک سارا علاقہ مسلم باغیوں نے تباہ کیا تھا۔ بعد میں باغیوں کی سرکوبی کی گئی تھی اور لوگوں کی عبرت کے لئے باغیوں کے سرغنوں کے سر شہر کے پھاٹک پر پنجروں میں لٹکا کر رکھے گئے تھے۔ اُن میں ایک تبّتی کا سر بھی تھا، جس نے لگ بھگ دو سال پہلے ایک فرانسیسی سیاح De Trouille De Rhins کو قتل کیا تھا۔

ویلبی لکھتا ہے: ''فسادات کی شروعات مارچ ۱۸۹۵ء میں مسلمانوں کے دو گروپ پیلی سفید ٹوپی والے سالار اور سیاہ ٹوپی والے کے درمیان ایک جھگڑے سے ہوئی تھی۔ سیننگ کے ایک افسرِ اعلا کی دخل اندازی اور سالار کے ایک سرکردہ شخص کی ہلاکت سے فساد کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ اور یہ مسلمانوں کے دونوں گروپوں تک محدود نہیں رہا تھا۔ جس میں بقولِ ویلبی چالیس ہزار چینی بھی مارے گئے تھے۔''

ویلبی کے مطابق سیننگ کے مضافات میں جہاں دس ہزار مسلمان بستے تھے، مسلمانوں کے گھروں کی ایک بھی چھت نہیں بچی تھی۔ بڑی مسجد کے صرف چند مینار نظر آتے تھے۔

۲۰ راکتوبر کو پارٹی نے سیننگ کو خیر باد کہا۔

ٹنکر سے چنگ وی تک قلعوں کے پھاٹکوں پر مسلمان لیڈروں کے کٹے ہوئے سر آویزاں تھے۔ کانسو میں مسلمانوں اور ترکی بولنے والے سالاروں نے بڑے پیمانے پر بغاوت کی تھی۔ جسے بڑی مشکل اور بربریت سے دبایا گیا تھا۔

ویلبی نے سیننگ میں شہزاد میر کو بازار جانے سے منع کرتے ہوئے کہا: ''یہ لوگ مسلمانوں کے دُشمن ہیں۔'' چونگ وی میں شہزاد میر کو ایک سالار سمجھا گیا اور لوگوں کی ایک بھیڑ شور مچاتی ہوئی اُس کے پیچھے لگی تاہم رجنی ہارٹ کے سمجھانے بجھانے پر لوگ شانت پڑ گئے۔

شہزاد میر نے سیننگ شہر میں بہت سارے مسلمان دیکھے۔ میر نے لکھا ہے کہ یہ لوگ بڑے عبادت گزار اور پرہیز گار ہیں۔

پیکینگ کے سفر کے آخری مرحلے میں ڈاکٹر پیٹرز، ویلبی کی پارٹی میں شامل ہوئے۔ چینی زبان کی واقفیت اور سرزمینِ چین کی جانکاری کی وجہ سے پارٹی کے لئے وہ معاون ثابت ہوئے۔

اُدھر خدا خدا کر کے قلم رسول، جمعہ مالک اور محمد رحیم کو پہلی بستی نظر آئی۔ اس سے آگے چند اور گاؤں تھے۔ لیکن فسادات کی وجہ سے گاؤں کے لوگ فرار ہوئے تھے۔ اُنہوں نے ایک گنپہ دیکھا لیکن اُس کے مہنت اور بھکشو سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ قلم رسول اور اُس کے ساتھیوں نے گنپہ میں ماسوائے ایک نیزہ کے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اُن کے مطابق گنپہ میں سونا اور چاندی تھے۔ غالباً مورتیوں پر سونا چاندی کا کام ہوگا۔ نیزہ قلم رسول نے بطور عصا استعمال کیا۔ ایک گاؤں میں اُن کی وضع قطع اور حلیہ دیکھ کر گاؤں والے پہلے گھبرا گئے۔

اُن کے بال اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور بدن پر صرف چیتھڑے بچے تھے۔ ایک بستی میں وہ کچھ دِنوں تک گڈریئے کا کام کرتے رہے۔ ایک روز وہاں سے تینوں رفو چکر ہو گئے۔

ویلیمی نے بھی کُم سِم نام کے ایک مقام پر ایک گنپہ کا ذکر کیا ہے۔ جس میں چار ہزار لامے تھے۔ جن میں ستر فیصد تبّتی، بیس فیصد منگول اور باقی چینی تھے۔

شہزادمیر کی طرح قلم رسول نے بھی مقتولین کے آویزاں سر بریدوں کا ذکر کیا ہے۔ قلم کی آپ بیتی میں ایک فساد زدہ شہر کا بیان ہے جہاں مسلمانوں اور بودھوں کے درمیان خون ریز فساد ہوا تھا۔ لیکن شہر کا نام نہیں دیا ہے۔ قلم رسول نے سنا کہ اس شہر میں فساد ایک مسلمان اور بودھ قصاب سے شروع ہوا تھا۔ اُن دونوں کی دُکانیں آمنے سامنے تھیں۔ گوشت کے لٹکے ہوئے دھڑوں پر مکھیاں آتی جاتی رہتی تھیں۔ اس پر مسلمان قصاب نے بودھ قصاب سے شکایت کی تھی اور دُکان بند کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ بودھ قصاب نے نہیں مانا۔ اِس بات پر دونوں میں جھگڑا ہوا اور سارا شہر اِس کی لپیٹ میں آگیا۔

یہاں قلم رسول اور ساتھیوں نے کچھ عرصہ محنت مزدوری کر کے گزارہ کیا اور ایک روز ایک گھوڑے پر سوار ہو کر آگے روانہ ہوئے۔

ایک شہر میں قلم اور اُس کے ساتھی ایک مسجد کے دروازے کے سامنے ایک رومال بچھائے خیرات مانگنے لگے۔ نمازیوں نے اُنہیں مایوس نہیں کیا۔

شن جیانگ (چینی ترکستان) کے بعد آج بھی چین کے کانسو صوبہ میں مسلمانوں کی بڑی آبادی ہے۔

ایک جگہ ایک پُل پر قلم رسول اور جمعہ مالک کو ایک جھگڑالو آدمی سے پالا پڑا۔ اُس نے دونوں بھائیوں کو پکڑنے کی کوشش کی۔ قلم رسول نے اپنے بھائی جمعہ سے لداخی میں کہا۔ "یہ آدمی مشکوک لگتا ہے۔ اس سے گلو خلاصی پانے کے لئے ہمیں کچھ کرنا چاہیئے۔" اور دونوں نے اُس آدمی کو اٹھا کر دریا میں پھینک دیا اور وہاں سے فرار ہوئے۔ ایسا لگتا ہے تب محمد رحیم اُن کے ساتھ نہیں تھا۔ سفر کے آخری مرحلے پر محمد رحیم اُن سے الگ ہوا تھا۔

سائمن ڈِگبائی نے سون ہیڈین کے حوالے سے لکھا ہے کہ ٹنکر میں ہیڈین نے قلم رسول اور جمعہ مالک کو اُس کے آدمیوں کے ہمراہ ایک گھوڑا اور راشن کے ساتھ کاشغر بھیج دیا۔ شکور علی کو ویلبی نے کانسُو کی راج دھانی لنچیو میں چھوڑا جہاں سے اس کو کسی قافلے کے ہمراہ یارقند اور وہاں سے لداخ روانہ ہونا تھا۔ ویلبی اور باقی لوگ بطرف بیجینگ روانہ ہوئے۔ اُس روز تاریخ ۲۵ اکتوبر تھی۔

قلم رسول کی آپ بیتی میں پیکینگ روانگی کا تذکرہ ہے۔ جہاں سے دونوں بھائی کاشغر گئے تھے۔ محمد رحیم تب ٹنکر میں نہیں تھا۔

سوسی ریجن ہارٹ کے مطابق ٹنکر سے ویلبی کی روانگی کے کوئی ڈھائی ماہ بعد محمد رحیم شہر میں نمودار ہوا۔ وہ ٹنکر شہر میں یا روپوش تھا یا دُوسری جگہ سے نیا نیا آیا تھا۔ باقی تین لداخیوں کو ہیڈین نے لداخ روانہ کیا۔ محمد رحیم کہیں چرواہے کا کام کر رہا تھا۔ اِس لئے ہیڈین سے نہیں مل سکا۔

محمد رحیم نے ٹنکر میں پیٹرز ریجن ہارٹ کے ہاں نوکری کی۔ سوسی ریجن ہارٹ لکھتی ہے: "ویلبی کی المناک مہم کے بعد یورپی بدنام ہو گئے تھے اور اُنہیں نوکر ملنا مشکل ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس مہم میں اُنہوں نے کئی لداخیوں کو بے یار و مددگار نکال دیا تھا۔"

محمد رحیم نے سوسی ریجن ہارٹ کا دِل جیت لیا۔ اُس کے تاثرات ویلبی سے مختلف ہیں۔ وہ اِن الفاظ میں محمد رحیم کو یاد کرتی ہے: "ہمارے لئے وہ نہایت ہی کارآمد نوکر تھا۔ اُس کا مزاج تھوڑا تیز تھا، جو اس کو کبھی کبھی مشکلات میں ڈالتا تھا۔ اُن کے بچے سے اُس کو گہرا لگاؤ تھا۔ وہ اس کے لئے ہندوستانی میں گیت گاتا اور بگل کا انگریزی نغمہ سناتا تھا' جو اُس نے ہندوستان میں سیکھا تھا۔"

محمد رحیم نے سوسی اور ڈاکٹر پیٹرز کو بتایا کہ اس مہم میں تین آدمیوں کی جانیں چلی گئیں۔ تختہ آخون اور سُولو پُوریکپا پہلے مر گئے تھے۔ تیسرا غالباً عثمان چونکا کی طرف

اِشارہ تھا، جسے وہ اور دُوسرے ساتھی بیماری کی حالت میں ایک چشمے پر چھوڑ گئے تھے۔
اور محمد رحیم، جمعہ اور قلم رسول کو یہی تشویش تھی کہ عثمان جانبر نہیں ہو سکے گا۔

ڈاکٹر پیٹرز ریجن ہارٹ اور مسز ریجن ہارٹ نے دُوسرے یورپیوں کی طرح لہاسہ پہنچنے کی ناکام کوشش کی۔ اُس سفر میں محمد رحیم اُن کے لئے بڑا مددگار ثابت ہوا۔

بعد میں محمد رحیم لداخ روانہ ہوا۔ محمد رحیم کی جدائی میاں بیوی کے لئے بڑی تکلیف دہ تھی۔

شہزاد میر نے کانسُو کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''اس ملک کے لوگ عام طور زیادہ تر بودھ ہیں۔ لوگ ایک ہی رنگ کے لباس پہنتے ہیں۔ عورتوں کی ٹانگوں میں لنگ ہے۔ میں نے سنا لڑکی پیدا ہونے پر اُس کے پیروں میں پٹیاں باندھی جاتی ہیں۔ اِس طرح ان کے پیر چھوٹے رہتے ہیں۔ جس سے لنگ رہتا ہے۔ جس لڑکی کے پیر چھوٹے نہ ہوں تو امیر گھرانے میں وہ شادی کے لائق سمجھی نہیں جاتی۔

کانسُو کے بودھوں کے ناخون بڑے لمبے ہیں۔ وہ انہیں نہیں کاٹتے۔

عورتیں ننگے سر چلتی ہیں۔

مرنے والوں کی قبروں کے اُوپر کھیتی باڑی کی جاتی ہے۔''

ویلبی لکھتا ہے: '' کانسو صوبہ میں ہوچیو مسلمانوں کا ایک بڑا شہر ہے جہاں اُن کے ایک سے زیادہ کالج تھے اور عربی پڑھائی جاتی تھی۔''

۴ر نومبر کو ویلبی کی پارٹی چنگوئی (چونگ وی) شہر پہنچی۔ یہاں سے وہ کشتی میں شاہ پوہ تسی نامی شہر پہنچے، جہاں اُنہوں نے دیوارِ چین دیکھی۔ اِس کے بعد اُن کے راستے میں متعدد شہر اور بستیاں آئیں۔ اِس سفر میں اُنہوں نے بگھی استعمال کی، جسے دو گھوڑے کھینچتے تھے۔

نومبر کے آخری ہفتے میں وہ اپنی منزلِ مقصود پیکینگ پہنچے۔ لیہہ سے پیکینگ تک اُنہوں نے تین ہزار میل لمبا فاصلہ طے کیا تھا۔ پیکینگ میں ویلبی اور ملکولم برٹش

منسٹر ریذیڈنس سرکلاڈ میکڈ ونلڈ اور لیڈی میکڈ ونلڈ سے ملے۔ پیکینگ میں ایک روز شہزاد میر نے چینی شہنشاہ کی بیٹی کو آلات موسیقی کی دُھنوں میں ایک پالکی میں جلوس کی صورت میں گزرتے دیکھا۔ بازار کے دونوں طرف فوجی اِستقبال کے لئے جھنڈے وغیرہ لئے کھڑے تھے۔ شہزاد کے مطابق فوجیوں کی وردی فقیرانہ تھی۔ اُنہوں نے رُوسی طرز کی بندوقیں تانی تھیں اور ساتھ صرف ایک کارتوس رکھا گیا تھا۔ افسروں کے سروں پر عہدے کی پہچان کے لئے پر سجائے گئے تھے۔

وہ صرف تین روز پیکینگ میں رہے' جہاں سے پارٹی سمندر کے راستے ہانک کانگ، سنگاپور سے ہوتے ہوئے ہندوستان لوٹے۔ سنگاپور میں شہزاد نے جہاز کے عرشے پر سے اپنے پرانے کپڑے سمندر میں پھینک دیئے۔ مسافروں نے جب پوچھا تو شہزاد میر بولا۔ ''آج میں نے جوؤں کے سارے سٹور کو سمندر میں ڈبو دیا ہے تاکہ ان سے کسی طرح نجات پاؤں۔''

انڈمان کے پاس سے ہوتے ہوئے ۲۷ دسمبر کو وہ کلکتہ پہنچے۔ کلکتہ میں اپنے قیام کے بارے میں شہزاد میر لکھتا ہے:

''کلکتہ میں ہم گھومے پھرے۔ سبھوں کی جیبیں روپوں سے بھری تھیں۔''

کلکتہ سے ویلبی لکھنو روانہ ہوا۔ شہزاد نے نوشہرہ میں اپنے رجمنٹ گیارھویں بنگال لنسرز میں دوبارہ حاضری دی۔ لسُو اور ایشے چھرنگ لیہہ واپس لوٹے۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ برفانی زوجی لا پار کرنے میں اُن کو بڑی دِقت آئی ہوگی۔

ویلبی نے شہزاد میر کو بطورِ معاوضہ دو سو روپے بھیجے۔ کپتان کی سفارش پر اُس کو Check Mcgregor کا تمغہ اور ایک سو پچاس روپے کا نقد اِنعام عطا کیا گیا۔

ویلبی نے شہزاد میر، لسُو اور ایشے چھرنگ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ تینوں وفادار آدمی دُکھ اور سکھ میں ہمارے ساتھ رہے.....ان کے بغیر یہ سفر کبھی تکمیل کو نہیں پہنچا ہوتا۔

ویلبی نے ۴۲۲ صفحات کی اپنی کتاب کو دو لداخیوں کے حوالے سے ذیل کے جملہ پر ختم کیا ہے:

''جہاں بھی وہ (ویلبی اور ملکولم) ہوں گے، دُنیا میں اُن کے دو دوست (لسُو آرغون اور ایشے چھرنگ) ہوں گے، جن کو وہ ہر حال میں نہیں بھول سکتے۔''

کلکتہ میں ویلبی اور ملکولم نے لسُو اور ایشے چھرنگ کو توصیفی اسناد دیں۔ ایشے چھرنگ تگ کی یہ اسناد منشی غلام محی الدّین کے پاس تھیں۔ منشی نے مجھے دے دیں۔ اُن کے ساتھ ایک انگریز کا فوٹو ہے۔ یہ ویلبی یا ملکولم ہو سکتا ہے۔

میں یہاں اُن سارٹیفکیٹوں کا اُردو ترجمہ پیش کرتا ہوں۔

''ایشے چھرنگ لداخی نے اس سال (۱۹۹۶) ملکولم ۹۳ ہائی لینڈرز اور راقم الحروف کے ہمراہ تبت اور چین کا سفر کیا۔ وہ بڑا وفادار اور ہمہ وقت نہایت ہی مفید نوکر تھا۔ چاہے حالات کتنے دگرگوں ہوں، وہ ہشاش بشاش رہتا تھا۔ وہ تبتّی لکھ پڑھ سکتا تھا۔ خچروں پر بار لادتا، کھانا پکاتا، اور جو بھی کام کرنے کے لئے کہے، شوق سے کرتا تھا۔

اگر مجھے دوبارہ سفر کرنا پڑے تو میں اس کو بطورِ خادم دوبارہ لینے کے لئے حتیٰ الامکان کوشش کروں گا۔ میں ہر کسی کے لئے اُس کے حق میں پُرزور سفارش کرتا ہوں۔

وہ مجھ سے ماہانہ بیس روپے مشاہرہ پاتا تھا۔

ایم ایس ویلبی کپتان

آٹھارواں ہُسار

کلکتہ

۲۹ر دسمبر ۱۹۹۶ء

''حاملِ رُقعہ ایشے چھرنگ جو ایک لداخی ہے، کپتان ویلبی اور میرے ہمراہ تبت او و پیکینگ، چین تک تھا۔ جب حالات مخدوش تھے اور غذائی قلت تھی، تب بھی وہ ہمیشہ خوش و خرم رہتا تھا اور ہمارے لئے نہایت ہی مفید تھا۔

بطورِ مترجم بھی وہ سبھوں سے کارآمد ہے اور زبانیں سیکھنے کا فطری میلان رکھتا ہے۔

میں ہر کسی کو جو وسطِ ایشیا یا تبت سفر کر رہا ہو، اس کے حق میں پُرزور سفارش کرتا ہوں۔ کیونکہ کام جتنا زیادہ مشکل ہو، وہ زیادہ خوش اسلوبی سے اسے سرانجام دیتا ہے۔

نیل ملکولم

۹۳ ہائی لینڈرز

کاشغر میں قلم رسول اور جمعہ مالک غالباً لمبی مدّت رُکے تھے۔ اس کی تفصیل نہیں ملی۔ تب لیہہ میں لوگوں نے اُن کے کاشغر پہنچنے کی خبر سنی تھی۔

کاشغر سے وہ گلگت کے راستے سرینگر آئے۔ اُن کے پاس خرچ کے لئے روپیہ پیسہ نہیں تھا۔ جون کا مہینہ تھا۔ خوش قسمتی سے برٹش جوائنٹ کمشنر لیہہ روانہ ہو رہا تھا۔ وہ لداخ میں سنٹرل ایشیا کے تجارتی امور کا افسر اعلیٰ تھا اور گرمیوں کے چند ماہ لداخ میں گزارتا تھا۔ سرینگر سے اُس کے ساتھ حسبِ معمول کلرک، لداخی جمعدار اور چپراسی لیہہ جا رہے تھے۔ قلم رسول اور جمعہ اُن کی پارٹی میں شامل ہوئے۔ لیہہ تک اُنہیں مفت سواری اور کھانا پینا ملا۔

قلم رسول اور جمعہ مالک کی لیہہ آمد چھوٹے سے قصبے کے لوگوں کے لئے بڑی خبر تھی۔

اِس مہم کے تین سال بعد ۱۸۹۹ء میں کپتان ویلبی جنوبی افریقہ میں بوئر جنگ میں مارا گیا۔ تب شہزادمیر لندن میں ویلبی کے خاندان کے ہاں بطورِ مہمان ٹھہرا تھا۔

قلم رسول کا اِنتقال ہوئے بہت سال ہوئے ہیں۔ اُس کا ایک گیت لیہہ ریڈیو سٹیشن سے کبھی کبھی نشر ہوتا ہے۔ اُس کے چند بول ملاحظہ ہوں:

''بچوں کو گھونسلے میں چھوڑ کر بڑا پرندہ اُن کے لئے
کچھ دانہ دُنکا لانے کے لئے چین روانہ ہوا
چین میں مَیں نے حقے کا کش لیا
اور اُس کے دھوئیں کا مرغولہ لیہہ کی طرف چھوڑا
میرا شان بھرا لیہہ
اِس کی خوشبو تم تک پہنچے....''

قلم رسول نے شاید یہ گیت چین میں اپنے سفر کی نسبت سے کہا تھا۔

قلم غلام رسول
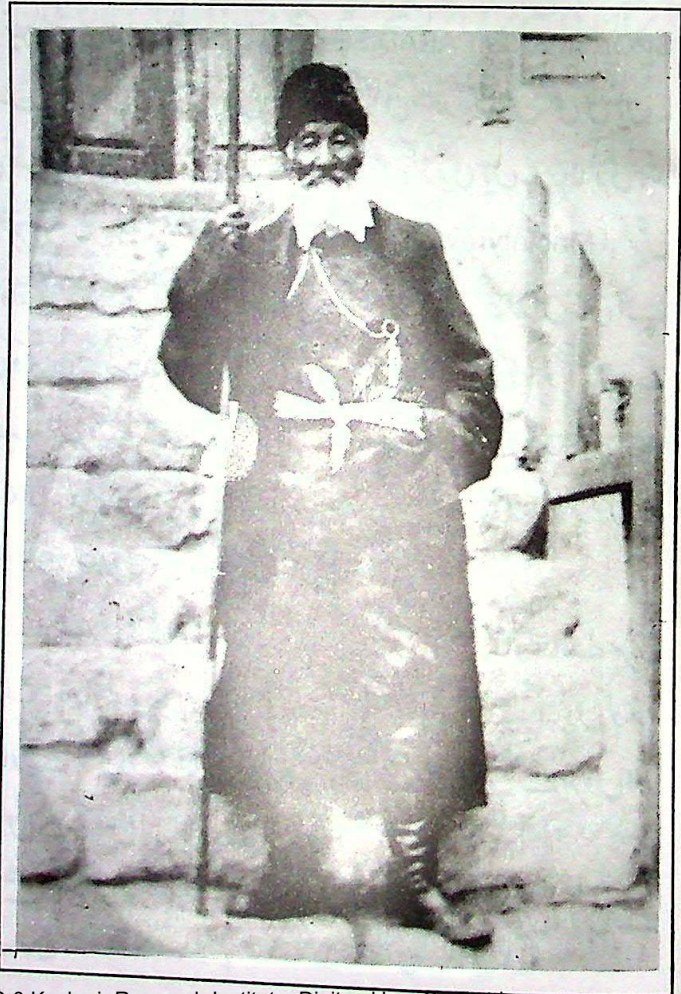
جنگلی جانور

لداخ کے ننگے پہاڑوں اور رتیلے میدانوں میں دُنیا کے چند مشہور جنگلی جانور پائے جاتے ہیں۔ ان میں جنگلی بھیڑ اور بکرا (جن کی لداخ میں کئی نسلیں پائی جاتی ہیں) جنگلی سُسر اگائے، جنگلی گدھا، برفانی چیتا، بھیڑیا، خرگوش، ہرگ، لومڑی، ریچھ، بن بلاؤ وغیرہ مشہور ہیں۔ اِسی بنا پر لداخ کو SPORTMAN'S PARADISE یا شکاریوں کی جنت کہا گیا ہے۔ لداخ میں شکار سے متعلق متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ راقم الحروف کی نظر سے کم سے کم ایسی ایک درجن کتابیں گزری ہیں۔ برطانوی ہند کے اعلیٰ فوجی افسروں میں جرنیل کینلوچ، جرنیل میسین ٹائر (Macintyre)، کرنل ڈورانڈ، کرنیل وارڈ، کرنل ہیبر، کرنل ریجنلڈ، کرنل مارکھم وغیرہ نے لداخ میں اپنے شکار کے تجربوں کو کتابی صورت دی ہے۔ کئی لداخی جانور یورپ کے مہم جو محققین کے ناموں سے منسوب ہیں جیسے مشہور جنگلی بکرا Ovis Ammon کو HODGSON'S SHEEP، URIAL کو VIGNE'S SHEEP یا OVIS VIGNEI اور خرگوش کی ایک قسم کو STOLIZIKA'S MOUSE HARE کہا جاتا ہے۔

یورپ کے شکاری جنگلی بکروں اور بھیڑوں کے لمبے سینگوں والے سر جمع کرتے جن کو وہ اپنے ڈرائینگ روم وغیرہ کی زینت بناتے یا پھر عجائب گھروں کو نذر کرتے تھے۔ شکار سے متعلق اکثر کتابوں کو جنگلی بکروں اور بھیڑوؤں کے سروں اور ٹرافیوں کی تصویروں سے مزین کیا گیا ہے۔

لداخ کے پالتو جانور جہاں مقابلتاً کافی چھوٹے ہوتے ہیں، اس کے

برعکس جنگلی جانور بڑے جسیم اور قوی ہیکل ہیں۔ یورپی سیاحوں نے اس دلچسپ تفاوت کا مشاہدہ کیا ہے۔ چنانچہ اُن کی نظر میں ایک لداخی ٹٹو عام بکرے کے برابر ہے لیکن جنگلی بکرا لداخی ٹٹو کے برابر ہے۔

لداخ کے قدیم گیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں لداخ کی سرزمین پر جنگلی جانوروں کے غول کے غول گھومتے تھے۔ یہ جانور شروع میں لداخ میں آباد ہونے والے آریائی نسل کے قبیلوں کے لئے غیر معمولی اہمیت رکھتے تھے۔ یہ ان کے لئے مقدس مخلوق بھی تھے اور پیٹ کی آگ بجھانے کا سامان بھی۔ وہ چٹانوں پر اُن کی تصویریں تراشتے تھے۔ جو اب بھی لداخ اور بلتستان کے علاوہ شاہراہ قراقرم، چترال، گلگت وغیرہ میں نظر آتی ہیں۔ IBEX (کیل) کو دیوی دیوتا کا درجہ دیا گیا ہے۔

شکار سے متعلق دو گیت اس کتاب کے ایک اور مضمون لداخ کے ''لوک گیت'' میں دیئے گئے ہیں۔ یہاں ایک اور گیت کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

''یہ تیر لے لو! اپنی کمان سنبھالو! لو یہ تیر بھی تھام لو
نوجوان (شکاری) تم چھپنے میں بڑے طاق ہو!
نوجوان! تم پہاڑ پر چڑھنے میں بڑے ہوشیار ہو!
نوجوان! تم مرگ (ANTELOPE) کی آواز کی نقل اُتارنے میں ماہر ہو!
ارے دیکھ! وہ IBEX نظر آرہے ہیں
اے نوجوان! تیر چلے پر چڑھا!

آرتھر نیوے جب کشمیر سے لداخ کی سیاحت پر آیا تو (ڈوقپا) آریائی نسل کے مرد عورتوں نے اُن کو گیت سنایا۔ نیوے نے اس گیت کا مرکزی مفہوم یہ بتایا ہے۔ ''ہمارے آباواجداد بڑے اچھے شکاری تھے۔ وہ گلگت سے یہاں آئے تھے۔'' لداخ میں کئی مقامات کے نام شکار سے وابستہ ہیں۔ مثلاً ایک گاؤں کا

نام لینکشیت یعنی شکار گاہ ہے۔ زنسکار میں ایک مقام کا نام ہیما لینگ یا شکاری آدمی ہے۔

لداخ میں ڈوگرہ عمل داری قائم ہونے کے بعد یورپی شکاریوں کی آمد شروع ہوئی۔ رفتہ رفتہ اُن کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ بعد میں سرینگر میں متعینہ برطانوی ریذیڈنٹ سے لداخ جانے کی اجازت لینی پڑتی تھی۔ ہر سال شکاریوں کی ایک مقررہ تعداد کو لداخ جانے کی اجازت دی جاتی تھی۔ لیفٹیننٹ کرنل سر ریجی نالڈ نے لداخ میں شکار سے متعلق اپنی کتاب A TOUR IN THE HIMALAYAS AND BEYOND مطبوعہ ۱۸۹۸ء میں لکھا ہے:

''۱۸۹۵ء میں کل چار سو شکاری شکار کھیلنے لداخ اور بلتستان گئے۔ شکار کے لائیسنس ۱۵ / مارچ سے ۱۵ / نومبر تک کے لئے اجرا کئے جاتے تھے۔ شکاری لداخ اور بلتستان کے پہاڑوں اور مختلف گھاٹیوں میں پھیل جاتے۔ ایک شکاری کو چھ کیل، دو نیان (Ovis Ammon) چار شاپو، چار ناپو، چار مرگ اور دو غزال مارنے کی اجازت تھی۔''

کرنل ریجی نالڈ لکھتا ہے کہ ''مقامی شکاری اس تعداد کا پاس نہیں رکھتے۔ وہ بڑی تعداد میں جانوروں کا شکار کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک لداخی شکاری نے سینکڑوں مارخور مارے۔''

یہ بات اُس زمانے تک ہی محدود نہیں۔ اکثر شکاری کبھی مقررہ تعداد کے پابند نہیں رہے۔

سیاحوں اور شکاریوں کے سفرناموں اور یادداشتوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لداخ آکر کوئی شکاری مایوس نہیں ہوا۔ وہ اپنی محنت کا ثمرہ لے کر ہی گھر لوٹتا ہے۔ فریڈرک ڈریو نے جو ۱۸۷۱-۱۸۷۴ء کے دوران لداخ میں ناظم اعلیٰ رہا تھا، اپنی کتاب J&K Territories میں لکھتا ہے کہ اُنہوں نے لداخ میں صرف ایک دِن

کے سفر میں متعدد جنگلی گدھے دیکھے جن کی تعداد ۳۰۰ بنتی تھی۔

کرنل داراہ (DARAH) ۱۸۹۶ء میں لداخ آیا تھا۔ وہ اپنی کتاب SPORTS IN THE HIGH LAND OF KASHMIR میں رقم طراز ہے کہ آنلے گاؤں میں ایک جگہ اُنہوں نے ۱۳۶ جنگلی گدھے اور دُوسری جگہ ۳۰ غزال دیکھے۔

تقریباً دو دہائی پہلے ہوئے سروے کے مطابق سارے لداخ میں صرف ۵۰۰ جنگلی گدھے اور ۵۰ غزال بچے تھے۔ اسی طرح جنگلی یاک (سُراگائے) اور Ovis Ammon قریب قریب معدوم ہوگئے تھے۔ یہ نادر جانور صرف لداخ اور تبت میں پائے جاتے ہیں۔

لداخ میں جنگلی جانوروں کو آزادی کے بعد پچیس سال تک بے تحاشا اور اندھا دُھند شکار سے غالباً سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ اس کے باوجود لداخ کے روپشو، کورزوق علاقے میں اس کے بعد بھی ایک مسافر کو سفر کے دوران روزانہ سو ڈیڑھ سو خرگوش اور کہیں کہیں جنگلی بکروں کے غول نظر آتے تھے۔

ماضی قریب تک چشم دید بیانات کے مطابق کبھی کبھی ایک بڑا سا بھیانک گدھ غوطہ کھاتا تھا اور ایک خرگوش کو اپنے پنجے میں دبا کر فضا میں بلند ہوتا تھا۔

۱۹۷۲ء میں مرکزی سرکار اور ۱۹۷۸ء میں ریاستی سرکار نے جنگلی جانوروں کے تحفظ کا قانون پاس کیا اور مذکورہ نادر جنگلی جانوروں کا شکار ممنوع قرار دیا۔ لائیسنس دینا بند کیا ہے لیکن غیر قانونی طور شکار کرنا جاری رہا۔ پھر بھی ماضی کے مقابلے میں صورت حال میں خوشگوار تبدیلی آئی ہے اور بہت کم شکار ہوتا ہے۔

کہتے ہیں لداخ میں بارہ سینگا (لداخی میں شاوا ریدقس)، مارخور (راچے، راپوچے) اور مشک نافہ والا ہرن پائے جاتے تھے۔ لیکن اُن کی نسلیں اب ناپید ہیں۔ صرف نام باقی ہیں، نشان کہیں نہیں۔ دردلوگ مارخور کی کھال اپنے مکانوں میں سانپوں کو بھگانے کے لئے آویزاں رکھتے تھے۔ اُن کے نظریئے کے مطابق سانپ

مارخور سے ڈرتا ہے۔

۱۹۷۰ کے بعد چند جنگلی جانوروں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۹ء کے درمیان جنگلی جانوروں کے تحفظ سے متعلق محکمہ اور چند ماہرین جے. ایل. فوکس، چھرنگ نربو، آر. ایس. چُنداواٹ، ایس. سنہا اور داس نے لداخ میں پائے جانے والے مختلف جنگلی جانوروں کا سروے اور گنتی کی۔ اُن کی رپورٹ کے مطابق ماسوائے ارگلی جنگلی یاک، مرگ اور غزال دُوسری اقسام کے جانوروں کی تعداد بڑھی ہے۔

اِس دوران جنگلی جانوروں کی حفاظت کے لئے گیارہ پناہ گاہیں اور ایک نیشنل پارک قائم کیا گیا ہے۔ یہ پناہ گاہیں ۷۰ مربع کلومیٹر رقبہ سے دس ہزار مربع کلو میٹر رقبہ تک بڑی ہیں۔

آیئے لداخ کے مشہور جنگلی جانوروں سے متعلق جان کاری حاصل کریں:

OVIS AMMON (لداخی میں نیان) یہ ارگلی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اور مشہور ترین جنگلی بھیڑو ہے جو دُنیا میں صرف تبت اور لداخ میں پایا جاتا ہے۔ اسے ''زمین پر تمام ریوڑوں کا باپ'' FATHER OF ALL FLOCKS ON EARTH کہا گیا ہے۔ اِس کا اوسط وزن ۲۸۰ پونڈ ہوتا ہے۔ یہ مارکوپولو بھیڑو کی نسل سے قریبی مشابہت رکھتا ہے تاہم قد رقامت میں اس سے چھوٹا ہے اور سینگ بڑے ہیں۔ اس کے سینگ کی اوسط لمبائی ۴۲ اِنچ ہوتی ہے۔ ایک شکاری آرنلڈ پائیک نے ۵۷ اِنچ لمبے سینگوں والا نیان مارا، جو اب تک کا ریکارڈ ہے۔ اس کے سینگ سر پر قوس کی طرح دونوں جانب پھیلے ہوتے ہیں۔ بڑھاپے میں بھاری سینگ اس کے لئے وبالِ جان ہیں۔

میجر جرنیل میسنٹرین اپنی کتاب ''ہندوکش'' میں لکھتا ہے:

''جو کوئی OVIS AMMON کا شکار کرے، مان لو کہ اُس کو ہمالیائی شکار کا

BLUE RIBBON کا اعلیٰ ترین اعزاز ملا۔"

لیہہ میں جنگلی جانوروں کے تحفظ کے محکمہ کے اندازہ کے مطابق لداخ میں صرف ۲۰۰ نیان بچے ہیں، جو ۱۰۰۰۰ مربع کلومیٹر رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ۴۵۰۰ میٹر بلند کانڈ الا کے دونوں طرف یہ ہر موسم میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ گیا میرو میں واقع جنگلی جانوروں کی پناہ گاہ اور اس کے نزدیک ۸۰ نیان دیکھے گئے۔

اِس کوئی جگہ کی تلاش نہیں رہتی ہے اور گرمیوں کا موسم ۴۵۰۰ میٹر بلند مقام پر گزارتا ہے۔

آزادی کے بعد جب نیان کے شکار پر پابندی نہیں تھی۔ ایک امریکی ارب پتی جیمز روز میلن اس کی تلاش میں لداخ آیا اور ۴۱ انچ لمبے سینگوں والا ایک نیان مارا۔ میلن نے اس شکاری کے لئے پانچ سو ڈالر کا انعام رکھا تھا جو سب سے پہلے اُس کو نیان دکھائے۔

نیان کو OVIS AMMON HODGSONI بھی کہتے ہیں۔

IBEX (لداخی میں ریدقس) یہ ہرن کی قسم کا مشہور جانور ہے۔ لداخ کے قدیمی گیت، روایتیں اور چٹانوں پر تراشی گئی تصویریں اِس کی افادیت کو اُجاگر کرتی ہیں۔ یہ نہایت ہی تیز رو، پھرتیلا اور بلندیوں پر رہنے والا جانور ہے۔ انہیں صفات کی بناء پر لداخ سکاؤٹس اور گلگت سکاؤٹس کا سپاہیانہ نشان IBEX ہے۔ سکاوٹ کی فوجی ٹوپی پر Ibex کا علاقائی بیج لگایا جاتا ہے۔ اس کا اوسط وزن ۲۰۰ پونڈ ہوتا ہے۔

اِس کے سینگوں کی اوسط لمبائی ۴۴ انچ ہوتی ہے جو سیدھ میں جا کر نوک پر پیچھے کی طرف ذرا خم کھاتے ہیں۔

لگ بھگ پندرہ سال پہلے ہوئے اعداد و شمار کے مطابق لداخ میں چھ ہزار کیل (ibex) تھے، جو ۱۴۰۰۰ ہزار مربع کلومیٹر میں پائے گئے اور ۴۰۰۰ اور ۴۸۰۰ میٹر کی بلند ڈھلوانوں پر دیکھے گئے۔ کرگل میں سورو علاقے میں ۱۲۰۵ مرتبہ مشاہدوں کے

دوران کیلوں کے ۸۷ گروہ نظر آئے۔ ستارپ کُرگیان میں دُور بین سے ۳۱۳
مشاہدوں کے دوران اس کے ۲۷ گروہ دیکھے گئے۔ دسمبر ۱۹۸۴ء میں جنگلی جانوروں
کے تحفظ کے محکمہ کے ارکان نے ہمس نیشنل پارک میں ۳۱۲ کیلوں کی گنتی کی۔ تب سے
مجموعی طور اُن کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہوگا۔

فوکس نے لکھا ہے کہ سورج طلوع ہونے سے پہلے ibex چست ہوتے
ہیں۔ دوپہر میں سست ہو جاتے ہیں۔ سورج غروب ہونے کے وقت دوبارہ چاق و
چوبند نظر آتے ہیں۔ یہ انسانوں سے جلدی گھبرا جاتا ہے۔ برفانی چیتے اور بھیڑیے
اس کی جان کے دشمن ہوتے ہیں۔

جوزف ایل فوکس اور اس کے ساتھیوں نے یہ سروے وائلڈ لائف انسٹی
ٹیوٹ آف انڈیا کے تعاون سے کیا تھا۔

BLUE SHEEP (لداخی ناپو) اِس کو BHARAL بھی کہا جاتا ہے۔ اس کو
شکل اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے نیم بکری، نیم بھیڑ کہا جاتا ہے۔ اس کے
سینگوں کی اوسط لمبائی ۲۴ انچ ہوتی ہے۔ ناپو گرمیوں میں اٹھارہ ہزار فٹ تک کی بلندی
پر چلا جاتا ہے۔

تقریباً پندرہ سے بیس سال پہلے ہوئے سروے کے مطابق ناپو خطے کے
اڑتیس ہزار مربع کلومیٹر رقبے میں پائے جاتے ہیں اور ان کی تعداد اندازاً ۱۰۰۰ ابتائی
جاتی ہے۔ تب سے ان کی تعداد میں قابل قدر اضافہ ہوا ہوگا۔ فوکس نے جو ۲۰۰۴
میں دوبارہ لداخ آیا۔ اس کی تصدیق کی ہے اور کہا ہے کہ دوسری اقسام کے جنگلی
جانوروں میں بھی اضافہ ہوا لگتا ہے۔

نومبر ۱۹۸۴ء میں ہمس نیشنل پارک میں صرف ایک مربع کلومیٹر رقبے میں
۱۲۳۶ ناپو گنے گئے۔

URIAL (لداخی میں شاپو) اِس کو OVIS VIGNEI بھی کہتے ہیں۔ پہلے یہ

لداخ میں بکثرت پایا جاتا تھا۔ پچھلے ساٹھ سال کے دوران اس کی تعداد کم ہوگئی ہے۔ ماضی میں کسی نے لداخ کو OVIS VIGNEI کی سرزمین کہا تھا۔ مادہ شاپو نر سے چھوٹی ہوتی ہے۔

حال میں وادیٔ سندھ میں تقریباً ۵۰۰ شاپو نظر آئے۔

اِس کے سینگ کی لمبائی ۱۲۸ انچ ہوتی ہے۔ برٹش میوزم میں میجر پاول کون کا مارا ہوا لداخی شاپو کا پتلا محفوظ ہے۔

جنگلی یاک ((ڈونگ لداخی) لداخ کے چنگ چھنمو علاقہ میں تھوڑی سی تعداد میں پایا جاتا ہے اور ہند چین سرحد کے آر پار آتے جاتے رہتے ہیں۔ چنگ چھنمو کا لفظی معنی ''بڑا شمالی میدان'' ہے۔ سروے کرنے والوں کو ایک گروپ میں ۱۳ سے زیادہ نظر نہیں آئے۔ صرف ۱۹۸۹ء میں ۲۰ جنگلی یاک کا ایک گروہ نظر آیا۔

جنگلی یاک تُند خو اور خوفناک جانور ہے۔ کئی دفعہ شکاری پر ہلہ بول دیتا ہے۔ اس لئے مورچہ بندی کر کے اس پر گولی چلائی جاتی تھی۔ زخمی یاک بڑا خوفناک ہوتا ہے۔ شکاری پر حملہ کرے تو خدا ہی حافظ ہے۔ جنگلی یاک کا ذکر پہلے پہل ''تاریخِ راشدی'' میں مرزا حیدر گورکان نے اِن الفاظ میں کیا ہے:

''نہایت ہی تند خو جنگلی جانور ہے۔ اپنے شکار کو سینگ اور لات مارتا ہے یا زبان سے فضا میں بیس گز کی بلند تک اُچھال پھینکتا ہے اور زمین پر پہنچنے سے پہلے شکار ملکِ عدم کا سفر کر چکا ہوتا ہے۔''

رُوسی سیاح N.M. PRZEWAL نے جنگلی یاک اور ایک شکاری کی مہم کو ہسپانوی بھپرے ہوئے بیل اور انسان کے درمیان ڈوئیل سے تعبیر کیا ہے۔

یاک کے سینگوں کی اوسط لمبائی ۳۶ انچ اور درمیان میں موٹائی ۱۴ انچ ہوتی ہے۔ اس کا قد ۱۵ ہاتھ بتایا گیا ہے۔

چنگ چھنمو میں یورپی شکاریوں نے بہت جنگلی یاک مارے تھے۔

جنگلی گدھا (سکیانگ لداخی): سکیانگ نہایت ہی تیز رفتار جانور ہے جو لداخ کے علاقہ چنگ تھنگ میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اب اس کی آبادی میں بڑی کمی آئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ گھاس کی کمی بتائی جاتی ہے۔ سکیانگ کے مسکنوں کے مقامات پر چین اور ہند کی مسلح فوجوں نے قلعہ بندی کی ہے۔ اِس لئے یہ گھبرا کر وہاں سے فرار ہوئے ہیں۔

۱۹۸۸ء میں ہوئی سکیانگ شماری کے دوران کل ۵۰۰ پائے گئے۔

سکیانگ تبت اور لداخ کی سرحد کی دونوں جانب پائے جاتے ہیں۔

سکیانگ آدمی کی آہٹ سنتے ہی رفو چکر ہوتا ہے۔ ایک لداخی نے جنگلی گدھے کو سدھا کر پالتو بنایا تھا لیکن زیادہ نہیں جیا۔ چنگ تھنگ میں ایک جنگلی گدھا اور گھوڑی کے اختلاط سے ایک اعلیٰ نسل پیدا ہوئی ہے جو ماہرینِ حیوانات کی توجہ چاہتی ہے۔

مرگ (Antelope) (ژوس لداخی): اِس کو چیرُو بھی کہتے ہیں۔ ژوس لداخ کے چنگ چھنمو اور لینگزی تھنگ کے علاوہ سرحد پار چینی علاقے میں بھی پایا جاتا ہے۔ اِس کی اُون شہتوس پشم سے اعلیٰ ہوتی ہے اور سونے کے بھاؤ بکتی ہے۔ ژوس کا ایک شال ایک لاکھ روپیہ میں فروخت ہوتا ہے۔ اسی اُون کی وجہ سے ژوس اکثر مارا جاتا ہے اور اس کی نسل قریب المعدوم ہے۔ خانہ بدوش چنگپا اس کے سینگ تنبو کے لئے بطور پگا اِستعمال کرتے ہیں۔

۲۵۰۰ مربع کلومیٹر کے رقبے میں لگ بھگ ۲۰۰ ژوس گنے گئے۔ موسم گرما میں اچھی گھاس ہونے کی وجہ سے یہ چنگ چھنمو اور لینگزی تھنگ میں رہتے ہیں اور سردیاں چینی کنٹرول والے اکسائی چین کے مقابلتاً نشیبی علاقے میں گزارتے ہیں۔ شہتوس کی تجارت پر حکومت نے پابندی عائد کی ہے۔

تبّتی غزال (گوآ): تبّتی غزال کی نسل رُوبہ زوال ہے۔ جنگلی جانوروں کے تحفظ کے محکمہ نے ۱۰۰۰ مربع کلومیٹر سے کم رقبہ میں چھوٹے چھوٹے گروہوں میں کل

۵۰ غزال دیکھے۔ اِس کے سینگ بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ سب سے لمبا سینگ ۱۴.۵ اِنچ پایا گیا۔

برفانی چیتا (لداخی۔ چن): برفانی چیتے کی لمبائی ساڑھے چھ فٹ تک ہوتی ہے۔ تقریباً آدھی لمبائی دُم کی ہوتی ہے۔ فوکس، سنہا، چنداواٹ اور داس نے نومبر ۱۹۸۵ء سے جولائی ۱۹۸۶ء کے درمیان برفانی چیتا کے مسکنوں کا مطالعہ کیا۔ اِس ضمن میں اُنہوں نے زنگلا خرنق راستہ، مارکھا وادی، بالائی سورو اور لُونگ نق گُرگیاق وادی کا دورہ کیا۔ اُنہوں نے وادی مارکھا میں ۳۸ افراد سے انٹرویو لئے۔ جن میں سے ۹ نے برفانی چیتا دیکھا تھا۔ اُن کے مطابق اپریل ۱۹۸۵ء سے مارچ ۱۹۸۶ء تک ایک سال کے دوران برفانی چیتوں اور بھیڑیئوں نے ۱۳۰ بھیڑیں، بکریاں اور ۱۰ ایاک ہلاک کئے تھے۔

ایک دفعہ جب ایک چیتا بھیڑ بکریوں کے باڑے میں گھسنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ۳۰ سے ۴۰ بھیڑ بکریوں کو مار دیتا ہے۔ وہ صرف خون پیتا ہے۔ آخر میں چیتا بھی مارا جاتا ہے کیونکہ بھیڑ بکریوں کے زیادہ خون پینے سے وہ بھاگ نہیں سکتا ہے۔

فوکس کی ۱۹۹۱ء کی ایک رپورٹ کے مطابق لداخ میں برفانی چیتے کی آبادی ۲۰۰ ہے جبکہ بھیڑیئے تین سو ہیں۔

برفانی چیتوں کے تحفظ کے لئے ۱۹۸۱ء میں لیہہ سے ۳۷ رکلومیٹر دور ہمس میں نیشنل پارک قائم کیا گیا۔ جس کو بعد میں توسیع دے کر ۴۸۰۰ مربع کلومیٹر رقبے تک بڑھایا گیا۔

ریچھ (لداخی۔ ٹینمو): ریچھ لداخ کے سکیُو مرکھا علاقہ دراس اور کئی دُور اُفتادہ اور دُشوار گذار دیہات میں پایا جاتا ہے۔ اس کی قوت شامہ اور سماعت تیز اور بینائی کمزور ہوتی ہے۔ ریچھ کی نسل کی افزائش نہیں ہوتی ہے۔ اِس کی ایک انوکھی وجہ بتائی جاتی ہے۔ ریچھ ایک جگہ سے دُوسری جگہ جاتا رہتا ہے۔ اِس علاقے میں گرمیوں

میں پانی کے بہت سارے نالے بہتے ہیں۔ ریچھ اپنا پہلا نوزائیدہ یا ننھا بچہ لے کر نالہ پار کرتا ہے اور بزعم خود اُس کی حفاظت کے لئے اُس کے اُوپر ایک بڑا اور بھاری پتھر ڈالتا ہے۔ پھر یکے بعد دیگرے دُوسرے بچوں کو اپنے ساتھ کنارے پر لے جاتا ہے اور اُن کے اُوپر بھاری پتھر ڈالتا ہے۔ جب وہ آخری بچہ لے کر نالہ پار کرتا ہے تو سارے بچے بھاری پتھر کے بوجھ میں دب کر مر گئے ہوتے ہیں اور آخری زندہ بچہ لے کر وہ چلتا بنتا ہے۔

خطّے میں جنگلی بلا، جنگلی کتا اور MARMOT (لداخی- پھیا) بھی پائے جاتے ہیں۔ پھیا سے متعلق مورخ ہیروڈٹس نے لکھا تھا کہ لداخ میں سونا نکالنے والا ایک جانور پایا جاتا ہے۔ پھیا اپنا بل گہرا کھودتا ہے۔ ممکن ہے کہ کبھی اس گہرے بل سے اتفاقیہ طور سونا نکلا ہو۔

لداخ میں ماضی اور حال میں کئی مشہور شکاری ہو گزرے ہیں۔ کئی یورپی سیاحوں نے چند شکاریوں کے نام دیئے ہیں۔ سون ہیڈین نے اپنی مشہور کتاب Trans Himalaya میں تنڈوپ صنم نام کے شکاری کی تعریف کی ہے اور اس کو Grand Court Hunt's Man کہا ہے۔ آرتھر برینک مین نے اپنی کتاب RIFLE IN KASHMIR میں پلچور نام کے ایک شکاری کی بذلہ سنجی اور خوش مزاجی پر کئی صفحے سیاہ کیئے ہیں۔ ۱۸۸۸ء میں کشمیر سرکار نے جنگلی جانوروں کے شکار سے متعلق قواعد کا اعادہ کیا۔ اس سرکاری دستاویز میں لکھا گیا ہے کہ لداخ میں بہت سے اچھے شکاری ہیں اور سیاحوں اور یورپی شکاریوں کو اُن کی خدمات حاصل کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

ماضی قریب میں بھی لداخ میں کئی اچھے شکاری تھے۔ جو اچھے نشانہ باز ہی نہیں تھے بلکہ جنگلی جانور کی طرح تیزی سے پہاڑوں پر چڑھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لیکن آج لداخ کو اچھے شکاریوں کی نہیں بلکہ جنگلی جانوروں کے محافظوں اور

بہی خواہوں کی ضرورت ہے۔
ماہرین نے جنگلی جانوروں کی خوراک کے لئے پالتو جانوروں کی پہنچ سے باہرنئی چراگاہوں کا قیام، اُونچے مقامات کی چراگاہوں کا پالتو جانوروں کے لئے کم اِستعمال اور ارگلی اور غزال کے لئے سابقہ مسکنوں کی بحالی کی تجویزیں رکھی ہیں۔

منگول نسل کے پانچ افراد
(لیہہ میں منشی غلام محی الدین کی لی ہوئی ایک پرانی تصویر)

پرندے

لداخ میں کسی سے بھی یہ سوال کیا جائے کہ لداخ میں کون سے پرندے پائے جاتے ہیں۔ وہ جھٹ کہے گا۔

''کوا، چڑیا، کبوتر، گدھ، چڑیا، چکور.........''

زیادہ سے زیادہ دس پندرہ پرندوں کے نام بتا سکے گا لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ اب تک لداخ میں ۲۶۳ / اقسام کے پرندوں کی شناخت ہوئی ہے۔ ابھی تک لداخ کے کئی علاقوں کا سروے نہیں ہوا ہے۔ جب اُن کا سروے ہوگا تو اِس تعداد میں اور بڑا اضافہ ہوگا۔

لداخ میں پرندوں کے دو زُمرے ہیں:

۱- Resident Birds مقیم پرندے

۲- Migratory Birds مہاجر پرندے۔ یہ دائمی مہاجر نہیں ہیں' سردیوں کے آغاز میں لوٹتے ہیں اور گرمیوں میں لداخ واپس آجاتے ہیں۔

سائبریا جیسے دُور اُفتادہ علاقوں سے بھی ہزاروں لاکھوں پرندے نقلِ مکانی کر کے آغازِ بہار میں لداخ پہنچتے ہیں۔ یہ پرندے اور مرغابیاں، پنگ گونگ، چھوموری ری اور دُوسری جھیلوں کے کنارے رہتے ہیں' جہاں مختلف قسموں کے ہزاروں لاکھوں انڈے ملتے ہیں۔ ماضی میں دوتین سو گھوڑوں پر یہ انڈے تبت لئے جاتے تھے جہاں اُن کے نوڈل وغیرہ بنائے جاتے تھے۔

پرندوں کو قدرت نے ایک خاص حِس عطا کی ہے۔ کہتے ہیں جس روز

لداخ کی جھیل چھوموری ری کا یخ ٹوٹ جاتا ہے، اُس کے دُوسرے روز یہ پرندے جھیل کے کنارے پہنچ جاتے ہیں اور یخ لگنے سے ایک دِن پہلے یہاں سے واپس پرواز کر جاتے ہیں۔

لداخ کے آکاش پر ابابیلوں، رنگین طوطیوں اور کبوتروں کی ڈاریں اُڑان کرتی نظر آتی ہیں۔ بہت سارے پرندے پہچانے نہیں جاتے اور بہتوں کے اُردو یا ھندی میں متبادل الفاظ نہیں ملتے۔ کئی دفعہ ویران اور ننگے پہاڑوں اور چٹیل میدانوں میں پہاڑی چڑیاؤں کی چہچہاٹیں سنائی دیتی ہیں۔

لداخ میں گدھ بہت پائے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی بھیانک سا گدھ غوطہ کھاتا اور جانکار لوگوں کے مطابق ایک خرگوش کو اپنے پنجے میں دبا کر آسمان کی بلندیوں میں کھو جاتا ہے۔ روایت کے مطابق یہ گدھ آسمان کی بلندی سے اِنسان پر گول گول پتھر پھینکتا ہے اور اِنسان ہلاک ہو جاتا ہے۔ بچوں تک کو اُٹھا کر لے جانے کی کہانیاں مشہور ہیں۔

ایک انگریز ایڈیر ADAIR نے لداخ میں ۱۷۵۰۰ فٹ بلند تق لینگ درّہ کے سامنے ایک چٹان پر ایک داڑھیل گدھ کو پانی پیتے دیکھا۔ جس کی لمبائی ایک پر کے سرے سے دُوسرے پر کے سرے تک نو گز (تقریباً نو میٹر) تھی۔

لداخ چکور اور رام چکور کے لئے مشہور ہے۔ ماضی میں خطّے میں بہت چکور پائے جاتے تھے۔ برف باری کے دِنوں میں مکانوں میں چکور گھس آتے اور مکین کالقمہ بنتے۔ شکاری چکوروں کے جھنڈ کو برف میں بھگا بھگا کر تھکا دیتے۔ چکور چھتوں کی اوٹ میں پناہ لیتے اور بیسیوں سینکڑوں چکور پکڑے جاتے تھے۔ آج کل صورتِ حال مختلف ہے۔ چکور کا شکار بھی ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ پچھلے دو سالوں میں کسی متعدی مرض سے ان گنت چکور مرے ہیں اور کم چکور نظر آتے ہیں۔

پندرھویں صدی میں ایک لداخی راجہ سترقپا چو یا چکور خور راجہ کے نام سے

موسوم تھا۔ وہ چکور کھانے کا اِتنا بڑا شوقین تھا کہ اِسی نام سے مشہور ہو گیا اور اُس کا اصلی نام تاریخ کے صفحات سے مٹ گیا ہے۔

۱۹۷۶ء میں نامور ماہرِ طیور ڈاکٹر سلیم علی نے سیاہ گردن والی سارس اور جنگلی ہنس کی تلاش میں لداخ کا دورہ کیا۔ اُنہوں نے سیاہ گردن والے سارس کی ایک جوڑی دیکھی۔ ایک لداخی نے مجھے بتایا کہ وہ گھنٹوں چُپ چپاتے چھپ کر اُن کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کرتے تھے۔ اُنہوں نے اس جوڑی کی تصویر بھی لی۔ یہ نادر اور نایاب پرندہ دُنیا میں صرف لداخ اور تبت میں پایا جاتا ہے۔ ۱۹۸۲ء کے موسم گرما میں سارس کی مزید کئی جوڑیاں لداخ کے کئی دُور افتادہ دیہات میں دیکھی گئیں۔

راقم الحروف نے ۱۹۶۰ء کی دھائی میں لداخ کے علاقہ چنگ تھنگ میں سارس کی کئی جوڑیاں دیکھیں۔

لداخ میں جانے پہچانے کئی اور پرندوں میں ہُدہُد، پُھٹکی، چیل، برفانی چکور، لعل نما سرخ گردن والی تبتّی مرغابی اور نیلی گردن اور داغدار بدن والے طیور شامل ہیں۔

پہلے کوؤں کے پرے کے پرے نظر آتے تھے۔ آج کل کوّے بالکل غائب ہو گئے ہیں۔ شاید کسی متعدی مرض نے کوؤں کی نسل ختم کی ہو۔ جس طرح حال میں چکوروں کی تعداد میں بڑی کمی آئی ہے۔

۱۹۲۳ء میں بی. اوسمسٹن (B.OSMESTON) نام کا ایک مغربی ماہر لداخ آیا تھا۔ اُس نے لداخ کی ۶۷ اقسام کے پرندوں کی فہرست بنائی ہے۔ وہ غالباً پہلا ماہر تھا جس نے لداخ کے پرندوں کا سروے کیا۔ اس کی فہرست کے چند پرندوں کے اُردو نام ملاحظہ ہو: چنڈول، ناری، اسھلی، چاہا، تیتر، دھوبن، کوئل، تیہاری، کُرّی، کالا باز، مندہ، طوطی، رام گنگر، دیّا، دھومرا، عقاب، ابابیل، سنبل، طوطی اور اس کی کئی قسمیں شامل ہیں۔

۱۹۲۰ء کی دھائی میں کئی یورپیوں نے لداخ میں پرندوں کا مطالعہ کیا اور

اپنے مشاہدات شائع کئے۔ اُن کے نام وی. ایس. پرسوننے، ایف لڈلو اور آرمیز ٹس ہیگن ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں ڈبلیو کوئلز نے زنسکار اور پوریگ میں پائے جانے والے پرندوں پر ایک پیپر شائع کیا۔

۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان اِنگلینڈ کی ساؤ تھمپسٹن یونیورسٹی کے تین ریسرچ سکالروں نے لداخ کے پرندوں سے متعلق تحقیق کی۔ یہ لیہہ کے پاس ایک گاؤں ٹھکسے میں تین سال تک مقامی اور نقل مکانی کرنے والے پرندوں پر ریسرچ اور مطالعہ کرتے رہے اور اُنہوں نے ۲۴۰ اقسام کے پرندوں کی نشان دہی کی ہے۔ اُن میں تقریباً ۴۰ ایسے پرندے تھے، جن کو تب تک لداخ میں ریکارڈ نہیں کیا گیا تھا۔ چار ایسے پرندے تھے جو ملک کے کسی بھی حصّے میں پائے نہیں جاتے تھے۔ بعد میں مَیں نے کہیں پڑھا کہ اُن میں صرف ایک پرندہ تھا جو ہندوستان کے کسی اور حصّے میں نہیں پایا جاتا۔

اُن محققوں کو لداخ میں Restricted ممنوع علاقوں میں سروے کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ اگر اجازت ملتی تو غالباً پرندوں کی قسموں کی تعداد ۲۴۰ سے کہیں زیادہ ہوتی۔

لداخ کے دو نوجوان محققین، محمد عباس اور دیسکیونگ نمگیل نے شوقیہ طور پرندوں کی تحقیق پر کام کیا اور ریڈیو یا سیمناروں میں مقالوں کے ذریعے اپنے مشاہدات اور تجربات سے شائقین کو آگاہ کیا۔ محمد عباس نے جو محکمہ جنگلات میں ملازم ہیں، ۳۶۳ پرندوں کی ایک فہرست بنائی ہے۔ یہ اُن کے بیس سالہ مشاہدات اور تحقیق کا ثمرہ ہے۔ ۳۶۳ میں مقیم اور مہاجر دونوں قسموں کے پرندے ہیں، جن کو عباس نے ذیل کے تین زُمروں میں تقسیم کیا ہے۔

شاذونادر نظر آنے والے پرندوں کی تعداد: ۱۹۰

وقتاً فوقتاً نظر آنے والے پرندوں کی تعداد: ۵۵

عام نظر آنے والے پرندوں کی تعداد: ۱۸۸

کل میزان: ۳۶۳

عباس نے ہر پرندے کا سائنسی نام بھی دیا ہے اور جن مقامات پر یہ پرندے دیکھے، اُن کی تفصیلات بھی دی ہیں۔ جن پرندوں کے لداخی نام ہیں، اُنھیں بھی شاملِ فہرست کیا ہے۔

عباس کی یہ فہرست بھی نامکمل ہے کیونکہ یہ پرندے علاقہ چنگ تھنگ اور سنٹرل لداخ میں دیکھے گئے۔ دیسکیونگ نمگیل نے، جو ایک لیکچرار ہیں، پرندوں کے اطوار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ behaviours

لداخ کے علاقہ زنسکار، نوبراہ اور کرگل کے متعدد دیہات میں اِس ضمن میں کوئی سروے نہیں ہوا ہے۔ حال ہی میں ایک مغربی محقق اوٹوفنشر نے اپنی کتاب میں لداخ میں پائے جانے والے یا عارضی طور یہاں آنے والے تین سو سے زائد پرندوں کا ذِکر کیا ہے۔

چھوموری ری اور دُوسری جھیلوں کے پرندوں کی پُرسکون اور خاموش زندگی پر سیاحت کا برا اثر پڑا ہے۔ چھوموری ری جھیل کے کنارے پر ہٹوں کی تعمیر، گاڑیوں کے شور، سیاحوں کی تصویریں لینے، فلموں کی شوٹنگ، آوارہ کتوں وغیرہ سے پرندے سہم جاتے ہیں اور محمد عباس کے مطابق یہ دریائے سندھ کے جزیرہ نما زمینی قطعات پر پناہ لے رہے ہیں۔ لیکن وہاں بھی انسانی دخل اندازی سے اُنھیں چین نہیں مِلا ہے۔ اِسی طرح قورزوق کے ہنسوں اور سارسوں نے بھی اِسی وجہ سے اپنے مسکن بدل ڈالے ہیں۔

لداخ میں کئی پرندوں سے متعلق دلچسپ روایات ہیں۔ پھٹکی PIEBALD سے متعلق یہ کہاوت مشہور ہے کہ جسم پر سپید و سیاہ دھاریوں والا یہ پرندہ وبائی امراض کا سد باب کرتا ہے۔ مقامی روایت کے مطابق پھٹکی کو اگر کشمیر لیا جائے تو زوجی لا سے

آگے نہیں جیتی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گھر کی منڈیر وغیرہ پر صبح پھٹکی آکر بولے تو یہ مہمان کی آمد کی نشانی ہے۔ کوّا بولے تو بری خبر سنے گا۔

لداخی میں پھٹکی کو خاٹنگ پوٹی کہتے ہیں۔

ہُد ہُد سے متعلق یہ نظریہ ہے کہ اس کے گھونسلے میں زیورات ہوتے ہیں جو وہ چرالیتا ہے۔ سُرخ چونچ والی چیل چہچہائے تو آسمان صاف ہونے کی علامت ہے۔

لداخ میں مور نہیں ہوتا لیکن اسے لداخ کے تمدّن اور کلچر میں خاص مقام حاصل ہے۔ اِس کی تعریف میں گیت کہے گئے ہیں اور تقریبوں میں اس کا ناچ پیش کیا جاتا ہے۔

لداخ میں مرغ مرغیاں پہلے پہل اُنیسویں صدی کے پہلے رُبع میں کشمیر سے لائی گئی تھیں۔

لداخ میں مختلف قسموں کی تتلیاں پائی جاتی ہیں۔ ADAIR نے علاقہ کورزوق میں پائی جانے والی ۴۲ قسموں کی تتلیوں کی فہرست مرتب کی ہے اور ہر تتلی کا ایک نمونہ برطانیہ کے نیشنل ہسٹاریکل میوزیم کو پیش کیا ہے۔

کورزوق سطح سمندر سے پندرہ ہزار فٹ سے زیادہ اُونچائی پر واقع ہے۔

تتلیاں جتنی بلندی پر پائی جاتی ہوں، اُتنی ہی عمدہ اور اعلیٰ مانی جاتی ہیں۔

لارڈ ڈینمور نے لداخی کے ۱۸۲۵۰ افٹ بلند ایک درّے پر ایک تتلی دیکھی اور اُس کا نام لداخی میں ''پیمالا پشرے لا'' یا تتلی درّہ رکھا۔

لداخ میں کئی نادر تتلیاں پائی جاتی ہیں، جن کی بڑی مانگ ہے۔ ایک نادر اور نایاب تتلی کا دام ہزاروں روپے تک جاتا ہے۔

لداخ کے دریاؤں میں کئی اقسام کی رُوپہلی اور سنہری مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں اُودبلاؤ بھی پایا جاتا ہے۔
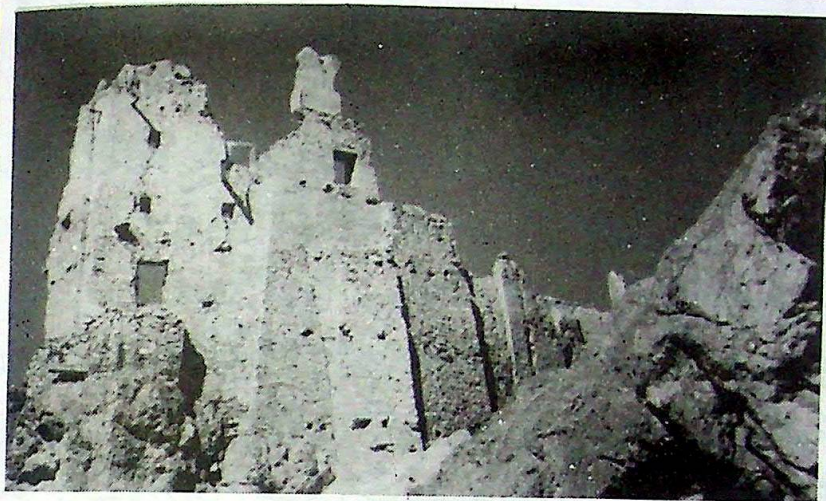
چیکتن کے تاریخی محل کا کھنڈر
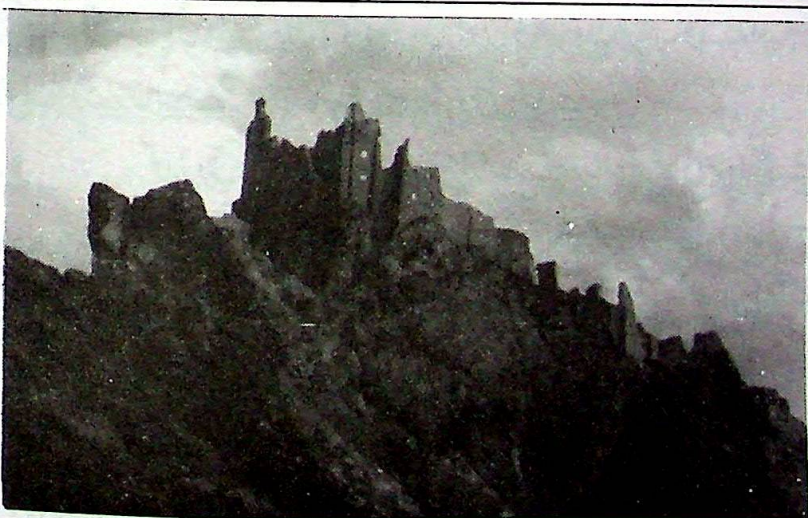
چیکتن کھر (محل)

۱۹۱۷ء سے پہلے لی گئی ایک تاریخی تصویر

کرسی پر براجمان (بائیں سے) راجہ صنم نمگیل (۱۸۶۶آ-۱۹۴۲ء)، کوشوق بکولا لبزانگ ایشے (اٹھارواں بکولا-
۱۸۶۲ء-۱۹۱۷ء)، راجہ ڈاڈوُل نمگیل (۱۸۹۵ء-۱۹۴۹ء)۔ کھڑے (بائیں سے) داواشا'
گےڈُوقپا، گے ایشے چھوانگ، صنم ونگدوس اور تنڈوپ بیلو

لیہہ مڈل سکول کی ایک پرانی تصویر: ماسٹر غلام سلطان ہارمونیم بجاتے ہوئے۔ دائیں طرف منشی غلام محی الدّین
رومی ٹوپی میں۔ تب وہ لداخ میں واحد فوٹوگرافر تھے۔
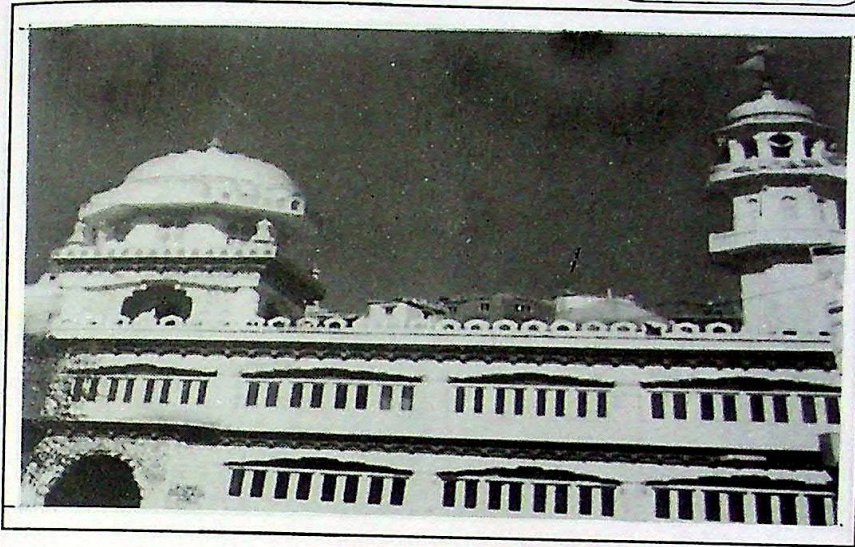
جامع مسجد، لیہہ
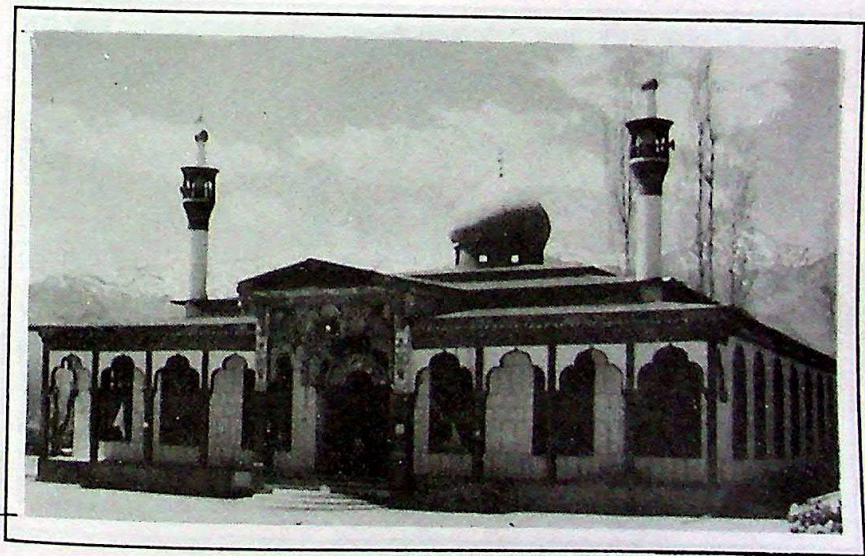
امام باڑہ چھشوت یوغما (لیہہ)
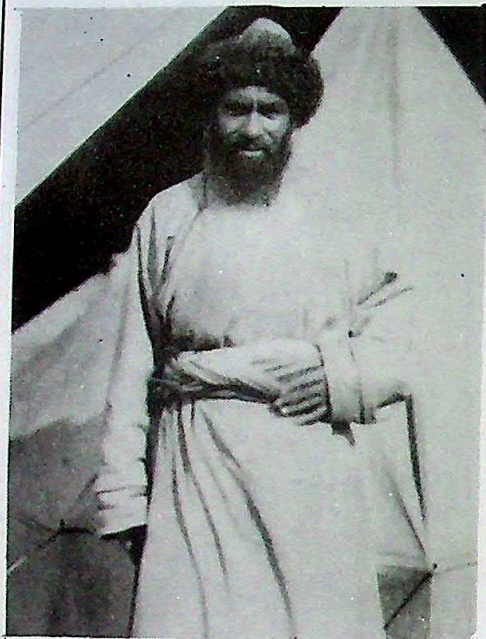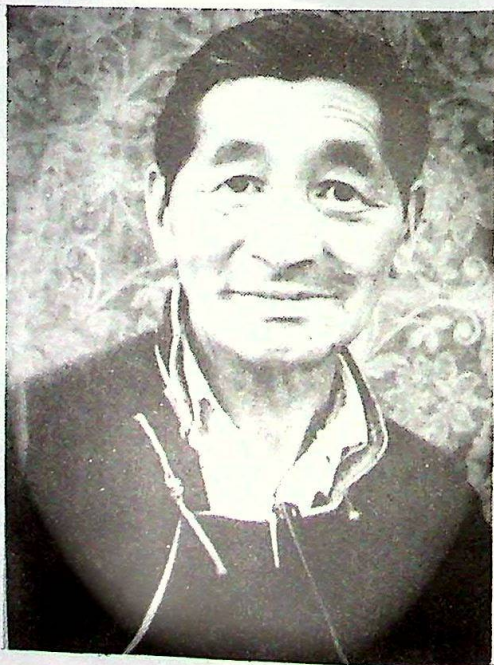
غلام رسول گلوان

مُنشی عبدالستّار

آج کا لداخی بچّہ،
جس کو تعلیم و تربیت کی پہلے سے
بہت بہتر سہولیات میسّر ہیں

لیہہ کا موراوین مشن مرکز-۱۸۸۵ء

پشکیوم

SERVANT OF SAHIBS

A Book to be Read Aloud

BY

GHULAM RASSUL GALWAN

Aksakal of Leh

With an Introduction by

SIR FRANCIS YOUNGHUSBAND

CAMBRIDGE

W. HEFFER & SONS LTD.

1923
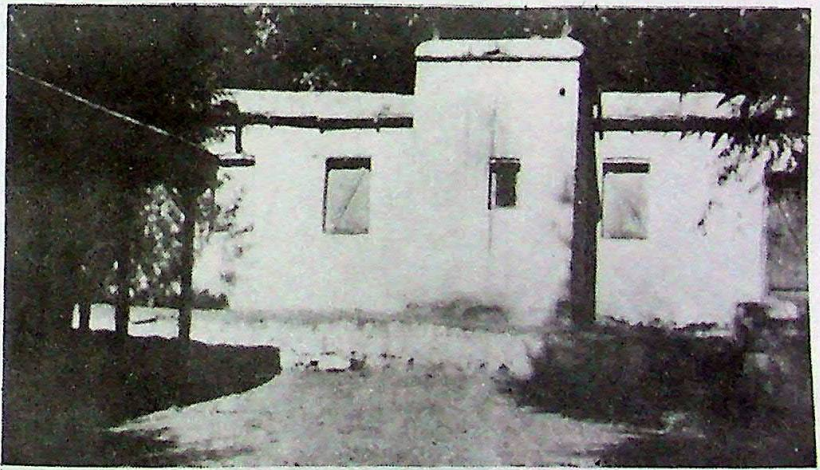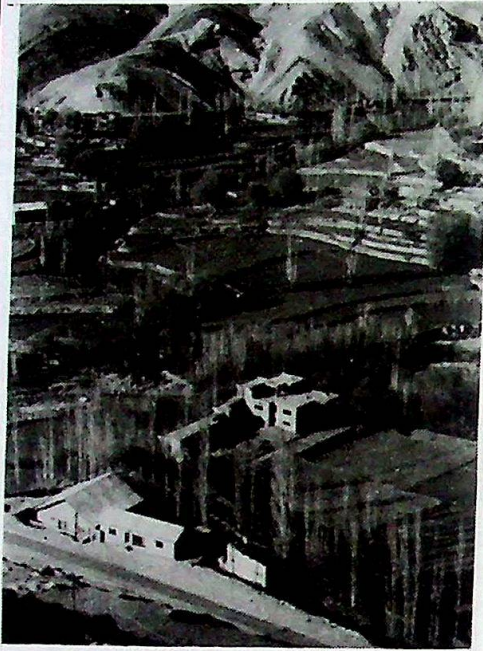
رسول گلوان کی کتاب
''سرونٹس آف صاحبس''
کا سرورق
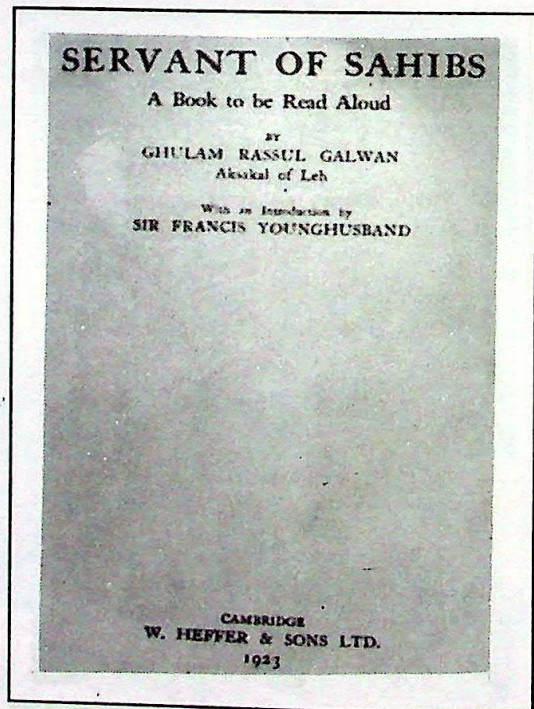
لداخی عورتوں نے اب ٹوپی
چھوڑ دی ہے

خواجہ عبداللہ شاہ اقستقال

لیہہ کا ایک پرانا فوٹو

نربو صاحب، بابو دورجے، خواجہ عبدالحق، ایلی ایزر جولدن، ستبدن شنگارا وغیرہ نظر آرہے ہیں

پوریگ، کرگل کی دو مُسلم لڑکیاں

کتابیات

حشمت اللہ خان — ''تاریخِ جموں، کشتواڑ، تبت، لداخ، بلتستان، پوریگ، گلگت، مظفر آباد'' ۱۹۳۷ء

کاچو سکندر خان — ''قدیم لداخ'' ۱۹۸۷ء

جے. ایس. گیرگن — ''لداخس گیالربس چیمید'' (لداخی) ۱۹۷۶ء

محمد امین پنڈت — ''لداخ کی کہانی'' ۱۹۷۰ء

ٹشی ربگیس — ''مریُول لداخسکی سکوُربس کُونسل میلونگ (لداخی) ۱۹۸۴ء

عبد الغنی شیخ — ''لداخ نامہ'' (۲۶ ریڈیائی بات چیت) ۲۰۰۰ء

منشی عبد السّتار — ''تاریخِ مغربی تبت'' ۱۹۱۹ء

مہتہ شیر سنگھ — ''سفر نامہ مہتہ شیر سنگھ'' (لگ بھگ ۱۸۶۷ء) (قلمی نسخہ)

محمد یوسف ٹینگ — ''رُسل گلوان: ارضِ کشمیر کا ایک نامور سپوت'' (مضمون)

محمد خان وغیرہ — ''احوالِ مُلک لداخ'' (لگ بھگ ۱۸۶۹ء) (قلمی نسخہ)

کاچو سکندر خان — ''افکارِ پریشاں''

مرزا سیف الدّین — ''خلاصۃ التواریخ'' (اقتباس)

راہول سنکرواتسائن ''یاترا کے پنّے'' (ہندی)
محمد دین فوق ''مکمل تاریخِ کشمیر'' ۱۹۱۰ء
سیّد محمد عباس کاظمی ''بلتی لوک گیت'' ۱۹۸۵ء
نذیر احمد ملک ''کشمیری سرمایۂ الفاظ کے سرچشمے''
محمد رضا آخون زادہ ''اسرار شاہِ ہمدان''
سیّد رسول پونپور ''بابا زین الدّین رِشی'' (مضمون)
ابوبکر امیر الدّین ''تبت اور تبّتی مسلمان''
شہزاد میر ''شاہِ سفر سیرِ دُنیا''
مولوی ذکاء اللہ ''تاریخِ ہند''
عبدالحمید لاہوری ''بادشاہ نامہ''
کاچو سکندر خان نُو رِبُو زانگپو اور اِت ٹھوق لہامو'' ۱۹۷۷ء
جی ایم میر ''کشورِ کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ'' ۲۰۰۲ء
ٹشی ربگیس ''نیا لداخی ادب'' (مضمون)
راہول سنکرواتسائن میری لداخ یاترا

ENGLISH BOOKS

Alexander Cunningham — Ladakh-physical, statistical, and Historical, (First published 1853.)

C.L. Datta — General Zorawar Singh, His life and Achievements in Ladakh, Baltistan & Tibet. 1984.

A.H. Francke — A History of Western Tibet,1907.

Neil Howard — The Kingdoms of Guge Puhrang (Article) 1997-98.

Shri Dhar Koul and H.N. Koul — Ladakh,Through the Ages.1992.

M.W. Fisher, Leo E. Rose and Robert Huttenback, — Himalayan Battle ground:

	Sino Indian Rivalry in Ladakh,1963
ArchaeologicalSurvey of India	Report, Pre-historic stone tools in Ladakh, 1990.
Karl Marx	Lawdags Gyalrabs (English Version)1891,1894,1901, 1902, 1903, 1904 and 1906.
Luciano Petech	The kingdom of Ladakh. 1977.
Roberto Vitali	The kingdom of Guge Puhrang. 1996.
Siddiq Wahid	Ladakh Between Earth and Sky, 1981.
C.S.J. Wessels	Early Jesuit Travellers in Central Asia, (1603-1721), 1924.
Wadia Institute of Himalayan Geology, Dehradun	Report, Found in Ladakh, 1979.
Amar Nath Pandit.	An Echo of Unknown. 1931.
Martijn Van Beek and Brix Bertelsen Kristoffer	Ladakh, Independence is not Enough (Article) 1995.
Frederic Drew	The Jammu and Kashmir Territories, 1875.
Joseph Gergan and Walter Asboe	A thousand Tibetan Proverbs and Wise Sayings, 1942.
Robert Shaw	High Tartery , Yarkand and Kashghar, 1871.
Madanjeet Singh	Himalayan Art, 1971.
David Snellgrove and T.Skorupski	The Cultural Heritage of Ladakh, (2 Vols.) 1977 and 1979.
S.P. Verma.	Struggle for the Himalayas,1965.
Younghusband	The Heart of continent.
Drothy Woodman	Himalayan Frontiers.
Younghusband	The Nothern Frontier of Kashmir.1980
E. Keumbury (compiled)	The Silk Route and the Diamond Path.
G. Sandbery	Tibet-A chronicle of Exploration.

	1904.
J.N. Ganhar	The wild life of Ladakh, 1979.
Reginald Rankin	A Tour in the Himalayas and Beyond, 1895.
Edger Philips	Yak Shooting in Tibet, 1900.
Henry Zouch Darrah	Sports in the High lands of Kashmir-8 months trip in Baltistan and Ladakh,1898.
Col. Fred Markhom	Shooting in the Himalayas, 1854.
A.E. Ward,	The Tourists and sportsmen's guide to Kashmir and Ladakh, 1896.
R. Lydeker,	The game Animals of India, Burma, Malaya and Tibet, 1907.
Arthur Brinckman	The Rifle in Kashmir, 1862.
Himalton Bower,	Diary of a Journey Across Tibet, 1894.
Roger Goepper,	Alchi, 1982.
Giuseppe Tucci,	Archaelogia Mvndi Trans Himalaya
B.I. Kuznetsov,	Who was the Founder of the Bon religion?
Marco Pallis,	Peaks and Lamas, 1939.
A.H. Francke,	Ladakhi Songs,1899.
C.E. Tyndale Biscoe	Kashmir in Sunlight and Shadow, 1925.
The Earl of Dunmore	The Pamirs, 1893.
Cowley lambart,	A Trip to Kashmir and Ladakh, 1877.
R.L. Kennion,	Sport and Life in the Further Himalaya, 1910.
F.E.S.A.	Sports in Ladakh, 1895.
C.E.M Russell	Bullet and shot in Indian Forest, Plain and Hill. 1900.
Torrens	Travels Ladakh, Tartary and Kashmir, 1862.
A.Heber and Kathleen M.Heber	In Himalayaan Tibet.

H.H. P. Deasy	In Tibet and Chinese Turkistan, 1901.
F.E.S. Adair	A summer in High Asia, 1899.
Edited by S.N. Gadru	Kashmir papers-British intervention in Kashmir, Published in 1868, 1870 and 1890 respectively.
F.A. Peter	Glossary of Place Names in Western Tibet, 1977.
E.F. Knight	Where there Empires meet, 1892.
A.H. Francke	Antiquities of Indian Tibet, (2 vols.) 1910.
Fida Hassnain	British Policy Towards Kashmir, 1974.
Sven Hedin	Transhimalaya, 1909.
Mirza Mohammad Haider	Tarikh Rashidi, English Translation by Denison Ross, 1973.
William. H. Knight	Diary of a Pedestrian in Cashmere and Tibet, 1863.
William Moorcraft and George Trebeck	Travels in the Himalayan Provinces of Hindustan and the Punjab, in Ladakh and Kashmir 1837.
Arthur Neve	Thirty years in Kashmir, 1908.
Quarter Master General	Gazetteer of Kashmir, 1890.
Janet Rizvi,	Ladakh: Crossroads of High Asia, 1983.
P.K.N. Bamzai	Kashmir and Central Asia, 1980.
P.K.N. Bamzai	Kashmir and Power Politics
L.E.M. Bourbel	Routes in Jammu and Kashmir. 1897
Ahmad Hussain Dani	Human Records on the Kara korum highway.
Rassul Galwan	Servant of Sahibs, 1923.
Charles Genoud	Buddhist Wall Paintings of

	Ladakh, 1981.
Q.M.G. of British India,	The Gazetteer of Kashmir and Ladakh, 1890.
Peter Hopkirk	The Great Game
Peter Hopkirk	Foreign Devils on the Silk Road
D.Klimburg-Salter	Buddhist Art of the Western Himalayas,
Alastair Lamb	British and Chinese Central Asia, 1960.
Sir Walter Lawrance	The Imperial Gazette of India.
G.N.Rao	The India China Border.
Shridhar Kaul	Ladakhi Folk Dances and Songs (Article)
John Bray,	The Moravian Church in Ladakh, The first 40 years 1885-1925, 1984. (Article)
M.L.A. Gompertz (Ganpat)	Magic Ladakh, 1928.
William. O. Douglas	Beyond the High Himalayas, 1953.
Translated and edited by P.M.Kemp,	Russian Travellers to India and Persia (1624-1798), 1959.
University of South amption	Ladakh Expedition, 1982.
Nicol Smith	Golden Doorway to Tibet, 1948.
Nicky Grust	Ladakh, A Trading State, 1985 (Article)
N.T. Shaqspo	Ladakhi Language and Literature 1985 (Article)
John Bray	Christianity in Ladakh, 1985. (Article)
Sanyugta Kushal	The Conversational Ladakhi
Rohit Vohra	The Religion of the Dards in Ladakh, 1989.
Rohit Vohra	An Ethnography - The Buddhist Dards of Ladakh,1989.
R.P.Anuruddha	An Introduction into Lamaism,
Giuseppe Tucci	The Religion of Tibet , 1980.
Edgar Phelps	Yak shooting in Tibet, 1900.
Jeste and Sanday	Sengey Namgyal Palace

Thomas Thomson	Western Himalaya and Tibet, 1852.
Gpsy Davy and Lady Ba	Himalayan Letters, 1927.
F.de. Filippi	Kara koram and East Turkistan 1913-14. (Expedition) , 1932.
Rohit Vohra	Moravian Missionaries Among the Buddhist Dards,1990 (Article)
David Freser	Trans - Himalaya Unveild, 1986 (Reprint)
S.S. Gergan	History of Ladakh, 1978, (Article)
Mohammad Amin Pandit	Ladakh: Land of Possessive Powers and Charm (edited) 1997.
A. Mark. Trewin	On the History and Orign of 'GAR' the court ceremonial,1997.
Sayyid Ali Najaf	Travels in Ladakh, 1998.
Nicola Grist	Muslims in Western Ladakh, 1997.
Pascale Dolfus,	The History of Muslims in Central Ladakh, 1995. (Article)
Gerhard Emmer,	The Unnoticed Muslims on the Roof of the World, 1999.
Fida Mohammed Hassnain	History of Shawl Bafi in Kashmir, 2003, (Article)
Abdul Ghani Sheikh	Ladakh's Relations with Central Asia, 1997. (Article)
- Do -	Economic Conditions in Ladakh during the Dogra Period, 1999. (Article)
- Do -	Heritage of Ladakh, 2002, (Article)
- Do -	Ladakh and Baltistan through the Ages, 1998. (Article)
- Do -	Ladakhi Culture over the Centuries, 2002. (article)
- Do -	Muslims in Ladakh and Sufi Traditions, 2003. (Article)
M.Shafi	The Noorbakhshis. (An Article)

Andreas Risck	The Noorbakhshis of Baltistan, 1998. (Article)
Mir Izzat-u-llah	Travels Beyond the Himalaya
Jose Ignacio Cahezon	Islam on the Roof of the World (Article)
Rohit Vohra	Arabic Inscriptions of the Late Ist Millennium A.D. from Tangtse in Ladakh.
S.M. Yusuf	The Early Contacts between Islam and Buddhism
Dawa Norbu	Khache Phalu's Advice-on the Art of Living, 1987.
Ghulam Mohi-ud-Din Sufi	A History of Kashmir, 1974.
Joseph L. Fox, Tsering Norbu and R.S. Chundawat.	The Mountain Ungulates of Ladakh, 1991. (Article).
- Do -	Tibetan argali establish a new Population. (Article)
Joseph.L.Fox, Satya P. Sinha and R.S.Chundawat	Activity Patterns and habitat use of the Asiatic Ibex in the Himalaya Mountains of India. (Article)
- Do -	A Field Survey of Snow Leopard (Article)
K.Warikoo	Central Asia and Kashmir
C.L.Datta,	Ladakh and Western Himalaya
Peter Hopkirk,	Trespassers on the Roof of the World.
Thupstan Paldan	The Guide to the Buddhist Monasteries and Royal castles of Ladakh, 1997.
Amar Singh Chohan	Historical Study of Society and Culture in Dardistan and Ladakh, 1983.
J& K State Gazetteers	Ladakh Region
Ahmad Hassan Dani	History of the Northern Areas of Pakistan

M.S. Wellby — Through Unknown Tibet, 1898.

Elizer Joldan — Harvest Festival of Buddhist Dards of Ladakh and other essays.

National archives, New Delhi.
J&K Archives, Leh, Jammu and Srinagar.

بیسویں صدی کے شروع میں زنسکار میں لی گئی ایک تصویر